پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال 2014

2014

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

ذرائع معلومات

ذرائع، جہاں متن یا حاشیہ میں ان کا حوالہ نہیں دیا گیا، ایچ آر سی پی کے جائزے پر مبنی رپورٹس، نامہ نگاروں اور عام شہریوں کے ساتھ خط و کتابت، سرکاری گزٹ، اقتصادی اور قانونی دستاویزات اور دیگر سرکاری اطلاعات اور بیانات، قومی اور علاقائی پریس میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور یواین ڈی پی، آئی ایل او، ڈبلیو ایچ او، یونیسف اور ورلڈ بنک جیسے عالمی اداروں کی مطبوعات پر مبنی ہیں۔ سرکاری رپورٹوں، پریس کے جائزوں اور این جی اوز کی نمونے کی سروے رپورٹوں کو ان کے محدود وسائل کے پیش نظر صورت حال کی مکمل یا حتمی تصویر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ صرف سال کے دوران سامنے آنے والے رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔

ناشر

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور - 54600

فون : 92-042-35838341-35864994-35865969 فیکس : 92-042-35883582

ای میل : hrcp@hrcp-web.org

ویب سائٹ: www.hrcp-web.org

طابع

یو بی پرنٹرز

مشن روڈ، لاہور

اپریل 2015

قیمت : 400 / = روپے

10 ڈالرز

5 پاؤنڈ

(علاوہ ڈاک خرچ)

ISBN No. 978-969-8324-78-0

سرورق ڈیزائن: وژنریز ڈویژن، لاہور

متن کمپوزنگ: جمال احمد/سید رضا شاہ

54600

92-042-35883582

فہرست مضامین

اختصارات ... i

تعارف ... 1

اہم نکات ... 3

1- قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی ... 17

عدل وانصاف کا انتظام وانصرام ... 35

2- قانون کا نفاذ

امن عامہ کی صورت حال ... 71

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں ... 103

3- بنیادی آزادیاں

نقل وحرکت کی آزادی ... 133

سوچ، ضمیر اور مذہب کی آزادی ... 150

اظہار رائے کی آزادی ... 171

اجتماع کی آزادی ... 188
انجمن سازی کی آزادی ... 210

4- فروغ جمہوریت
سیاسی عمل میں شرکت ... 225

5- محروم طبقوں کے حقوق
خواتین ... 247
بچے ... 272
لیبر ... 293

6- سماجی اور معاشی حقوق
تعلیم ... 315
صحت ... 339
رہائشی سہولیات ... 362
ماحولیات ... 381
مہاجرین ... 401

ضمیمے
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں ... 423
اہم مسائل پر کمیشن کا موقف ... 455

اختصارات

اے ڈی بی	ایشین ڈویلپمنٹ بنک
اے سی	اسسٹنٹ کمشنر
اے این پی	عوامی نیشنل پارٹی
اے پی پی	ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان
اے آر ڈی	الائنس فار دی ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی [یہ وسیع تر اتحاد برائے بحالی جمہوریت 2000 کے اواخر میں تشکیل پایا تھا، جس میں پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی دونوں شامل تھیں]
اے ایس آئی	اسسٹنٹ سب انسپکٹر [پولیس]
اے ایس جے	ایڈیشنل سیشن جج
اے ٹی اے	اینٹی ٹیررازم ایکٹ
اے ٹی سی	اینٹی ٹیررازم کورٹ
بی ایچ سی	بلوچستان ہائی کورٹ
بی ایچ یو	بنیادی ہیلتھ یونٹ
سی ڈی اے	کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی اسلام آباد، کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA)، لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی - (LDA)
سی ای سی	چیف الیکشن کمشنر
سی ای ڈی اے ڈبلیو	[CEDAW] عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے کا کنونشن
سی آئی اے	کریمنل انویسٹی گیشن ایجنسی
سی آئی آئی	کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی [اسلامی نظریاتی کونسل]
سی سی آئی	کونسل برائے مشترکہ مفادات
سی جے	چیف جسٹس
سی این آئی سی	کمپیوٹرائزڈ نیشنل آئیڈنٹٹی کارڈ
سی او اے ایس	چیف آف آرمی سٹاف
سی او پی	کانسٹی ٹیوشن آف پاکستان
سی آر پی سی	کرمنل پروسیجر کوڈ
سی آر سی	کنونشن آف دی رائٹس آف دی چائلڈ [بچوں کے حقوق کا کنونشن]
ڈی سی او	ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر
ڈی پی او	ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر
ڈی آئی جی	ڈپٹی انسپکٹر جنرل [پولیس]
ڈی ایس جے	ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج
ڈی ایس پی	ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ای سی ایل	ایگزٹ کنٹرول لسٹ
ای آئی اے	انوائرنمنٹ امپیکٹ اسسمنٹ
ای پی اے	انوائرنمنٹ پروٹیکشن ایجنسی [ادارہ تحفظ ماحولیات]
ای پی آئی	ایکس پینڈڈ پروگرام آف امیونائزیشن
ایف اے ٹی اے (فاٹا)	فیڈرلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز [وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات]
ایف سی آر	فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز
ایف آئی آر	فرسٹ انفارمیشن رپورٹ
ایچ ای سی	ہائر ایجوکیشن کمیشن
ایچ آر سی پی	ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان [پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق]
آئی ڈی ایم سی	انٹرنیشنل ڈس پلیسمنٹ (اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کے بارے میں) مینجمنٹ سنٹر
آئی ای ای	انٹرنیشنل انوائرنمنٹ ایگزامینیشن
آئی جی	انسپکٹر جنرل [آف پولیس]
آئی ایچ سی	اسلام آباد ہائی کورٹ
آئی ایم ایف	انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ
آئی ایس آئی	انٹر سروسز انٹیلی جنس
آئی ایس پی آر	انٹر سروسز پبلک ریلیشنز
آئی یو سی این	انٹرنیشنل یونین فار دی کنزرویشن آف نیچر
جے آئی	جماعت اسلامی
جے یو آئی (ایف)	جمعیت علمائے اسلام (ف)
جے جے ایس او	جووینائل جسٹس سسٹم
ایل ایچ سی	لاہور ہائی کورٹ
ایل ایچ وی	لیڈی ہیلتھ وزیٹر
ایم این اے	ممبر قومی اسمبلی

ایم پی اے	ممبر صوبائی اسمبلی
ایم کیو ایم	متحدہ (سابق مہاجر) قومی موومنٹ
ایم ایس ایف	مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن
این اے	نیشنل اسمبلی
این اے بی	نیشنل اکاؤنٹ ایبلٹی بیورو
این سی ایس ڈبلیو	نیشنل کمیشن آن دی سٹیٹس آف ویمن
این ای کیو ایس	نیشنل انوائرنمنٹ کوالٹی سٹینڈرڈز
این جی او	نان گورنمنٹ آرگنائزیشن [غیر سرکاری تنظیم
سی این آئی سی	کمپیوٹرائزڈ نیشنل آئیڈنٹی کارڈ
این آئی آر سی	نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمیشن
این ایس سی	نیشنل سیکورٹی کونسل
پی اے ای سی	پاکستان اٹامک انرجی کمیشن
پی اے ٹی اے [پاٹا]	پروونشلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز [صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات]
پی ایف یو جے	پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس
پی ایچ اے	پاکستان ہاؤسنگ اتھارٹی
پی ایچ سی	پشاور ہائی کورٹ
پی ایم ایل [این]	پاکستان مسلم لیگ [نواز شریف گروپ]
پی او این ایم (پونم)	پاکستان اپریسڈ نیشنز موومنٹ [چھوٹے صوبوں کی قومیت پرست جماعتوں کا پلیٹ فارم، جس کا مقصد پنجاب کی بالادستی کے خلاف شکایات کے ازالے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔]
پی پی سی	پاکستان پینل کوڈ
پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی
پی پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی۔ پارلیمنٹیرین
پی ایس	پولیس اسٹیشن
پی ٹی آئی	پاکستان تحریک انصاف
آر ایچ سی	رورل ہیلتھ سنٹر
ایس اے اے آر سی (سارک)	ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن
ایس سی	سپریم کورٹ
ایس سی اے آر پی [سکارپ]	سیلنٹی کنٹرول اینڈ ریکلیمیشن پروجیکٹ
ایس سی بی اے	سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن
ایس ایچ سی	سندھ ہائی کورٹ

ایس ایچ او	اسٹیشن ہاؤس آفیسر [تھانیدار]
ایس آئی	سب انسپکٹر [آف پولیس]
ایس آئی ٹی ای [سائیٹ]	سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ
ایس ایم پی	سپاہ محمد پاکستان
ایس پی	سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ایس ایس پی	سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ایس ٹی این	شالیمار ٹیلی ویژن نیٹ ورک
ٹی بی	ٹیوبرکلوسس
ٹی جے پی	تحریک جعفریہ پاکستان
ٹی این ایس ایم	تحریک نفاذ شریعت محمدی
ٹی ٹی پی	تحریک طالبان پاکستان
یو جی سی	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن
یو این ڈی سی پی	یونائیٹڈ نیشنز ڈرگ کنٹرول پروگرام
یو این ڈی پی	یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام
یو این ای ایس سی او [یونیسکو]	یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل، سائنٹیفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن
یو ڈی ایچ آر	یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس
یو این ایچ سی آر	یونائیٹڈ نیشنز ہائی کمیشن فار ریفیوجیز [اقوام متحدہ ہائی کمیشن برائے مہاجرین]
یو این آئی سی ای ایف (یونیسف)	یونائیٹڈ نیشنز انٹرنیشنل چلڈرنز ایجوکیشن فنڈ
ڈبلیو اے پی ڈی اے	(واپڈا) واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی
ڈبلیو اے ایس اے	واٹر اینڈ سیوریج اتھارٹی (واسا)
ڈبلیو بی	ورلڈ بنک
ڈبلیو ایچ او	ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن
ڈبلیو ٹی او	ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن
ڈبلیو ڈبلیو ایف	ورلڈ وائیڈ فنڈ فار نیچر
ملین	دس لاکھ
بلین	ایک ارب/ایک سو کروڑ

تعارف

ایسے کسی سال کا احاطہ آسان نہیں جس کا آغاز مذہبی اقلیتوں پر عقیدہ کی بنیاد پر حملوں کے ایک سلسلہ سے اور اختتام نوجوان طالب علموں کے ایسے قتل عام پر ہوا ہو جو ملکی تاریخ میں کسی ایک دہشت گرد حملے میں سب سے زیادہ اموات کا باعث ہو۔ معاشرے کے سب سے کمزور طبقات کے خلاف پہلے سے کہیں زیادہ لرزہ خیز تشدد کے بہت سے واقعات ان کے علاوہ ہیں۔

تاہم، سال 2014 میں بھی امید کی کرن کبھی کبھار دکھائی ضرور دی جیسے کہ ملک میں خواتین کی سیاسی مظاہروں میں فعال شرکت اور عورتوں کی حالت میں بہتری کے لیے کچھ قوانین کا بننا۔ کم از کم ملک کے کسی حصے میں 18 سال سے کم عمر بچوں کی شادی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ بلوچستان میں گھریلو تشدد جرم ٹھہرا۔ صوبائی حکومتوں نے غیر ہنر مند کارکنوں کے لئے کم از کم اجرت میں اضافہ کیا اگرچہ یہ اضافہ کارکنوں کی توقعات سے کم تھا۔ دسمبر میں پشاور سکول حملے کے بعد ملک میں موجود ایسے تمام جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف اتفاق رائے پیدا ہوتا نظر آیا جو بعض چھوٹے اور بڑے مقاصد کے تحت مذہب کا استحصال کر رہے تھے۔ حکومت نے قبائلی علاقوں میں اپنی رٹ بحال کرنے کے لئے کچھ عزم انتہا پسند عسکریت پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن سے ظاہر کیا۔

پھر بھی انسانی حقوق کے خدشات اور پریشان کن رجحانات کی فہرست بہت طویل ہے۔ دہشت گردی اور فرقہ وارانہ تشدد کی ہولناک کارروائیاں ملک کو تباہ کرنے کے لئے جاری رہیں۔ مذہبی اقلیتوں پر حملوں میں نئے عناصر در آتے رہے اور حکومت عقیدہ کی بنیاد پر تشدد کو دبانے کی صلاحیت یا عزم کے مظہر ایسے اقدامات لینے میں ناکام رہی جن سے شہریوں کا اعتماد بحال ہو سکتا۔ ماورائے عدالت قتل، غیر قانونی اور من مانی حراست، حراست میں تشدد اور جبری گمشدگیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بیس لاکھ سے زائد بے گھر افراد، جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی ہے، کو حفاظت کی خاطر گھر بار چھوڑ کر ان ہزاروں افراد کی صف میں شامل ہونا پڑا جو سیکیورٹی فورسز اور انتہا پسند عسکریت پسندوں کے درمیان ہونے والے مسلح تصادم کے پہلے واقعات کے نتیجے میں بے خانماں ہوئے تھے۔

نام نہاد غیرت کے نام پر قتل، عصمت دری، تیزاب حملے، گھریلو تشدد اور خواتین کے خلاف حملوں کے

واقعات کا بڑھنا عیاں تھا۔ نوزائدہ بچے تھرپارکر کی طویل خشک سالی کا سب سے زیادہ شکار ہوئے اور ارباب اختیار کی بے حسی کا اشارہ دیتے 650 سے زائد بچے اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ ایک اور سال ایسا گزرا کہ پاکستان بچوں، خاص طور پر لڑکیوں، کی ایک بڑی تعداد کو تعلیم دینے میں زیادہ تر ایشیائی ممالک سے پیچھے رہ گیا۔ پولیو کے خلاف پاکستان کی ہارتی ہوئی جنگ پر صحت کے کارکنوں اوران کی حفاظت پر مامور افراد پر ہدفی حملے مستزاد تھے۔ 2014 میں پاکستان میں پولیو کے واقعات میں ایسا اضافہ ہوا کہ ملک کے اپنے ہی حالیہ ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ صحت عامہ کا نظام، جو پہلے ہی جنوبی ایشیا میں کمزور ترین نظاموں میں سے ایک ہے، تیزی سے زوال کا شکار رہا۔ بچوں اور دیگر افراد کی جبری مشقت کا رواج رہا اور بچوں سمیت مزدور خطرناک حالات میں کام کرتے رہے۔

ذرائع ابلاغ سے منسلک چودہ افراد کے قتل کے ساتھ ملک، خاص طور پر صوبہ بلوچستان، صحافیوں کے لئے دنیا میں سب سے خطرناک مقامات میں شمار ہوا۔ حریف ٹیلی وژن نیوز چینلز مہینوں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے اور حتیٰ کہ مذہبی توہین کے الزامات کا تبادلہ کرتے رہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو مذہبی توہین کے قانون کے تحت الزامات کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ایک سازگار ماحول فراہم نہ کرنے کی ریاستی ضد کے باوصف انسانی حقوق کا دفاع مشکل سے مشکل تر ہوتا رہا۔

جب کہ قید خانے مقررہ گنجائش سے کہیں زیادہ بھرے جاتے رہے، تعزیری قید کا متبادل تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلوچستان کے علاوہ، تمام صوبے مقامی حکومتوں کے انتخابات کے انعقاد سے پہلوتہی کرتے رہے۔ غریبوں کے لئے رہائش ایک بڑا مسئلہ رہا اور سیلاب جیسی آفات کے باعث پہلے سے ناکافی رہائشی سہولیات پر بوجھ بڑھتا رہا۔

نظام انصاف سست رو رہا اور یوں سال کے اختتام پر تقریبا بیس لاکھ کیس عدالتوں میں زیر التوا تھے۔ عسکریت پسندی اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی کوششیں قانونی عمل کے بنیادی تحفظ کو ٹھیس پہنچاتی رہیں اور ایسے قوانین کے بننے پر منتج ہوئیں جو سکیورٹی کے نام پر انسانی حقوق سے سمجھوتا کرنے پر ہدف تنقید بنے۔ پشاور سکول حملے کے تناظر میں عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائی کے لیے دباؤ کے باوصف حکومت نے فوجی عدالتوں کو ترجیح دی اور سزائے موت پر عائد غیر اعلانیہ پابندی ختم کردی۔ سال کے آخر تک سات مجرموں کو شتابی سے پھانسی دی جا چکی تھی۔

2014 کے اواخر میں ملک کو درپیش چیلنجز ان مسائل سے ہرگز کم نہیں تھے جن کا اسے سال کے اوائل میں سامنا تھا۔ تاہم عسکریت پسندی اور عدم برداشت کے تمام مظاہر کے خلاف عزم کی پرورش اوراس پر عمل درآمد شاید ایک ایسے محرک کا باعث بنے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کی جدوجہد جس کے لئے طویل عرصے سے تڑپ رہی تھی۔

وقار مصطفیٰ

مدیر

اہم نکات

قوانین اور قانون سازی

☆ پارلیمنٹ نے دس قوانین بنائے۔ یہ تعداد پچھلے برس کی نسبت آدھی سے بھی کم ہے۔ پچھلے برس پارلیمنٹ نے 22 قوانین بنائے تھے۔

☆ پارلیمنٹ نے جو چند اہم قوانین منظور کیے ان کا تعلق سالمیت کے تحفظ، عدالتی نظام، دہشت گردی کے خاتمہ سے تھا۔ اس میں تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء شامل ہے۔

☆ صوبوں میں 137 قوانین بنائے گئے۔ یہ قوانین مختلف اور اہم معاملات سے متعلق تھے۔

☆ سال کے دوران صوبوں میں خیبر پختونخوا میں سب سے زیادہ ایکٹ اور آرڈی ننس منظور کیے گئے۔ اس کے بعد سندھ، پنجاب اور پھر بلوچستان کا نمبر آتا ہے۔

☆ 2011ء میں ہندو میریج بل اور کرسچین ڈائیورس بل پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے جو تاحال زیرِ غور ہیں۔ گھریلو تشدد کے بل پر بھی کوئی پیش رفت ممکن نہ ہو سکی۔

انصاف کا انتظام وانصرام

☆ ملک بھر میں تاحال سترہ لاکھ ترانوے ہزار مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت پڑے ہیں۔

☆ قوانین اور ان پر عمل درآمد کے درمیان فرق کے باعث جرائم کی شرح میں اضافہ ہوا جبکہ سزائیں دینے کے عمل میں کمی نظر آئی۔ خصوصاً اقلیتوں اور معاشرے کے کمزور طبقات کے خلاف جرائم میں

نمایاں اضافہ ہوا۔

☆ عدالتی اور قانونی اصلاحات کے حوالے سے کسی قسم کی کوششیں ہوتی نظر نہیں آئیں۔ لگتا تھا کہ قانون ساز ادارے ان قوانین کے نفاذ میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے جن کے ذریعے شہریوں کے حقوق اور ان کی آزادیوں کی قیمت پر ریاستی تحفظ کو فروغ ملتا ہے۔

☆ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی تحقیق کے مطابق سال کے دوران مذہبی دل آزاری سے متعلق جرائم پر 37 مقدمات درج کیے گئے۔ ان میں سے سات مقدمات دفعہ 295 سی کے تحت درج کیے گئے جس کے تحت سزائے موت لازمی ہے۔

امن وامان

☆ ملک بھر میں 2014ء کے دوران افراد اور املاک کے خلاف جرائم 627,116 مقدمات درج ہوئے۔ اس کے مقابلے میں 2013ء میں ان مقدمات کی تعداد 634,404 تھی۔ یہ کمی برائے نام تھی۔

☆ 2014ء کے دوران سندھ پولیس نے خواتین کے اغواء کے 1261 مقدمات درج کیے۔ ان خواتین کو زبردستی شادی کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ پاکستان میں تیزاب پھینکنے کے 114 مقدمات درج ہوئے۔ 159 افراد اس بھیانک جرم کا نشانہ بنے۔

☆ 2014ء کے دوران دہشت گردی کے 1206 حملوں میں 1723 افراد جاں بحق اور 3143 افراد زخمی ہوئے۔ ان میں 26 خودکش حملے بھی شامل ہیں۔ فرقہ وارانہ تشدد سے جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 210 تھی۔

☆ اہدافی حملوں میں بارہ ڈاکٹر اور 13 وکلاء جاں بحق ہوئے۔

☆ پولیو ٹیموں کے 45 ارکان، جن میں ویکسی نیٹر اور سہولت کار شامل ہیں، جاں بحق ہوئے۔

☆ ایچ آر سی پی کی مانیٹرنگ کے مطابق سال کے دوران قانون نافذ کرنے والے اداروں کی حراست میں چار خواتین اور دو نابالغوں سمیت 63 افراد جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ صرف 14 واقعات کی ایف آئی آر درج کی گئی۔ سات خواتین سمیت 47 افراد کو حراست کے دوران تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

☆ سندھ میں 2014ء کے دوران 3392 پولیس مقابلے ہوئے جبکہ 2013ء میں ان کی تعداد

2616 تھی۔کراچی میں فرائض کی ادائیگی کے دوران پولیس اور رینجرز کے 160 اہلکار فائرنگ کے دوران جاں بحق ہوئے۔جبکہ پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے مجرموں کی تعداد 925 تھی۔خیبر پختونخوا پولیس نے مختلف مقابلوں میں 26 افراد کو مار دیا۔پنجاب پولیس نے 276 مشتبہ مجرموں کو ہلاک کر دیا جبکہ 322 کو گرفتار کر لیا گیا۔2014ء میں جاں بحق ہونے والے پولیس اہلکاروں کی تعداد 27 تھی۔اس کے علاوہ 59 مشتبہ مجرم اور 73 پولیس اہلکار 283 پولیس مقابلوں میں زخمی ہوئے۔

جیل خانے اور قیدی:

☆ عدالتوں نے 231 افراد کو موت کی سزا سنائی۔حکومت نے 2014ء کے آخر میں پھانسی کی سزا پر عائد عارضی پابندی اٹھالی اور سال کے اختتام تک سات افراد کی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کر دیا گیا تھا۔

☆ سزائے موت پر عارضی پابندی ساڑھے گیارہ ماہ تک رہی لیکن 16 دسمبر کو آرمی پبلک سکول پشاور پر حملے کے بعد اس عارضی پابندی کو ختم کر دیا گیا۔

☆ پنجاب کی 32 جیلوں میں قیدیوں کی تعداد 49560 تھی ان میں 32514 وہ افراد تھے جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

☆ بلوچستان کی کل 11 جیلوں میں قیدیوں کی تعداد 2,980 تھی ان میں 1214 وہ افراد تھے جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

☆ گلگت بلتستان کی سات جیلوں میں قیدیوں کی تعداد 307 رہی جن میں سے 212 افراد وہ تھے جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

☆ پنجاب بھر کی جیلوں میں 31 قیدی ایسے تھے جنہیں ایڈز اور 80 قیدیوں کو ایچ آئی وی پازیٹو کی تشخیص ہوئی۔

☆ 2014ء کے دوران سندھ سے 11 سیاسی قیدی غائب کر دیئے گئے۔

نقل و حرکت کی آزادی:

☆ مسلح تصادم، کرفیو کے نفاذ یا کرفیو جیسے حالات، اندرون ملک بے گھری، لاقانونیت یا چند علاقوں میں حکومتی اختیار کی عدم موجودگی کے باعث نقل و حرکت کی آزادی اور اپنی رہائش گاہ کے انتخاب

پر بلا واسطہ یا بالواسطہ بھاؤ تاؤ کیا گیا۔ بھاری سفری اخراجات، سڑکوں کی خستہ حالی، ٹرینوں یا ریلوے ٹریکوں پر حملے اور سفر کے ذرائع اور وسائل میں کمی نقل وحرکت میں رکاوٹ کا سبب بنی۔

☆ فاٹا سے بے گھر ہونے والے افراد کے کچھ صوبوں میں داخلے کی مخالفت کی گئی اور ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ یہ صورت حال زیادہ تر جون اور جولائی میں پیش آئی۔

☆ قرضوں میں جکڑے لاکھوں مزدور حقیقتاً غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

☆ ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے تحت شہریوں کے غیر ملکی سفر پر کچھ پابندیاں عائد رہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر اور دوسرے ملکوں میں سفارت خانوں کی طرف سے پاکستانی شہریوں کو پاسپورٹ کے حصول میں بلا وجہ تاخیر کے بہت سے واقعات سامنے آئے جس کے باعث سفر میں دشواریاں پیش آئیں۔ ہوائی جہازوں اور کراچی کے ہوائی اڈے پر حملوں، سکیورٹی کے باعث کچھ فضائی کمپنیوں کی طرف سے پروازوں کی منسوخی اور بڑھتے ہوئے پولیو کے واقعات کے سبب پاکستان پر عالمی ادارہ صحت کی طرف سے سفر کی پابندیاں عائد ہونے کے باعث آمدورفت میں بے حد کمی آئی۔

☆ بلوچستان کے راستے سفر کرنے والے شیعہ زائرین کی بسیں اور گلگت بلتستان اور ملک کے دوسرے علاقوں کے درمیان چلنے والی چھوٹی بسیں (وین) پولیس کی حفاظت میں سفر کرتی رہیں۔

☆ حکومت خواتین کو یہ تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی کہ وہ اپنے خاندان کے مردوں کے بغیر شہر کے بازاروں میں آزادی سے گھوم پھر سکیں۔

سوچ، عقیدے اور مذہب کی آزادی

☆ سندھ میں ہندوؤں اور مسیحیوں کی گیارہ عبادت گاہوں پر حملے کیے گئے۔

☆ بلوچستان میں ذکری عقیدہ رکھنے والوں پر دو حملے کیے گئے۔ ان حملوں میں چھ افراد جاں بحق اور سات زخمی ہوئے۔

☆ پاکستان بھر میں فرقہ وارانہ تشدد کے کل 144 واقعات میڈیا کے ذریعے سامنے آئے۔ یہ تمام واقعات فرقہ وارانہ دہشت گردی سے متعلق تھے جبکہ فرقہ وارانہ تصادم کے تین واقعات سامنے آئے۔

☆ کوٹ رادھا کشن، پنجاب میں ایک مسیحی جوڑے کو ہجوم نے قتل کر کے لاشوں کو جلا ڈالا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے قرآن پاک کے نسخہ کی بے حرمتی کی تھی۔

☆ ہدف بنا کر کیے جانے والے حملوں میں گیارہ احمدیوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔

☆ وفاقی حکومت نے ایسے قوانین نہیں بنائے جن کے ذریعے مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ تاہم صوبائی سطح پر صرف خیبر پختونخوا اسمبلی نے اقلیتوں سے متعلق دو بل منظور کیے۔

☆ فاٹا میں فوجی آپریشن کے باعث تقریباً 157 خاندانوں کو نقل مکانی کرنی پڑی۔ بعض خاندانوں نے شکایت کی کہ آئی ڈی پی کیمپوں میں انہیں امتیازی سلوک کا نشانہ بننا پڑا۔

اظہار رائے کی آزادی:

☆ میڈیا کے حوالے سے پاکستان دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک ملک شمار کیا گیا۔ صرف 2014ء کے دوران 14 صحافی اور میڈیا ورکرز جاں بحق ہوئے۔ اظہار رائے کی اس سے زیادہ اور کیا تضحیک ہو سکتی ہے۔

☆ 2014ء کے دوران اظہار رائے کی آزادی کو درپیش چیلنجوں اور بندشوں میں کسی قسم کی کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔

☆ حال ہی میں اطلاعات تک رسائی سے متعلق قوانین کے تحت اطلاعات تک رسائی کے لیے جو درخواستیں دی گئیں ان کا وفاقی حکومت، بلوچستان اور سندھ کی حکومتوں کی طرف سے جواب ہی نہیں دیا گیا۔

☆ 2014ء کا سال میڈیا کے حوالے سے مائل بہ پستی رہا۔ ایک بڑے نیوز نیٹ ورک کو کیبل آپریٹروں کے ذریعے بند رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ایک سیاسی شخصیت کی طرف سے صحافیوں کو دھمکیاں دی گئیں۔ مزید برآں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی نے رپورٹنگ کی حدود اور نوعیت پر پابندیاں لگانے کا مطالبہ کیا۔

☆ میڈیا کو جن بڑے مسائل کا سامنا رہا، ان میں سرفہرست مذہب کی بے حرمتی تھی۔ ان مسائل کی اشاعت کے حوالے سے میڈیا کو معمولی جرمانے اور ایسی خبروں کی اشاعت پر پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان اداروں نے اشاعت کو جاری رکھنے کے لیے خود پر پابندیاں عائد کر لیں۔

اجتماع کی آزادی

☆ 16 جون کو پاکستان عوامی تحریک اور پولیس کے درمیان ہونے والے تصادم میں 14 افراد جاں بحق ہو گئے۔

☆ وزیراعظم کی برخاستگی اور ملک کے سیاسی نظام کو سدھارنے کے حوالے سے پاکستان عوامی تحریک نے ''انقلاب مارچ'' کے عنوان سے ریلیاں نکالیں۔

☆ مئی 2013ء میں ہونے والے قومی انتخابات میں 64 نشستوں پر ہونے والی مبینہ دھاندلیوں کے خلاف 14 اگست کو ریلیاں شروع کی گئیں جو 16 دسمبر کو پشاور کے ایک سکول پر ہونے والی دہشت گردی کی کارروائی کے بعد ختم کر دی گئیں۔

☆ اگست تک پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کے 1980 کارکن پنجاب کی جیلوں میں قید تھے۔

☆ 20 جون کو ہزاروں افراد، جن میں زیادہ تعداد خواتین اور بچوں کی تھی، بلوچستان کے شہر پنجگور میں سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے مسلسل پانچ روز سے نجی سکولوں کی بندش کے خلاف شدید احتجاج کیا۔

انجمن سازی کی آزادی:

☆ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں 2014ء کے دوران 134 سیاسی کارکن قتل کر دیئے گئے۔

☆ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی طرف سے پاکستان کے 48 مائل بہ تشدد اضلاع کی مانیٹرنگ کے مطابق 2014ء کے دوران صحافیوں اور انسانی حقوق کا دفاع کرنے والوں کے خلاف 19 حملے کیے گئے۔

☆ میڈیا رپورٹس کے مطابق پاکستان میں دسمبر 2012ء سے دسمبر 2014ء تک کے عرصے میں کم ازکم تیس پولیو ویکسی نیٹر اور ان کی حفاظت پر مامور تیس پولیس والے جاں بحق ہوئے۔

☆ پنجاب میں ایچ آر سی پی کے کوآرڈی نیٹر اور انسانی حقوق کے فعال کارکن راشد رحمان کو 7 مئی کو ملتان میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ قتل کی وجہ یہ تھی کہ شہید راشد رحمان توہین رسالت کے مبینہ ملزم کی عدالت میں وکالت کر رہے تھے۔

☆ نیشنل انٹرنل سکیورٹی پالیسی کے مطابق حکومت کی طرف سے سکیورٹی کے متعلق ایک دستاویز شائع کی گئی تھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں ساٹھ کالعدم تنظیمیں دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔

سیاسی عمل میں شرکت:

☆ 2014ء کے دوران سیاسی سرگرمیوں میں عوام کی شرکت بھرپور رہی۔ تاہم یہ شرکت احتجاجوں،

ریلیوں، دھرنوں، سوشل میڈیا، سول نافرمانی اور ملک بھر میں کاروبار کی بندش کی صورت میں نظر آئی۔

☆ پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے احتجاجوں نے اس ضرورت کو نمایاں کیا کہ عوام کے احتجاج کرنے کے حق اور عوام کے حقوق اور مفادات کو ریاستی تحفظ دینے کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔

☆ اس سال کے دوران سیاست میں غیر اہم طبقات کی شرکت مزید محدود ہوگئی۔

☆ بلوچستان میں ماضی میں ''مارو اور ٹھکانے لگا دو'' کی جس پالیسی پر عمل درآمد کیا جاتا رہا ہے، زیر بحث سال کے دوران یہ پالیسی سندھ کے قوم پرستوں کے خلاف بھی استعمال کی گئی۔

☆ سیاسی تحریکوں میں خواتین کی بے مثال شرکت کے بارے میں نازیبا باتیں کہی گئیں۔ چند قدامت پسند اور انحطاط پرست عناصر نے خواتین کے اس عمل کو غیر اخلاقی قرار دے دیا۔

☆ پی ٹی آئی نے نوجوانوں کو پارٹی کی رکنیت دے کر انہیں سیاسی عمل میں متحرک کیا۔

☆ سال کے دوران مذہبی اقلیتوں پر پرتشدد حملے جاری رکھے گئے۔ اس کا مقصد اقلیتوں کی سیاسی عمل میں شرکت سمیت بھرپور زندگی گزارنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا۔

☆ بلوچستان کے سوا باقی تمام صوبے بلدیاتی انتخابات کروانے کی قانونی اور انتظامی ضرورت پوری کرنے سے گریزاں رہے۔

☆ مقامی آبادی کو اختیارات دینے کے نئے نظام کو متعارف کروانے میں گلگت بلتستان کی حکومت ناکام رہی۔

خواتین:

☆ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مطابق 2014ء میں 597 خواتین اور لڑکیاں اجتماعی زیادتی کا شکار ہوئیں۔ 828 کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ 36 خواتین کو لوگوں کے سامنے ننگا کر کے ذلیل کیا گیا۔ 923 خواتین اور 82 نابالغ بچیوں، جن میں سے 21 کا تعلق گلگت بلتستان سے تھا کو عزت کے نام پر قتل کر دیا گیا۔ 92 خواتین اور 13 نابالغ لڑکیوں پر تیزاب پھینکا گیا جن میں سے سات جاں بحق ہوگئیں۔ اس کے علاوہ 60 خواتین سلنڈر پھٹنے، سٹوو کے پھٹنے اور آگ لگنے سے جاں بحق ہوئیں۔

☆ گلوبل جینڈر گیپ رپورٹ (جی جی جی آر) 2014ء کے مطابق مردوں کے مقابلے میں صحت، تعلیم اور روزگار تک خواتین کی رسائی کے حوالے سے ترتیب دی گئی فہرست میں پاکستان آخری

سے صرف ایک درجہ اوپر تھا۔

☆ پنجاب حکومت نے سال کے دوران 47 ہزار لیڈی ہیلتھ ورکرز کی ملازمتوں کو باقاعدہ بنایا۔ ملازمین کرنے والی خواتین کے لیے 65 ڈے کیئر مراکز قائم کرنے اور دیہی علاقوں کی چار ہزار خواتین کے لیے تربیتی پروگرام متعارف کروانے کے اعلانات کیے۔

☆ خیبر پختونخوا میں خواتین کا پہلا اینٹی ٹیرر کمانڈوز سکواڈ قائم کیا گیا جنہیں مردوں کے ساتھ ہی تربیت دی گئی۔ حکومت نے خواتین کی شکایات کے ازالے کے لیے پولیس سٹیشنوں پر خواتین کی معاونت کے ڈیسک قائم کیے۔

☆ اپنی 17 جولائی 2014ء کی رپورٹ میں عالمی ادارہ صحت نے شمالی وزیرستان میں ہونے والی جنگ کے باعث بے گھر ہونے والے 9 لاکھ 50 ہزار افراد کی جو فہرست شائع کی اس میں 73 فیصد تعداد خواتین اور بچوں کی تھی۔

☆ قانون، انصاف اور انسانی حقوق کی وزارت نے اذیّت میں مبتلا خواتین کے لیے ہیلپ لائن 1414 قائم کی جو 24 گھنٹے کام کرتی رہی۔ اس ہیلپ لائن کے ذریعے ایسی خواتین، ویمن پولیس آپریٹروں سے بات کر کے اپنی شکایات درج کرواسکتی تھیں۔

☆ دی پنجاب ویمن ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے کسی قسم کی فیس کی ادائیگی کے بغیر تکلیف میں مبتلا خواتین کی شکایات درج کرنے کے لیے ایک ہیلپ لائن شروع کی جو روزانہ صبح آٹھ بجے سے سہ پہر چار بجے تک کام کرتی ہے اور جہاں پر پنجاب بھر سے خواتین اپنی شکایات درج کرا سکتی ہیں۔

☆ خواتین کی سماجی حیثیت کے حوالے سے پنجاب کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد خواتین کے اختیارات کو تسلیم کرنا، ان کی سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے راستے تلاش کرنا اور ان کے خلاف امتیازات کی تمام شکلوں کو ختم کرنا تھا۔

☆ سندھ میں ریسٹرینٹ آف چائلڈ میرج ایکٹ 1929ء میں ترمیم کے ذریعے لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر اٹھارہ سال مقرر کر دی گئی۔

☆ بلوچستان کی حکومت نے جون 2014ء میں ڈومیسٹک وائلنس (پری وینشن اینڈ پروٹیکشن) بل 2014ء کو منظور کر کے گھریلو تشدد کو جرم قرار دے دیا۔

بچے:

☆ حکومت نے 2015ء تک پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں ہونے والی اموات کی تعداد کو 52 فی ہزار تک محدود کرنے کا جو ہدف مقرر کیا تھا، حکومت وہ ہدف پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

☆ سال کے دوران خشک سالی، ناقص اور ناکافی غذا اور ماؤں کی دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث تھرپارکر سندھ میں 650 بچوں کی اموات ہوئیں۔

☆ الف اعلان نے انکشاف کیا کہ ڈھائی کروڑ بچے (یعنی، پاکستان میں کل بچوں کا 47 فیصد حصہ)، سکول نہیں جاتے۔ ان بچوں میں 68 فیصد وہ بچے ہیں جو کبھی سکول نہیں گئے جبکہ 32 فیصد ایسے بچے ہیں جو عمر کے کسی نہ کسی حصے میں کچھ وقت کے لیے سکول میں داخل ہوئے۔

☆ سندھ میں بچوں کے تحفظ کے حوالے سے جس قانون سازی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا وہ تھا سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ 2011ء۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس قانون کی منظوری کے تین سال گزر جانے کے باوجود اس کا نفاذ عمل میں نہیں آ سکا۔

☆ سندھ پاکستان کا وہ پہلا صوبہ ہے جہاں بچوں کی شادی پر پابندی کا بل منظور کیا گیا۔

☆ ساحل نے انکشاف کیا ہے کہ جنوری 2014ء سے 30 ستمبر 2014ء تک کے دوران بچوں کے ساتھ جنسی درندگی کے 311 واقعات سامنے آئے۔ ان میں 214 لڑکیاں اور 97 لڑکے تھے۔ یاد رہے کہ ان تمام بچوں کا تعلق راولپنڈی اور اسلام آباد سے تھا۔

☆ ایچ آر سی پی کی مانیٹرنگ کے مطابق 27 بچیوں سمیت 120 بچوں کو سال کے دوران جسمانی سزا کا نشانہ بنایا گیا۔

☆ گلوبل سلیوری انڈکس 2014ء (عالمی سطح پر غلامی کی فہرست) کے مطابق پاکستان میں بچوں سے مزدوری لینا معمول کا حصہ ہے۔

☆ موجود اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر کی جیلوں میں 1126 نابالغ بچے قید ہیں۔ ان میں 764 پنجاب میں، 313 سندھ میں اور تین گلگت بلتستان کی جیلوں میں قید ہیں۔

☆ پنجاب میں بچوں کی پیدائش کی رجسٹریشن کی شرح میں اضافہ کرنے کے لیے پنجاب ویمن ایمپاورمنٹ انیشی ایٹو آف 2014ء کے تحت صوبے بھر میں یونین کونسل کی سطح پر رجسٹریشن کی فیس ختم کر دی گئی ہے۔

لیبر:

☆ یورپی یونین نے پاکستان کو جی ایس پی پلس کی حیثیت دلوادی جو یکم جنوری سے مؤثر ہوئی۔اس کے حوالے سے شرط یہ ہے کہ پاکستان کو آئی ایل او کے آٹھ میثاقوں (معاہدوں) پر من وعن عمل درآمد کرنا ہوگا۔

☆ نجکاری کمیشن نے نو اداروں کی نجکاری کا اعلان کیا جس کے خلاف محنت کشوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

☆ انٹرنیشنل ٹریڈ یونین کنفیڈریشن (آئی یو ٹی سی) کے گلوبل رائٹس انڈکس 2014ء کے مطابق 1 سے 5 پلس کے سکیل پر پاکستان چوتھے درجے پر ہے۔ یہ درجہ بندی ظاہر کرتی ہے کہ خلاف ورزیاں جان بوجھ کر کسی مقصد کے تحت کی گئی تھیں۔

☆ پنجاب اور سندھ کی حکومتوں نے غیر ہنرمند محنت کشوں کے لیے کم سے کم ماہانہ اُجرت بارہ ہزار روپے مقرر کی۔ خیبر پختونخوا حکومت نے کم سے کم اجرت پندرہ ہزار روپے اور بلوچستان حکومت نے کم سے کم اجرت نو ہزار سے بڑھا کر دس ہزار روپے کردی۔

☆ میڈیا رپورٹس کے مطابق 2014 تک کے دوران کم از کم 38 پیشہ ورانہ حادثات پیش آئے۔ ان حادثات میں 82 افراد جاں بحق اور 88 افراد زخمی ہوئے۔

تعلیم:

☆ ہمارے ہاں تعلیم کے لیے مختص وفاق اور صوبوں کے اجتماعی بجٹ پورے ایشیاء میں سب سے کم ہیں جو مجموعی قومی پیداوار (جی ڈی) کا صرف 2 فیصد ہے۔

☆ ملک بھر میں اور خصوصاً بلوچستان اور شمال مغربی علاقوں میں تعلیمی اداروں پر حملے پورے سال کا معمول بنے رہے۔ پشاور میں آرمی پبلک سکول پر ہونے والی دہشت گردی کے نتیجے میں 150 شہادتیں ہوئیں جن میں زیادہ تر تعداد طلبہ کی تھی۔

☆ پاکستان دنیا کا وہ دوسرا ملک ہے جہاں نائجیریا کے بعد سکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ تعداد 55 لاکھ کے آس پاس ہے۔

صحت:

☆ سال 2014ء کے دوران پولیو کے 306 نئے مریضوں کے واقعات سامنے آنے کے بعد

پاکستان وہ ملک بن گیا ہے جو اس مرض سے سب سے زیادہ متاثرہ ہے۔ سال کے دوران دنیا بھر میں پولیو کے جو 356 مریض سامنے آئے ہیں ان میں سے 86 فیصد مریض پاکستان میں سامنے آئے۔ سال 2014ء کے دوران پولیوٹیموں جن میں ویکسی نیٹر، معاون کار اور حفاظت کار شامل تھے، کے 45 ارکان قتل کردیئے گئے۔

☆ ایک سال سے کم عمر میں وفات پا جانے والے بچوں کی تعداد 95 فی ہزار رہی جبکہ دوسرے ملکوں میں یہ تعداد 60 فی ہزار ہے۔

☆ حمل کے حوالے سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں اور بچپن کی شادی کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی تعداد ایک لاکھ میں 276 رہی۔

☆ پاکستان میں ایک جسم سے دوسرے جسم میں خون کی منتقلی کی خدمات نہ تو منظم ہیں اور نہ ہی یہ کسی اصول اور قاعدے کے تحت کی جاتی ہیں۔ انتقال خون کی خدمات کے حوالے سے نیشنل پالیسی اینڈ سٹریٹیجک فریم ورک 20-2014ء صحیح سمت کی طرف ایک قدم ہے۔

☆ دماغی صحت کے مریضوں کے لیے کوئی مناسب قانونی ڈھانچہ موجود نہیں۔ صرف سندھ حکومت نے ایک قانون منظور کیا ہے لیکن 2014ء کے آخر تک اس حوالے سے قواعد وضوابط تیار ہونا باقی تھے۔

رہائشی سہولیات

☆ 2014ء کے آخر تک نوے لاکھ مکانات کی کمی قائم تھی۔ ان میں سے شہری علاقوں میں یہ تعداد تیس لاکھ سے 35 لاکھ تھی اور یہ ضرورت کم آمدنی والے خاندانوں کی تھی۔

☆ گھروں کی بہت زیادہ مانگ کے باوجود مکانات میں سرمایہ کاری بے حد کم رہی۔ یہ (جی ڈی پی) مجموعی قومی پیداوار کا صرف ایک فیصد تھی۔

☆ پاکستان میں شہری سیاق وسباق کے حوالے سے کرایہ پر مکان لینا استطاعت سے باہر سمجھا جاتا ہے۔

☆ ملک بھر میں آبادی والے علاقوں میں آگ لگنے کے واقعات سب سے بڑی رکاوٹ رہے۔

ماحولیات:

☆ 2014ء کے دوران سندھ اور خیبر پختونخوا حکومتوں نے ماحولیاتی تحفظ کا ایکٹ (انوائرنمنٹل

پروٹیکشن ایکٹ) منظور کر کے باقی صوبوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ بھی ماحولیاتی تحفظ سے متعلق ایکٹ اختیار کریں۔

- ☆ خیبر پختونخوا میں پی ٹی آئی کی حکومت نے شجر کاری کے پانچ سالہ پروگرام کا اعلان کیا جس کے تحت صوبے میں جنگلات میں بیس سے تیس فیصد تک اضافہ کیا جاتا تھا۔
- ☆ موسمی تبدیلی کے باعث متعدد علاقوں کو خوراک کی کمی اور سیلابوں کا سامنا کرنا پڑا۔
- ☆ ختم ہوتی ہوئی نسل کے دوسو سے زائد کچھوؤں، جنھیں سمگل کر کے چین بھیج دیا گیا تھا، کو سندھ وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ اور ڈبلیو ڈبلیو ایف، پاکستان کی مشترکہ کوششوں سے پاکستان واپس لایا گیا۔
- ☆ بلوچستان ہائی کورٹ نے مرغِ زرّیں سمیت تمام نایاب پرندوں کا شکار بلوچستان میں ممنوع قرار دے دیا۔

مہاجرین:

- ☆ افغانستان سے آنے والے پندرہ لاکھ مہاجرین کو رجسٹر کیا گیا تھا اور اتنی ہی تعداد میں افغان مہاجرین بغیر رجسٹریشن کے پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ یہ تعداد 2014ء کے اختتام تک کی ہے۔ 2014ء کے دوران صرف 12991 افغان مہاجرین اپنے وطن واپس گئے۔
- ☆ فاٹا کے خیبر اور شمالی وزیرستان کے علاقوں سے کم از کم 25 لاکھ ساٹھ ہزار افراد بے گھر ہوئے۔ یہ لوگ انتہا پسند گروہوں کے خلاف ہونے والے فوجی آپریشن کے باعث بے گھر ہوئے۔ اس سے قبل ہونے والے آپریشنوں کے دوران فاٹا کے دوسرے اضلاع سے لاکھوں افراد بے گھر ہو چکے تھے۔
- ☆ مسلسل چوتھے سال بڑے پیمانے پر آنے والے سیلابوں سے 25 لاکھ افراد متاثر ہوئے۔ ان میں سے پانچ لاکھ افراد صرف صوبہ پنجاب میں بے گھر ہوئے۔
- ☆ سندھ میں تھر اور پنجاب میں چولستان کے صحرا سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ قحط سالی کے باعث دوسرے علاقوں کو منتقل ہوئے۔
- ☆ سرحد پار سے بھارتی افواج کی فائرنگ کے باعث سیالکوٹ کے درجنوں دیہات سے تقریباً چالیس ہزار افراد کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔
- ☆ 1971 سے بنگلہ دیش میں محصور لاکھوں پاکستانیوں کی بے وطنی کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔

1

قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی

بنیادی حقوق، بشمول رتبے، مواقع، قانون کی نظر میں برابری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف اور فکر، اظہار، عقیدہ، ایمان، عبادت اور اجتماع کی آزادیاں، قانون کے مطابق اور اخلاق عامہ کے مفاد میں عائد پابندیوں کے ساتھ مہیا کرنے کی ضمانت دی جائے گی۔ عدلیہ کی آزادی کو مکمل طور پر یقینی بنایا جائے گا۔ آئین پاکستان [تعارف]

قانونی تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا بنیادی اور ناقابل تنسیخ حق ہے، چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر اس شخص کا بھی جو عارضی طور پر پاکستان میں مقیم ہو۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 4]

کوئی قانون یا کوئی رسم یا رواج، جسے قانون کی حیثیت حاصل ہو اگر ان حقوق سے متصادم ہے جو اس باب [بنیادی حقوق] کے تحت شہریوں کو حاصل ہیں، تو وہ اس میں پائے جانے والے تضاد کی حد تک منسوخ تصور کیا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 8 (1)]

اگر انسان کو اس بات پر مجبور کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ آخری چارہ کار کے طور پر ظلم اور ناانصافی کے خلاف خود علم بغاوت بلند کرے، تو لازم ہے کہ قانون کی حکمرانی کے ذریعے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [ابتدائیہ]

ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر یا آزادانہ طور پر منتخب نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل دفعہ - 21 (1)]

2014ء میں پارلیمنٹ نے سال 2013ء کے 22 قوانین کے مقابلے میں 10 قوانین کی منظوری دی۔ تاہم صوبائی سطح پر قانون سازی میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔

وفاق کی سطح پر قانون سازی

وفاقی پارلیمنٹ نے سلامتی، عدالتی نظام، اور انسداد دہشت گردی کے حوالے سے چند اہم قوانین منظور کیے۔ صدر نے نو آرڈیننس جاری کیے جن میں ایک آرڈیننس ملک کی سلامتی کے لیے خطرے کا باعث

بننے والی کارروائیوں کی روک تھام سے متعلق تھا۔

ملک بھر میں دہشت گردی سے متعلق بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھتے ہوئے قانون سازوں نے ایک قدرے متنازعہ قانون تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء منظور کیا۔ 2013ء میں جاری کیے جانے والے آرڈیننس پر مبنی اس بل کو سول سوسائٹی اور سیاستدانوں کی جانب سے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر تنقید کرنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ یہ قانون ظالمانہ اور انسانی حقوق کے منافی تھا۔ ہندو میرج بل، کرسچن ڈائیورس (ترمیمی) بل اور گھریلو تشدد بل کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

صوبائی اسمبلیوں نے کہیں زیادہ اور مختلف نوعیت کے قوانین منظور کیے جن کی بدولت ان اسمبلیوں کو ان اختیارات کو بہتر طور پر استعمال کرنے کا موقع ملا جو انہیں اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت دیے گئے تھے۔ ان اسمبلیوں نے جو قوانین وضع کیے ان کا تعلق ماحول، صحت، تعلیم، خواتین کے حقوق، ٹیکس، سلامتی، ترقی، سیاحت، اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق سے تھا۔

گزشتہ سال کے دوران سب سے زیادہ قوانین اور آرڈیننس خیبر پختونخوا اسمبلی نے منظور کیے جبکہ سندھ، پنجاب اور بلوچستان بالترتیب دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر رہے۔

صوبائی سطح پر قانون سازی

چند ایسی مثالیں بھی دیکھنے کو ملیں کہ صوبائی اسمبلیوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ایوان میں حزب اختلاف کے اراکین کی حاضری کم تھی، عجلت میں قوانین منظور کیے۔ بعض اوقات اسمبلی میں مجوزہ بل پیش کرنے سے پہلے نوٹیفیکیشن بھی جاری نہ کیا گیا۔ ایسے اقدامات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مجوزہ قوانین کی نہ تو جانچ پڑتال کی گئی اور نہ ہی ان پر مشاورت کی گئی تھی۔

13 مارچ کو پنجاب اسمبلی نے، جہاں پی ایم ایل (ن) کو اکثریت حاصل تھی، حزب اختلاف کے اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے تین بلوں کی منظوری دے دی۔ اسمبلی کے اجلاس کے دوران وزیر قانون پنجاب نے بھی چار نئے بل پیش کیے۔ حزب اختلاف، جس کی قیادت پی ٹی آئی کر رہی تھی، نے درخواست کی کہ ان بلوں کو مشتہر کیا جائے تا کہ ان پر عوام کی رائے لی جا سکے۔ لیکن وزیر قانون نے ان دلائل کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ اسمبلی میں عوامی نمائندوں کی موجودگی میں ان بلوں کو مشتہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اگرچہ پنجاب میں قانون سازی میں اضافہ دیکھنے میں آیا تاہم ان قوانین کا معیار اور ان کا نفاذ موضوع بحث بنا رہا۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مختص کیے گئے فنڈ یا تو ناکافی یا پھر تاخیر کا شکار تھے، جس

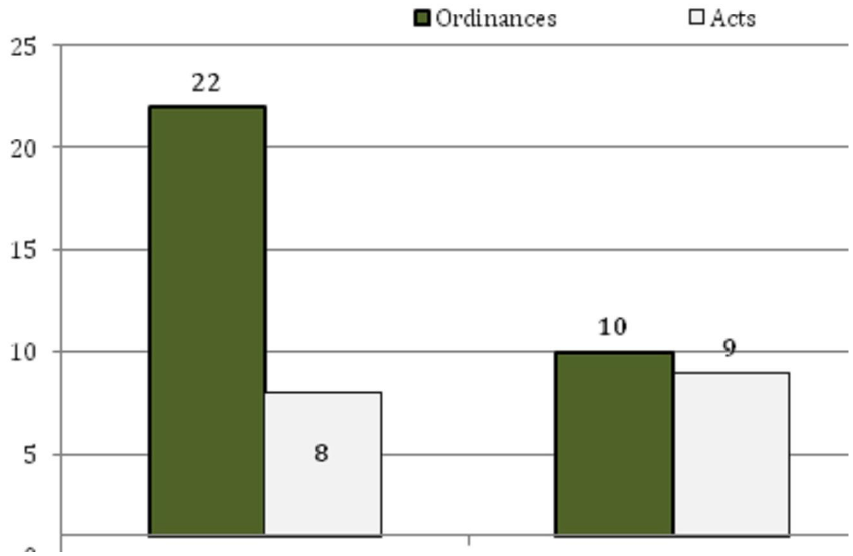

کی وجہ سے ان قوانین کا نفاذ متاثر ہوا۔

وفاقی بجٹ جون میں مالیاتی ایکٹ کی شکل میں منظور کیا گیا۔صوبوں کے بجٹ کی منظوری اس قانون کے وضع کیے جانے کے بعد دی گئی۔

مقنّنہ کے منظور کردہ قوانین

2014ء میں بنائے گئے چند اہم قوانین درج ذیل ہیں:

- ☆ تحفظ پاکستان ایکٹ، جولائی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد پاکستان کو جنگ اور بغاوت/شورش سے تحفظ فراہم کرنا، پاکستان کی سلامتی کو درپیش خطرات کا تدارک کرنا، اور ان سے متعلق جرائم کے مقدمات کی فوری سماعت تھا۔
- ☆ مالیاتی ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد وفاقی حکومت کی مالیات سے متعلق تجاویز کو موثر بنانا تھا۔
- ☆ پاکستان کمیشن برائے قانون و انصاف (ترمیمی) ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد وفاقی حکومت کو ہر صوبے کے لیے ایک رکن متعین کرنے اور کمیشن کو اس بات کی منظوری دینا تھا کہ وہ کسی بھی ملک کے قانونی کمیشن کے ساتھ مفاہمت کی یاداشت پر دستخط کر سکتا ہے۔
- ☆ انسداد دہشت گردی (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد دہشت گردی سے متعلق شقوں میں ترمیم کرنا اور انصاف کی فوری فراہمی کو یقینی بنانا تھا۔

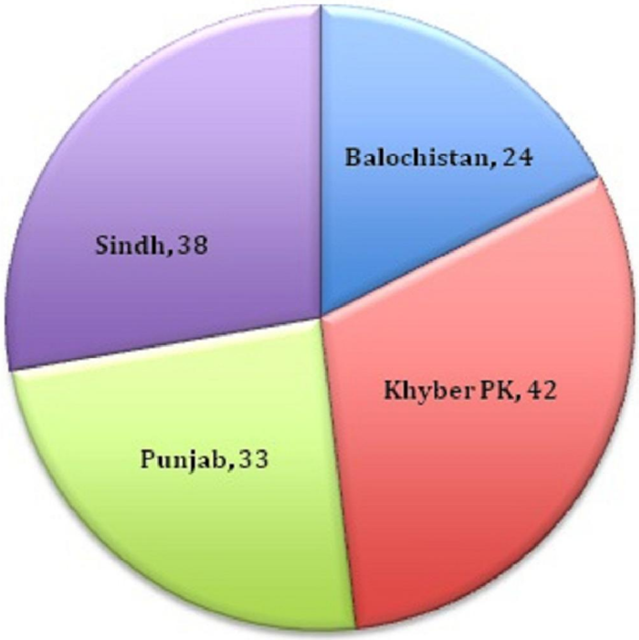

☆ ماہرین قانون و بار کونسلز ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سنگین پیشہ ورانہ ناروا رویہ کے خلاف انضباطی کارروائیوں کو مزید باضابطہ بنانا اور تحریری شکایات کو جلد سے جلد نمٹانے کے لیے وقت کا تعین کرنا تھا۔

☆ نیشنل جوڈیشل (پالیسی سازی) کمیٹی (ترمیمی) ایکٹ، جون 2014ء؛ اس کا مقصد اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو نیشنل جوڈیشل (پالیسی سازی) کمیٹی میں بطور رکن شامل کرنا تھا۔

☆ وفاقی عدالت (تنسیخی) ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد وفاقی عدالت ایکٹ، 1937ء کی تنسیخ تھا جو کہ سپریم کورٹ رولز 1980ء کے ضوابط تشکیل دیئے جانے کے بعد بے معنی سمجھا جانے لگا تھا۔

☆ سروے و نقشہ کشی ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سروے اور نقشہ کشی سے متعلق سرگرمیوں کو باضابطہ بنانا تھا۔

صدر کے نافذ کردہ آرڈیننس

☆ گیس انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ محصول آرڈیننس مجریہ 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد قدرتی گیس پر انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ محصول عائد کرنا اور وصول کرنا تھا۔

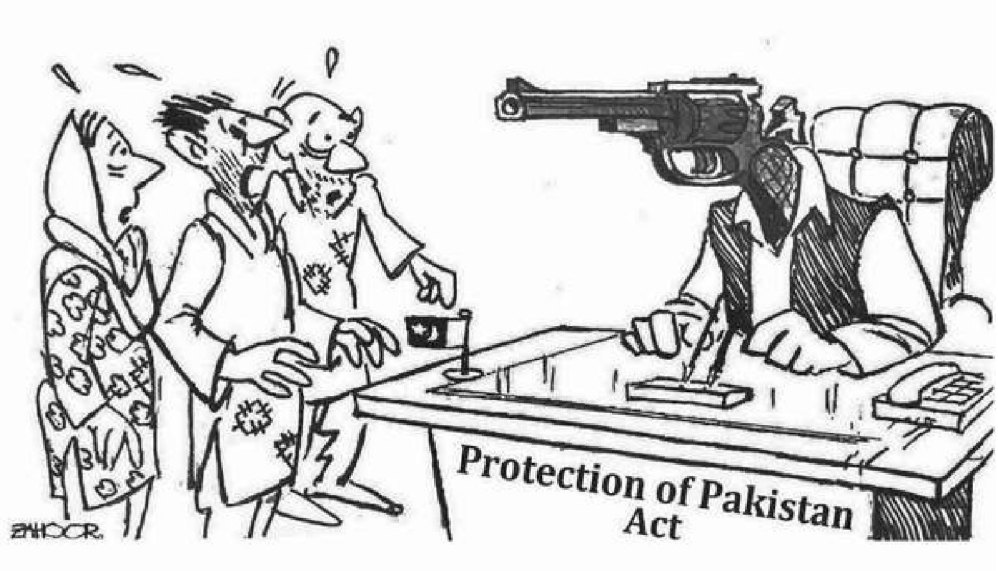

- ☆ انتخابی فہرست (ترمیمی) آرڈیننس، 2014ء؛ اس آرڈیننس کا نفاذ بلدیاتی انتخابات کو الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) کے دائرہ اختیار میں لانے کے لیے کیا گیا۔
- ☆ حلقہ بندی (ترمیمی) آرڈیننس، 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد بلدیاتی انتخابات کے انعقاد کے لیے حلقہ بندیاں کرنا تھا۔
- ☆ وفاقی عدالتی اکیڈمی (ترمیمی) آرڈیننس، 2014ء؛ اس آرڈیننس کے نفاذ کا مقصد وفاقی عدالتی اکیڈمی کو ایک اعلیٰ نوعیت کے قانون و عدالتی تعلیم کے مرکز میں تبدیل کرنا اور اسے سند دینے کا مجاز ادارہ بنانا تھا۔
- ☆ پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل (ترمیمی) آرڈیننس، مارچ 2014ء؛ اس کا مقصد انضباطی تنظیم میں اصلاح تھا۔
- ☆ سیلز ٹیکس (ترمیمی) آرڈیننس، 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد گیس فلنگ سٹیشنوں کو اپنے واجب الادا ٹیکسوں کی ادائیگی پر مجبور کرنا تھا۔
- ☆ گیس (چوری کی روک تھام اور وصولی) آرڈیننس، جنوری 2014ء؛ اس آرڈیننس کے نفاذ کا مقصد گیس کی چوری اور اس سے متعلق دیگر جرائم کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا تھا۔
- ☆ تحفظ پاکستان (ترمیمی) آرڈیننس، جنوری 2014ء؛ اس کا مقصد پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرے کا باعث بننے والی کارروائیوں کی روک تھام کرنا تھا۔

☆ قانون فوجداری (ترمیمی) آرڈیننس، جنوری 2014ء؛ اس آرڈیننس کے نفاذ کا مقصد بجلی کی چوری سے متعلق جرائم کے لیے سزائیں دینا تھا۔

صوبائی مجالس قانون ساز کی جانب سے بنائے گئے قوانین

پنجاب اسمبلی

☆ پنجاب کمیشن برائے مقام نسواں ایکٹ 2013ء مجریہ فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد خواتین کی سماجی و معاشی ترقی کے لیے مزید مواقع فراہم کرنا اور ان سے ہونے والے امتیازی سلوک کا خاتمہ تھا۔

☆ پنجاب شاپس اینڈ اسٹیبلشمنٹ (ترمیمی) ایکٹ مجریہ فروری 2014ء؛ اس قانون کے تحت ایسے اداروں جہاں 25 یا اس سے زائد خواتین کام کرتی ہوں، کے لیے لازم قرار دینا کہ وہ ان خواتین کے چھ سال سے کم عمر بچوں کے لیے ایک نگہداشت کا شعبہ قائم کریں۔

☆ پنجاب فنانس (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس کا مقصد جائیداد پر لگنے والے ٹیکس کی سابقہ شرح کو بحال کرنا تھا۔

☆ پنجاب کا خواتین کی منصفانہ نمائندگی کا ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد چند قوانین میں ترمیم کرنا تھا تا کہ فیصلہ ساز مجالس میں خواتین کی نمائندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔

☆ لاہور گیریژن یونیورسٹی ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد مذکورہ یونیورسٹی کے پہلے سے موجود دو کیمپسوں پر مشتمل یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔

☆ پنجاب لائیوسٹاک بریڈنگ ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس ایکٹ کا مقصد مویشیوں کی افزائش سے متعلق سہولیات کو باضابطہ بنانا، مویشیوں کی جینیاتی صلاحیت کو بہتر بنانا اور مقامی مویشیوں کا تحفظ کرنا تھا۔

☆ پنجاب سول سرونٹس (ترمیمی) ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سول سرونٹس کی تقرری اور ان کی ملازمت کے قواعد وضوابط تیار کرنا تھا۔

☆ دی پنجاب ایمپلائز ایفی شینسی، ڈسپلن اینڈ اکاؤنٹیبلیٹی (ترمیمی) ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سرکاری اور بلدیہ کے ملازمین کی کارکردگی، نظم وضبط اور جوابدہی کے حوالے سے ان کے خلاف قانونی کاروائی کرنا تھا۔

پنجاب اسمبلی کا اجلاس

- ☆ پنجاب پیمنٹ آف ویجز (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء؛
- ☆ پنجاب شہری ترقی (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ترقیاتی اداروں میں موجود ضلعی ناظموں کے اختیارات وزیر اعلیٰ کو منتقل کرنا تھا۔
- ☆ پنجاب میٹرنل، نیونیٹل، اینڈ چائلڈ ہیلتھ اتھارٹی ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد 48,000 لیڈی ہیلتھ ورکرز کو مستقل کرنا اور ملازمین کے معاملات کا انتظام وانصرام کرنا تھا۔
- ☆ پنجاب نجی وسرکاری اشتراک ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سرکاری ونجی اشتراک کے فروغ کے لیے ایک سازگار ماحول قائم کرنا تھا۔
- ☆ پنجاب صنعتی تعلقات (ترمیمی) ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کو عالمی ادارہ برائے محنت (آئی ایل او) کے میثاق C-87 اور C-98 جن پر حکومت پاکستان نے دستخط کر رکھے ہیں، کے مطابق بنا کر ان پر عملدرآمد کرنا تھا۔
- ☆ محمد نواز شریف یونیورسٹی برائے سائنس وٹیکنالوجی ملتان ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ملتان میں انجینئرنگ وٹیکنالوجی یونیورسٹی کا قیام تھا۔
- ☆ پنجاب دماغی صحت (ترمیمی) ایکٹ، مئی 2014ء؛ یہ قانون دماغی صحت کے آرڈیننس 2001ء کی جگہ وضع کیا گیا تھا، کیونکہ اٹھارہویں ترمیم کے تحت یہ معاملہ صوبوں کو منتقل ہو چکا تھا۔

☆ خواجہ فرید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، رحیم یار خان ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد رحیم یار خان میں انجینئرنگ و آئی ٹی یونیورسٹی کا قیام تھا۔

☆ پنجاب فنانس ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد چند ٹیکس، ڈیوٹیاں اور فیسیں عائد کرنا اور انہیں حقیقت پسندانہ بنانا تھا۔

☆ باب پاکستان فاؤنڈیشن ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کے نفاذ کا مقصد باب پاکستان ٹرسٹ کے فرائض کی انجام دہی میں مدد دینا تھا۔

☆ ترقیاتی اداروں کی جانب سے جائدادوں کے انتظام و انصرام اور انتقال کا ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد پنجاب کے ترقیاتی اداروں کو اس بات کا مجاز بنانا تھا کہ وہ ایک حکمت عملی کے ذریعے غیر منقولہ جائیدادوں کا انتظام وانصرام اور انتقال کریں۔

☆ پنجاب سٹریٹیجک کوآرڈینیشن آرڈیننس، اکتوبر 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد دہشت گردی کے سدباب کے لیے ایک طریق کار اور سلامتی سے متعلق ایک پالیسی وضع کرنا تھا۔

☆ پنجاب میں گوداموں کے اندراج کا آرڈیننس، اکتوبر 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد گوداموں کے اندراج کا ایک نظام تشکیل دینا تھا۔

☆ پنجاب نصاب و درسی کتب بورڈ آرڈیننس، ستمبر 2014ء؛ اس آرڈیننس کا نفاذ درسی کتب کی تیاری، منظوری اور اشاعت کو یقینی بنانے کے لیے کیا گیا۔

☆ پنجاب کمیشن برائے سمندر پار پاکستانی ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سرکاری ایجنسیوں کے حوالے سے سمندر پار پاکستانیوں کی شکایات وصول کرنا اور ان کا ازالہ کرنا تھا۔

☆ دی پنجاب لوکل گورنمنٹ (ترمیمی) ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد اضلاع میں مویشی منڈیاں قائم کرنے کی اجازت دینا تھا۔

☆ پنجاب لوکل گورنمنٹ (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس کا مقصد الیکشن کمیشن آف پاکستان کو بلدیاتی انتخابات کے لیے حلقہ بندیاں کرنے کا اختیار دینا تھا۔

☆ پنجاب سٹریٹیجک کوآرڈینیشن ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ایک ''صوبائی سلامتی کونسل'' اور صوبائی سٹریٹیجک کوآرڈینیشن بورڈ'' کا قیام تھا۔

☆ پنجاب مفت اور لازمی تعلیم کا ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد پانچ سے سولہ سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنا تھا۔

☆ دی پنجاب ہائیر ایجوکیشن آرڈیننس، اکتوبر 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد پنجاب ہائیر ایجوکیشن کمیشن کو یونیورسٹیوں کی فنڈنگ کو باضابطہ بنانے اور ان کے چانسلروں کو مقرر کرنے کا مجاز بنانا تھا۔

☆ پنجاب اسلحہ (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون میں معمولی سی تکنیکی تبدیلی کی گئی۔

☆ پنجاب دھماکا خیز مواد (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون میں معمولی سی تکنیکی تبدیلی کی گئی۔

☆ پاکستان کڈنی اینڈ لیور انسٹی ٹیوٹ اینڈ ریسرچ سینٹر ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد پاکستان کڈنی اینڈ لیور انسٹی ٹیوٹ اینڈ ریسرچ سینٹر کا قیام تھا۔

☆ پنجاب ادارہ برائے تعلیم قرآن وسیرت ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبے میں اعلیٰ تعلیم، تحقیق اور ترقی کو بہتر بنانا اور انہیں فروغ دینا تھا۔

سندھ اسمبلی

☆ املاک کا حلیہ بگاڑنے کی روک تھام کا ایکٹ 2013، مجریہ فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد دیواروں کا حلیہ بگاڑنے سے بچانا تھا۔

☆ سندھ بلڈنگ کنٹرول (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد بلدیاتی اداروں سے شہری منصوبہ بندی کے اختیارات واپس لے کر سندھ بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کو منتقل کرنا تھا۔

☆ سندھ ایمرجنسی پروکیورمنٹ ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مختصر نوٹس پر جدید ہتھیار، بکتر بند گاڑیاں اور دیگر سامان حاصل کرنے کی اجازت دینا تھا۔

☆ سندھ نگہداشت صحت کمیشن ایکٹ 2013، مجریہ فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صحت کی سہولیات کے معیار کو بہتر بنانا اور عطائیت پر پابندی عائد کرنا تھا۔

☆ ماحولیات ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد قدرتی وسائل کا تحفظ اور بحالی، اور آلودگی پر قابو پانا تھا۔

☆ دی رجسٹریشن (سندھ کا ترمیمی) ایکٹ، 2013ء، مجریہ فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد رجسٹریشن ایکٹ 1908ء میں ترمیم کرنا تھا تاکہ اس کا اطلاق سندھ پر کیا جا سکے۔

☆ سندھ مالیہ اراضی (ترمیمی) ایکٹ، 2013ء، مجریہ فروری 2014ء۔

☆ دی این آئی بی ڈی پوسٹ گریجوایٹ انسٹی ٹیوٹ آف لائف سائنسز ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد مذکورہ ادارے کا قیام تھا۔

سندھ اسمبلی کی نئی عمارت میں اسمبلی کا اجلاس

☆ دی سندھ سالڈ ویسٹ مینجمنٹ بورڈ ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ٹھوس اور دیگر فضلہ جات کو اکٹھا کرنے اور انہیں تلف کرنے کے لیے ایک بورڈ قائم کرنا تھا۔

☆ سندھ کے سرکاری ملازمین (ایڈہاک ملازمین کی مستقلی) کا (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ایڈہاک ملازمین کو بھرتی کے وقت سے ملازمت کے تمام فوائد فراہم کرنا تھا۔

☆ دی سندھ سروس ٹرائیبونلز (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سپریم کورٹ کی ہدایات پر سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی مشاورت سے تین سال اور صرف ایک مرتبہ کے لیے ایک تین رکنی سروس ٹرائیبونل کی تقرری تھا۔

☆ صوبائی موٹر گاڑیوں کا (ترمیمی) ایکٹ، مئی 2014ء۔

☆ دی سندھ کریمینل پراسیکیوشن سروس (آئین، فرائض اور اختیارات) (ترمیمی) ایکٹ، مئی 2014ء؛

☆ سندھ کے شہیدوں کی قدر شناسی اور انہیں معاوضہ فراہم کرنے کا ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد دہشت گردی کے خلاف ذمہ داریوں کی انجام دہی کے دوران اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے افراد کی خدمات کو تسلیم کرنا اور ان کے قانونی ورثا کو معاوضہ فراہم کرنا تھا۔

☆ سندھ کم عمری کی شادیوں کی ممانعت کا ایکٹ، 2013ء، مجریہ اپریل 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبے میں اٹھارہ سال سے کم عمر کی شادی کو جرم قرار دینا تھا۔

- ☆ سندھ فنانس ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبائی حکومت کی مالیات سے متعلق تجاویز پر عملدرآمد کرنا تھا۔
- ☆ دی سندھ لوکل گورنمنٹ (ترمیمی) ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد بلدیاتی حلقہ بندیوں کے اختیارات الیکشن کمیشن آف پاکستان کو منتقل کرنا تھا۔
- ☆ دی سندھ سول سرونٹس (ترمیمی) ایکٹ، اکتوبر 2014ء۔
- ☆ دی سندھ سپیشل ڈویلپمنٹ بورڈ ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد کم قیمت رہائشی سکیمیں تعمیر کرنا، کچی اور پسماندہ آبادیوں کو بحال کرنا، اور کثیر منزلہ اور بلند و بالا عمارتوں کو باضابطہ بنانا تھا۔
- ☆ سندھ کا زخمی افراد (طبی امداد) کا ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ڈاکٹروں کو پولیس کی اجازت کے بغیر زخمیوں کا علاج کرنے کی اجازت دینا تھا۔
- ☆ دی سندھ ایلوپیتھک سسٹم (ناجائز استعمال) ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ایلوپیتھک ادویات کے غلط استعمال کو روکنا تھا۔
- ☆ فزیوتھراپی کونسل ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ایک فزیوتھراپی کونسل کا قیام تھا۔
- ☆ دی فارمیسی کونسل ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد فارمیسیوں جیسے فعال اداروں کو باضابطہ بنانے کے لئے کونسل قائم کرنا تھا۔
- ☆ دی سندھ نرسنگ کونسل ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد پاکستان نرسنگ کونسل کو صوبے کے سپرد کرنا تھا۔
- ☆ دی پوسٹ گریجوایٹ کالج آف میڈیکل سائنسز ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد مذکورہ ادارے کا قیام تھا۔
- ☆ سندھ اسلحہ (ترمیمی) ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد اہلیت کے مطابق اسلحہ لائسنس کے اجراء کا دائرہ کار وسیع کرنا تھا تاکہ عام لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔
- ☆ سندھ املاک کی مشترکہ نگرانی کا ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سرکاری منصوبوں میں سہولیات، وضع قطع، پارکنگ اور مشترکہ مقامات کی دیکھ بھال کو باضابطہ بنانا تھا۔
- ☆ سندھ وبائی امراض ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد خطرناک وبائی امراض کے پھیلاؤ کی روک تھام سے متعلق قانون کو مربوط بنانا تھا۔

- ☆ سندھ آئی سرجری (پابندی) ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کے تحت یہ پابندی عائد کی گئی کہ اندراج شدہ طبی ماہرین کے سوا کوئی اور شخص آنکھوں کی سرجری کرنے کا مجاز نہیں۔
- ☆ سندھ ٹی بی نوٹیفیکیشن ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ٹی بی نوٹیفیکیشن کا ایک نظام تشکیل دینا تھا۔
- ☆ سندھ سرکاری و نجی اشتراک (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء۔
- ☆ لاڑکانہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء۔
- ☆ قومی ادارہ برائے امراض قلب (سندھ ایڈمنسٹریشن) ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد قومی ادارہ برائے امراض قلب کے معاملات کی دیکھ بھال تھا۔
- ☆ دی سندھ ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سندھ ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ انسٹی ٹیوشن کا قیام تھا۔
- ☆ سندھ کا تعلیمی معیار و نصاب کا ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد پہلی جماعت سے بارھویں درجے تک کی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانا تھا۔
- ☆ دی الطاف حسین یونیورسٹی ان کراچی ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد کراچی میں ایک یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔
- ☆ دی الطاف حسین یونیورسٹی ان حیدرآباد ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کا قیام تھا۔
- ☆ دی شہید بےنظیر بھٹو یونیورسٹی ان شہید بےنظیر آباد ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد نوابشاہ میں ایک یونیورسٹی کا قیام تھا۔

بلوچستان اسمبلی

- ☆ دی بلوچستان بریسٹ فیڈنگ اور بچوں کی غذائیت کے تحفظ اور فروغ کا ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ماؤں کا دودھ پلانے کو فروغ دینے اور اس کے تحفظ کے ذریعے نومولود اور کم سن بچوں کی غذائیت کو یقینی بنانا تھا۔
- ☆ دی بلوچستان لوکل گورنمنٹ (ترمیمی) ایکٹ، جنوری 2014ء۔
- ☆ بلوچستان میں پرائمری سطح پر مادری زبانوں کو لازمی اضافی مضمون کے طور پر متعارف کرانے کا ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد قومی زبان کے علاوہ مادری زبان کی تعلیم دینا تھا۔

بلوچستان اسمبلی نے صوبے میں نجی قرضہ دینے پر پابندی عائد کردی

- ☆ دہشت گردی کا نشانہ بننے والے شہریوں (امداد اور آبادکاری) کا ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد دہشت گردی کا نشانہ بننے والے شہریوں کی امداد اور آبادکاری تھا۔
- ☆ دی بلوچستان فوڈ اتھارٹی ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد خوراک کی حفاظت اور معیار کو یقینی بنانا اور بلوچستان فوڈ اتھارٹی کا قیام تھا۔
- ☆ بلوچستان لازمی تعلیم کا ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد بلوچستان میں مفت اور لازمی تعلیم کی فراہمی تھا۔
- ☆ بلوچستان سمندری ماہی گیری (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد غیر قانونی ماہی گیری کو روکنا تھا۔
- ☆ بلوچستان وزیرِاعلیٰ و وزراء (تنخواہ، الاؤنس اور مراعات) ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد وزراء کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ کرنا تھا۔
- ☆ سپیکر و ڈپٹی سپیکر بلوچستان (تنخواہ، الاؤنس اور مراعات) (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کی تنخواہ اور مراعات میں اضافہ کرنا تھا۔
- ☆ اراکین بلوچستان اسمبلی (تنخواہ، الاؤنس اور مراعات) (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد اراکین بلوچستان اسمبلی کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ کرنا تھا۔

- ☆ سردار بہادر خان یونیورسٹی برائے خواتین (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبے میں ایک یونیورسٹی کا قیام تھا۔
- ☆ دی بلوچستان فیملی ٹارچر اینڈ پروٹیکشن ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد مشتبہ شخص کے خاندان کو ایذا رسانی سے تحفظ فراہم کرنا تھا۔
- ☆ دی بلوچستان کوسٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ، فروری 2014ء۔
- ☆ بلوچستان گھریلو تشدد (روک تھام اور تحفظ) کا ایکٹ، فروری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد گھریلو تشدد کی اقسام کی وضاحت کرنا اور خواتین کو تحفظ دینا تھا۔
- ☆ بلوچستان جنگلی حیات کے تحفظ، نگہداشت اور انتظام و انصرام کا ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد محفوظ علاقے کا قیام اور اس کی دیکھ بھال، اور جنگلی حیات کا تحفظ تھا۔
- ☆ دی بلوچستان ٹورسٹ گائیڈز ایکٹ، مئی 2014ء۔
- ☆ دی بلوچستان ٹورسٹ ٹریول ایجنسیز ایکٹ، مئی 2014ء۔
- ☆ بلوچستان ہوٹل وریستوران ایکٹ، مئی 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سیاحوں کو سہولتیں فراہم کرنا اور سیاحت کے فروغ کے لیے بنیادی ڈھانچے کی فراہمی تھا۔
- ☆ بلوچستان عدالتی اکیڈمی ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد مذکورہ ادارے کا قیام تھا۔
- ☆ دی بلوچستان آرکائیوز ایکٹ، اگست 2014ء؛
- ☆ بلوچستان آثار قدیمہ ایکٹ، اگست 2014ء؛ اس قانون کا مقصد قرون وسطیٰ سے پہلے کے دور کی نادر اشیاء کی سمگلنگ کی روک تھام تھا۔
- ☆ بلوچستان بورسٹل انسٹی ٹیوٹ ایکٹ، اگست 2014ء؛ اس قانون کا مقصد بلوچستان میں کم سن مجرموں کی اصلاح کے ادارے قائم کرنا اور انہیں باضابطہ بنانا تھا۔
- ☆ بلوچستان نجی ساہوکاری کی ممانعت کا ایکٹ، اگست 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبے میں سودخوری پر پابندی عائد کرنا تھا۔

خیبر پختونخوا اسمبلی

- ☆ خیبر پختونخوا احتساب کمیشن ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد بہتر نظم ونسق کا قیام اور بدعنوانی کی روک تھام کرنا تھا۔
- ☆ خیبر پختونخوا انسانی حقوق کے فروغ، تحفظ اور نفاذ کا ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد

خیبر پختونخوا میں انسانی حقوق کا فروغ، تحفظ اور نفاذ تھا۔

☆ خیبر پختونخوا وزراء (تنخواہ، الاؤنس اور مراعات) (ترمیمی) ایکٹ، جنوری 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا مستحق بیواؤں اور خصوصی افراد کی فلاح کی فاؤنڈیشن کا ایکٹ، اس قانون کا مقصد بیواؤں اور خصوصی افراد کی مدد کے لیے ایک فلاحی فاؤنڈیشن قائم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا ہائر ایجوکیشن سکالرشپ اینڈ وومنٹ فنڈ ایکٹ، جنوری 2014ء؛ اس قانون کا مقصد طلباء کو وظائف دینا اور ایک وقف فنڈ قائم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا حسّاس اور غیر محفوظ عمارتوں اور مقامات (حفاظت) کا آرڈیننس، فروری 2014ء؛ اس آرڈیننس کا مقصد صوبے میں حسّاس اور غیر محفوظ عمارتوں اور مقامات کی حفاظت کرنا تھا۔

☆ دی خیبر پختونخوا فوڈ سیفٹی اتھارٹی بل، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد خوراک کے کاروبار کو باضابطہ بنانے اور اس کی نگرانی کے لیے ایک ادارہ قائم کرنا تھا تاکہ صحت بخش خوراک کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکے۔

☆ دی خیبر پختونخوا فارم سروسز سینٹرز ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد خیبر پختونخوا کے تمام اضلاع میں فارم سروسز سینٹرز قائم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا مزارعت (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا ادارہ برائے ترقیٔ توانائی (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا کرائے کی عمارتوں کی حدود کے تعین (حفاظت) کا ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد کرائے کی عمارتوں کے کاروبار کی نگرانی کرنا تھا۔

☆ دی خیبر پختونخوا جرنلسٹس ویلفیئر اینڈ وومنٹ فنڈ ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صحافیوں کے لیے ایک فلاحی وقف فنڈ قائم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا ریگولیٹری اتھارٹی برائے طبی پیوند کاری ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد انسانی اعضاء کی پیوند کاری کو باضابطہ بنانے کے لیے ایک ادارہ قائم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا سرکاری نجی اشتراک ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد سرکاری نجی اشتراک کے لیے ایک سازگار ماحول قائم کرنا تھا۔

☆ دی خیبر پختونخوا لوکل گورنمنٹ ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا دریائی تحفظ ایکٹ، مارچ 2014ء۔

خیبر پختونخوا اسمبلی

☆ خیبر پختونخوا خلاف قانون ہتھیاروں سے دستبرداری کا ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد غیر قانونی ہتھیاروں کو ترک کرنا تھا۔

☆ دی خیبر پختونخوا ہاؤسنگ اتھارٹی (ترمیمی) ایکٹ، مارچ 2014ء۔

☆ دی خیبر پختونخوا ہوٹل رسٹرکشن (سیکیورٹی) ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد ہوٹلوں اوران میں قیام کرنے والے مہمانوں پر نظر رکھنا تھا۔

☆ طب اور ہومیو پیتھک ملازمین (ضابطہ ملازمت) ایکٹ، مارچ 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبے میں عارضی ملازمین کو مستقل کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا احتساب کمیشن (ترمیمی) ایکٹ، جون 2014ء؛ اس قانون کا مقصد احتساب کمیشن کو بدعنوانی کے واقعات کی تحقیقات کرنے والا واحد ادارہ بنانا تھا۔

☆ دی خیبر پختونخوا منسٹرز (تنخواہیں، الاؤنسز اور دوسری مراعات) ایکٹ، جون 2014ء؛

☆ خیبر پختونخوا تنخواہوں، الاؤنسز اور مراعات سے متعلق قوانین کا (ترمیمی) ایکٹ، جون 2014ء؛

☆ دی خیبر پختونخوا فنانس (ترمیمی) ایکٹ، جون 2014ء؛ اس کا مقصد صوبائی حکومت کی مالیاتی تجاویز پر عمل درآمد کرانا تھا۔

☆ دی خیبر پختونخوا ریگولیشن آف لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام اینڈ ایمپلائز (سٹینڈرڈائزیشن) ایکٹ، جون 2014ء؛اس قانون کا مقصد لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام کی حیثیت کو باضابطہ بنانا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا خیراتی و مذہبی ٹرسٹ ایکٹ، اکتوبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد خیراتی اور مذہبی ٹرسٹوں کے انتظام وانصرام کی نگرانی کو اور زیادہ موثر بنانا تھا۔

☆ صوبائی موٹر وہیکل (خیبر پختونخوا) (ترمیمی) ایکٹ، نومبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا مالیہ (ترمیمی) ایکٹ، نومبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا اندراج (ترمیمی) ایکٹ، نومبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا سول سرونٹس ریٹائرمنٹ بینیفٹس اینڈ ڈیتھ کمپنسیشن ایکٹ، نومبر 2014ء؛اس قانون کا مقصد سرکاری ملازمین کو ریٹائرمنٹ کی مراعات اور بعد از مرگ معاوضے کی فراہمی کے لیے ایک فنڈ قائم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا ابتدائی وثانوی تعلیم فاؤنڈیشن (ترمیمی) ایکٹ، نومبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا زکوٰۃ وعشر (ترمیمی) ایکٹ، نومبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا زخمی افراد اور ہنگامی صورتحال (طبی امداد) کا ایکٹ، نومبر 2014ء؛اس قانون کا مقصد زخمی افراد کو ترجیحی بنیادوں پر علاج معالجے کی سہولیات فراہم کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا ماحولیاتی تحفظ ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد مستحکم ترقی کو فروغ دینا، آلودگی پر قابو پانا، اور تحفظ ماحول، اس کی بحالی اور بہتری تھا۔

☆ خیبر پختونخوا قانونی افسروں کی تقرری کا ایکٹ، نومبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد قانونی افسروں کی تقرریاں کرنا تھا۔

☆ خیبر پختونخوا جنرل پراویڈنٹ انویسٹمنٹ فنڈ (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا سروس ٹرائبونل (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا ہنگامی امداد (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا پینشن فنڈ (ترمیمی) ایکٹ، دسمبر 2014ء۔

☆ خیبر پختونخوا اقلیتوں کی املاک کے تحفظ کا ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد غیر مسلم برادریوں کی املاک کا تحفظ تھا۔

☆ خیبر پختونخوا متروکہ املاک ٹرسٹ (انتظام وانصرام) ایکٹ، دسمبر 2014ء؛اس قانون کا مقصد

اقلیتوں کی املاک کا انتظام وانصرام تھا۔

☆ خیبر پختونخوا معمر شہریوں کا ایکٹ، دسمبر 2014ء؛ اس قانون کا مقصد صوبے کے معمر شہریوں کی فلاح، آرام اور وقار کو یقینی بنانا تھا۔

سفارشات

1۔ ہر سال منظور کیے گئے متعدد قوانین کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے فوری طور پر سرکاری طریق کار اور نگرانی کا نظام تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ نگرانی کے عمل کو یقینی بنانے کے لیے سول سوسائٹی کو بھی زیادہ موثر کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

2۔ بہت سے اہم مجوزہ قوانین جیسے کہ ہندو میرج بل ایک طویل عرصے سے التوا کا شکار ہیں، ایسے اہم معاملات سے متعلق مجوزہ قانون سازی کو بلاتاخیر پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

3۔ نجی اراکین کے بل بالخصوص انسانی حقوق سے متعلق بلوں پر مناسب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

4۔ مجوزہ قوانین کے مسودے کی تیاری کے وقت لوگوں کی رائے لینے کے لیے مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو اظہار رائے کا موقع دینے سے قانون سازی کے عمل میں ان کی دلچسپی بڑھے گی اور قانون سازوں کو رائے عامہ کی روشنی میں معلومات پر مبنی فیصلے کرنے کا موقع ملے گا۔

5۔ وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز کی ویب سائٹ پر قوانین کی فہرست تو موجود ہے مگر یہ فہرستیں جامع نہیں ہیں اور بعض جگہوں پر صرف قانون کا نام درج ہے۔ یہ ضروری ہے کہ تمام نئے قوانین کی قومی اور علاقائی زبانوں میں نشر واشاعت کی جائے تاکہ ان قوانین سے متعلق عوام کی معلومات میں اضافہ کیا جا سکے۔

عدل وانصاف کا انتظام وانصرام

قانون کا تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا چاہے وہ جہاں بھی ہو، نا قابل تنسیخ حق ہے اور ہر اس شخص کا بھی جو فی الوقت پاکستان میں موجود ہے۔ خاص طور پر (الف) کسی شخص کی زندگی، آزادی، جسم، وقار یا جائیداد کے خلاف کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جو نقصان دہ ہو۔ سوائے ایسے قدم کے جو قانون کے عین مطابق ہو (ب) کسی شخص کو ایسا کوئی کام سرانجام دینے سے نہیں روکا جائے گا جس کی قانون ممانعت نہیں کرتا اور (ج) کسی شخص کو ایسا کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جس کی قانون اجازت نہیں دیتا۔

[آئین پاکستان [آرٹیکل- 4 (1) اور (2)]

کسی شخص کو اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ سوائے قانون کی مطابقت میں۔

[آئین پاکستان [آرٹیکل - 9]

تمام افراد قانون کے سامنے مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 25(1)]

محض جنس کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 25 (2)]

ریاست سستے اور فوری انصاف کے حصول کو یقینی بنائے گی۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 37(اے)]

کسی جائیداد کو جبراً حاصل یا اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا ماسوائے قومی سطح پر کسی مقصد کے لیے اور ماسوائے قانون کی اجازت سے۔ آئین پاکستان [آرٹیکل- (2)24]

تمام انسانوں کے وقار اور ان کے مساویانہ اور نا قابل تنسیخ حقوق کو تسلیم کرنا، دنیا میں امن اور انصاف اور آزادی کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [تعارف]

ہر شخص کو قانون کے روبرو بطور انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل (6)]

ہر شخص قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتا ہے اور بغیر کسی تمیز کے مساویانہ قانونی تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- (3)]

قانون یا آئین کی طرف سے عطا کردہ حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف ہر شخص کو با اختیار قومی ٹریبونلز کے ذریعے موثر دادرسی کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل نمبر - 8]

ہر شخص کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں یا اپنے خلاف عائد کیے گئے کسی بھی فوجداری الزام کے تعین کے لیے، ایک خود مختار اور غیر جانبدار ٹریبونل کے ذریعے، مکمل مساویانہ حیثیت میں منصفانہ اور کھلی سماعت کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 10]

کسی شخص کو یکطرفہ طور پر اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 17 - (2)]

موجودہ اختیاری پروٹوکول [سزائے موت کے خاتمے کے لیے] کی فریق کوئی ریاست اپنی حدود میں کسی شخص کو سزائے موت نہیں دے گی۔

ہر فریق ریاست اپنی حدود اختیار میں موت کی سزا کے خاتمے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔

دوسرا اختیاری پروٹوکول ICCPR۔[آرٹیکل - 1]

2014ء میں پاکستان میں قیام انصاف کے لیے جدوجہد جاری رہی۔ 21ویں آئینی ترمیم کی تجویز پیش کی جا رہی تھی۔ اس سال کے آخری پندھرواڑے میں سزائے موت کے مجرموں کی صف بندی کی تجدید کر دی گئی۔ جنرل پرویز مشرف کا مقدمہ شروع ہونے لگا مگر ان کے قانونی مشیروں اور ان کے تعلقات رکھنے والوں کی ٹیم نے ججوں کی غیر جانبداری کو چیلنج کر دیا۔ اپوزیشن لیڈر عمران خان نے ایک تحریک شروع کرتے ہوئے جسے وہ کرپٹ انتخابی نظام کہتے تھے ایک سابق چیف جسٹس اور ریٹائرڈ ججوں پر (جو الیکشن کمشنرز اور ریٹرننگ افسروں کے طور پر کام کر رہے تھے) 2013 کے قومی انتخابات میں منتظم طور پر دھاندلی کرنے کا الزام لگا دیا، عدلیہ ملک کے اندر 17 لاکھ 93 ہزار سے زائد زیر التوا مقدمات کو نمٹانے میں جتی ہوئی تھی۔ مقدمات کی یہ بھرمار افراد اور نظام دونوں کے لیے ایک بہت بڑا بوجھ تھا جس سے عوام کا نظام انصاف پر اعتماد متزلزل ہو گیا اور نظام ناکامی سے دوچار ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔

نظام انصاف

جیسے ہی سال ختم ہونے لگا، تحریک طالبان پاکستان نے آرمی پبلک سکول پشاور پر حملہ کر دیا جس سے 145 افراد جاں بحق ہو گئے جن میں 132 طالب علم بچے تھے۔ زخمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ پشاور میں اس حملے کے بعد سوال یہ اُٹھا کہ کیا ایسا وحشیانہ اور خوفناک واقعہ پاکستان کے ضمیر کو جھنجوڑ دے گا اور ریاست اور معاشرے کو گہری جڑوں والے اداراتی بگاڑ اور معاشرتی بدعملیوں کے خاتمے کے لیے کوئی قدم اُٹھایا جا سکے گا جس نے پاکستان کے اجتماعی قومی رجحان کو دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کے لیے ایک قدرتی محفوظ علاقہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب دہشت گردی متنوع اداراتی اور سماجیاتی عوامل کے تحت جنم لیتی اور پرورش پاتی رہتی ہے تو ان میں قومی تحفظ کا ایک بگڑا ہوا اصول اور ریاستی امور میں مذہب کا کردار بھی نمایاں کردار موجود ہوتا ہے۔ سکول پر حملے کے بعد جنم لینے والی سوچوں میں غیظ و غضب کی لہروں نے توجہ کو اس نقطے پر مرکوز کر دیا

پاکستان میں قانون کی حکمرانی تاحال ایک مستحکم قدر نہیں سمجھی جاتی

کہ ہمارا جوجداری نظام انصاف دہشت گردوں کوسزا دینے اورانصاف مہیا کرنے میں ناکامی کی طرف جاتا ہوا کیوں محسوس ہورہا ہے۔

قوانین کا غلط استعمال

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قانون کے سیاہ حروف اوراس پر عمل درآمد میں خلیج بڑھتی ہی جارہی ہے۔جس کا اظہار، جرائم کے بڑھنے اور سزایابی کی شرح کم ہونے کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔یہ خاص طور پر اقلیتوں اور معاشرے کے زدپذیر طبقوں کے خلاف زیادہ جرائم کی شکل میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔جابرانہ قوانین کو اقلیتوں کواذیتیں دینے اور مخالفت میں اُٹھنے والی آوازوں کو دبانے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔اس سے ہمارے قوانین کے معیاراوران کی انصاف پیدا کرنے کی اہلیت پر طرح طرح کے سوالات اُٹھ رہے ہیں اور تنازعات نظام انصاف کے ظاہری ڈھانچے کے باہر جاکر طے کئے جارہے ہیں۔ بہ مقابلہ قانون جبر سے زیادہ کام لیا جارہا ہے اس طرح ایک بڑا سوالیہ نشان دکھائی دے رہا ہے کہ ہمارا رسمی عدالتی نظام ریاستی اداروں کے مابین خاردار تنازعات یا شہریوں اور ریاست کے باہمی اختلافات دور کرنے میں کسی کام کا رہ گیا ہے یا

نہیں۔آسودہ خاطری میں مگن اعلیٰ عدالتوں نے اپنا کام ایسے طریقے سے جاری رکھا کہ وہ عام صارفین انصاف کے دکھ درد سے بظاہر لاتعلق ہی دکھائی دیں۔فوجداری نظام انصاف کے جملہ کل پُرزوں کی طرف سے نفرت وتعصب کے جرائم سنگدلانہ انداز میں قبول کرنے ،عدلیہ اورانتظامیہ کی جانب سے جلد سیاسی وقانونی اصلاحات کے نافذ کرنے کے احساس کے فقدان اور مقنّنہ کے ایسے قوانین وضع کرنے کے رجحان کے باعث جوشہریوں کے حقوق اور آزادیوں کی قیمت پر ریاستی سلامتی تلاش کرتے ہیں(مثلاً قانونی تحفظ پاکستان مجریہ 2014ء) اور ایسے قوانین (جیسے قانون توہین مذہب) پر نظرثانی سے انکار جن کے غلط استعمال کا اعتراف خودقانون سازوں کوبھی ہے۔2014ء میں پاکستان میں قیام انصاف پر نظرثانی کے لیے معدودے چندہی تجاویز سامنے آسکیں۔

نمبر 1: قانون کی حکمرانی اب تک پاکستان میں کوئی حصار بند قدر(Entrenched Value) نہیں ہے۔اداروں یا پاکستان کے طاقتور رؤساء(ایلیٹس) میں کوئی معیاری اتفاق رائے نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے طرزعمل کواعلان کردہ قانون کے تابع کرسکیں۔نمبر 2 سماجی سطح پر عدالتی نظام پر اعتماد میں مسلسل کمی واقع ہورہی ہے کیونکہ وہ ایک عام شہری کو بروقت انصاف فراہم کرنے سے عاری ہے۔ججوں میں یہ اہلیت نہیں کہ وہ غیرجانبداررہ کرثالث قانون کے طور پر اپنا فریضہ ادا کرسکیں جس کی وجہ سے عوام میں یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ دہشت گردی روکنے کے لیےفوجی عدالتیں قائم کی جائیں۔

عدالتی احتساب

قومی عدالتی پالیسی ساز کمیٹی آرڈیننس مجریہ 2002ءاور 18ویں اور 19ویں آئینی ترامیم کے تحت عدالتی تقرریوں کے نئے طریق کار کی رُو سے جوچیف جسٹس آف پاکستان کوچیئرمین جوڈیشل کمیشن نامزد کرتا ہے اوراس طرح اس کے کردار کوبطور سربراہ خاندان مزید مورچہ بند بنادیتا ہے۔(چیف جسٹس کے لیے ایک استعارہ جوانتظامی مسائل میں اس کی حیثیت کا مظہر ہے) ہماری عدلیہ کی وفاقی نوعیت جس کا تصور 1973ء کے اصل دستور میں پایا جاتا ہے وہ ثابت قدمی کے ساتھ وحدانی شکل اختیار کرچکا ہے۔

عدالتی احتساب کا ذکر ایک شجرممنوعہ ہے۔ پاکستان میں تقسیم ثلاثی (Trichotomy) اور اختیارات کی علیحدگی کی آئینی سکیم کارفتہ رفتہ یہ مفہوم بن گیا ہے کہ دستور کے تحت عدالتی احتساب کی واحد قابل قبول شکل ''خود احتسابی''(Self Accountability) ہے۔مگر یہ تصور جڑنہیں پکڑ سکا۔ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے مطابق پاکستان میں عدلیہ کونسبتاً زیادہ بدعنوان اداروں میں سے ایک سمجھا جانے لگا ہے۔مگر ہائی کورٹوں نے جنہیں اپنے اپنے صوبوں میں ضلعی عدلیہ کاانتظامی کنٹرول حاصل ہے اپنی ذیلی عدالتوں میں پائی

سپریم جوڈیشل کونسل کے ذریعے ججوں کی جوابدہی

جانے والی کرپشن کو ختم کرنے کے لیے کوئی ساختیاتی (Sturctured) کوشش نہیں کی۔

سپریم جوڈیشل کونسل جو دستور کے آرٹیکل 209 کے تحت قائم کی گئی تھی وہ بھی ایک غیر فعال احتسابی ڈھانچے کے طور پر پائی جاتی ہے۔ کوڈ آف جوڈیشل کنڈکٹ موجود ہے مگر سپریم جوڈیشنل کونسل نے اسے موثر بنانے کے لیے بظاہر کوئی کوشش نہیں کی۔ مثلاً لاہور ہائی کورٹ نے اے آر وائی نیوز کے خلاف توہین کی کاروائی کے سلسلے میں اپنے ارکان کی دیانت اور وقار کے بارے میں میڈیا میں نشر ہونے والے سکینڈلز کا سخت نوٹس لیا اور دستور کے آرٹیکل 204 اور کانٹیمپٹ آف کورٹ آرڈیننس 2003ء کے تحت حاصل اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے ایک جج کے خلاف نامناسب رویئے کے الزامات کی گرفت کی تاہم سپریم جوڈیشل کونسل نے نہ تو نامناسب رویئے کی چھان بین کی نہ اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کے خلاف بدعنوانی کے الزام کی تحقیق کی اور نہ ہی جوڈیشل کوڈ آف کنڈکٹ پر سختی سے عمل درآمد کے لیے کوئی قدم اُٹھایا۔

2013ء میں فوجداری ریویو پٹیشن 10 ایل کو جو 2012ء کی کریمنل پٹیشن نمبر 896 ایل سید مظہر اکبر علی نقوی بنام ریاست کے خلاف دائر کی گئی تھی بذریعہ حکم مجریہ 22 جنوری 2014ء نپٹا دیا گیا۔ (نہ کہ رپورٹنگ کے لیے محض منظور کرلیا گیا بلکہ تمام ہائی کورٹوں کے رجسٹراروں کو برائے تعمیل بھجوادیا گیا۔ سپریم

کورٹ پر منکشف ہوا کہ ہائی کورٹ کے ایک جج کی ضمانت منظور کرنے میں بظاہر غیر متفقہ چیزوں کو ملحوظ رکھا گیا اور صوابدیدی اختیار کو ایسے طریقے سے استعمال کیا گیا جو کسی ''قدر مصنوعی'' لگتا ہے۔ تاہم ایک سپریم کورٹ کے ایک جج کی طرف سے جو فوجداری قانون کے معاملات بشمول قتل کے مقدمات کی سماعت کرتا ہے ایسی اتہام آمیز رولنگ دیئے جانے کے باوجود سپریم جوڈیشل کونسل کا اجلاس منعقد نہیں ہوا کہ اس میں اس جج سے باز پرس کی جاتی یا اسے کلین چٹ دیدی جاتی۔

قومی عدالتی پالیسی ساز کمیٹی جس کے سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان ہیں، وہ جن امور کی ذمہ دار ہے ان میں یہ امور بھی شامل ہیں ''عدل گستری کی کارکردگی اور صلاحیت بہتر بنانا'' جوڈیشنل افسروں اور عدلیاتی اور نیم عدلیاتی امور نمٹانے سے متعلقہ دیگر افراد کی کارکردگی کے لیے معیار مقرر کرنا اور جوڈیشل افسروں اور عدالتی سٹاف کی شرائط ملازمت بہتر بنانا تاکہ ان کی ہنرمندی اور عدلیہ کی استعداد میں اضافہ ہو۔ 2009ء میں چیف جسٹس افتخار چوہدری کی بحالی کے بعد قومی عدالتی پالیسی ساز کمیٹی (NJMPC) نے 2009ء میں قومی عدالتی پالیسی جاری کی جس کا کلیدی نصب العین ''سال ہا سال سے عدلیہ کی مختلف سطحوں میں پڑے ہوئے مقدمات کی بھرمار کو صاف کرنا تھا''۔

زیر التوا مقدمات

قومی عدالتی پالیسی اپنے اس کلیدی نصب العین کے حصول میں ناکام رہی۔ پاکستان سالانہ رپورٹ 2013ء کی شماریات عدلیہ میں جولاء کمیشن نے شائع کرائی ہے بتایا گیا ہے کہ یکم جنوری 2013ء کو پاکستان بھر میں 15 لاکھ 61 ہزار ساٹھ (1561060) مقدمات زیر التوا تھے۔ 31 جنوری 2013ء کو یہ تعداد بڑھ کر 17 لاکھ 9 ہزار 345 تک پہنچ گئی تھی۔ یہ تقریباً یکساں طور پر مقدمات کی مختلف اقسام کی پاکستان کی تمام عدالتوں میں صورت حال تھی۔ سال 2014ء کے اختتام پر وزیر قانون وانصاف کے مطابق ملک بھر کی تمام عدالتوں میں 17 لاکھ 93 ہار سے زائد مقدمات زیر سماعت تھے۔ وزیر نے قومی اسمبلی میں بتایا کہ سپریم کورٹ میں 20 ہزار 480 مقدمات لاہور ہائی کورٹ میں ایک لاکھ 73 ہزار 37 سندھ کورٹ میں 66 ہزار 475، پشاور ہائی کورٹ میں 26 ہزار 716، بلوچستان ہائی کورٹ میں 4 ہزار 923 اور اسلام آباد ہائی کورٹ میں 31 ہزار 783 مقدمات زیر سماعت تھے۔ پنجاب کی ضلعی عدالتوں میں 11 لاکھ 7 ہزار 634، بلوچستان میں 8 ہزار 444 اور اسلام آباد میں 30 ہزار 300 مقدمات زیر سماعت تھے۔ ہر سال پچھلے مقدمات میں اضافے کی ترتیب یکساں معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان سالانہ رپورٹ 2012ء کی عدالتی شماریات کے مطابق یکم جنوری 2012ء کو ملک بھر کی تمام عدالتوں میں زیر التوا مقدمات کی

تعداد 14 لاکھ 49 ہزار 494 تھی۔ سال کے آخر میں یہ تعداد بڑھ کر 15 لاکھ 61 ہزار 60 تک جا پہنچی۔

عدالتی تقرریوں کے مسئلے میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ پاکستان سالانہ رپورٹ 2013ء کی عدالتی شماریات کے مطابق 31 دسمبر 2013ء کو پنجاب کی ضلعی عدلیہ کی منظور شدہ 2365 پوسٹوں میں سے 1193، سندھ میں 446 پوسٹوں میں سے 81، خیبر پختونخوا میں 450 میں سے 112، بلوچستان میں 273 میں سے 89 اور اسلام آباد میں 101 میں سے 48 خالی تھیں۔ اس سے بھی بڑھ کر برائی یہ ہے کہ ہائی کورٹ ججوں کو ضلع ججوں کے انتخاب کے لیے کوئی واضح کسوٹی یا طریقہ کار نہیں بتایا گیا۔ یہ بات ہر ہائی کورٹ پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ جسے چاہے ضلعی عدالتوں کے جج مقرر کرے بعض اوقات وہ امتحان لیتی ہے اور بعض اوقات صرف انٹرویوز لے لیتی ہے۔ اس کی صوابدید اور بدعنوانیوں کے لیے کافی گنجائش چھوڑ دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر 2011ء میں اسلام آباد ہائی کورٹ نے انٹرویو لئے جس کے نتائج کو چیلنج کر دیا گیا اور سپریم کورٹ کمیشن سول ملازمین کی طرح سول ججوں کا انتخاب کرتا تھا مگر بعد میں عدلیہ کی آزادی کے نام پر کمیشن سے یہ اختیار واپس لے لیا گیا اور انتظامی کنٹرول عدلیہ کے پاس چلا گیا۔

ججوں کا تقرر

جب آئین میں آرٹیکل 175-A ''شامل کر دیا گیا'' تو اس کے نتیجے میں ایک جوڈیشل کمیشن بنا اور عدلیہ میں تقرریوں کی جانچ پڑتال کے لیے ایک پارلیمانی کمیٹی قائم ہوگئی۔ عدلیہ دستور کی تشریح کے لیے اپنے اختیارات اس طرح استعمال کرنے لگی کہ پارلیمانی کمیٹی ایک فالتو چیز بن گئی۔ تاہم آرٹیکل 175-A کا متن اور اس آرٹیکل کی روح کے تحت عدلیہ میں تقرریاں تقریباً اسی طرح ہو رہی ہیں جیسے نیا طریقہ کار متعارف کرنے سے پہلے ہوا کرتی تھیں۔

عدلیہ کی قیادت غیر رسمی صلاح مشورہ کے ذریعے نئے ججوں کے تقرر سے اتفاق کرتی ہے۔ مگر اس صلاح مشورے پر اخفا کا پردہ تنا رہتا ہے اور آئینی طریق کار کو ایک ربڑ سٹیمپ کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔

حالیہ اہم مقدمات (مثلاً اشرف ٹوانہ، محمد یاسین) میں سپریم کورٹ نے قرار دیا ہے کہ پبلک عہدوں پر تقرریاں کھلے، جائز، شفاف او شراکتی طریق کار کے تحت ہونی چاہئیں۔ برطانیہ میں سپریم کورٹ میں تقرریاں کانسٹی ٹیوشنل ریفارم ایکٹ مجریہ 2005ء کے تحت ہوتی ہیں جبکہ قانون سازوں نے کوئی طریق کار وضع نہیں کیا۔ سلیکشن کمیشن اپنے طور پر شفاف طریقے سے اسامیوں کی تشہیر کرتا ہے خواہ اعلیٰ ترین کورٹ کی سطح پر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن پاکستان میں ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرری کے سلسلے میں حکومت کی رہنمائی کے لیے کوئی کسوٹی نہیں اور نہ ہی ان کی کارگزاری کے معتبر ہونے کے لیے کسی صداقت نامے کی

ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ اس لیے اس طرح ہونے والی تقرریاں ہمیشہ باعث نزاع بنی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر نومبر 2014ء میں خیبر پختونخوا بار کونسل نے پشاور ہائی کے نئے ججوں کے حلف لینے کی تقریب کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ججوں کی انتظامی تقرریوں کے لئے ان کے اختیار کا استعمال ان کے خود مقرر کردہ معیار پر بھی پورا نہیں اُترتا۔

اختیارات کا آمرانہ استعمال

اعلیٰ عدالتوں کو زیادہ تر غیر اختیاری کورٹ اینڈ کیس مینجمنٹ نظاموں کے تحت چلایا جا رہا ہے۔ اگرچہ اصلاحات کا ایک طریقہ شروع ہو چکا ہے اور لسٹوں کے لیے ترجیحات مقرر کر دی جاتی ہیں۔ ہر روز اعلیٰ عدالتیں اختیارات کے من مانے استعمال کے سلسلے میں انتظامیہ کی طرف کان جھکاتی رہتی ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ من مانی کیا ہو سکتی ہے جیسے بنچوں کی تشکیل اور مقدمات کی ساعت مقرر کی جاتی ہے جو سپریم کورٹ میں بھی ہوتے ہیں اور ہائی کورٹوں میں بھی حالانکہ بے ڈھب آمرانہ صوابدید کا استعمال انتظامیہ کے اقدامات کے عدالتی ریویو کے لیے اولین بنیاد ہوتا ہے۔ یہ طریق کار چیف جسٹسوں کے انتظامی اختیار اور شخصی امتیازی اختیار (Prerogative) کا زندہ اور فعال حصہ ہوتا ہے۔

18 دسمبر 2009ء کو سپریم کورٹ نے حبیب میکرو کیس کا فیصلہ کرتے ہوئے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو کراچی میں ایک کھیل کے میدان کے لیز کو منسوخ کر دیا اور اس پر تعمیر شدہ میکرو سٹور کو منہدم کرنے کا حکم دے دیا، 17 مارچ 2010ء کو جبکہ بانی جج اسلام آباد سے باہر تعینات تھا چیف جسٹس افتخار احمد نے اپنے بنچ کے سامنے موجود آرڈر کے خلاف ریویو پٹیشن کی تاریخ مقرر کرتے ہوئے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ بانی جج کی سربراہی میں قائم بنچ نے 21 مئی 2013ء کو ریویو خارج کر دیا مگر سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی۔ دسمبر 2013 میں درخواست گزار نے حکم کے نفاذ کے لیے توہین عدالت کی درخواست دائر کر دی، اس پر ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔

اصول قانون کی سطح پر آرٹیکل 184(3) کے اختیار کے استعمال کے لیے کوئی معروضی کسوٹی نہیں ہے۔ افتخار چودھری کی عدالت نے از خود نوٹس لینے کے اختیار (Suo Moto) کو ایسے طریقے سے استعمال کیا کہ اس پر بہت زیادہ تنقید ہوئی کہ شراب کی برآمدگی کا تو از خود نوٹس لے لیا گیا جبکہ قومی انتخابات میں فراڈ اور وسیع پیمانے پر دھاندلی کے الزامات کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ قانون کی حکمرانی کا انحصار قانونی تیقن پر ہوتا ہے۔ اس امر کی اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ ممکن ہے کہ اعلیٰ عدلیہ چودھری افتخار کے بعد ایک بڑا بنچ بنایا جائے جو آرٹیکلز 184(3) کے تحت حاصل اختیارات کی ایک واضح بنیاد فراہم کرے اور نیز بار کے مطالبے پر

آرٹیکل 184(3) کے تحت اپیل بھی فراہم کرے تاکہ انہیں آنے والے چیف جج کے من کی موج یا لہرو خواہشات سے منقطع کیا جاسکے۔ افتخار چودھری کی ریٹائرمنٹ کے بعد آنے والے دوسرے چیف جسٹس کے آجانے کے باوجود یہ توقع پوری نہیں ہوسکی۔ اگرچہ ازخود اختیار کے مقدمات کی تعداد کافی کم ہوچکی ہے اور داخلی ضبط کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔

مگر ''بعداز چودھری'' والی سپریم کورٹ ججوں کی بحالی کے بعد کے چند برسوں میں ہمارے دستوری اُصول قانون کو جو نقصان پہنچا ہے اس کو کالعدم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ دوسانی ٹریولز (Pvt) لمیٹڈ بنام ایم ایس ٹریولز شاپ (PLD/SCI) کے مقدمہ میں چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی کی سربراہی میں سماعت کرنے والے بنچ نے قرار دیا کہ عدالتوں کو پالیسوں کی جانچ پڑتال کرتے وقت ضبط (Restraint) سے کام لینا چاہتے اور انہیں عام طور پر انتظامی اداروں کوسونپے گئے پالیسی سازی کے امور میں کئے گے اقدامات کا احترام کرنا چاہیے۔ اس سے قبل چودھری عدالت نے خواجہ محمد آصف بنام وفاق (آئینی درخواست نمبر 30 سال 2013) میں رولنگ دیتے ہوئے دراصل اعلیٰ انتظامیہ کے دائرے میں تقرریوں کا اختیار سنبھال لیا اور حکم دیا کہ اسے اعلیٰ اختیاراتی خودمختار کمیشن میں اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت فیصلے پر نظر ثانی کرانے سے اس وقت گریزاں رہی جب تک چیف چودھری اپنے منصب پر فائز رہے مگر ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے انتظامی امور کی تقرریوں کے کنٹرول کو واپس لینے کی کوشش کرتے ہوئے درحقیقت ''خواجہ آصف کیس'' پر نظر ثانی کی درخواست دائر کردی۔ اس کے لیے اس نے ایک غیر متعلقہ درخواست بعنوان ''غلام رسول بنام حکومت پاکستان'' میں ایک متفرق درخواست دائر کرتے ہوئے یہ مسئلہ اُٹھایا۔ اس وقت اس کی سماعت چیف جسٹس ناصرالملک کررہے تھے۔ اس میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ وہ ''خواجہ آصف رولنگ'' میں ابہام دور کرانا چاہتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے عملاً نظر ثانی کرتے ہوئے معاملے کو الٹا دیا اور قرار دیا کہ ''قانون کے تحت قائم اداروں خودمختار نیم خودمختار اور باضابطہ اداروں وغیرہ میں افسروں کا تقرر وفاقی حکومت کا محفوظ اور بلاشرکت غیرے حق ہے۔

گزشتہ دور کے ازخود حاصل اختیار (Suo Moto) کے عوامیت پسندانہ اقدامات سے بجا طور پر گریز کرتے ہوئے بعداز افتخار چودھری دور میں اعلیٰ ترین عدالت نے شعبہ انصاف میں ساختیاتی اصلاحات نافذ کرنے کا کوئی ایجنڈ وضع نہیں کیا اور وہ افتخار چودھری کے ''دلاسہ بطور انصاف'' ماڈل کی جگہ پر جائز راستے سے حقیقی انصاف فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدلیہ پاکستان کے اندر سماجی وسیاسی ماحول مرتب کرنے سے زیادہ تر غیر متعلق ہوتی جارہی ہے اور ان کے لیے بھی بے فیض ہوتی جارہی ہے جو

مارچ 2009ء میں آزادانہ سوچ کے حامل ججوں کی بحالی کے بعد عدلیہ کو پاکستان میں تبدیلی کی ایسی ایجنٹ بنتے ہوئے دیکھنے کے متمنی تھے جس کا مطمح نظر جمہوریت اور آئینی نظام کے فروغ کے لیے قانون کی حکمرانی کی مضبوط ترین مورچہ بنانا ہو۔

آئینی ڈھانچے میں تناؤ کا جواز

اولاً جنرل مشرف پر غداری کے مقدمے ثانیاً حامد میر پر قاتلانہ حملے کے بعد جنگ/جیو گروپ اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے مابین کشیدگی اور ثالثاً دہشت گردی کے مقدمات کے فیصلے کے لیے فوجی عدالتوں کا قیام عمل لایا گیا۔ جن کے فیصلوں کے خلاف کوئی امداد یا سویلین عدالتوں میں اپیل کا کائی راستہ نہیں ہوتا ہمارے سول ملٹری نزاع اور عدم توازن نے شہری زندگی میں پھر سے ایک بڑی دراڑ ڈال دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پی ٹی آئی نے انتخابی دھاندلی، عدالتی نظام سے انصاف نہ ملنے پر ایک زوردار تحریک شروع کر رکھی ہے جس میں ادائیگی فرائض سے قاصر آئینی نظام میں جبری اصلاح کے لیے نظام سے باہر سے مدد کا مطالبہ کیا گیا ہے اور کوئی ٹھوس تجاویز بھی پیش نہیں کی گئیں۔ ان دونوں پیشتر فتوں نے آئینی ڈھانچے کے جواز اور عدلیہ کے کردار پر شدید دباؤ ڈالا ہے جبکہ عدلیہ ریاستی اداروں یا ریاست امداد کان معاشرہ کے درمیان تصفیے کے لیے ایک حتمی ثالث ہوا کرتی ہے۔

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو حکمران ڈکٹیٹروں کو مطلوبہ حمایت عدلیہ اور بیوروکریسی کی طرف سے ملتی رہی ہے مگر 3 نومبر 2007ء کو جنرل مشرف کا دوسرا اقدام بنیادی طور پر عدلیہ کے خلاف تھا۔ اگرچہ برطرف شدہ جج مارچ 2009ء میں بحال ہو گئے تھے اور سپریم کورٹ نے ابتدا میں محتاط مزاحمت سے کام لیا جس کا اظہار لاپتہ افراد کے مقدمے اور اصغر خان کیس شروع کرنے میں تاخیر (ائیر مارشل محمد اصغر خان بنام جنرل مرزا اسلم بیگ) انسانی حقوق کا مقدمہ نمبر 19 سال 1996ء کرنے سے ہوا۔ ان مقدامات میں فوج کے خلاف حامل نتائج چبھتے ہوئے فقرے استعمال ہوئے اور ان کے ساتھ ہی جنرل مشرف پر مقدمہ چلانے کا اصرار کیا گیا۔ کوشش کے باجود عدلیہ اور فوج کے درمیان دھڑے بندی کم ہونے میں مدد نہ مل سکی۔ جی ایچ کیو اور سپریم کورٹ کی لیڈر شپ میں تبدیلی کے باوجود یہ کہنا محفوظ اور بجا ہے کہ فوج عدلیہ کو ''سول ملٹری تقسیم'' کی غلط سمیت میں کھڑی دیکھ رہی ہے۔

قانونی طور پر دیکھا جائے جنرل پرویز مشرف کا غداری کیس کوئی ''مشکل کیس'' نہیں ہے۔ اس نے 1999ء میں دستور کو سبوتاژ کیا مگر عدلیہ نے (ظفر علی شاہ کیس میں) اس کے اقدامات کو جائز قرار دیا اور بعد میں پارلیمنٹ نے 17ویں ترمیم کے ذریعے اس کو تحفظ دے دیا۔ جب اس نے 3 نومبر 2007 کو

دوسری بار دستور کو سبوتاژ کیا تو بچ نکلنے میں ناکام رہا۔ افتخار چودھری کی زیر قیادت قائم سپریم کورٹ نے اس کے اقدامات کو دستور کے منافی قرار دیدیا۔ (سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کیس) اور پارلیمنٹ نے بھی 18ویں آئینی ترمیم کے ذریعے اسے تحفظ دینے سے انکار کر دیا۔ پاکستان مسلم لیگ ن کی حکومت غداری (سزا) ایکٹ مجریہ 1973ء کی دفعہ 2 کے تحت اس کے خلاف غداری کا مقدمہ چلانے کی تیاری شروع کی تو اس سے فوج ناراض ہوگئی۔ اس نے اس مقدمے کو انصاف نہیں بلکہ انتقام کے طور پر دیکھا، یعنی یہ سمجھا کہ نواز شریف جنرل مشرف سے 1999ء کی بغاوت کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔

چونکہ دوسری بغاوت عدلیہ کے خلاف تھی اس لیے جنرل مشرف کے حامیوں نے عدلیہ کی غیر جانبداری کے بارے میں سوالات کھڑے کر دیئے اور کہا کہ وہ جنرل کے ساتھ انصاف کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مشرف کی لیگل ٹیم نے فوجداری قانون ترمیمی (خصوصی عدالتیں) ایکٹ کی دفعہ 4 کے تحت قائم خصوصی عدالت کے سامنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ اس کے خلاف مقدمہ یہاں نہیں بلکہ فوجی عدالت میں چلنا چاہیئے۔ خصوصی عدالت نے اس موقف کو مسترد کر دیا۔ مشرف کی ٹیم دو مقاصد حاصل کرتی ہوئی دکھائی دی۔ پہلا یہ کہ قانونی اعتراضات کھڑے کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دائرے کو وسیع کر کے مشرف کی مدد کرنے والے سب افراد کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ مقدمہ غیر معینہ عرصے تک چلتا رہے اور فراہمی انصاف میں زیادہ سے زیادہ تاخیر واقع ہو۔ ان کی پہلی چال چند نکات نمٹانے کی حد سے زیادہ دیر نہ چل سکی۔ جبکہ خصوصی عدالت نے 30 تاریخ 2014ء کو جنرل مشرف پر فرد جرم عائد کر دی۔

دوسری چال جزوی طور پر کارآمد رہی اور نومبر 2014ء میں خصوصی عدالت نے مقدمے کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مشرف کی استدعا قبول کرتے ہوئے وفاقی حکومت کو حکم دیا کہ شکایت دوبارہ دائر کرے اور اس میں شوکت عزیز کا نام شامل کرے جو 3 نومبر 2007ء کو وزیراعظم تھے۔ اسی طرح زاہد حامد کو شامل کرے جو اس وقت وزیر قانون تھا اور وہ اب پاکستان مسلم لیگ کا ایک نمایاں رہنما ہے اور ساتھ ہی سابق چیف جسٹس عبدالمجید ڈوگر کا نام شامل کیا جائے۔ بلا لحاظ مشرف کے مقدمے کے نتائج کے بہت سے تنازعات نے پہلے ہی معاملے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر مشرف کو سزا ملتی ہے تو پاکستان میں بہت سے لوگ اسے عدلیہ اور نواز شریف کا انتقام سمجھیں گے۔ اگر مقدمہ غیر مبینہ عرصہ تک لٹکا رہتا ہے اسے فوج اور پاکستان مسلم لیگ ن حکومت کے درمیان ایک سمجھوتہ قرار دیا جائے گا۔

مشرف پر غداری کے الزام میں چلنے والا مقدمہ بہت ہی سخت معاملہ ہے کیونکہ یہ ایسی چیزوں کے بارے میں ہے جو پاکستان کو تقسیم کر دیتی ہیں۔ جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی ضرورت اور فوج کا احساس

استحقاق، دستور کی دفعات فوج کے سویلین کنٹرول کے بارے میں غیر مبہم طور پر واضح ہیں اور سیاست میں فوجی مداخلت کے لیے کوئی قانونی بنیاد نہیں ہے مگر پاکستان کے زیادہ تر حصے پر فوج کی براہ راست حکمرانی رہی یا وہ پردے کے پیچھے سے ڈوریاں کھینچ کر حکومت کرتی رہی ہے۔ یہ ریکارڈ کا معاملہ ہے۔ اس طرح سوال یہ نہیں کہ کیا پاکستان کے تاریخی سول ملٹری عدم توازن کو کسنے کی ضرورت ہے بلکہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔

جو لوگ سول ملٹری عدم توازن کو کسنے کے لیے مشرف کے مقدمے کی مخالفت کو ایک ذریعہ سمجھتے ہیں یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر فوجی بغاوتوں کا راستہ بند کرنے کے لیے سب سے زیادہ یقینی طریقے کے طور پر ہر جنرل کے دل میں آرٹیکل 6 کا خوف پیدا کر دیا گیا ہوتا تو ایک منتخب وزیراعظم (ذوالفقار علی بھٹو) کو ایک ڈکٹیٹر (جنرل ضیاءالحق) کے ہاتھوں پھانسی نہیں لگ سکتی ہے اور 1973ء کے آئین میں غداری کی شق شامل ہونے کے نتیجے میں دوسرے حکمران (نواز شریف) کو کوئی دوسرا ڈکٹیٹر ملک بدر نہیں کر سکتا تھا۔ اگر آرٹیکل 6 ایک رکاوٹ تھا جو جمہوریت کو محفوظ کر سکتا تھا تو پاکستان ایک ایسے برسر ملازمت آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو نہیں دیکھ سکتا تھا جو اخبارات کی رپورٹ کے مطابق غیر مبہم الفاظ میں یہ انتباہ جاری کرتا کہ ''فوج عزم واستقلال کے ساتھ اپنے وقار اور اداراتی فخر کا تحفظ کرے گی''۔ اُنھوں نے یہ الفاظ اس آرٹیکل 6 کے تحت سابق آرمی چیف کے مقدمے پر اپنا ردعمل دیتے ہوئے ادا کئے تھے۔ پاکستان کے اداراتی عدم توازن کی اصلاح کے لیے قابل پُر از اعتماد اور ثابت قدم سول اور فوجی قائدین کی ضرورت ہے۔ دونوں جانب ضروری سمجھوتوں اور از سر نو توافق (Readijustment) لانے کے لئے حوصلہ درکار ہے۔

ایسی فوج کو جو اپنی مقدس گائے کی حیثیت کے لیے درپیش چیلنج کو ایک سنگین گستاخی اور اپنے اشد ضروری اداراتی مفادات کے لیے خطرہ سمجھتی ہو اس کی قلب ماہیت کر کے ایسی فوج میں تبدیل کرنا جو خود کو نجات ہندہ سمجھنے کے ذہنی خلل میں مبتلا نہ ہو اور قانون اور آئین کو بہ رضا و رغبت واجب الاطاعت قانونی دستاویز سمجھتی ہو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے طرز عمل اور ذہنی رجحان میں ایک تبدیلی لانی ہوگی۔ ڈی جی آئی ایس آئی کو صحافی عامر میر پر قاتلانہ حملے میں کلیدی موجب الزام ٹھہرانے دیئے جانے پر جیو کی بندش عمل میں آجانے سے ایسا لگتا ہے کہ ذہنی رویوں میں تبدیلی نہیں آرہی ہے۔

حامد میر پر حملہ، حملے پر جیو کے ردعمل اور جیو کی کوریج پر اسٹیبلشمنٹ کے ردعمل نے میڈیا اور سوسائٹی کے اندر شدید گروہ بندی پیدا کر دی اس کے نتائج قانون کی حکمرانی کے لیے مضر اثرات رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان شک اور یقین، صحیح رپورٹنگ اور افترا پردازی میں فرق کرنے کی اہلیت کھو رہا ہے۔

احتساب اور درست طریق کار کے لیے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا ہے۔قومی سلامتی اور قومی مفاد کے لیے دوراز کار تصورات اور انہیں سختی سے منوانے کے لیے بے لچک عہد و اقرار زندہ اور فعال دکھائی دے رہا ہے۔قومی مفاد کے سیکورٹی سٹیٹ نقطہ نظر پر سوال اُٹھانے والوں کو اب تک غدار قرار دیا جا رہا ہے۔

تقریر کی آزادی بہتان تراشی یا دوسروں کو بدنام کرنے کی آزادی کا نام نہیں ہے۔ ایک رائے رکھنے اور اس کے اظہار کے حق کا تحفظ کرنے کی ضرورت ہے۔لیکن رائے کو بطور ایک واقعہ پیش کرنا صحافت کو ضرر پہنچانا ہے۔جیو نے ڈی جی آئی ایس آئی کے خلاف حامد میر کے الزامات کی رپورٹنگ کرتے ہوئے غالباً سرخ لائن عبور کر لی تھی۔اس لئے نہیں کہ اس نے ایک الزام کا اظہار کیا بلکہ ایسے طریقے سے اظہار کیا جو ایک میڈیا ٹرائل کے مترادف تھا۔ یہ محض الزام دینا نہیں بلکہ ڈی جی آئی ایس آئی کو پبلک کے سامنے بطور مجرم پیش کرنے والی بات تھی۔

لیکن جیو کو شہرت خراب کرنے پر ماخوذ نہیں کیا گیا، اس کو بطور ایک غدار نشانہ ملامت بنایا گیا اور شروع میں اس کی بندش اس لئے ہوئی کہ اس نے ایک جنرل کے مرتبے کے حامل شخص کے خلاف نشانہ بننے والے ایک شخص کے شبہے کے اظہار کی گستاخی کی تھی۔

اس کی ٹرانسمشن عدالت کے احکام کے باوجود بحال نہیں کی گئی۔جب اسے کافی نہ سمجھا گیا تو جیو انٹرٹینمنٹ اور جیو کے مالک کیخلاف ایک مارننگ شو میں متنازع مواد پیش کرنے کے الزام میں بے حرمتی مذہب کے قانون (Blasphemy Law) کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا۔چینل پر جرمانہ کر کے اسے 15 دن کے عرصہ کے لیے بند کر دیا گیا اور اس نے ناظرین سے ممکنہ طور پر ان کے مذہبی احساسات مجروح ہونے پر معافی بھی مانگی۔لیکن الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہا۔جیو کی ٹرانسمشن مکمل طور پر بحال نہ ہوئی اس کے مالک کے خلاف پاکستان کے مختلف شہروں میں تقریباً 25 مقدمات چلائے گئے اور گلگت بلتستان میں ایک انسداد دہشت گردی عدالت نے عوام کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کے الزام میں جیو کے مالک کو 26 سال قید کی سزا سنادی۔اس طرح پاکستان میں پریس کی آزادی حملے کا نشانہ بنی رہی۔

پاکستان مسلم لیگ ن کی حکومت فوج کے ساتھ کشیدگی اور پی ٹی آئی کے حملے کی وجہ سے کمزور ہوتی رہی جس سے یہ امر یقینی ہو گیا کہ سکیورٹی کے تمام مسائل بلا شرکت غیرے فوج کے دائرے میں چلے گئے ہیں۔سولین حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت یا جنبش دیکھنے میں نہ آسکی خواہ یہ بحوالہ افغانستان، بھارت اور امریکہ ملک کی خارجہ پالیسی کا معاملہ ہے یا فاٹا میں فوجی کارروائیوں کا طریق کار اور ٹائمنگ یا فوجی خدشات ہیں جن کی وجہ سے قانونی ساخت میں ایسی تبدیلیاں مطلوب ہیں جن کا ہونا اس کی سکیورٹی ڈیوٹیز کے لیے ضروری

ہے، تو اب فوج کو فری ہینڈ ملا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء

تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء (PPA) 9 جولائی 2014ء کو اپنے نفاذ کے فوراً بعد کڑی تنقید کا نشانہ بن گیا۔ اس کے ناقدین کی طرف کیا جانے والا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا یہ بطور ایک ایسے قانون کے جو پاکستان کے خلاف جنگ یا بغاوت، پاکستان کی سلامتی کو خطرے سے دوچار کرنے اور جرائم کے خلاف فوری مقدمات چلانے کا دعویٰ رکھتا ہے کیا وہ دستور میں دی گئی ضمانت کے مطابق شہریوں کے بنیادی حقوق کا صحیح توازن قائم کرتا ہے۔ جبکہ وہ دہشت گردی کے خلاف لڑنے کے لیے ریاست کو مطلوبہ اختیار دے رہا ہے۔ فوج نے دلیل دی ہے کہ غیر ریاستی دہشت گرد گروہوں کی طرف سے پیش کردہ قومی سرحدوں سے ماوریٰ خطرے کے خلاف لڑتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ فوجداری انصاف کے قانونی تقاضے مناسب طور پر پورے نہ ہو سکتے ہوں۔ لہٰذا اس کو بدلنا پڑ سکتا ہے یا اس کے لیے جنگی ضابطہ کار کی مدد لی جا سکتی ہے تاکہ دہشت گردوں کو محدود حقوق دیئے جائیں۔

پاکستان میں ریاست نے دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے روایتی طور پر مقررہ فوری حل کے طریقوں، خصوصی ڈھانچوں اور قوانین پر انحصار کو ترجیح دی ہے جن میں منجملہ اور طریقوں کے درج ذیل قوانین شامل ہیں: انسداد دہشت گردی سرگرمیوں کے (خصوصی عدالتیں) ایکٹ 1975ء خصوصی عدالتیں برائے فوری مقدمات آرڈیننس 1987ء: دہشت گردی سے متاثرہ علاقہ جات (خصوصی عدالتیں) ایکٹ 1997ء: انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997ء: پاکستان آرمڈ فورسز (سول پاور کی امداد کے لیے کام کرنے) آرڈیننس 1998ء: انویسٹی گیشن فار فیئر ٹرائل ایکٹ مجریہ 2013ء اور تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء ان میں سے بیشتر قوانین میں مشترکہ کوششوں کو دیکھ کر اب لگتا ہے کہ وہ جج پروف ہیں۔ یعنی سب کو پکڑ لو تاکہ ریاست کے لیے ملزموں کو سزا دینا آسان ترین ہو جائے۔

گزشتہ برسوں میں پاکستان کو درون ملک سے اُٹھنے والے خطرات بھی درپیش رہے ہیں جو ملک کی قومی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ رہے ہیں۔ روز افزوں داخلی خطرات سے نپٹنے کے لیے مناسب توجہ نہیں دی جا سکی جس کی وجہ سے قانون نافذ کرنے والے سویلین اداروں کی صلاحیت کار میں اضافہ نہیں ہوا، نتیجتاً فوج اور فوج کی ذیلی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے استعمال پر زیادہ انحصار کرنا پڑا جو داخلی سکیورٹی اور تفتیشی ایجنسیوں کے فرنٹ کے طور پر کام کرتی رہیں۔ تاہم چونکہ پاکستان کے موجودہ قوانین میں فوج کے لیے ایسے کردار کے بارے میں تصور نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ان قوانین پر نظرثانی کر کے ایک

مناسب قانونی ڈھانچہ وضع کرتے ہوئے فوج کے عملی پولیسنگ اور تفتیشی کردار کو قانونی شکل عطا کی جائے۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997 ء جو دہشت گردی، فرقہ وارانہ تشدد اور سنگین جرائم کے مقدمات کی تیز رفتار سماعت کے لیے بنایا گیا تھا اور تشکیل شدہ انسداد دہشت گردی عدالتیں جو اینٹی ٹیررسٹ ایکٹ 1997ء کے تحت مقدمات کی فوری سماعت کے لیے بنائی گئی تھیں سپریم کورٹ نے محرم علی بنام وفاق کیس میں ان کی کئی دفعات کو اس لیے مسترد کر دیا کہ وہ دستور میں گارنٹی شدہ بنیادی حقوق سے متصادم تھیں اس طرح وہ خارج از اختیار قرار پائیں۔ پاکستان آرمڈ فورسز (سول پاور کی مدد کے لیے کام کرنا) آرڈیننس 1998ء کو بھی منافی دستور ہونے کی بنا پر چیلنج کیا گیا تھا جسے شیخ لیاقت حسین بنام وفاق کیس میں مسترد کر دیا گیا۔

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن (از سر نو تنظیم) ایکٹ 1996ء میں کہا گیا تھا کہ ''قومی سلامتی کے مفاد میں یا کسی جرم کے ارتکاب کے خدشے میں وفاقی حکومت کسی شخص یا اشخاص کو یہ اختیار دے سکتی ہے کہ وہ کالوں اور پیغامات کو روک لیں یا اپنے ٹیلی کمیونیکیشن نظام کے ذریعے ایسی کالوں کا سراغ لگالیں''۔ جبکہ انٹیلی جنس ایجنسیاں کئی عشروں سے بغیر کسی قانونی طریق کار کے لوگوں کے ٹیلی فون روکتی رہیں۔ فیئر ٹرائل ایکٹ مجریہ 2013ء کے تحت ایسے روکے ہوئے مواد کو تمام عدالتی کارروائیوں میں پہلی بار سماعت پذیر قرار دیا گیا اور اس کا حوالہ اس طور پر تھا ''جدید تفتیشی فنون مثلاً خفیہ نگرانی، انسانی سراغ رسانی، اثاثے میں مداخلت، فون پر کنسوئیاں لینا اور مواصلات کو روکنا اور اسے قانون نافذ کرنے اور انصاف مہیا کرنے کے لیے ناگزیر مدد قرار دے دیا گیا۔

قانون تحفظ پاکستان پر جو کلیدی اعتراضات کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

شہریوں پر متحارب دشمن کا لیبل لگانا اور ان سے اجنبیوں جیسا سلوک کرنا ایسا پولیس افسر جو بنیادی سکیل 15 سے کم کا نہ ہو۔ یا مسلح افواج یا سول آرمڈ فورسز کے ارکان کو کسی بھی ایسے شخص کو گولی مار دینے کا حق دیتا ہے جو ارتکاب جرم کر رہا ہو یا اس امر کا قوی امکان ہو کہ وہ شیڈول میں شامل کوئی سا جرم کرے گا اور ایسے کسی افسر کے لیے یہ امر بھی جائز قرار دیتا ہے کہ ایسے اقدام سے معقول خدشہ ہو کہ موت واقع ہو جائے گی یا شدید زخم آجائیگا وہ ایسے شخص پر فائر کر سکتا ہے یا فائر کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ وارنٹ کے بغیر تلاشی لینے یا گرفتار کرنے کا حق ایکٹ کا سیکشن 3(2)(C) قرار دیتا ہے کہ ''بالخصوص اور ذیلی شق (1) کی عمومیت سے بغیر تعصب کے کوئی پولیس افسر جو سکیل 15 سے کم کا نہ ہو، یا مسلح افواج یا سول آرمڈ فورسز کا ممبر یا سول آرمڈ فورسز کا ممبر مندرجہ بالا صورت حال میں بغیر وارنٹ کسی احاطے میں داخل ہو

سکتا ہے اور اس کے اندر تلاشی لے سکتا ہے، گرفتاری کر سکتا ہے، کسی بھی اسلحے دھماکہ خیز مواد گاڑی اوزار کسی جرم میں استعمال شدہ یا قابل استعمال چیز کو اپنے قبضے میں لے سکتا ہے۔ کچھ بتائے بغیر محتاط نگرانی کے ساتھ روک رکھنا اور قید کرنا (ایکٹ کی سیکشن 6 کسی بھی شخص کو قید کرنے کا اختیار دیتی ہے اگر حکومت کو یہ یقین کرنے کے لیے معقول بنیاد موجود ہو کہ وہ شخص ایسے طریقے سے عمل کر رہا ہے جس سے پاکستان یا اس کے کسی حصے کی سلامتی، تحفظ، دفاع پاکستان یا پاکستان کے بیرونی معاملات یا پبلک آرڈر یا سپلائی اور سروسز کو گزند پہنچے کا اندیشہ ہے) اور بار ثبوت کی تقلیب (Reversal) تحفظ پاکستان ایکٹ کی وہ سیکشن 15 یہ قیاس کرتی ہے کہ ایک ''دشمن اجنبی'' یا عسکریت پسند جس پر اس قانون میں شیڈولڈ جرائم کا الزام ہو یا ایسے جرم کی تیاری کرتے ہوئے گرفتار کیا جائے، پاکستان کے خلاف جنگ یا بغاوت کرنے میں مصروف تھا، سوائے اس کے کہ وہ اس جرم میں اپنے ملوث نہ ہونے کا ثبوت فراہم کر دے۔ مزید برآں ایسا شخص جسے ایک جرم کی تیاری کرتے ہوئے پکڑا جائے اور جس سے کوئی ہتھیار (جو قابل استعمال ہو اور ایسے جرم میں اسے سہولت ملتی ہو) برآمد ہوا سے ایسے جرم کی تیاری کا جرم قرار دیا جائے گا۔ اس لئے سیکشن 15 بار ثبوت کی تقلیب کر دیتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ وہ شخص اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ روکنے کے عمل کو تقویت دیتے ہوئے (تحفظ پاکستان ایکٹ کے شیڈول کی مد (1)(XIV) اب وضاحت کرتی ہے کہ سائیبر کرائمز، انٹرنیٹ جرائم اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلقہ دیگر جرائم ہیں جو اس ایکٹ کے تحت ہونے والے کسی بھی جرم کے ارتکاب میں سہولت دیتے ہیں۔ یہ جرائم اب تحفظ پاکستان ایکٹ کے تحت جرائم سمجھے جائیں گے۔ انوسٹی گیشن فار فیئر ٹرائل ایکٹ 2013ء اور تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء جاری کر کے اینٹی ٹیررازم ایکٹ 1997ء میں ترامیم متعارف کرا کر اس طریق کار کو قانونی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے جس میں پاکستان میں قانون نافذ کرکے اینٹی جنس اکٹھی کرنے اور تفتیش کرنے کے کام کو موثر بنا دیا گیا ہے خاص طور پر دہشت گردانہ سرگرمیوں کے خلاف کام کیا جا رہا ہے۔

اس بات پر کچھ بحث ہوتی رہی ہے کہ آیا دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے جنگ کا ضابطہ کار اختیار کیا جائے یا فوجداری قانون ہی استعمال کیا جائے۔ ان میں سے کوئی طریق کار بھی صحیح نہیں بیٹھتا۔ کیونکہ ایک طرف تو دشمن زیادہ تر شہریوں پر ہی مشتمل ہے اور دوسری جانب ایک مسلح ملیشیا ہے جو ملکی اور غیر ملکی سرپرستی میں بڑی مہارت کے ساتھ گوریلا جنگ کے طور طریقوں کو استعمال کر رہا ہے۔ پشاور کے واقعے سے قبل پاکستان دہشت گردی کے خلاف لڑنے کے لیے لے فوج کو سزا سے مامونیت (Impunity) دینے پر آمادہ نہیں تھا اس طرح فوج فوجداری انصاف کے ضابطہ کار کے اندر اپنے لئے ذرائع تلاش کر رہی تھی۔ مگر پشاور سکول پر

حملے کے بعد وہ کافی دکھائی نہ دیئے۔ اس حملے نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جس کے اندر عوامی جذبات کی رہنمائی کر کے ایک جنگی ضابطہ کار اختیار کرنا بہتر دکھائی دیا اور دہشت گردی کے معاملات میں فوجداری انصاف کے طریق کار کو مسترد کر دیا گیا۔

تین قوانین ترمیم شدہ اینٹی ٹیررازم ایکٹ پروٹیکشن آف پاکستان ایکٹ اور فیئر ٹرائل ایکٹ نے مل کر داخلی سکیورٹی، اینٹی جنس اور انوسٹی گیشن پر فوج کو کنٹرول دے دیا۔ ایڈ آف سول پاور ریگولیشنز برائے فاٹا اور پاٹا کے تحت کارروائی نے فوج کو انٹرنمنٹ کمیشن دیئے ہیں۔ اس میں حقیقی طور پر گمشدہ کڑی عدالتیں تھیں۔ لاپتہ افراد کے مقدمات پر توجہ مبذول ہو جانے سے فوج دہشت گردی کیسوں سے مطلوبہ نتائج کے حصول میں عدالتوں کو ایک رکاوٹ سمجھتی تھی۔ پشاور میں آرمی سکول پر حملے نے انتقام لینے کی خواہش کو بھڑکا دیا اور دستور، بنیادی حقوق اور جائز طریق کار (Due Process) اچانک عیاشی دکھائی دینے لگے کیونکہ غیر معمولی حالات میں پاکستان ان کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔

فوجی عدالتیں

فوجی عدالتیں فوج کو ناقابل تردید طور پر مرغوب ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتی ہے کہ یہ دہشت گردی کیخلاف لڑائی میں ایک محوری کردار رکھتی ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ دہشت گردی سے لڑنے کے لیے صف اول کی قومی ایجنسی ہیں اور فوجداری نظام انصاف کا مکمل کنٹرول اس لڑائی کو ان کے لیے زیادہ آسان بنا دے گا۔ فوج کو عدالتوں، تفتیش اور استغاثہ وغیرہ کے امور کی کوئی تربیت نہیں دی گئی ہوتی اور وہ دہشت انگیزی کے خلاف اعلان کردہ جنگ ک درمیان جا کر کوئی تربیت شروع نہیں کرنا چاہتی۔ فوج کی داخلی منطق یہ معلوم ہوتی ہے کہ دہشت گردوں سے لڑانے اور جھڑپوں کے دوران انہیں پکڑنے کے بعد اسے کسی اور ایجنسی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے کہ یہ لڑاکے خطاکار رہیں یا نہیں اور قانون کے اس جائز عمل سے لڑکوں کو کیوں فائدہ پہنچے یا ایسا امکان کیوں پیدا ہونے دیا جائے کہ وہ شہادت کی کمی کا فائدہ اُٹھا کر بھاگ جائیں۔

نواز شریف کی سویلین حکومت اور پارلیمنٹ میں نمائندگی رکھنے والی دوسری پارٹیاں اس بات پر آمادہ دکھائی دیتی ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف نیشنل ایکشن پلان کے ایک حصے کے طور پر ایک محدود عرصے کے لیے فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے۔ پشاور کے سکول پر حملے کے نتیجے میں فوج کے اندر اور عوام میں پائے جانے والے بے پناہ غصے کے پیش نظر سویلین سیاسی لیڈروں کو دہشت گردی کے خلاف لڑنے کے عزم کا کوئی غیر معمولی مظاہرہ کرنا ہوگا اس کے ساتھ ہی انہیں زمانہ جنگ کے لیڈر بننے کی اہلیت بھی دکھانی ہوگی۔ مشکوک دہشت گردوں پر مقدمے چلانے کے سلسلے میں ایک محدود عرصے کے لیے فوجی عدالتوں کے

قیام کے لیے اکیسویں ترمیم آچکی ہے۔ یہ ہماری سویلین اور فوجی لیڈروں کے مابین شادیٔ حکومت عملی (Marriage of Expediency) بن سکتی ہے۔سسرو نے کہا تھا ''زمانہ جنگ میں قانون کو چپ لگ جایا کرتی ہے''۔امریکی سپریم کورٹ نے مقدمہ بعنوان (Korematru (65 S.CT 193 V. United State نے یہ منطق دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانی امریکیوں کو نظر بندی کیمپ کے حوالے کرتے ہوئے ایک انتظامی حکم کی توثیق کرتے ہوئے استعمال کی۔تین ججوں نے اختلاف کیا۔جسٹس رابرٹ جیکسن نے روز دار موقف اختیار کیا کیونکہ انہوں نے ضرورت یا حکمت عملی کے نام پر دستور اور قانون کی حکمرانی کے تصور سے چھیڑ چھاڑ کے خطرے کو بے نقاب کیا: ''ایک فوجی حکم جواہ وہ کتنا ہی غیر آئینی ہو فوجی ایمرجنسی سے زیادہ عرصے تک برقرار رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔لیکن جب کبھی عدالتی رائے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ دستور کو مانتی ہے ایسے حکم کو درست ثابت کرتی ہے۔ بلکہ وہ کسی حد تک دستور کی تاویل کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتی ہے کہ دستور ایسے حکم کو جائز سمجھتا ہے۔اس طرح عدالت نے فوجداری مقامات میں نسلی امتیاز کے اُصول کو ہمیشہ کے لیے جائز ٹھہرایا ہے۔پھر اُصول ایک بارود بھرے ہتھیار کی طرح ہو جاتا ہے جو کسی حاکم کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ ہنگامی ضرورت کا بظاہر معقول دعویٰ سامنے لا سکتا ہے''۔

اگر 21 ویں آئینی ترمیم منظور ہو جاتی ہے۔(6 جنوری کو ملکی پارلیمنٹ نے 21 واں دستوری ترمیمی بل منظور کر لیا اور پاکستان آرمی (ترمیمی) بل 2015ء بلا مقابلہ منظور ہوا کیونکہ قومی اسمبلی کے 247 راکان اور سینٹ نے اس کی حمایت کی تھی۔اس کا مقصد دستور کے زیر تحفظ فوجی عدالتوں کا قیام تھا جو دہشت گردی کے مشتبہ سویلین افراد پر مقدمہ چلانے کی مجاز ہیں)۔تو ایسی فوجی عدالتیں قائم ہوں گی جو عدلیہ کی پر احتیاط نگرانی کی تابع نہیں ہوں گی۔اس امر کا قومی امکان ہے کہ اس ترمیم کو اس بنیاد پر سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے گا کہ یہ شہریوں کے بنیادی حقوق کو زنگ آلود کر رہی ہے اور اس بنیاد پر کہ خواہ پارلیمنٹ نے اسے دو تہائی اکثریت سے منظور کیا ہے،اس میں یہ قانونی استعداد نہیں ہے کہ وہ دستور کے بنیادی ڈھانچے ہی کو تبدیل کر دے۔(جونہی 21 ویں ترمیمی بل پر دستخط کر کے اسے قانون کی شکل دی گئی ایک شہری نے سپریم کورٹ میں سے بمعہ پاکستان آرمی (ترمیمی) ایکٹ کے چیلنج کر دیا) سپریم کورٹ سے کہا جائے گا کہ وہ انڈین سپریم کورٹ کے فیصلے کا اتباع کرے (اس نے وہ فیصلہ His Holiness Kesavenanda Bharati Sripadagalvaru and others versus State of Kerala and Anr. کیس میں دیا تھا۔سپریم کورٹ آف پاکستان میں چیلنج کرنے والے شہری کی طرف سے کہا جائے گا اگرچہ پارلیمنٹ کے پاس وسیع اختیارات ہیں وہ ہمارے دستور کی بنیادی خصوصیات کو برباد نہیں کر سکتی جیسا کہ

اس میں اختیارات کی علیحدگی اور عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس طرح سپریم کورٹ کا ترمیم کو ختم کرنے میں حوصلہ بڑھے گا اور وہ ایک خود مختار ستون ریاست کے طور پر اپنا جائز مقام پھر سے حاصل کرلے گی اور اپنا وقار بھی بحال کریگی۔

دستور پاکستان کا آرٹیکل 239 واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ (i) پارلیمنٹ کے اختیار پر کوئی قدغن نہیں کہ وہ دستور میں ترمیم کرے اور (ii) عدالت کو دستوری ترامیم کو دیئے گئے چیلنجوں کو ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے۔ بھارت کے بنیادی ڈھانچے والے اُصول کو اپنانے ہوئے سپریم کورٹ کو اس امر کی ضرورت پڑے گی کہ وہ دستوری تشریح کے بھیس میں آرٹیکل 239 کی غیر مبہم دفعات کو نظرانداز کردے، دستور میں اپنے عدالتی مفروضات داخل کردے جنہیں واضح الفاظ یا دفعات کا سہارا حاصل نہیں اور یہ اعلان کردے کہ ججوں کی مرضی کے انحصار میں سے برآمد ہونے والے الفاظ ہی منشائے دستور ہیں۔

اگر وہ بنیادی ڈھانچہ اُصول اختیار کرنے اور اس کا اطلاق کرنے کا راستہ لیتی ہے، جس کو اس نے گزشتہ چالیس برس میں بارہا مسترد کیا ہے تو سپریم کورٹ کم از کم تین قضیوں کی توثیق کررہی ہوگی۔ نمبر 1: وہ قانون ساز اسمبلی جس نے 1973ء کا دستور نافذ کیا وہ قادر مطلق تھی اور چند ایک دفعات جو اس نے دستور کے اندر داخل کیں خدائی اعلانات کی ہم سرشت (Akin) جن میں پارلیمنٹ کوئی ردوبدل نہیں کرسکتی۔ نمبر 2: 1973ء کا دستور ایک بے لچک دستاویز ہے اس کے چند پہلوؤں کو اس وقت بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا جب عوام اپنے چنیدہ نمائندوں کے ذریعے ان میں کوئی ردوبدل کرنا چاہتے ہوں اور نمبر 3: جب عدلیہ دستور کے الفاظ کی تشریح کرنے کے اختیارات خود دستور میں سے اخذ کرتی ہے تو اسے یہ اختیار بھی بالذات حاصل ہے کہ وہ دستور کی غیر دلچسپ دفعات کو نظرانداز کردے یا اپنی مرضی سے طے کردے کہ دستور کی بعض دفعات دوسری دفعات پر حاوی ہوں گی۔

سزائے موت کی بحالی اور پھانسیاں

سات سال کے ایک عارضی تعطل کے بعد حکومت نے دسمبر میں دہشت گردی سے متعلقہ جرائم کے لئے سزائے موت دوبارہ متعارف کرادی۔ یہ سلسلہ 16 دسمبر کو پشاور سکول پر حملے کے بعد شروع ہوا۔ سال کے اختتام تک سات افراد پھانسی چڑھ چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو سابق فوجی حکمران جنرل مشرف کو قتل کرنے کی کوشش کرنے اور فوجی تنصیبات پر حملے کرنے پر سزا ہوئی تھی۔ (مارچ 2015ء میں حکومت نے سزائے موت کے تمام کیسوں پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا جن میں اپیلوں اور رحم کی بنیاد پر معافی کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی)۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون اور یورپی یونین نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ سزائے موت پر اپنے عارضی تعطل کو بحال کردے جس کا اطلاق زنا کاری، ارتداد اور بے حرمتی مذہب جیسے جرائم پر بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ پاکستان میں بعض طبقے سزائے موت کے حامی تھے جن کا کہنا تھا کہ اس سے جرائم میں کمی آتی ہے۔ حقوق گروپوں مثلاً ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کا کہنا تھا کہ سولی کی طرف واپسی پاکستان کے سکیورٹی اور امن عامہ کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں دے گی۔ انہوں نے کہا کہ سزائے موت سزا کی ایک غیر موثر شکل ہے اور ملک کے نظام عدل کو ناجائز مقدمات، گھٹیا وکالت اور پولیس کی ایذاؤں نے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ملک میں 8000 سے زائد شہری موت کی قطار میں لگے سوکھ رہے ہیں۔ سزائے موت پانے والوں کی یہ تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن کی مطابق زیر جائزہ سال کے دوران 231 افراد (225 مرد اور 6 عورتیں) مختلف عدالتوں سے سزائے موت پا چکے ہیں۔

جابروں کا عروج

ریاستی اداروں کے اندر قانون کی حکمرانی کو بطور غیر منقسم قدر (Inalienable value) عموماً رضامندی سے قبول کرنے کے فقدان کے ساتھ ساتھ معاشرے میں رجعت پسندانہ رجحانات بڑھ رہے ہیں۔ جیسا کہ میڈیا نے رپورٹ دی ہے چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل محمد خان شیرانی نے بیان کیا ہے کہ مسلم فیملی لاآرڈی نینس کے تحت بچوں کی شادی کی ممانعت غیر اسلامی ہے۔ انہوں نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ دوسری (یا تیسری یا چوتھی) شادی کرنے سے قبل پہلی بیوی سے اجازت لینے کی ضرورت بھی غیر اسلامی ہے۔ اُنہوں نے یہ رائے بھی دی ہے کہ زنا بالجبر کے کیسوں میں فورنزک ڈی این اے ٹیسٹنگ پر مبنی شہادت کو ابتدائی شہادت کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تمام صورتوں میں رجعت پسندی کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا ناانصافی ہوگا کہ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل صنفی عدم مساوات کا محض ایک علمبردار ہے۔

چیئرمین نظریاتی کونسل کی سوچ پاکستان میں مذہبی افکار کے بحران کی غمازی کرتی ہے۔ یہ تقسیم محض روایت کے مطلق تحفظ کے علمبرداروں اور ترقی پسندانہ تبدیلی کی وکالت کرنے والوں کے مابین، یا مذہب کی طرف سے کم سے کم دھیان دینے کی وکالت کرنے والوں اور ریاست کی طرف سے زیادہ سے زیادہ مذہب کے نفاذ کی خواہش رکھنے والوں کے مابین، یا مذہبی متن کی بے لچک تشکیل بمقابلہ سیاق وسباق کے مطابق تشکیل کے علمبرداروں کے مابین نہیں ہے۔ اصل مسئلہ جابروں کے عروج کا ہے جو مذہبی متون کی فہم پر اجارہ داری کا دعویٰ رکھتے ہیں اور معقول اور فہمیدہ لوگوں کے لئے کوئی سیاسی اور سماجی میدان نہیں چھوڑنا چاہتے جہاں وہ مذہبی عقائد سے متعلقہ معاملات پر بحث یا اظہار خیال کرسکتے ہوں۔

1990ء سے شروع کیا جائے تو اسلام آباد میں قائم ادارہ سنٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز(CRSS) کے مطابق پاکستانی نظام انصاف سے باہر توہین مذہب سے متعلقہ کیسوں میں کم از کم 60افراد قتل ہوئے۔اس فہرست میں وکلاء، مبینہ طور پر مذہب کی توہین کرنے والے اور حتیٰ کہ وہ سیاستدان بھی شامل تھے جو اس قانون میں ترمیم کی حمایت کررہے تھے۔ جبکہ مذہب سے متعلقہ پاکستان کے قوانین کا اہم حصہ 1860ء میں برطانوی حکمرانی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔فوجی حکمران ضیاء الحق نے 1970ء کی دہائی اور 1980 کی دہائی کے آخری حصوں میں تبدیلیوں کی بھرمار کردی۔ اس کے نتیجے میں جہاں پہلے 1851ء سے لے کر 1947ء تک توہین مذہب کے سات مقدمے درج ہوئے، CRSS کے مطابق 1977ء سے 2012ء تک اس مد میں 327 مقامات درج کئے گئے۔

جابروں کے عروج کے باعث توہین مذہب کا غلط استعمال روکنے کے لیے ان قوانین کی اصلاح کی کوئی بات کرنے کو بجائے خود ایک توہین کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔اس رویے کا شکار دبنے والوں میں سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر اور سابق وفاقی وزیر شہباز بھٹی بھی شامل تھے۔جب مذہبی سکالر جاوید غامدی نے سلمان تاثیر کے قتل (جو اپنے گارڈ کے ہاتھوں اس لئے مارا گیا کہ اس نے توہین مذہب کے قانون کی زد میں آنے والی ایک عیسائی عورت آسیہ بی بی کی حمایت میں بات کی تھی) کے سلسلے میں گفتگو کی تو انہیں بم کے حملے کی دھمکی ملی جس پر انہیں اپنی فیملی سمیت ملک سے فرار ہونا پڑا۔1998 میں فیصل آباد کے بشپ ڈان جان جوزف نے خود کو عدالت کے باہر گولی مارلی۔وہ عیسائیوں کو توہین مذہب کے نفاذ کے نام پر ایذائیں پہنچانے کے واقعات پر احتجاج کررہے تھے۔

جج پرویز علی شاہ جس نے ممتاز قادری کو گورنر سلمان تاثیر کے قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی تھی، اس کے ''جلاوطن'' کر کے سعودی عرب بھیج دیا گیا ہے تاکہ اس کی زندگی بچائی جاسکے۔1996ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس عارف بھٹی کو ان کے چیمبر میں گولی ماردی گئی کیونکہ اُنہوں نے توہین مذہب کے 11 سالہ ملزم کو رہا کردیا تھا۔دریں اثنا آسیہ بی بی کی اپیل کی سماعت کے بعد (جس کے مقدمے کو گورنر سلمان تاثیر کے قتل کے حوالے سے بہت شہرت حاصل ہوگئی تھی اسے ایک ٹرائل کورٹ نے توہین مذہب کے الزام میں چار سال پہلے سزائے موت سنائی تھی) لاہور ہائی کورٹ نے اس کی سزا کی توثیق کردی۔

انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کی وجہ سے شہرت یافتہ وکیل راشد رحمان کو عدالت کے اندر بتایا گیا کہ اس نے توہین مذہب کے ایک ملزم کی جو وکالت قبول کی ہے اس پر اسے قتل کردیا جائے گا پھر اسے ملتان میں اس کے دفتر کے اندر گولی مار کر قتل کردیا گیا۔

جولائی میں احمدیہ کمیونٹی کی تین ممبر خواتین کو جن میں دو نابالغ تھیں قتل اور آٹھ دیگر کو شدید زخمی کر دیا گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب مبینہ توہین مذہب پر ایک مشتعل ہجوم نے حملہ کر کے پانچ گھروں، ایک سٹور یج بلڈنگ اور متعدد گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا۔ قتل ہونے والیوں میں ایک 55 سالہ خاتون بشیراں، ایک نابالغ لڑکی کائنات اور ایک سات سالہ لڑکی حرا شامل تھی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ معاملہ اسی طرح شروع ہوا کہ ایک احمدی نوجوان نے فیس بک پر توہین مذہب پر مبنی مواد پوسٹ کر دیا تھا۔

لاہور ہائی کورٹ ملتان بنچ نے نومبر 2014ء میں مذہبی بنیاد پر شیری رحمان کے خلاف مقدمہ بحال کر دیا اور جوڈیشل مجسٹریٹ نے اس مقدمے کو مسترد کر دیا تھا۔

مذہب سے متعلقہ جرائم

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی تحقیق کے مطابق سال کے دوران تعزیرات پاکستان کے باب xv کے تحت مذہب کے حوالے سے 37 مقدمات درج ہوئے۔ سات مقدمات کا زیر دفعہ 295-C اندراج ہوا۔ اس دفعہ کے تحت مقدمہ ثابت ہونے پر سزائے موت مقرر ہے۔ باب xv تعزیرات پاکستان جرائم یہ ہیں۔

نمبر شمار	دفعہ	جرم	زیادہ سے زیادہ سزا
1	295	عبادت گاہ کی بے حرمتی کرنا	2 سال قید یا جرمانہ یا دونوں
2	295-A	معاوندانہ اقدامات جو مذہبی احساسات کو مجروح کرتے ہوں	2 سال قید یا جرمانہ یا دونوں
3	295-B	ایک قرآنی نسخے کی بے حرمتی کرنا	صرف ایک سزا عمر قید
4	295-C	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں توہین آمیز جملے بولنا	واجب التعمیل سزائے موت
5	296	مذہبی اجتماع کو منتشر کرنا	ایک سال قید، یا جرمانہ، یا دونوں
6	297	جائے تدفین میں مداخلت بے جا	ایک سال قید، یا جرمانہ، یا دونوں
7	298	ایسے الفاظ کی ادائیگی یا اشارہ جس سے مذہبی احساسات مجروح ہوتے ہوں	ایک سال قید، یا جرمانہ، یا دونوں
8	298-A	مقدس شخصیات کے بارے میں ہتک آمیز ریمارکس	3 سال قید، یا جرمانہ، یا دونوں
9	298-B	مقدس شخصیات یا مقامات کے لیے مخصوص القابات کا غلط استعمال	3 سال قید اور جرمانہ
10	298-C	احمدیوں کے مذہب کی تبلیغ	3 سال قید اور جرمانہ

مسلمانوں کے خلاف 24 مقدمات درج کئے گئے۔ ان میں سے چھ مقدمے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295C کے تحت درج ہوئے۔ اس ذخیرۂ معلومات (Data) میں 600 سے زائد مقدمات شامل نہیں۔ مختلف مقامات پر کسی ایک یا زائد پر بہت سے مقدمات درج کئے گئے جن کے بارے میں شکایات پیش کرنے والوں کو یقین تھا کہ وہ مخصوص میڈیا چینلز کی طرف سے معاصر چینلز کے سٹاف کے خلاف کام کر رہے تھے۔

2014 میں مذہبی بنیاد پر مسلمانوں کے خلاف مقدمات

نمبر شمار	نام	صوبہ	ضلع/شہر	ایف آئی آر نمبر بتاریخ	زیر دفعہ	تھانہ	تاریخ	الزام لگایا گیا	گرفتاری/جیل
1	اشرف	پنجاب	سیالکوٹ		295-B	ہری پور	یکم جنوری 2014	قرآن مجید نذر آتش	گرفتار کرلیا گیا
2	اعظم خان	سندھ	کراچی			بلدیہ ٹاؤن	اپریل 2014	فیس بک پر توہین آمیز سکیچ بنایا	گرفتار کرلیا گیا
3	نامعلوم	پنجاب	قصور		295-B	مصطفیٰ آباد		قرآن کی توہین کی گئی	-
4	علی	پنجاب	فیصل آباد	مئی 2014	295-B	غلام محمد آباد	مئی 2014	قرآن کی توہین کی	گرفتار کرلیا گیا
5	غلام اکبر	پنجاب	وہاڑی		295-C		6-5-14	بنوت کا دعویٰ کیا	گرفتار کرلیا گیا
6	وکلاء کے خلاف مقدمہ 8 نامزد 60 نامعلوم	پنجاب	جھنگ	492/14 13-15 2014	298-A	کوتوالی	13-5-14	حضرت عمرؓ کے خلاف نعرے لگائے لیکن ناموں کے بارے میں غلط فہمی رہی۔	
7	شاہد علی	پنجاب	عارف والا		295-B	شہر		قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی	گرفتار کرلیا گیا
8	میاں بیوی مع دیگر 2	سندھ	میرپور خاص			ریلوے سٹیشن		مذہبی جذبات مجروح کئے گئے	گرفتار کرلیا گیا
9	ایم شہباز	پنجاب	ننکانہ		298-A			صحابہ کرامؓ کے خلاف بے ہودہ الفاظ استعمال کئے گئے	گرفتار کرلیا گیا

10	مرادالرحمان	سندھ	کراچی		295-C			توہین مذہب پر مبنی ای میل بھیجی	گرفتار کرلیا گیا
11	اظہر عباس شفقت رضا	پنجاب	میلسی	مئی 2014	298-C	شہر	28-5-2014	صحابہ کرامؓ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے	
12	یاسر محمود	پنجاب	لالہ موسیٰ	جون 2014	295-B		جون 2014	قرآن کی بے حرمتی کی	گرفتار کرلیا گیا
13	مظہر علی شاہ	سندھ	نوشہرو فیروز	4/14	295-B	تگر	جون 2014	قرآن کی بے حرمتی کی	گرفتار کرلیا گیا
14	صدیق بلوچ	پنجاب	چشتیاں	جولائی 2014	295-B	شہر	جون 2014	قرآن کی بے حرمتی کی	
15	ایم بلال	پنجاب	لاہور	اپریل 2014	295-B	نصیر آباد	اپریل 2014	قرآن مجید کی بے حرمتی کی	گرفتار کرلیا گیا 23-08-14 کو ضمانت سے انکار ہو گیا
16	تنویر احمد	پنجاب	ٹوبہ ٹیک سنگھ	اکتوبر 2014	295-B	شہر	اکتوبر 2014	قرآن مجید کے اوراق جلائے گئے	گرفتار ہو گیا
17	عالم	پنجاب	جھنگ		295-A	کوتوالی		صحابہ کرامؓ کی توہین کی گئی	
18	طاہر	پنجاب	جڑانوالہ	نومبر 2014	295-C	شہر	نومبر 2014	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں توہین آمیز الفاظ ادا کیے	
19	منظور	پنجاب	منچن آباد			میکلوڈ گنج	نومبر 2014	قرآن مجید کی توہین کی	گرفتار کرلیا گیا
20	غلام یاسین	پنجاب	جلال پور پیروالا	نومبر 2014	298-A	شہر	نومبر 2014	صحابی ہونے کا دعویٰ کیا	گرفتار کیا گیا، نشتر ہسپتال میں مرا جہاں اسے بغرض علاج جیل سے پہنچایا گیا تھا
21		پنجاب	چکوال	نومبر 2014			نومبر 2014		

22	پروفیسر حفیظ طاہر	پنجاب	اٹک	نومبر 2014	295-C		نومبر 2014	کلاس میں لیکچر کے دوران مذہب کے لیے توہین آمیز الفاظ استعمال کیے	
23	جنید جمشید	سندھ	کراچی	23-4-14	295-C 298-A	رسالہ		توہین آمیز الفاظ استعمال کیے	
24	نذیر	پنجاب	لاہور،سندر	722-14 دسمبر 2014	295-C	سندر	دسمبر	توہین آمیز ایس ایم ایس بھیجا	

اقلیتیں

نومبر میں دو پاکستانی مسیحیوں 26 سالہ شہزاد اور 24 شمع کو کوٹ رادھا کشن کی اینٹوں کے بھٹے میں جلا کر کوئلے کے ٹکڑوں کی طرح کر دیا گیا۔ وہ اسی بھٹے میں کام کرتے تھے۔ ان پر مقامی مسجد کے مردم آزار منبر پر سے توہین مذہب کا الزام لگایا تھا۔ جس پر ان کے ہمراہ کام کرنے والے گاؤں کے لوگوں نے مشتعل ہو کر دونوں کو بھٹے کے اندر دھکیل دیا۔ وزیر اعلیٰ نواز شریف نے مبینہ طور پر اس واقعے کا ''سخت'' نوٹس لیا جیسا کہ اُنہوں نے 2009ء میں گوجرہ کے فسادات کے بعد لیا تھا ان فسادات میں آٹھ پاکستانی مسیحیوں کی جانیں ضائع ہوگئیں اور لاہور میں جوزف کالونی پر حملے کے بعد بھی نوٹس لیا تھا۔ جہاں 150 گھر اور دو کلیسا نذر آتش کر دیئے گئے۔(یہ واقعات بھی توہین مذہب کے الزام کے شاخسانہ تھے)۔ 2013ء میں ایک مسیحی ساون مسیح پر توہین مذہب کے الزامات لگنے کے بعد 3000 سے زائد حملہ آوروں نے کالونی میں تباہی و بربادی پھیلا دی۔

ساون مسیح کو مارچ 2014ء میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس نے اپنی سزا کے خلاف اپیل کی جس میں اس نے کہا کہ یہ من گھڑت الزامات اس لئے لگائے گئے کہ عیسائیوں کو اس علاقے سے جلد از جلد بے دخل کیا جاسکے۔ پولیس نے ابتداء کہا تھا کہ وہ اس امر کی تفتیش کرے گی کہ کیا علاقے کے تاجروں نے زمین پر قبضے کے لئے ایسا کیا ہے یا توہین مذہب کے الزامات کسی سیاسی فائدے کے لیے لگائے گئے ہیں۔ مگر پولیس نے ایسا نہ کیا اور بیشتر بلوائیوں کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے ردعمل میں ایمنسٹی انٹرنیشنل (AI) کے حقوق گروپ نے ساون مسیح کو سزائے موت دینے کی شدید مذمت کی۔ ''یہ انصاف کے ساتھ ایک مذاق

ہے،اس کے مقدمے کے جواز کے بارے میں شدید تشویش پائی جاتی ہے۔ دو دوستوں کے درمیان دلیل بازی کو کسی کو سولی چڑھانے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ ساون مسیح کو فوراً اور غیر مشروط طور پر رہا کردیا جانا چاہیے''۔یہ بات ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ڈپٹی ایشا پیسفک ڈائریکٹر ڈیوڈ گریفتھس نے ایک بیان میں کہی۔اگرچہ (بلوے) کے درجنوں مشکوک مرتکبین پر فرد جرم عائد کردی گئی ہے،ابھی تک کوئی بھی سزایاب نہیں ہوسکا۔ایمنسٹی انٹرنیشنل اور حقوق کے دیگر تفتیش کاروں کے مطابق ایک بلوے کو اس امر کی اجازت نہیں ملنی چاہیے تھی کہ وہ لاہور کی قدیم ترین مسیحی بستی کو بالکل تباہ کرڈالتا''۔گریفتھس نے کہا''قانون کے تحت ساون مسیح کے ساتھ پرتشدد سلوک ایک مرتح تضاد کا مظہر ہے۔لوگوں کے گھروں کو جلانے والوں کو اب تک کٹہرے میں نہیں کھڑا کیا گیا۔یہ مسیحیوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کے ساتھ توہین مذہب کے قوانین کے ذریعے امتیازی سلوک پر روشنی ڈالتا ہے اور عمومی طور پر پاکستان کے نظام انصاف کو بے نقاب کرتا ہے''۔جنوری میں ایک معمر برطانوی کو توہین مذہب کے الزام میں سزائے موت دے دی گئی۔اگرچہ اس کے وکلا نے یہ کہا کہ عدالت اس کی ذہنی علالت کے متعلق ''غالب'' شہادت پر غور کرنے میں ناکام رہی۔2010ء میں محمد اصغر کو جیل میں ڈال دیا گیا۔اس لئے کہ اس کا ناراض کرایہ دار جو اس کی جائیداد میں رہتا تھا مبینہ طور پر محمد اصغر کے لکھے ہوئے اور غیر فرستادہ (Unsent) خطوط لے کر تھانے پہنچا جن میں اس نے ایک پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

امریکہ میں مقیم ایک ماہر امراض قلب ڈاکٹر مہدی قمر جو ایک ہفتے کے لیے پاکستان کے دورے پر گیا تھا۔اسے مئی 2014ء میں ربوہ میں دس بار گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا۔ڈاکٹر قمر احمدی تھا۔شیعہ ایک اور زد پذیر مذہبی اقلیت ہیں۔مئی 2014ء میں ڈاکٹر فیصل منظور کو حسن ابدال میں اس کے کلینک کے باہر گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔وہ شیعہ تھا۔شیعوں پر بالخصوص کوئٹہ میں ہزارہ سے متعلقہ لوگوں پر حملوں کی بے شمار کہانیاں موجود ہیں۔ریاست کی طرف سے دہشت گرد گروپوں مثلاً لشکر جھنگوی جیسے گروپوں کو باز رکھنے یا نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی منظّم کوشش نہیں ہوئی۔یہ گروہ فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے میں اور فرقہ وارانہ قتل کے واقعات کی عمومی طور پر ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔محسوس ہوتا ہے کہ بد قسمتی سے پاکستان میں لوگوں کی اکثریت نے یہ بات قبول کر لی ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے قوت کے استعمال پر یقین رکھنے والوں (Hardliners) کے ہاتھوں قتل ہوسکتا ہے۔

مسیحیوں کے خلاف پانچ مقدمات درج ہوئے۔ ان میں سے ایک تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت درج ہوا ہے۔

2014ء میں مذہبی بنیاد پر مسیحیوں کیخلاف مقدمات

اتنی ہی تعداد میں احمدیوں کیخلاف مقدمات درج ہوئے۔ ان میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے تحت کوئی مقدمہ نہیں ہوا۔

نمبر شمار	نام	صوبہ	ضلع/شہر	ایف آئی آر نمبر بتاریخ	زیر دفعہ تعزیرات پاکستان	تھانہ	تاریخ واردات	مبینہ الزام	گرفتاری جیل
1	قیصر ایوب	پنجاب	چکوال	جون 2011	295-C		جون 2011	پیغمبرؐ کے بارے میں توہین آمیز ریماکس	لاہور سے نومبر 2014 میں گرفتار ہوا
2	جاوید مسیح انندلال	پنجاب	بہاولپور	487/14	295-B	بغداد الجدید	28-08-14	قرآن چلایا	ضمانت ہوگئی
3	نذیر مسیح	پنجاب	بہاولپور	404-A 23-8-14	295-A	سول لائنز	23-08-14	لوط کی توہین کی	ضمانت ہوگئی
4	بشیر مسیح	پنجاب	سرگودھا	422/14 اکتوبر 2014	295-B			قرآن کی توہین کی	
5	پاسٹر عارف اور دس دیگر افراد	دارالحکومت اسلام آباد	596/14 دسمبر 12 2014	295-B	295-B		22-12-14	قرآن جلایا	

مذہبی بنیاد پر احمدیوں کے خلاف مقدمات

دو مقدمات ہندوؤں کے خلاف درج ہوئے۔ ان میں سے کوئی بھی زیر دفعہ 295-C تعزیرات پاکستان درج نہیں ہوا۔

نمبر شمار	نام	صوبہ	ضلع/شہر	ایف آئی آر نمبر/تاریخ	تھانہ	تاریخ واردات	مبینہ الزام	قید/جیل
1	ایم ادریس عباس ایم خان	سندھ	بدین ٹنڈو باگو	298-B 298-C			عبادت گاہ کو مسجد قرار دینا	ضمانت ہوگئی

2	طاہر احمد خالد	سندھ	ٹنڈو اللہ یار	295-C 63/2014 31مارچ 2014	تھانہ ٹنڈو اللہ یار	مارچ2014	قرآن مجید کی توہین	
3	ایم یار وہاب الحسن	پنجاب	اوکاڑہ	298-C 224/14 31مارچ2014	حویلی لکھا		تبلیغ	
4	خلیل احمد غلام احمد احسن احمد مبشر احمد	پنجاب	شرقپور	295-A 12مئی2014	شرقپور		ایک اشتہار کے خلاف احتجاج کیا	گرفتار کر لیا گیا
5	مبشر احمد خالد احمد جاوید احمد	پنجاب	گوجرانوالہ	298-C 547-14 2جون2014			تبلیغ	گرفتار کر لیا گیا
6	عاقب	پنجاب	گوجرانوالہ	295-A 553-14 28جون2014	پیپلز کالونی		قابل اعتراض میسج فارورڈ کیا	

2014ء میں مذہبی بنیاد پر ہندوؤں کے خلاف مقدمات

نمبر شمار	نام	ضلع / شہر	تعزیرات پاکستان کی دفعہ	مبینہ الزام	ریمارک / جیل
1	ویرگی کوہلی نصیب کوہلی	بدین	295-A	مذہبی جذبات مجروح کئے	گرفتار کر لیا گیا
2	نام کی تصدیق نہیں ہوئی	جیکب آباد	295-B	مقدس صفحات کی توہین کی	معلوم نہیں ہو سکا

زیر جائزہ سال کے دوران عدالتوں نے توہین مذہب پر تین افراد کو سزائے موت، چھ افراد کو عمر قید اور تین افراد کو دو سال قید کی سزا سنائی۔ ایک کو بری کر دیا گیا۔ ماہ نومبر میں ایک پاکستانی نژاد برطانوی قومیت کے حامل شخص کو جس نے توہین مذہب کے الزام میں کراچی جیل میں پانچ سال قید بھگتی تھی، اعلیٰ عدالت نے اسے ضمانت پر رہا کر دیا۔

''ہم یہ کہنے پر اپنے آپ کو مائل سمجھتے ہیں کہ درخواست دہندہ (ملزم) کیس کے اس سٹیج پر مستحق ضمانت ہے، نہ صرف اس لئے کہ اس کو اپنی طبی حالت پر ایک ماہر خصوصی کی مدد درکار ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے مقدمے کی کارروائی میں تاخیر واقع ہونا ہماری نظر میں بے جا اور غیر منصفانہ ہے۔ اس لئے اس پٹیشن کو

اپیل میں تبدیل کرتے ہوئے ضمانت منظور کی جاتی ہے‘‘۔ یہ بات سپریم کورٹ نے اپنے چار صفحات پر مشتمل فیصلے میں کہی جیسا کہ میڈیا نے اسے نشر کیا ہے۔

22 مئی کو سندھ ہائی کورٹ نے رحمان کو توہین مذہب کے مقدمے میں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ مقدمہ 18 جولائی 2009ء کو کراچی کے تھانہ گذری میں درج ہوا تھا۔ ایڈیشنل پراسیکیوٹر جنرل سندھ سلیم اختر کے مطابق ملزم کے خلاف یہ مقدمہ صحافی انصار عباسی مبینہ توہین مذہب کی حامل ای میل وصول کرنے کے بعد درج کرایا تھا۔ ملزم پر فرد جرم 3 جون 2010ء کو عائد کی گئی مگر مقدمے کوئی قابل ذکر پیشرفت دیکھنے میں نہ آسکی۔ اعلیٰ عدالت نے اپنے حکم میں اظہار رنج کرتے ہوئے کہا کہ درخواست دہندہ بغیر تعین جرم پہلے ہی پانچ سال سے زائد عرصہ جیل میں گزار چکا ہے۔

سزائیں/بریت

نمبر شمار	نام	صوبہ	ضلع/شہر	ایف آئی آر نمبر تاریخ	زیر دفعہ تعریزات پاکستان	تھانہ	تاریخ واردات	مبینہ الزام	گرفتاری/جیل
1	ایم اصغر	پنجاب	راولپنڈی	ستمبر 2010	295-C	صادق آباد	22-9-2010	نبوت کا دعویٰ کر دیا	سزائے موت بتاریخ 23-02-14
2	حسین رضا شاہ	پنجاب	پاکپتن		295-B	احمد یار	2013	قرآن مجید جلایا	عمر قید بتاریخ 08-02-2014
3	ساون	پنجاب	لاہور	112-13 08-03-2013	295-C	بادامی باغ	مارچ 8-3-2014	پیغمبرؐ کے بارے میں توہین الفاظ کہے	سزائے موت 27-03-2014
4	شفیق	پنجاب	لاہور		295-B	شاد باغ	2012	قرآنی صفحات کی توہین کی	عمر قید 27-03-2014
5	جلال چانڈیو	سندھ	شہداد پور		295-B			قرآن مجید کی بے حرمتی کی	عمر قید 02-04-2014
6	عمار شفقت	لاہور							بری کر دیا گیا

7	ملک محمد فاروق	کراچی			295-C			ایسا پرچم پھاڑا جس پر نبی اکرمؐ کا نام اور کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا	عمر قید سنا دی گئی 08-05-14
8	عبدالصمد	لاہور			295-B			قرآن مجید جلا دیا	عمر قید مئی 2014
9	غلام عباس	سیالکوٹ			295-B			قرآنی اوراق جلائے	عمر قید 16 ستمبر 2012
10	ذوالفقار	لاہور			295-C			دیواروں پر توہین مذہب کے نعرے لکھے	سزائے موت 14-07-2014
11	عسکری شاہ	بھکر			295-A			ایس ایم ایس کے ذریعے مذہبی جذبات مجروح کیے	دو سال قید
12	شہباز	ٹنڈو آدم						صحابہ کرام کے بارے میں توہین آمیز الفاظ ایس ایم ایس کے ذریعے بھیجے	تین سال قید بتاریخ دسمبر 2014
13	محمد قاسم	سرگودھا			298-C			تبلیغ کی	2 سال قید

خواتین

مئی 2014ء میں تین ماہ کی حاملہ 25 سالہ خاتون فرزانہ پروین کو لاہور ہائی کورٹ کے باہر اس کے والد، بھائی اور ان کے دیگر ساتھیوں نے لوگوں کے بھرے مجمعے میں خاندانی وقار کے نام پر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ فرزانہ نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی رشتہ داروں پر یہ انکشاف ایوان عدل کے بالکل باہر ہوا اور اس کا لرزہ خیز قتل فوجداری نظام انصاف کا منہ چڑا رہا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ نے 1990 کی دہائی میں رولنگ دی تھی کہ جو عورتیں کسی کے ساتھ اپنی مرضی سے شادی کر کے اپنے والدین کی رسوائی کا باعث بنتی ہیں عدالت کی

ہمدردی کا کوئی استحقاق نہیں رکھتیں۔ نومبر میں ایک انسداد دہشت گردی عدالت نے فرازنہ کے قتل کے چار ملزموں کو سزائے موت سنائی تھی جن میں مقتولہ کا والد اور بھائی بھی شامل تھے۔ بعض اندازوں کے مطابق 2008ء سے پاکستان میں 3000 سے زائد عورتیں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل ہوئیں۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق ہر دو گھنٹوں میں ایک عورت زنا بالجبر اور ہر آٹھ گھنٹوں میں اجتماعی آبروریزی کا شکار بنتی ہے۔ مگر عدالتی نظام انہیں مایوس کر دیتا ہے۔ نچلی عدلیہ میں جنسی جرائم کے بہت سے مقدمات فائل کیے گئے ہیں مگر صرف چند ایک میں ہی سزا یابی ہو سکی ہے۔

تنظیم وار اگینسٹ ریپ کے ایک متحرک رضا کار کے مطابق پاکستان میں صرف چار فیصد مقدمات میں سزا ہوتی ہے۔ حقوق کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ زیادہ تر ریپ کرنے والے سزا سے اس لئے بچ جاتے ہیں کہ پولیس جوڑ توڑ میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جج ریپ کی شکار لڑکیوں کے بارے میں شک میں پڑ جاتے ہیں اس طرح وہ تفتیش میں بڑی بڑی خامیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فورنزک تجزیوں کے لیے وسائل کم ہیں اور ریپ کے قوانین کے بارے میں الجھاؤ پایا جاتا ہے۔

پاکستان کے نظام قانون میں خواتین ججوں یا ایسے مرد ججوں کی کمی ہے جو صنف اور زنا بالجبر کے بارے میں غیر معمولی حساسیت رکھتے ہوں اور ایسے پروگرام بھی موجود نہیں ہیں جن میں جبر کا شکار ہونے والی خواتین کے گواہی کے لیے پیش ہونے پر ان کو درکار تحفظ دے۔ بعض جج اب بھی عورت پر الزام دھرنا ایک آسان کام سمجھتے ہیں۔ ریپ کو ثابت کرنا کوئی آسان چیز نہیں بلکہ آسانیوں سے بہت دور ہے۔ وکیل صفائی فوراً کہہ ڈالتا ہے کہ یہ کام باہمی رضامندی سے ہوا ہے۔ بیشتر ماہرین کا کہنا ہے کہ سارے نظام کو متاثر کرنے والی خامیوں اور ثقافتی رویوں میں جو ریپ کی شکار ہونے والی لڑکی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں (نہ کہ اسے محفوظ رہنے کی ہمت دلاتے ہیں) یہ وہ ریپ کے مقدمات کی عوامی نوعیت ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مقدمے بہت جارحانہ اور رسوا کن ہوتے ہیں۔ اور اس امر کا ایک بڑا سبب ہوتے ہیں کہ شکار ہونے والی عورت اپنے الزامات سے دستبردار ہونے ہی میں عافیت سمجھتی ہے۔ اگرچہ الزامات سے دستبرداری کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ایک ناقابل راضی نامہ جرم کا خاتمہ ہو جائے جو کہ زنا بالجبر ہے۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے ایک منطقی انجام تک پہنچائے۔

2006 میں ملٹری ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے دور میں ایک ماقبل اخراج (Previous Exclusion) کے بعد زنا بالجبر کو دوبارہ مجموعہ تعزیرات میں شامل کر دیا گیا۔ جس کے مطابق مقدمہ فورنزک شہادت کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے اور ایسی عورتوں کے خلاف زنا کے مقدمات چلانے کا طریق کار جو بالجبر ہو

ثابت نہ کر سکیں اس کی خاص طور پر ممانعت کر دی گئی تھی۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں نے اس قانون کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے ایک آغاز قرار دیا تھا۔ مگر اسے گاہے گاہے ہی نافذ کیا جاتا ہے۔ نیز فورنزک تجزیے کے لیے وسائل بھی کم ہیں۔

پاکستان مسلم لیگ ن کی رکن قومی اسمبلی شائستہ ملک نے زنا بالجبر کے قوانین میں ترمیم کے لئے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا ہے جس میں مجرموں کو سخت سزا دینے، ان مقدمات کی مناسب تفتیش، کرپٹ ااور نافرض شناس پولیس افسروں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا ہے جو ناقص تفتیش کرتے ہیں اور زنا بالجبر کا نشانہ بننے والی خواتین کو تحفظ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے پہلے 2014ء کے اوائل میں اس طرح کا ایک بل پاکستان پیپلز پارٹی کی سینیٹر سیدہ صغریٰ امام نے سینٹ میں پیش کیا تھا جس میں تعزیرات پاکستان، ضابطہ فوجداری اور قانون شہادات ایکٹ میں ترمیم کر کے ان کے اسقام دور کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ صغریٰ امام نے سٹینڈنگ کمیٹی برائے قانون و انصاف کو بتایا کہ پچھلے پانچ برسوں میں انسداد زنا بالجبر کے قوانین میں موجود خامیوں کی وجہ سے ایک ملزم کو بھی سزا نہیں مل سکی۔

مقدمات کی بہت بڑی تعداد میں یا تو واپس لے لئے جاتے ہیں یا ان میں صلح کرنی پڑ جاتی ہے۔ تاہم 2014ء کے اوائل میں جسٹس اکرام اللہ خان آف پشاور ہائی کورٹ نے زنا بالجبر کے ملزم کی درخواست ضمانت مسترد کر دی، اگرچہ سات سالہ بچی کے والدین مصالحت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جسٹس خان نے اس موقع پر ایک نیوز رپورٹ کے مطابق کہا "ملزم دونوں فریقوں کے مابین راضی نامے کے باوجود ضمانت پر رہائی کا مستحق نہیں ہے کیونکہ اس قماش کے لوگ دوسروں کے مستقبل کے ساتھ کھیلتے ہیں"۔

عدم برداشت

ہمارے اندر عدم برداشت بڑھنے کی کئی اسباب ہیں لیکن نظام انصاف میں نہاں برمحل اسباب دو ہیں نمبر 1: اگر انصاف دینے والے رسمی قانون کے طریق کار پر اعتماد کم ہو جانے تو ناانصافی کی زد میں آنے والے اپنی مدد آپ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس طرح جو جگہ انصاف نے پُر کر رکھی ہوتی ہے اس جگہ کو انتقام اور تشدد بھرنے لگتا ہے۔ نمبر 2: اگر سزا یقینی نہ ہو اور نظام انصاف رکاوٹ نہ بن سکتا ہو تو جو لوگ اپنے نظریات اور عقائد منوانے کے لیے طاقت کے استعمال پر یقین رکھتے ہیں تو وہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے نظام انصاف میں عدم برداشت کے مظاہر یہ ہیں:۔

عدلیہ کی ایسی ساخت جس میں اقلیتوں کی نمائندگی کم ہے۔ حق آزادی کے لیے بامعنی اُصول انصاف وضع کرنے میں ناکامی۔ عدالتی کارروائیوں کے دوران عدم برداشت کو برداشت کر لینا: اپنی نیک نیتی

پر اصرار یا ججوں میں یہ اہلیت نہ ہونا کہ وہ قانون اور ذاتی اخلاق میں فرق کر سکیں۔ اب جبکہ عدالتوں نے چند برسوں میں بنیادی حقوق کا دائرہ وسیع کر دیا ہے، شہریوں کے معاشی حقوق وضع کر لئے گئے ہیں (محمد یاسین کا کیس) آرٹیکل 25 (حق مساوات) اور آرٹیکل 9 (حقِ زندگی جس کی فراخدلانہ تعبیر کی گئی ہے) کے تحت من مانے فیصلے اور تقرریاں ختم کر دی گئی ہیں۔ لیکن با معنی تعبیر یا آزادی کے حق کے نفاذ کا بنیادی فطری اظہار سے آگے بڑھ کر کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ یعنی من مانی گرفتاریوں سے آزادی نہیں دی گئی۔

جو چیز سب سے زیادہ مشتبہ اور غیر یقینی ہے وہ عدلیہ کا عدم برداشت کو واضح طور پر دکھائی دینے والے طریقے سے برداشت کرنا ہے۔ قانونی مساوات اس مفہوم میں ایک افسانہ بن چکی ہے کہ اس کا مقصد ہی اس کا برقرار رہنا ہے خواہ معاشرے کے اندر کتنی ہی سماجی اور اقتصادی اونچ نیچ یا عدم مساوات پائی جاتی ہو۔ لیکن اگر عدالتوں کی کارروائیوں کا مقصد طاقتوروں کے مقابلے میں کمزوروں کو تحفظ دینے کی بجائے طاقتور معاشی طبقوں کے باہمی تعلقات کی توثیق اور ان کو صحیح النسب قرار دینے تک محدود ہو کر رہ جائے تو وہ ایوانہائے مصلحت دکھائی دینے لگیں گی نہ کہ ایوانہائے عدل۔ خواہ ججوں کی تقرری کا مسئلہ ہو یا سماجی و مذہبی سوالوں کو نمٹانے کا ہو قانون کو ذاتی اخلاق سے ممیّز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اگر اس سلسلے کو روکا نہ گیا تو یہ رجحان قانون کی حکمرانی میں سے قانونی تیقن کو بے دخل کر دے گا اور اس کی جگہ انفرادی ججوں کی ترنگ لے لے گی۔

سفارشات

1- سپریم کورٹ کو جوڈیشل کمیشن کے قواعد پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ ججوں کے تقرر کے لیے معروضی کسوٹی وضع کرنی چاہیے اور اس امر کی یقینی بنا دینا چاہیے کہ یہ طریق کار جائز اور شفاف ہے۔ عدلیہ نے انتظامیہ کے صوابدیدی اختیار کے استعمال کے لئے جو اُصول مقرر کئے ہیں ان کا سب سے پہلے ججوں کے انتظامی اختیار پر اطلاق ہونا چاہیے۔ چیف جسٹس کے منصب میں جو وسیع اور بے لگام صوابدی اختیارات پائے جاتے ہیں ان کو متشکل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کا نقطہ آغاز جدید خودکار عدالت کے قیام اور تمام عدالتوں کے لیے کیس مینجمنٹ سسٹمز سے ہونا چاہیے۔

2- ایک نئی قومی جوڈیشل پالیسی لائی جائے جو التوا کے مسئلے کے لیے محض زبانی جمع خرچ نہ کرے بلکہ اس کے دائمی اسباب کو دیکھے اور اس کے لیے تحفظ پسندانہ حل تلاش کر کے اس پر عمل درآمد کا اہتمام کرے۔ نیشنل جوڈیشل پالیسی سازوں کے ایسے اقدامات کے ساتھ ساتھ لاکمیشن ضابطے اور قانون اصلی کے قوانین کے اندر پائے جانے والے اسقام کی نشاندہی کرے جو ایک طرف فیصلوں

کے صدور میں تاخیر کا سبب بنتے ہیں اور دوسری جانب ناانصافی کا باعث بنتے ہیں۔

3- وقت آ گیا ہے کہ عدلیہ اپنے مشاہدہ باطن (Intorpection) کا اہتمام کرے۔21ویں ترمیم پاکستان کے مسئلہ دہشت گردی کا حل کم ہے اور عدلیہ پر عدم اعتماد زیادہ ہے۔ جو جج اپنے فرائض تعصّبات سے بالاتر ہو کر محتاط توجہ اور محنت و دیانت کے ساتھ ادا کرتے رہے ہیں انہیں حکومت سے اظہار ناراضگی کا حق حاصل ہے جو عدلیہ کو ملک میں دہشت گردی پھیلانے کے ایک بڑے سبب کے طور پر پیش کرتی ہے۔تاہم ایسی ناراضگی کا رُخ عدالتی اصلاح کے آغاز کی طرف پھیر دیا جانا چاہیے۔

2

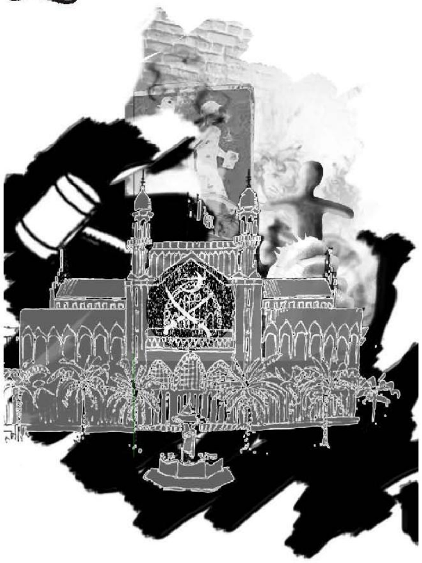

قانون کا نفاذ

امن عامہ کی صورت حال

کسی شخص کو وجہ بتائے بغیر حراست میں نہیں لیا جائے گا۔ نہ ہی اسے اس کی مرضی کے وکیل سے مشورہ حاصل کرنے یا اس کے ذریعے اپنے دفاع کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل-10(1) اور (2)]

انسانی وقار، گھر اور چار دیواری کی حرمت کی، قانون کے مطابق، ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔ کوئی شہادت یا ثبوت حاصل کرنے کے لیے کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 14(1) اور (2)]

ہر شخص کو زندہ رہنے، آزادی اور جان و مال کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل -3]

کسی شخص کو اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔ اور نہ ہی اس کے ساتھ ظالمانہ، غیر انسانی یا توہین آمیز سلوک کیا جائے گا۔
انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل -5]

ہر اس شخص کو جس پر کوئی قابل سزا الزام عائد کیا جائے، یہ حق حاصل ہے کہ جب تک قانون کے تحت اس کو ایک کھلی عدالت میں، جہاں اسے اپنے دفاع کی تمام سہولتیں حاصل ہوں، مجرم ثابت نہیں کیا جاتا، اسے بے قصور تصور کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 11-(1)]

کسی شخص کی خلوت یا تنہائی، خاندانی زندگی، گھر یا اس کی خط و کتابت میں، من مانے طور پر مداخلت نہیں کی جائے گی۔ نہ ہی اس کے وقار اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر شخص کو اس قسم کی مداخلت اور کوششوں کے خلاف قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل -2]

قانون کی حکمرانی اور انصاف کی مناسب فراہمی انسانی حقوق کے فروغ اور تحفظ میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی شہریوں کو ریاستی اختیار کے بے جا استعمال سے تحفظ فراہم کرتی ہے اور ریاست سے اس امر کا تقاضہ بھی کرتی ہے کہ وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور دیگر جرائم کی تحقیقات کرے، مجرموں کے خلاف قانونی کاروائی کرے اور انہیں سزا دے۔

2014 میں نہ صرف عام جرائم اور دہشت گردی کے واقعات کا سلسلہ جاری رہا بلکہ پولیس کے مظالم میں بھی کوئی کمی نہ آئی۔ ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کے قانون کی حکمرانی کے گوشوارے کے مطابق پاکستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں قانون کی حکمرانی کی حالت انتہائی خراب ہے۔ پاکستان قانون کی حکمرانی والے ممالک کی درجہ بندی کے حوالے سے چھ علاقائی ممالک میں پانچویں نمبر پر ہے اور صرف افغانستان سے بہتر حالت میں ہے۔قوانین کا غیر موثر نفاذ، بدعنوانی، پولیس کا ناقص نظام، مجرموں کو سزا سے استثنٰی، دہشت گردی کے واقعات، عقیدے کی بنیاد پر تشدد، ۔۔۔۔سمیت اسلحے کی بہتات 2014 میں پاکستان میں امن و امان کی خراب صورتحال کی بنیادی وجوہات تھیں۔ بعض شہریوں کو اپنے عقیدے یا لسانی شناخت کی بدولت انتہائی کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

بنیادی طور پر قانون کے نفاذ کا ذمہ دار ادارہ پولیس نہ صرف چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے مطلوبہ وسائل اور تربیت کے اعتبار سے پسماندہ تھا بلکہ اسے نااہلیت، بدعنوانی اور سیاست زدہ ہونے کی وجہ سے بھی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک میں بعض ایسے پولیس اسٹیشن بھی تھے جن کے پاس اپنی عمارتوں کی دیکھ بھال کرنے یا گاڑیوں کا ایندھن خریدنے کے لیے بھی وسائل نہیں تھے۔نجی سیکیورٹی کمپنیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اگرچہ جرائم سے نبٹنے کے لیے ان کے پاس بھی تربیت اور وسائل کی کمی تھی۔ پہلے سے کہیں زیادہ سیکیورٹی کیمرے اور باڑیں نصب کی گئیں اور خاردار تاروں والی دیواریں تعمیر کی گئیں۔

پر تشدد فرقہ ورانہ نظریات کے دوکانداروں سمیت انتہا پسندوں نے عام جرائم کے ارتکاب کے علاوہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں، اساتذہ اور وکلاء سمیت پیشہ ور ماہرین کو نشانہ بنایا۔ پولیو ویکسینیٹرز کو محض اس وجہ سے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ پاکستان کے بچوں کو اپاہج مستقبل سے بچانے کی کوششوں کا حصہ بنے تھے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے ریجنل کوآرڈینیٹر راشد رحمان ایڈووکیٹ کو تضحیک مذہب کے ملزم (یونیورسٹی کے لیکچرار) کی وکالت کرنے کی پاداش میں ان کے دفتر میں گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا۔

ماورائے عدالت قتل اور زیر حراست ایذا رسانی کے الزامات زبان زد عام رہے۔ علاوہ ازیں ہجوم کو کنٹرول کرنے کی ظالمانہ تدابیر نے بھی پولیس کے تشخص کو تار تار کیا۔ کمیونٹی سطح کے فعال پولیس کے نظام کی غیر موجودگی میں بلوائی انصاف کے واقعات بھی منظر عام پر آئے۔

24 دسمبر کو وزیر اعظم نے 20 نکاتی انسداد دہشت گردی نیشنل ایکشن پلان کا اعلان کیا۔ اگرچہ کئی نکات پر پیش رفت سست رہی جن کا ہدف دہشت گردی اور پر تشدد مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ تھا تاہم حکومت

تضحیک مذہب کے ملزم کا دفاع کرنے پر مارے گئے

معروف وکیل اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے کوآرڈی نیٹر راشد رحمان کو دو افراد نے 7 مئی کو رات 8:30 بجے اُن کے ملتان میں واقع دفتر میں گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ دفتر میں بیٹھے دو دیگر افراد شدید زخمی ہو گئے تھے۔ حملہ آور فرار ہو گئے تھے۔

راشد کو تضحیک مذہب کے ملزم (یونیورسٹی کے لیکچرار) کی وکالت کرنے پر دھمکیاں دی گئی تھیں۔

راشد بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے لیکچرار جنید حفیظ کی وکالت کر رہے تھے جن پر 2013 میں سوشل میڈیا پر تضحیک مذہب کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ جنید کا دفاع کرنے والے واحد وکیل نے دھمکیاں موصول ہونے کے بعد وکالت نامہ واپس لے لیا تھا۔

راشد کی پیش قدمی تک کوئی بھی وکیل عدالت میں جنید کا دفاع کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مارچ 2014ء میں مقدمے کی سماعت کے موقع پر جو کہ سکیورٹی وجوہات کی بنا پر جیل میں ہوئی تھی، شکایت دہندہ کے وکلاء نے راشد کو دھمکیاں دیں۔

راشد نے جج صاحب کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی جن کی موجودگی میں دھمکیاں دی گئی تھیں مگر جج صاحب خاموش رہے۔ ایچ آر سی پی نے وزیرِاعلیٰ پنجاب کو لکھا اور اپنی ایک پریس ریلیز میں کہا: ''سماعت کے دوران شکایت دہندہ کے وکلاء نے راشد کو کہا کہ وہ اگلی سماعت پر حاضر نہیں ہو سکے گا کیونکہ وہ اب زندہ نہیں رہے گا۔''

راشد نے پولیس کو بھی آگاہ کیا تھا مگر اُنہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ راشد نے ضلعی بار ایسوسی ایشن کو بھی دھمکیوں سے مطلع کیا تھا۔

اُن کے قتل کے اگلے روز پمفلٹس تقسیم کیے گئے جن میں راشد کے قتل کا یہ جواز پیش کیا گیا کہ انہوں نے جنید کی وکالت کی تھی اور مزید کہا گیا: ''ہم تمام وکلاء کو خدا کے خوف سے خبردار کرتے ہیں۔ اُنہیں ایسا اقدام کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا چاہیے۔

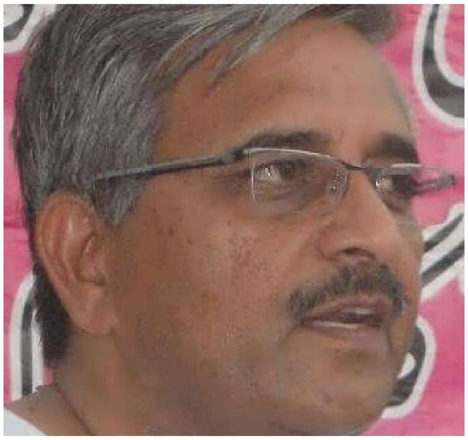

انصاف کی فراہمی میں جانبداری برتنا ظلم کے مترادف ہے......راشد رحمان

نے دو نکات پر بہت عجلت کا مظاہرہ کیا: سزا یافتہ دہشتگردوں' کے لیے پھانسی پر پابندی اٹھالی گئی۔۔۔۔۔البتہ پھانسی کے خواہشمندوں کی طرف سے زیادہ تر پھانسی ان لوگوں کو دی گئی جنہوں نے براہ راست فوج کو نشانہ بنایا تھا؛ اورفوری انصاف کے لیے فوجی عدالتوں کو قانونی جواز فراہم کیا گیا۔ ججوں، گواہوں، تحقیقات کاروں، پراسیکیوٹرز اور وکلاء کو مناسب تحفظ کی فراہمی میں ناکامی کے باوجود حکومت نے دہشت گردی کے ملزمان کی بریت یا ان کے مقدمات کے التواء کے لیے عدلیہ کو موردالزام ٹھرایا۔ فوجی عدالتوں کے قیام کے اقدام نے جمہوری قوتوں، انسانی حقوق کے کارکنوں اور عدلیہ میں کئی خدشات کو جنم دیا جو نہ صرف بے شمار مقدمات کے التواء کا سامنا کررہی تھی بلکہ اس سے تحقیقاتی اور مقدمہ سازی کے طرائق کار میں خامیوں کے باوجود مشتبہ افراد کو سزا سنانے کی توقع بھی کی جارہی تھی۔

اگرچہ دہشت گردی سے نبٹنے کے لیے بعض اقدامات کیے گئے اور قوانین متعارف کروائے گئے مگر پولیس کے ڈھانچے میں اصلاح کرنے یا تحقیقات اور مقدمہ سازی کے نظام میں ضروری تبدیلیاں لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ نتیجے کے طور پر امن وامان کی تنزلی کا سلسلہ جاری رہا۔

افراد اور املاک کے خلاف جرائم

زیرنظر سال کے دوران ملک بھر میں لوگوں اور املاک کے خلاف بے قابو جرائم اور تحقیقات ومقدمہ سازی کے ناقص نظام نے ثابت کیا کہ حکومت شہریوں کے تحفظ اور قانون کی حکمرانی کے نفاذ جیسے بنیادی فریضے کی انجام دہی میں بھی ناکام رہی ہے۔

وفاقی وزارت داخلہ کو صوبوں کے مہیا کردہ اعداد وشمار کے مطابق پولیس کو رپورٹ ہونے والے جرائم میں 1.16 فیصد کمی کے ساتھ گذشتہ برس کی نسبت 2014 میں جرائم کی شرح میں بہت معمولی کمی آئی ہے۔ 2014 میں پولیس کو افراد واملاک کے خلاف جرائم کے 627,116 واقعات رپورٹ ہوئے جبکہ 2013 میں یہ تعداد 634,404 تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جرائم کے بے شمار واقعات رپورٹ نہیں ہوتے جس کی بنیادی وجہ مقدمات کے اندراج میں پولیس کا عدم تعاون ہے کیونکہ اندراج کی صورت میں اس کی کارکردگی کا بھانڈہ پھوٹنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ پولیس کو وقوعہ سے مطلع کرنے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوگی۔

2.7 فیصد کی معمولی کمی کے ساتھ 2014 میں املاک کے خلاف جرائم کے 114,763 واقعات رپورٹ ہوئے جبکہ 2013 میں یہ تعداد 117,912 تھی۔ 2014 میں افراد کے خلاف جرائم

کے 88,767 واقعات رپورٹ ہوئے جبکہ 2013 میں ان کی تعداد 88,854 تھی۔ لہذا ان جرائم میں محض 09. فیصد کمی آئی۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 2014 میں 411 افراد کو تاوان کی غرض سے اغواء کیا گیا۔ پنجاب سے 81، سندھ سے 190، خیبر پختونخوا سے 96، بلوچستان سے 33، اسلام آباد سے 10 جبکہ ایک فرد کو ریلوے ٹرین پر سفر کرنے کے دوران اغواء کیا گیا۔ مزید برآں، 18,700 افراد کو کئی وجوہات کی بناء پر اغواء کیا گیا جن میں زیادہ تر خواتین شامل تھیں۔

سندھ پولیس نے بتایا کہ انہوں نے 2014 میں خواتین کے اغواء کے 1,261 مقدمات درج کیے جنہیں جبری شادی کے لیے اغواء کیا گیا تھا۔

خواتین کو شادی کی تجاویز رد کرنے کی پاداش جیسے واقعات میں تیزاب کا نشانہ بنایا گیا جو پاکستان بھر میں سستے داموں با آسانی دستیاب ہے۔ پاکستان بھر سے تیزاب گردی کے خاتمے کے لیے ایسڈ سروائیور فاؤنڈیشن پاکستان کے مطابق 2014 میں پاکستان میں تیزاب کے 114 حملے کیے گئے جن میں 159 خواتین کو نشانہ بنایا گیا۔ (خواتین والا باب بھی ملاحظہ کریں)

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ملک میں اجتماعی جنسی تشدد کے تقریبا 326 واقعات رپورٹ ہوئے۔ پنجاب سے 263، سندھ سے 35، کے پی سے 11، اور اسلام آباد سے 17 واقعات رپورٹ ہوئے تھے۔ جنسی تشدد کے 3,243 واقعات رپورٹ ہوئے۔ پنجاب سے 2,734، سندھ سے 191، خیبر پختونخوا سے 133، بلوچستان سے 119، اسلام آباد سے 162 جبکہ گلگت بلتستان سے چار واقعات رپورٹ ہوئے تھے۔

سال کے دوران ملک بھر میں کُل 13,199 افراد قتل ہوئے تھے۔ پنجاب میں 5,953، سندھ میں 3,252، کے پی میں 3,184، بلوچستان میں 615، اسلام آباد میں 144، ریلوے لائنوں پر چار (مقام نامعلوم) اور گلگت بلتستان میں 74 افراد قتل ہوئے۔

2014 میں املاک کے خلاف جرائم کے تقریباً 11,4211 واقعات رپورٹ ہوئے۔ پنجاب سے 87,933 سندھ سے 18,039، کے پی سے 3,237 بلوچستان سے 1,652، اسلام آباد سے 2,726، ریلویز (نامعلوم حکام) پر 353 اور گلگت بلتستان سے 211 واقعات رپورٹ ہوئے تھے۔

زیرِ نظر سال کے دوران تقریباً 33,115 گاڑیاں چوری کی گئیں یا چھینی گئیں۔ پنجاب سے 21,072، سندھ سے 8,685، کے پی سے 1,090، بلوچستان سے 913، اسلام آباد سے 1300،

ریلوے کی اراضی (نامعلوم مقام) سے تین جبکہ گلگت بلتستان سے 52 گاڑیاں چوری کی گئیں یا چھینی گئیں۔

شاہراہوں پر راہزنی، بینکوں، ایندھن اسٹیشنوں پر لوٹ مار، دکانات کی چوری، نقب زنی اور چوری کے 81,096 واقعات رپورٹ ہوئے۔ اِن واقعات میں سے 66,861 پنجاب میں، 9,354 سندھ میں، 2,207 کے پی، 739 بلوچستان میں، 426 اسلام آباد میں، 350 ریلوے اراضی (نامعلوم مقام) پر جبکہ 159 گلگت بلتستان میں پیش آئے۔

بھتہ

بھتہ، تشدد اور بھتہ کی وصولی کے لیے تشدد کی دھمکیاں نہ صرف کراچی میں عام تھیں بلکہ ملک کے دیگر حصوں سے بھی اس جرم کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔ زیرِنظر سال کے دوران صرف کراچی میں پولیس نے بھتہ سے متعلقہ 1,330 شکایات درج کیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد 891 تھی۔ بھتہ کے واقعات لاہور، فیصل آباد اور پشاور سمیت تمام مرکزی شہروں سے رپورٹ ہوتے رہے۔

اپریل میں پنجاب کے دارالحکومت لاہور کے علاقہ پاکستان چوک میں واقع ایک دکان میں ہونے

تاجر بھتہ خوری کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

والے بم دھماکے میں کم از کم 17 افراد زخمی ہو گئے۔ اگر چہ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ واقعے کی تحقیقات کر رہے ہیں، دکان مالک کا کہنا تھا کہ اُسے بھتہ کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ دو ماہ قبل نامعلوم مسلح افراد نے اُس کی دکان پر فائرنگ بھی کی تھی۔

ایوان تجارت وصنعت پختونخوا کے مطابق تقریباً 150 تاجر اور صنعت کار بھتہ مانگنے والوں کے خوف سے صوبہ چھوڑ گئے تھے جس کے باعث اُن کے ہزاروں ملازمین بیروزگار ہو گئے۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پختونخوا میں اس برس پہلے سے دس گناہ زیادہ بھتہ کے واقعات رپورٹ ہوئے تھے۔ پختونخوا میں سنٹرل پولیس آفس کے مطابق 2011 سے 2013 تک بھتہ کے رپورٹ شدہ واقعات کی شرح 30 واقعات فی برس تھی جبکہ 2014 کے پہلے نو ماہ میں ان واقعات کی تعداد 285 تک پہنچ گئی۔

دہشت گردی

2014 میں پاکستان میں متعدد دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی)، کالعدم فرقہ وارانہ تنظیموں اور بلوچستان میں قوم پرست جنگجوؤں جیسے جنگجو انتہا پسند گروہوں نے ملک بھر میں ہزاروں شہریوں اور سکیورٹی اہلکاروں کو پر تشدد کارروائیوں کا نشانہ بنایا۔ سال کا آغاز بلوچستان میں پر تشدد فرقہ وارانہ ہلاکتوں سے ہوا جبکہ اختتام آرمی پبلک سکول پشاور پر ملکی تاریخ کے بھیانک ترین حملے سے ہوا۔ جس میں 150 افراد ہلاک ہوئے۔

زیر نظر سال کے دوران دہشت گردی کے دیگر حملوں اور نتیجتاً ہلاکتوں میں 30 فیصد کمی آئی۔

پاک انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز (PIPS) کی جاری کردہ پاکستان سکیورٹی رپورٹ 2014 کے مطابق 2014 کے دوران دہشت گردی کے 1,206 حملوں میں 1,723 افراد جبکہ 3,143 افراد زخمی ہوئے تھے۔ ان میں 26 خودکش بم دھماکے بھی شامل تھے۔ مذکورہ حملے انتہا پسندوں، قوم پرست باغیوں اور پر تشدد فرقہ وارانہ گروہوں نے کیے تھے۔

ان حملوں میں ہلاک شدگان اور زخمیوں کی تعداد بھی بالترتیب 30 فیصد اور 42 فیصد کم ہوئی۔ کل رپورٹ شدہ واقعات میں سے 436 (36 فیصد) حملوں کا ہدف سکیورٹی فورسز اور قانون نافذ کرنے والے ادارے تھے۔

2001 سے لے کر اب تک 45 ڈاکٹرز ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن چکے ہیں۔ 2014 میں 12

2014 کے دوران پاکستان میں گزشتہ برس کی نسبت خودکش حملوں میں 43 فیصد کمی آئی

2014 میں دہشت گردی کے حملے

کل حملے:	1,206
خودکش حملے:	26
ہلاکتیں:	1,723
زخمی:	3,143

پنجاب:	8 فیصد اضافہ
کے پی:	26 فیصد کمی
بلوچستان:	32 فیصد کمی
کراچی:	40 فیصد کمی

دہشت گردی کے حملوں میں ہلاک شدگان اور زخمیوں کی تعداد

علاقہ	حملے	ہلاکتیں	زخمیوں کی تعداد
کے پی	325	542	829
بلوچستان	341	375	926
فاٹا	234	293	389
پنجاب	41	126	274
کراچی	217	317	438
سندھ	31	23	63
اسلام آباد	14	44	212
جی بی	3	3	12

(بشکریہ: PIPS)

ڈاکٹر قتل کیے گئے جبکہ 2013 میں سات کو مارا گیا تھا۔ 2001 سے لے کر اب تک 51 وکلاء کو قتل کیا جا چکا ہے۔

ساؤتھ ایشیا دہشت گردی پورٹل کے مطابق 2014 میں 13 وکلا کو قتل کیا گیا۔

پورٹل کی رپورٹ کے مطابق 2014 کے دوران 92 فرقہ وارانہ حملوں میں 210 افراد مارے گئے۔ 2013 میں 128 حملوں میں 525 ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ پورا سال ایسے واقعات کے ردِّ عمل میں پورے سال کے دوران ہر ماہ متشدد یا غیر متشدد احتجاجی مظاہرہ اور ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ البتہ سال کا پہلا نصف دوسرے کی نسبت زیادہ مہلک ثابت ہوا۔

واہگہ بارڈر پر بم دھماکے میں متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے

PIPS کا کہنا تھا کہ ماسوائے پنجاب جہاں دہشت گردی کے 41 واقعات کے ساتھ دہشت گردی کے حملوں میں 8 فیصد اضافہ ہوا، ملک کے دیگر حصوں میں 2014 کے دوران دہشت گردی کے حملوں میں 30 فید کمی آئی ہے۔ خیبر پختونخوا میں دہشت گردی کے واقعات میں گزشتہ برس کی نسبت 26 فیصد، بلوچستان میں 32 فیصد، سندھ میں 40 فیصد کمی آئی۔ 2014 میں خیبر پختونخوا میں دہشت گردی کے 325، بلوچستان میں 341، اور سندھ میں 217 حملے ہوئے جن میں زیادہ تر کراچی میں ہوئے تھے۔

PIPS کی رپورٹ کے مطابق کے پی میں دہشت گردی کے 325 حملوں میں 542 افراد ہلاک اور 892 زخمی ہوئے۔ بلوچستان میں 341 حملوں میں 375 افراد ہلاک جبکہ 926 زخمی ہوئے۔ وفاق کے زیر انتظام علاقہ جات (فاٹا) میں 234 حملوں میں 293 افراد ہلاک اور 389 زخمی ہوئے۔

پنجاب کو 41 حملوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں 26 افراد ہلاک اور 274 زخمی ہوئے۔ کراچی میں 217 حملے کیے گئے جن میں 317 افراد اور 438 زخمی ہوئے۔ سندھ کے دیگر علاقوں میں دہشت گردوں نے 31 حملے کیے جن میں 63 افراد ہلاک جبکہ 23 افراد زخمی ہوئے۔ اسلام آباد میں 14 حملے ہوئے جن میں 44 افراد ہلاک جبکہ 212 زخمی ہوئے۔ گلگت بلتستان میں تین حملوں میں تین افراد مارے گئے۔ ان حملوں میں 105 اہلکار اور 45 پولیس اہلکار بھی ہلاک ہوئے تھے۔ اموات کی تعداد کے حوالے سے جنوری مہلک ترین مہینہ تھا جب 42 بم دھماکوں میں 401 افراد ہلاک جبکہ 401 زخمی ہوئے تھے۔ 21 جنوری کو ایک خودکش بمبار نے دھماکہ خیز مواد سے بھری گاڑی جنوب مغربی ضلع مستونگ میں زائرین کی ایک بس سے ٹکرا دی جس

مظاہرین فرقہ وارانہ حملوں کے خلاف نعرے بلند کر رہے ہیں

کے باعث 29 افراد ہلاک اور 30 زخمی ہوئے۔ دوسرا مہلک حملہ 8 جون کو ہوا جب ایک خودکش بمبار نے تفتان، بلوچستان کو نشانہ بنایا جہاں ایران سے واپس لوٹنے والے شیعہ زائرین ٹھہرے ہوئے تھے۔ حملے نے 30 لوگوں کی جان لی جبکہ کئی زخمی ہوئے۔ دو نومبر کو ایک خودکش بمبار نے خود کو دو سو افراد کے ہجوم میں اڑا دیا جو واہگہ بارڈر پر پاکستان۔ ہندوستان کے مابین پرچم کشائی اور رینجرز کی پریڈ کی تقریب میں شرکت کر کے واپس آ رہے تھے۔ حملے میں کم از کم 62 افراد ہلاک اور 150 زخمی ہوئے تھے۔

9 اپریل کو وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کو بھی بم دھماکے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہاں سبزی و پھل منڈی میں بم دھماکہ کیا گیا جس میں کم از کم 23 افراد اور متعدد زخمی ہوئے تھے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ دھماکہ خیز مواد کو پھلوں کے ڈبے میں رکھا گیا تھا۔

سیاسی تشدد

معروف پاکستانی ادارے سنٹر برائے ریسرچ سکیورٹی سٹڈیز کے مطابق 2014 میں 186 سیاستدانوں اور سیاسی کارکنوں جبکہ مذہبی تنظیموں سے وابستہ 52 افراد کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا۔

سال کے دوران سیاسی تشدد کے بڑے واقعات لاہور، بھیرہ، اسلام آباد اور فیصل آباد سے رپورٹ ہوئے جب تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کے حکومت مخالف مظاہرین کا پولیس کے ساتھ

طالبان نے ایم کیوایم کے خیمے پر حملے کی ذمہ داری قبول کی

تصادم ہوا اور مختلف واقعات میں پیش آنے والے واقعات میں کم از کم 30 افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔
سابق کرکٹر اور حزب اختلاف کے رہنما اپنے حمایتیوں میں ملک کے مشرقی شہر گوجرانوالہ سے گزر رہے تھے کہ ایک ہجوم نے اُن پر پتھر پھینکے۔حکمران جماعت کے پوسٹرز تھامے لوگوں نے عمران خان کے قافلے پر جوتے اور پتھر پھینکے تھے۔

کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیوایم) کے کیمپ پر مسلح افراد نے فائرنگ کی جس سے تین اراکین پارلیمان سمیت کم از کم 15 افراد زخمی ہو گئے۔

اکتوبر میں، ایک مذہبی سیاسی جماعت جمعیت علمائے اسلام (جے یو آئی ایف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمان پر بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں حملہ کیا گیا۔فضل حملے میں محفوظ رہے جبکہ جے یو آئی کے تین کارکن ہلاک اور 30 افراد زخمی ہو گئے۔تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے ساتھ منسلک کالعدم جنگجو گروہ جنداللہ نے حملے کی ذمہ داری قبول کی۔یہ فضل پر تیسرا قاتلانہ حملہ تھا۔

تعلیمی ادارے

اگرچہ دسمبر میں آرمی پبلک سکول پشاور پر حملے نے قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تاہم تعلیم بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف جنگجوؤں کی طرف سے تعلیمی اداروں کا حملوں کا سلسلہ اُس سے پہلے سے ہی جاری تھا۔

مئی میں بلوچستان کے اضلاع پنجگور، تربت اور گوادر میں انتہا پسندوں نے مخلوط تعلیم کے نجی اداروں کو بند کرنے کی دھمکی دی۔ والدین کو اپنی بچیاں اسکول نہ بھیجنے بصورت دیگر سخت نتائج کے لیے تیار رہنے کی دھمکی دی۔ اساتذہ کو اپنے پیشے سے خیرآباد ہونے کے لیے کہا گیا اور پنجگور میں ایک اسکول ویگن کو آگ لگائی گئی۔ اس حملے کے بعد ضلع کے اسکول کئی ماہ تک بند رہے۔ بلوچستان کے قوم پرست گروہوں نے اسکولوں کی بندش کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے جن کا مقصد اسکول دوبارہ کھلوانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا۔

ایچ آر سی پی 2013 سے اُن 48 اضلاع کی صورت حال پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے جہاں منظّم گروہوں کی کارروائیوں کی بدولت انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔ چھ علاقوں میں پھیلے ان متعدد اضلاع سے 2014 میں اسکولوں پر حملوں اور حملوں کی دھمکیوں کی اطلاعات منظر عام پر آتی رہیں۔ 2014 کے دوران اضلاع کے تعلیمی اداروں پر ہونے والے 28 حملوں میں سے جو زیادہ بم دھماکوں پر مشتمل تھے، 12 فاٹا میں جبکہ 10 خیبر پختونخوا میں کیے گئے۔

بلوچستان کے منتخب اضلاع پر حملوں اور گلگت بلتستان کے اضلاع میں دو حملوں کی اطلاعات منظر عام پر آئیں۔ جن تعلیمی اداروں کو نشانہ بنایا گیا اُن میں 14 لڑکوں کے اسکول، 11 لڑکیوں کے اسکول جبکہ تین مخلوط تعلیمی ادارے شامل تھے۔

چھ ریجنیز میں جن اضلاع کی صورت کا جائزہ لیا گیا وہاں کے تعلیمی اداروں پر حملے: **2014**

گلگت بلتستان	بلوچستان	اندرون سندھ	جنوبی سندھ	خیبر پختونخوا	فاٹا	کل
2	4	0	0	10	12	28

2014 میں زیر نظر اضلاع میں اسکولوں پر حملے

لڑکوں کے اسکول	لڑکیوں کے اسکول	مخلوط اسکول
14	11	3

زیر نظر اضلاع میں اسکولوں پر حملوں میں ہلاک شدگان اور زخمیوں کی تعداد: **2014**

ہلاک شدہ خواتین	زخمی خواتین	ہلاک شدہ مرد	زخمی مرد	کل
3	6	153	121	283

اسکولوں کو زیادہ تر رات کے وقت بمباری کا نشانہ بنایا گیا۔ بیشتر مجرموں کی شناخت نہ ہو سکی اور صرف چند واقعات میں اُنہوں نے حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ بعض اسکولوں کو حملے سے قبل جنگجوؤں کی دھمکیاں بھی موصول ہوئی تھیں۔ انتہا پسندوں نے زیادہ تر اُن تعلیمی اداروں کو دھمکیاں دیں جہاں مخلوط تعلیم دی جا رہی تھی، لڑکیوں کو پڑھانے کا سلسلہ جاری تھا، ذریعہ تعلیم انگریزی تھا اور 'مغربی' نصاب کو فروغ دیا جا رہا تھا۔

امدادی کارکن

2012 سے لے کر اب پاکستان میں اندازاً 72 افراد کو قتل کیا جا چکا ہے جو پولیو کی ویکسی نیشن کے فرائض سے منسلک تھے۔

2014 میں تقریباً 45 ویکسی نیٹرز اور اُن کے معاونت کاروں کو مار ڈالا گیا۔ اگرچہ زیادہ تر حملے فاٹا، کے پی اور کراچی میں کیے گئے تاہم زیرِ نظر سال کے دوران ویکسینیٹرز کو بلوچستان اور پنجاب میں بھی نشانہ بنایا گیا۔ سال کا مہلک ترین حملہ یکم مارچ کو ہوا جب خیبر ایجنسی، فاٹا میں سڑک کنارے نصب بم دھماکے میں پولیو ویکسی نیشن ٹیم کے 11 کارکن ہلاک ہوگئے۔

دسمبر میں طالبان نے بلوچستان میں ویکسی نیشن ٹیم کے چار اراکین کو اغوا کر لیا جن میں شعبہ صحت کا

پولیو ویکسی نیشن ورکرز اپنے ساتھیوں کے قتل کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں

ایک کارکن، ڈرائیور اور دو سکیورٹی اہلکار شامل تھے۔ بعدازاں اُن کی نعشیں برآمد ہوئیں۔

خواتین ویکسینیٹرز پر بھی رحم نہ کیا گیا۔ مئی میں ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک خاتون ویکسینیٹرز پر کتے چھوڑ دیے گئے۔ دوسری کو قتل کرنے سے پہلے تشدد کا نشانہ بنایا اور اُس کی نعش کو پشاور کے نزدیک پھینک دیا گیا۔ کراچی میں ایک خاتون ویکسی نیٹرز کو ایک گھر میں بلایا گیا اور اُس پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ دو اُس وقت ہلاک ہوگئیں جب طالبان نے پولیو ورکرز کی ایک ویگن پر دستی بم پھینکا۔ البتہ زیادہ تر خواتین ویکسی نیٹر کو نقاب پوش موٹر سائیکل سواروں نے گولیاں مار کر ہلاک کیا۔

اگرچہ ملک بھر میں خوشی کی تقاریب میں ہونے والی فائرنگ سے مردوں، خواتین اور بچوں کی ہلاکت کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں تاہم فروری میں کراچی کے علاقے لیاری میں فائرنگ کے الگ واقعات میں چھیپا فاؤنڈیشن کے رضا کار لال محمد وہاب ہلاک ہوگئے جبکہ کئی افراد زخمی ہوئے۔

آپریشن ضرب عضب

سال کے دوران سکیورٹی فورسز نے اپنے کئی علاقوں میں کارروائیاں کیں جہاں گزشتہ کئی برسوں سے ریاستی کنٹرول کمزور تھا۔ جون کے وسط میں فوج نے فاٹا کے علاقے شمالی وزیرستان میں تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا۔ اس تصادم نے تقریباً 20 لاکھ افراد کو اپنے گھروں سے بے دخل کیا۔ اکتوبر میں فاٹا کے علاقے خیبر ایجنسی میں فوجی آپریشن کیا گیا۔ خیبر کے تقریباً 5 لاکھ افراد کو اپنے گھر بار چھوڑ کر محفوظ علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنا پڑی۔ (’مہاجرین‘ والا باب بھی ملاحظہ کریں)

PIPS کی سکیورٹی رپورٹ 2014 میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق، فوجی کارروائیوں نے دہشت گردوں کی حملے کرنے کی صلاحیت کو متاثر کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق 2013 کی نسبت 2014 میں خودکش بم دھماکوں میں 43 فیصد دہشت گردی کے حملوں میں 32 فیصد اور ہلاکتوں میں 31 فیصد کمی آئی۔

دفعہ 245: سویلین حکام کو فوج کی معاونت

حکومت نے آئین کی دفعہ 245 کو بروئے کار لاتے ہوئے وفاقی دارالخلافہ کا نظم و نسق یکم اگست سے 90 دنوں کے لیے فوج کے حوالے کر دیا تاکہ آپریشن ضرب عضب کا باعث دہشت گردوں کے ممکنہ پرتشدد ردِعمل کو روکا جا سکے۔ حکومت نے اس تاثر کو مسترد کیا کہ اس اقدام کا اصل مقصد حزب اختلاف کی سیاسی جماعت کے احتجاجی مارچ سے نبٹنا تھا۔ دسمبر میں وزیر داخلہ نے یہ کہتے ہوئے اِس اقدام کو باجواز قرار دیا کہ

آپریشن ضربِ عضب شروع کرنے کے بعد ''حکومت کو احساس ہوا کہ پولیس نہ تو مؤثر طور پر مسلح ہے اور نہ ہی تربیت یافتہ ہے اور امن وامان کی موجودہ صورت حال سے نبٹنے کے لیے اِسے وقت درکار ہے''۔ دسمبر میں انہوں نے ایک سکیورٹی میٹنگ کے دوران بتایا کہ صوبوں کی سکیورٹی فورسز کی معاونت کے لیے چاروں صوبوں میں 10,000 فوجی اہلکار تعینات کیے گئے تھے۔

ڈرون حملے

بیورو آف انویسٹی گیٹو جرنلزم کے مطابق اگرچہ امریکہ نے سال کے پہلے پانچ ماہ پاکستان میں ڈرون حملے نہیں کیے تھے تاہم 2014 میں ڈرون حملوں کے نتیجے میں 114 افراد کے مارے جانے کی اطلاعات منظرِ عام پر آئیں۔ لندن میں واقع ایک غیر منافع بخش خبر رساں ادارے کے مطابق 2014 میں ایک کے سوا تمام ڈرون حملے اُن علاقوں میں کیے گئے جہاں پاکستان کی زمینی فوجی کارروائیاں جاری تھیں۔

فاٹا کے علاقوں تک صحافیوں اور انسانی حقوق کے محافظین کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان حملوں میں کتنے دہشت گرد مارے گئے اور کتنے عام شہری ہلاک ہوئے۔

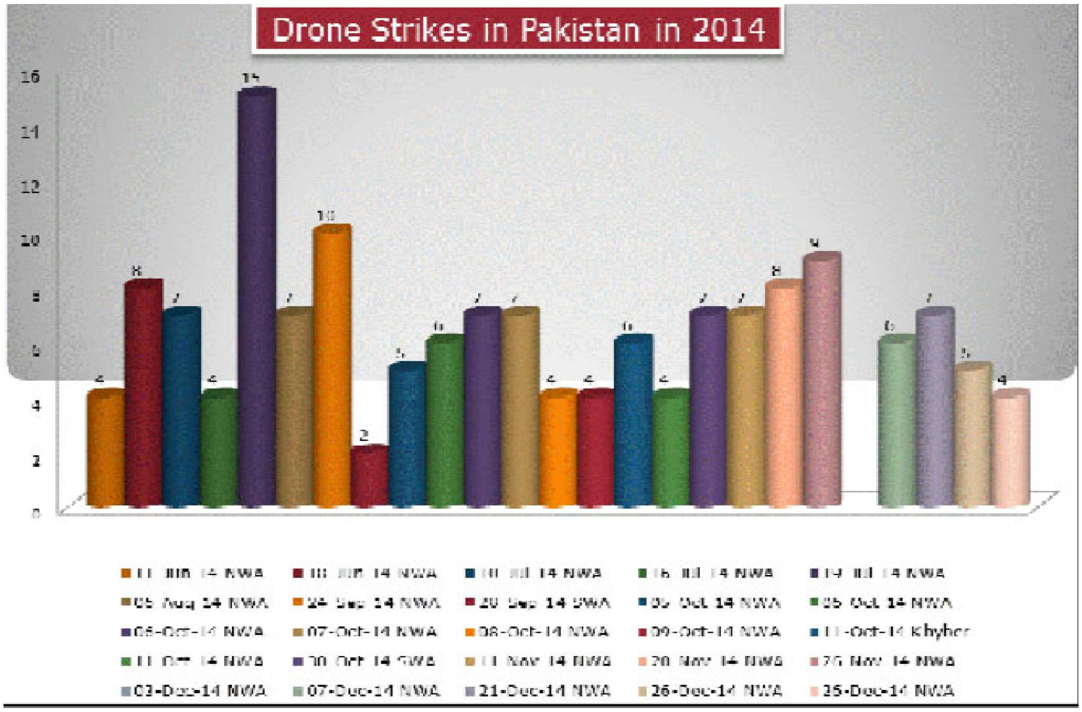

ذرائع: بیورو برائے تحقیقاتی صحافت

وردی میں جرائم کا ارتکاب

اگرچہ کئی ایسی شکایات سامنے آئیں کہ پولیس شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہے مگر تمام صوبوں سے ایسی اطلاعات بھی موصول ہوتی رہیں کہ جہاں مجرم پولیس اور سکیورٹی فورسز کی وردیوں میں ملبوس ہو کر جرم اور دہشت گردی کا ارتکاب کرتے رہے۔ متعدد واقعات میں پولیس اہلکار خود جرم سرزد کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اور کئی دیگر واقعات میں وہ قبضہ گیروں، کاریں چھیننے والوں اور بلیک میلرز سمیت دیگر مجرموں کی حمایت کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

اپریل میں، پشاور کے مضافات میں خزانہ پولیس اسٹیشن کی حد میں واقع ایک گھر پر چھاپے کے دوران ایلیٹ فورس پولیس کے تین اہلکار گرفتار ہوئے۔ اُس گھر میں دو تاجروں کو رکھا گیا تھا۔ انہوں نے گرفتاری سے بچنے کے لیے پولیس سے فائرنگ کی۔ اُن کے قبضے سے پولیس کی وردیاں، پولیس سائرن والی ایک جیپ اور وائرلیس سیٹ بھی برآمد ہوا۔

فروری میں شیعہ کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے 18 افراد کو خیبر پختونخوا کے ضلع کوہستان میں قتل کر دیا گیا۔ وہ شاہراہ قراقرم پر راولپنڈی سے گلگت جا رہے تھے۔ عینی شاہدین کے مطابق حملہ آور فوجی وردی میں تھے۔

8 مئی کو اولیول کے طالب علم سلیمان لاشاری کو اُس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ ڈیفنس کراچی میں واقع اپنے گھر میں مطالعہ کر رہا تھا۔ گولی ایک پولیس اہلکار نے چلائی تھی جو سکرنڈ پولیس ٹریننگ سنٹر کے سپیشل سپرنٹنڈنٹ کے بیٹے کے ہمراہ تھا۔ وقوعہ سے قبل دونوں لڑکوں کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ لاشاری کے والد کے بیان کے مطابق ابڑو اُن کے گھر بدلہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔ یہ بدقسمت کہانی سلیمان اور ایک پولیس اہلکار کی ہلاکت پر اختتام پذیر ہوئی۔ پولیس اہلکار کی ہلاکت کی وجہ یہ تھی کہ لاشاری خاندان نے بھی اپنے گھر پر محافظ رکھے ہوئے تھے جنہوں نے جوابی فائرنگ کی تھی۔

جولائی میں پاکستانی فوج کی وردی میں ملبوس تین درجن سے زائد مشتبہ اہلکاروں نے ضلع دیامر کے پولیس اسٹیشن پر دھاوا بولا، پولیس اہلکاروں کو باندھ دیا اور وہاں سے اسلحہ جات، وردیاں، وائرلیس سیٹس اور دیگر قیمتی اشیاء لے گئے۔ دودیشال پولیس اسٹیشن خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان کے بارڈر پر شاہراہ قراقرم سے ایک کلومیٹر کے فیصلے پر واقع تھا۔

دسمبر میں ملتان پولیس نے ایک ڈکیت گینگ کے دو اراکین کی گرفتاری کا دعویٰ کیا جو پولیس کی وردی میں کارروائیاں کرتے تھے۔ پولیس کے ترجمان نے کہا کہ چار رکنی گینگ شہر میں رہزنی کی 200 سے

زائد وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ لوگ پولیس کی وردی پہن کر چھوٹی سڑکوں پر ناکے لگاتے تھے جہاں وہ عام لوگوں کو تلاشی کے لیے روکتے تھے اور اُن سے موبائل فون، نقدی اور زیورات چھین لیے تھے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ مجرموں نے رہزنی کی 70 سے زائد وارداتوں کا اعتراف کیا تھا۔

کئی ایسے واقعات کی اطلاعات بھی منظر عام پر آتی رہیں جن میں ملک کے فضائی اڈوں کے اطراف میں سکیورٹی فورسز کے بھیس میں مسلح افراد بیرون ممالک سے آنے والوں یا مقامی مسافرین سے بھاری رقوم لوٹتے جب وہ ائیر پورٹ سے باہر آتے تھے۔

پولیس کے مظالم اور اصلاحات

ذاتی مقاصد کے لیے پولیس کا استحصال 1958 میں جنرل ایوب خان کی آمریت کے دور سے شروع ہوا تھا۔ پولیس آرڈر 2002 کا مقصد سیاسی طور پر غیر جانبدار، جوابدہ، عملی لحاظ سے خودمختار اور پیشہ وارانہ پولیس فورس کا قیام تھا مگر یہ قانون بنیادی طور پر مؤثر طریقے سے نافذ نہ ہونے کی وجہ سے اپنا مقصد حاصل نہ ہر سکا۔

پولیس ریکارڈ آف مینیجمنٹ انفارمیشن سسٹم یا پی آر او ایم آئی ایس کی بنیاد ایک عشرہ قبل رکھی گئی تھی جس کا مقصد پولیس اسٹیشن کے جرم کے اندراج والے رجسٹروں کو کمپیوٹرائزڈ کرنا تھا مگر یہ منصوبہ فنڈز کی کمی اور اس کے نفاذ کے ذمہ داران کے تواتر سے ہونے والے تبادلوں کے باعث کامیاب نہ ہوسکا۔

وفاقی حکومت

زیرِنظر سال کے دوران ملک کی پہلی قومی داخلی سلامتی پالیسی (2914-18) متعارف ہوئی جس میں پولیس کی بہتری اور استعداد سازی کا عزم ظاہر کیا گیا۔

2008 میں قائم ہونے والی قومی انسداد دہشت گردی اتھارٹی کے سربراہ کی تعیناتی نومبر میں کی گئی جب پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس کے اہلکار حامد علی خان نے سیکرٹری داخلہ سے چارج لیا جو کہ اتھارٹی کے ایڈیشنل سربراہ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اسلام آباد وفاقی حکومت کے کنٹرول کو اُس وقت ایک کڑے امتحان کا سامنا کرنا پڑا جب پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک نے وفاقی دارالحکومت میں طویل دھرنے دیے جو اگست میں شروع ہوئے۔ پارلیمان ہاؤس، وزیراعظم ہاؤس، پاکستان ٹیلی ویژن اور دیگر سرکاری عمارتوں کی طرف پرتشدد مارچ کیا گیا۔ مظاہرین اور پولیس کی جھڑپوں میں تین افراد ہلاک اور 600 سے زائد زخمی ہوئے۔ سینکڑوں مشتعل

ماڈل ٹاؤن لاہور میں پولیس اور ہجوم کے تصادم سے پولیس کی تربیت کی کمی یا تشدد کا سہارا لیے بغیر ہجوم پر قابو پانے میں ان کی عدم دلچسپی کی نشاندہی ہوئی ہے

مظاہرین نے ریاستی نشریاتی ادارے کی عمارت پر دھاوا بولا۔ پاکستان ٹیلی ویژن (پی ٹی وی) کی نشریات تقریباً آدھے گھنٹے تک بند رہیں جس کے بعد سکیورٹی فورسز نے اسلام آباد کے انتہائی سکیورٹی والے علاقے 'ریڈ زون' میں واقع عمارت کو ہجوم سے خالی کروایا۔

پنجاب

پنجاب کی پولیس فورس 178,000 پولیس اہلکاروں پر مشتمل تھی۔ ایلیٹ فورس کے اہلکاروں کی تعداد 5,700 تھی جن میں سے 4,000 سے زائد سینیئر سرکاری افسران، سیاستدانوں، دیگر بااثر افراد اور اُن کے اہل خانہ کی سکیورٹی پر مامور تھے۔ یہ واضح نہیں تھا کہ ایلیٹ فورس کے علاوہ دیگر پولیس اہلکاروں کی کتنی تعداد سکیورٹی کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی۔

پولیس ریکارڈ کو مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ کی کاوش کے طور پر جھنگ پولیس اپنے ایف آئی آر مینیجمنٹ انفارمیشن سسٹم (ایف آئی آر ایم آئی ایس) کے تحت یکم جنوری 2012 سے 31 دسمبر 2014 تک درج ہونے والی 20,000 سے زائد ابتدائی معلومات رپورٹس (ایف آئی آرز) کو آن لائن قابل دستیاب بنایا۔ جھنگ پہلا ضلع تھا جس کی پیروی کرتے ہوئے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ نے بھی 2014 میں اپنے تمام پولیس دفاتر

سندھ پولیس نے 2014 کے دوران جبری شادی کے لیے اغواء کی گئی خواتین کے 1,261 مقدمات درج کیے

اور پولیس اسٹیشنوں کا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کیا اور مختصر پیغام رسانی سروس (ایس ایم ایس) کے ذریعے واقعات کی پیش رفت کے بارے میں آگاہ رکھا۔

پولیس افسران کا کہنا تھا کہ ایف آئی آر ایم ایس کی کارکردگی پی آر او ایم ایس سے بہتر تھی جسے 2005 میں متعارف کیا گیا تھا مگر تا حال اُس پر عملدرآمد نہیں کیا گیا تھا۔

ہجوم اور احتجاجی مظاہروں کو کنٹرول کرنے کی ناقص حکمت عملی اور استعداد کی نشاندہی 2014 کے دوران کئی بار ہوئی۔ اس کا بدترین عملی مظاہرہ جون میں لاہور میں پیش آیا جب پولیس کی مظاہرین کے ساتھ جھڑپ ہوئی جو ماڈل ٹاؤن میں جو مذہبی، سیاسی شخصیت ڈاکٹر طاہر القادری کی رہائش گاہ کے اطراف سے سڑکوں سے رکاوٹیں ہٹائے جانے کی مزاحمت کر رہے تھے۔ دو خواتین سمیت 14 افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے۔ پی اے ٹی کے کارکنوں کا اُس وقت پولیس کے ساتھ تصادم ہوا جب وہ علاقے کے اطراف سے راستوں پر لگی رکاوٹیں ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تصادم کے نتیجے میں کم از کم دو افراد ہلاک ہوئے۔

دسمبر میں پولیس نے ایک احتجاجی مظاہرے میں شریک نابینا افراد پر لاٹھی چارج کیا جو جسمانی معذور پن کے لیے سرکاری ملازمتوں میں مختص کرنے پر عملدرآمد کا مطالبہ کر رہے تھے۔ تقریباً 70 نابینا افراد اپنے مطالبات کے لیے پریس کلب کے باہر اکٹھا ہوا تھا۔ جب اُنہوں نے سنا کہ صدر صاحب شہر میں تھے تو اُنہوں نے گورنر ہاؤس کی طرف پیش قدمی کی جس کے باعث پولیس کے ساتھ اُن کی جھڑپ ہوئی۔ کئی مظاہرین زخمی ہوئے اور ایک کو ہسپتال داخل کیا گیا۔ پولیس کا یہی مؤقف رہا کہ اُنہوں نے مظاہرین کو نقصان

نہیں پہنچایا تھا اور محض اُنہیں اُس مرکزی شاہراہ سے پیچھے دھکیلا تھا جہاں صدر کی گاڑی کے تحفظ کے لیے سکیورٹی دستہ تعینات کیا گیا تھا۔ایک حکومتی ترجمان نے بتایا کہ وقوعے کے بعد پانچ پولیس اہلکاروں کو معطل کر دیا گیا تھا۔ترجمان نے کہا کہ ''ہم اس واقعے کے لیے معذرت خواہ ہیں۔یہ واقعہ پیش نہیں آنا چاہیے تھا''۔

سندھ

صوبے کے 100,000 پولیس اہلکاروں میں سے 34,000 کراچی میں تعینات تھے۔کراچی کے 4,000 سے زائد پولیس اہلکار اہم شخصیات کے تحفظ پر مامور تھے جبکہ تقریباً 12,000 شہر میں ڈرائیورز اور مالی وغیرہ کے طور پر کام کر رہے تھے جس کا مطلب ہے کہ اندازاً دو کروڑ آبادی والے شہر میں جرم کی روک تھام اور امن وامان برقرار رکھنے کے لیے صرف 18,000 پولیس اہلکار دستیاب تھے۔تقریباً 3,000 پولیس اہلکار تحقیقات کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

پولیس کو فنی معاونت اور اپنے ہم وطنوں کو انصاف کے حصول میں امداد فراہم کرنے والے شہریوں پر مشتمل 'سٹیزن، پولیس رابطہ کار کمیٹی' (سی پی ایل سی) اپنی سرگرمیوں کو صوبہ سندھ کے تمام اضلاع میں پھیلانے کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی۔2014ء کے اختتام پر سی پی ایل سی کی چھ اضلاع میں

معروف سماجی ورکر عبدالستار ایدھی کے فلاحی ادارے کو بھی لوٹا گیا

موجودگی تھی اور حیدرآباد اور کراچی میں باضابطہ دفاتر قائم تھے۔

سی پی ایل سی کی ایک رپورٹ کے مطابق کراچی کے 113 پولیس اسٹیشنوں میں سے 17 میں بیت الخلانہیں تھے۔ چار پولیس اسٹیشنوں میں پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں جبکہ آٹھ اسٹیشنوں میں پولیس کے پاس سرکاری موٹر سائیکل نہیں تھا۔ 50 سے زائد پولیس اسٹیشنوں کا فرنیچر اس حد تک تباہ ہو چکا تھا کہ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ پولیس کے پاس تحقیقات کے لیے مطلوبہ استعداد اور تربیت کی کمی تھی۔ مزید برآں گولی کو روکنے والی جیکٹوں اور ہیلمٹوں سمیت سکیورٹی سے متعلقہ ضروری ساز وسامان بھی نہیں تھا۔ کم تنخواہ کو بھی دہشت گردوں اور مجرمانہ گروہوں کے خلاف ایماندارانہ ڈیوٹی کی راہ میں ایک بری رکاوٹ قرار دیا گیا۔

کراچی

دو کروڑ افراد کی آبادی پر مشتمل مرکزی شہر اور پاکستان کا معاشی دارالخلافہ ہونے کے علاوہ کراچی جرم اور فرقہ واریت، انتہا پسندی اور جرائم پیشہ گروہوں کے تشدد کا مرکز بھی تھا۔

کراچی کے منتشر حالات میں رہزنی اور ڈکیتیوں کے واقعات روزمرہ کا معمول تھے مگر ایدھی فاؤنڈیشن اور چھیپا ویلفیئر ایسوسی ایشن جیسے قابل احترام اداروں کے دفاتر میں رہزنی کے واقعات انتہائی تکلیف دہ تھے۔

زیر نظر سال کے دوران کراچی میں ہلاکتوں کے حوالے سے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے اعداد وشمار کے مطابق 2014 کے دوران شہر میں خواتین، بچوں، مشتبہ افراد اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں سمیت 2,909 افراد قتل ہوئے۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں نے 2014 کے دوران شہر میں 594 مشتبہ افراد کو ہلاک کیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے 142 افراد بھی سال کے دوران شہر میں مارے گئے۔ ان میں 130 پولیس اہلکار اور 12 پیرا ملٹری فورس کے اہلکار تھے۔ 27 نجی سکیورٹی گارڈ بھی سال کے دوران ہلاک ہوئے۔

2014 کے دوران شہر میں تقریباً 20 افراد قتل ہوئے جبکہ شہر کے مختلف علاقوں سے 340 نامعلوم نعشیں برآمد ہوئیں۔ 661 افراد کو دیگر وجوہات کی بنا پر قتل کیا گیا۔

تقریباً 120 افراد کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر قتل کیا گیا۔ 89 کو کالعدم فرقہ وارانہ گروہوں نے نشانہ بنایا تھا، 70 افراد کو اغوا کر کے قتل کیا گیا تھا اور 28 افراد بم دھماکوں میں ہلاک ہوئے تھے۔ تقریباً 87 افراد لیاری میں مجرمانہ گروہوں کی آپس کی لڑائی میں مارے گئے۔

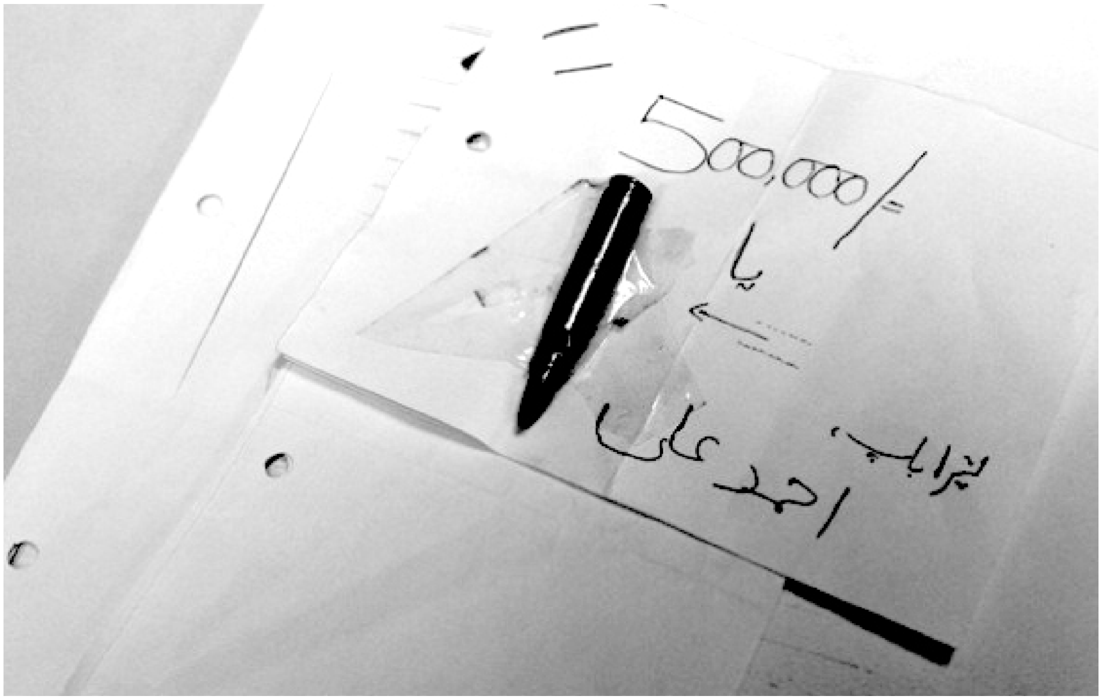

سٹیزن پولیس رابطہ کمیٹی (سی پی ایل سی) نے بھتہ خوری کے مطالبے کی ایک پرچی دکھائی جو بھتہ خوری کی طرف سے کراچی کے ایک تاجر کو بھیجی گئی تھی

ذرائع ابلاغ کی اطلاعات پر مبنی ایچ آر سی پی کے اعداد وشمار کے مطابق 2014 کے دوران 457 اور 135 مشتبہ افراد بالترتیب پولیس اور رینجرز کے ساتھ مقابلے میں مارے گئے جبکہ دو افراد پولیس تشدد سے ہلاک ہو گئے۔ تقریباً 134 افراد ذاتی تنازعے یا دشمنی میں مارے گئے۔ 107 افراد کو ڈاکوؤں نے قتل کیا، سات کو جلا کر مار ڈالا گیا جبکہ تین کو سکیورٹی گارڈز نے رہزنی کی کوشش کے دوران قتل کر دیا۔

تقریباً 36 افراد اندھی گولی کا نشانہ بنے، 28 ریلوے لائنوں پر ہلاک ہوئے، 61 منشیات کی زائد مقدار لینے یا زہریلی شراب پینے سے جبکہ تین افراد کی جیل میں ہلاکت کی اطلاع منظر عام پر آئی۔

کراچی میں ہلاکتوں سے متعلق ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق سال کے دوران 78 بچے ہلاک ہوئے۔ اُن میں سے آٹھ کو اغوا کر کے قتل کیا گیا، 15 بم دھماکوں میں مارے گئے، 20 اندھی گولیوں کا نشانہ بنے، 18 دشمنی کی بھینٹ چڑھے، پانچ کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کیا گیا جبکہ ایک بچے کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر مارا گیا۔ سال کے دوران ہلاک ہونے والی 154 خواتین میں سے 55 کو اُن کے رشتہ داروں نے قتل کیا، 61 کو با اثر افراد نے مارا، 14 اندھی گولیوں کا نشانہ بنیں، 11 بم دھماکوں میں ماری گئیں، تین ریلوے لائن پر ہلاک ہوئیں اور چار جل کر ہلاک ہوئیں۔

چھ خواتین کاروکاری یا غیرت کے نام پر قتل ہوئیں۔ چار افراد کو بھی عزت کے نام پر مارا گیا۔

زیرِنظر سال کے کسی ایک ماہ میں ہلاکتوں کی سب سے زیادہ تعداد (281) مارچ میں رپورٹ کی گئی جبکہ سب سے کم ہلاکتیں (187) دسمبر میں ہوئیں۔

2014 میں سکیورٹی فورسز نے کراچی میں مجرموں کے خلاف اپنی کارروائیاں تیز کر دیں جنہیں ستمبر 2013 میں شروع کیا گیا تھا۔ PIPS کی رپورٹ کے مطابق 2013 کی نسبت 2014 میں کراچی میں ہونے والے حملوں میں 40 فیصد کمی آئی۔ دسمبر میں پولیس نے ٹی ٹی پی کے کئی جنگجوؤں کو ہلاک کیا جن میں اُن کی عملی سرگرمیوں کا سربراہ عابد محسود (عرف مُچھڑ) بھی شامل تھا۔

خیبر پختونخوا

صوبائی پولیس کے مطابق 2014 کے دوران غائب ہونے والے افراد کی کل تعداد 1,066 تھی۔ اگرچہ 651 کا سراغ نہ لگایا جا سکا مگر پولیس 415 افراد کا سراغ لگانے میں کامیاب رہی۔ پولیس ریکارڈ سے یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ آیا اُنہیں اغوا کیا گیا تھا یا وہ جبری گمشدگی کا شکار ہوئے تھے۔ یہ بھی نہیں پتہ چل سکا تھا کہ وہ کہاں سے بازیاب ہوئے تھے۔

اغوا برائے تاوان، بھتہ خوری، منظّم جرائم پیشہ ور گروہوں کی کارروائیوں اور مذہبی جنگجوؤں کے پُرتشدد حملوں نے شہریوں کی زندگی اور بنیادی آزادیوں کو خطرات سے دوچار کیے رکھا۔ خیبر پختونخوا اور متصل قبائلی علاقہ جات سے کئی بار لوگوں کی نعشیں برآمد ہوئیں جنہیں قتل کر کے پھینکا گیا تھا۔

سکیورٹی فورسز کے اہلکاروں سمیت افراد پر ٹارگٹ 99 سے بڑھ کر 129 تک پہنچ گئے جس سے مراد یہ ہے کہ گزشتہ برس کی نسبت ان میں 30.3 فیصد اضافہ ہوا۔

خیبر پختونخوا نے خفیہ معلومات کی بنیاد پر تلاشی لینے اور حملے کرنے کی کارروائیاں، اچانک عکس دار چیکنگ، گاڑیوں کی تصدیق کا نظام، کھوج لگانے والے کُتوں کے یونٹوں میں اضافہ، جرائم گاہوں کے سراغ کے لیے انڈ ائیڈ پر مبنی نشانات لگانا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے پولیس اہلکاروں کی استعداد سازی جیسے انتظامی اقدامات شروع کیے۔ صوبائی پولیس 65,000 اہلکاروں پر مشتمل تھی جسے جرائم کی تحقیقات کے ذمہ دار 3000 اہلکاروں پر مشتمل تحقیقاتی ونگ، ایک فورینسک سائنس لیبارٹری (ایف ایس ایل)، انتہائی پُرخطر سکیورٹی کارروائیوں اور انسدادِ دہشت گردی کے لیے 6,000 اہلکاروں پر مشتمل ایلیٹ فورس اور 10,000 اہلکاروں کی فرنٹیئر محفوظ پولیس کی معاونت حاصل تھی۔

دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے متعدد قوانین ممانعت کروائے جن میں کرایہ شدہ بلڈنگ سکیورٹی کی ممانعت کا ایکٹ 2014، ہوٹل بزنس سکیورٹی کی ممعانت کا ایکٹ 2014; حساس اور غیر محفوظ مقامات اور اداروں کی سکیورٹی کا آرڈیننس 2014 شامل تھے۔ خفیہ معلومات کے حصول، مشتبہ افراد کے خلاف کارروائی کرنے، تحقیقات کرنے اور جاسوسی کرنے کے لیے انسداد دہشت گردی ڈیپارٹمنٹ (سی ٹی ڈی) قائم کیا گیا اور تمام ساتوں پولیس رینجز میں اُس کے ذیلی ادارے قائم کیے گئے۔ منظّم مسلح حملوں، اغوا کاری جیسی صورت حال اور دہشت گردوں، بھگوڑوں پر قابو پانے کے لیے فوری اقدام فورس (آر آر ایف) قائم کی گئی۔ بم ڈسپوزل یونٹ کی بھی اصلاح کی گئی۔

تنازعات کے تصفیے کی کونسلیں (ڈی آر سیز)، پولیس معاونت لائن (پی اے ایل)، آن لائن ایف آئی آر رجسٹریشن، پولیس تک رسائی کی سروس (پی اے ایس) اور پولیس سٹیشنوں میں خواتین کی مدد کے لیے ڈیسکوں کا قیام جیسے مفاد عامہ کے منصوبے شروع کیے گئے۔ آن لائن ایف آئی ایف رجسٹریشن کے باوجود شکایات کے مؤثر ازالے کا مسئلہ حل نہ ہوسکا جس کی بنیادی وجہ انٹرنیٹ سروس کی محدود دستیابی تھی۔ البتہ شکایات فون کے ذریعے بھی درج کروائی جاسکتی تھیں۔

انسانی سرمائے کی ترقی کے لیے پشاور میں اسکول برائے تحقیقات، ایبٹ آباد میں اسکول برائے خفیہ معلومات، پشاور میں اسکول برائے تدابیر، نوشہرہ میں دھماکہ خیز مواد سے نبٹنے کی تربیت کے لیے اسکول، مردان میں بدامنی پر قابو پانے کی تربیت کے لیے اسکول جبکہ سوات اور صوابی میں دو اضافی علاقائی تربیتی اسکول قائم کیے گئے۔

ڈائریکٹوریٹ پولیس شکایات و اندرونی جوابدہی و انضباطی کارروائی کے قیام کے نتیجے میں سال کے دوران 339 بدعنوان پولیس اہلکار برطرف ہوئے۔

محکمہ پولیس میں بہتری لانے کے لیے پولیس کی تنخواہ میں اضافہ، اندرونی رسائی لائن (آئی سی اے ایل) کے ذریعے کانسٹیبلری کی پولیس کمان تک رسائی اور پبلک سروس کمیشن کے ذریعے قابل افسران کی جلد ترقی جیسے اقدامات بھی متعارف کیے گئے۔

بلوچستان

بلوچستان میں قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کی تعداد 33,618 تھی جس میں بلوچستان کانسٹیبلری کے اہلکار بھی شامل تھے تاہم قانونی لحاظ سے یہ تعداد 35,098 ہونی چاہیے۔

ریسکیو ورکرز کوئٹہ کے مضافات میں جلی ہوئی مسافر بس سے شواہد اکٹھا کر رہے ہیں

ماورائے عدالت ہلاکتیں اور زیر حراست ناروا سلوک اور اذیت رسانی ایسے معاملات تھے جن پر 2014 کے دوران کوئی توجہ نہ دی گئی۔

ہوم ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق 2014 کے دوران صوبے سے کل 164 نعشیں برآمد ہوئیں۔ 164 نعشوں میں سے 71 بلوچ تھے، 35 پشتون تھے، 19 دیگر لسانی شناختوں سے تعلق تھے جبکہ 41 مقتولین کی شناخت نہیں ہوسکی تھی۔ سیکرٹری داخلہ کا کہنا تھا کہ غیر شناخت شدہ مقتولین کا تعلق جنگجوؤں یا ریاست مخالف عناصر سے ہوسکتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ان میں سے 80 نعشیں کوئٹہ سے، 41 قلات ڈویژن سے (خضدار، مستونگ)، 41 مکران ڈویژن سے (ضلع پنجگور، گوادر اور تربت)، چھ نصیر آباد ڈویژن سے، 13 ضلع ژوب سے اور آٹھ سبی ڈویژن سے برآمد ہوئی تھیں۔ رپورٹ میں اُن کے مشتبہ قاتلوں کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ 16 جنوری کو خضدار سے تین اجتماعی قبریں برآمد ہوئی تھی اور حکام کے مطابق ان قبروں سے 17 مسخ شدہ نعشیں برآمد ہوئی تھیں جبکہ قوم پرستوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ان قبروں سے 169 نعشیں برآمد ہوئی تھیں۔ اجتماعی قبروں کے معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک عدالتی کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اگست میں کمیشن نے فوج اور خفیہ معلومات کی ایجنسیوں کو واقع کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دے دیا۔

اکتوبر میں لسبیلہ سے نومغوی مزدوروں کی نعشیں برآمد ہوئی تھیں۔ پنجاب کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے مزدوروں کو ایک دن قبل اغوا کیا گیا تھا۔

دہشت گردی کے واقعات اور پُرتشدد جرائم میں زیرِنظر سال کے دوران کمی آئی۔ 2014 میں دہشت گردی/ تخریب کاری کے 169 واقعات رپورٹ ہوئے جبکہ 2013 میں یہ تعداد 276 تھی چنانچہ واقعات میں 39 فیصد کمی آئی۔ 2014 میں ٹارگٹ کلنگ (قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں، ہزارہ برادری کے افراد پنجابی آبادکاروں وغیرہ کی) کے 969 واقعات پیش آئے۔ جبکہ 2013 میں یہ تعداد 95 تھی۔ 2014 میں پولیس کو اغوا برائے تاوان کے 44 واقعات سے مطلع کیا گیا جبکہ 2013 میں یہ تعداد 67 تھی۔

پولیس نے کرائم انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ (سی آئی ڈی) پولیس ٹریننگ کالج، بلوچستان کانسٹیبلری میں اصلاحات متعارف کیں اور انسداد دہشت گردی تربیتی اسکول قائم کیا۔ مسلح افواج کی مدد سے پولیس کی تربیت اور استعداد سازی کی گئی۔ اُنہیں ہتھیار اور گولہ بارود بھی فراہم کیا گیا تاکہ خطرناک مجرموں کے خلاف کارروائیوں میں پولیس کی صلاحیتوں کو بڑھایا جائے۔ گولیوں کو روکنے والی گاڑیاں اور جیمرز بھی حاصل کیے گئے۔ دو کمان وکنٹرول سنٹرز بھی قائم کیے گئے جو سی ٹی ویز کی مدد سے جو مشتبہ افراد کی نقل وحرکت اور کوئٹہ آنے وجانے والی گاڑیوں پر نظر رکھیں گے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے 250 سے زائد مکانات پر 1,400 سے زائد محدود سرکٹ ٹیلی ویژن کیمرے (سی سی ٹی وی) نصب کیے جائیں گے۔

غیر قانونی اسلحہ

پاکستان میں ممنوعہ یا غیر اجازت شدہ اسلحہ رکھنا سنگین جرم ہے اور اس جرم کی سات برس تک سزا دی جاسکتی ہے۔ ہتھیاروں کا پھیلاؤ پاکستان کے تحفظ کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے اور انٹرنیشنل سٹریٹیجک سٹڈیز سنٹرز اسلام آباد کے مطابق اس نے نہ صرف امن وامان کی صورت حال کو متاثر کیا ہے بلکہ شدت پسندی میں اضافے کا سبب بھی بنا ہے۔ عوام کو تحفظ کی فراہمی میں ریاستی نااہلی کے عام تاثر نے بھی لوگوں کو ذاتی تحفظ کے لیے ہتھیار رکھنے پر مجبور کیا ہے۔

ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق ملک میں ممنوعہ اور غیر ممنوعہ ہتھیاروں کی تعداد تقریباً 605,000,000 ہے۔ ان میں سے صرف 50 لاکھ لائسنس یافتہ ہیں۔ صرف کراچی میں قانونی وغیر قانونی ہتھیاروں کی تعداد 170,000,000 تھی جبکہ لاہور میں ان کی تعداد تقریباً 40 لاکھ تھی۔ اطلاعات کے مطابق غیر قانونی ہتھیاروں کی بہت بڑی تعداد پشاور کے مضافات اور قبائلی علاقہ جات میں ہے۔

غیر قانونی ہتھیاروں کو تباہ کیا جا رہا ہے

ستمبر میں وزارت داخلہ کے ایک سینئر اہلکار نے سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلی امور کو بتایا کہ خیبر پختونخوا نے گزشتہ 12 ماہ کے دوران تقریباً 80,000 اسلحہ لائسنس جاری کیے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ گزشتہ ایک برس کے دوران کے پی نے 79,256 جبکہ سندھ نے 7,000 لائسنس جاری کیے۔ پنجاب نے اسی عرصہ کے دوران 2,482 لائسنس جاری کیے جن میں نندی پور پاور پراجیکٹ کے لیے جاری کردہ ممنوعہ بور کے 133 لائسنس بھی شامل تھے۔ بلوچستان نے 1,132 اسلحہ لائسنس جاری کیے تھے۔

2014 میں پنجاب پولیس نے 40,000 اور جبکہ 153,793 غیر قانونی ہتھیار اور گولہ بارود برآمد کیے۔ سندھ اور بلوچستان کے اعداد و شمار پولیس نے فراہم نہیں کیے تھے۔

قانون نافذ کرنے والوں کی زیادتیاں

زیر حراست ایذا رسانی

پاکستان نے 2010 میں ایذا رسانی کے خلاف اقوام متحدہ کے کنونشن کی توثیق کی تھی جس کی رو سے پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملکی قانون سازی کے ذریعے قانون اور ریاستی اہلکاروں کے عملی اقدامات کو ہم آہنگ کرے۔ اگرچہ پولیس آرڈر 2002 نے زیر حراست افراد پر ''ایذا رسانی یا تشدد'' کرنے

دورانِ سال پولیس کی وردی کے ناجائز استعمال کے متعدد واقعات منظر عام پر آئے

پر سزائیں تجویز کی تھیں تاہم عملی لحاظ سے پنجاب اور پختونخوا میں حتیٰ کہ اس قانون کے تحت کام کرنے والے پولیس کے صوبائی محکموں نے سزا کا اطلاق نہیں کیا۔ پولیس تحقیقات کو اس امر کی ضرورت تھی کہ وہ مشتبہ افراد سے تشدد کے ذریعے معلومات لینے کی بجائے جدید سائنسی اور فورنیسک طرائق کار پر انحصار کریں۔ تحفظ پاکستان ایکٹ 2014 ایک نیا قانون جو کہ باضابطہ قانونی کارروائی کے حق کے نفی کرتا ہے، زیر حراست تشدد کی راہ ہموار کرتا نظر آیا۔

ایذا رسانی پاکستان میں عام رہی۔ پولیس اور سکیورٹی ایجنسیاں اس کا تواتر کے ساتھ استعمال کرتی رہیں۔ مشتبہ افراد سے معلومات کے حصول کے لیے ایذا رسانی کی طرف رجوع کرنے اور زیر حراست افراد یا دیگر افراد کو ڈرانے کی اطلاعات ملک بھر سے موصول ہوتی رہیں۔ جبری گمشدہ افراد کی نعشوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتولین کے ساتھ انتہائی افسوسناک سلوک کیا گیا تھا۔

حراستی مراکز میں جرائم کی تحقیقات کے مرحلے کے دوران کئی نوجوانوں سمیت بے شمار زیر حراست افراد کو دل کا دورہ پڑنے کی اطلاعات بھی منظر عام پر آئیں۔ ایچ آر سی پی کے اعداد وشمار کے مطابق جو کہ ذرائع ابلاغ کی خبروں پر مبنی تھے، چار خواتین اور دو بچوں سمیت 63 افراد دوران حراست ہلاک ہوئے جبکہ ایف آئی آر صرف 14 واقعات کی درج ہوئی تھی۔ کوائف کے لیے میڈیا کی مانیٹر شدہ اطلاعات کے مطابق

2014 میں سات خواتین سمیت 47 افراد کو حراست کے دوران ایذا رسانی کا نشانہ بنایا گیا۔

ماورائے عدالت ہلاکتیں

پولیس مقابلے

پولیس مقابلوں میں مشتبہ افراد کی ہلاکتیں ملک بھر میں ہوتی رہیں مگر بڑے شہروں بالخصوص کراچی میں یہ واقعات زیادہ عام تھے۔ 2014 میں تقریباً 3,392 پولیس مقابلے ہوئے جبکہ 2013 میں ان کی تعداد 2,616 تھی چنانچہ اس برس پولیس مقابلوں میں نمایاں اضافہ واضح ہے۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق کراچی میں 925 مشتبہ افراد سکیورٹی فورسز کے ساتھ فائرنگ کے تبادلے میں مارے گئے جبکہ پولیس اور رینجرز کے 160 اہلکاروں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ 701 مشتبہ افراد پولیس مقابلے میں جبکہ 224 رینجرز کی گولیوں کا نشانہ بنے جبکہ رینجرز اور پولیس کے ترجمان کا کہنا تھا کہ شہر میں 17 رینجرز اہلکار جبکہ 143 پولیس اہلکار ٹارگٹ کلنگ کی بھینٹ چڑھے۔

پولیس کے ترجمان کے مطابق قتل ہونے والے پولیس اہلکاروں میں ایس ایس پی سی آئی ڈی چوہدری اسلم خان جو کہ اپنی گاڑی میں خودکش حملے کا نشانہ بنے تھے، پانچ انسپکٹرز، سب انسپکٹرز اور کانسٹیبلز شامل تھے۔

رینجرز کے ترجمان نے بتایا کہ کراچی میں جاری حالیہ آپریشن کے دوران 111 مشتبہ دہشت گرد اور گینگ کے افراد گرفتار ہوئے اور 50 رینجرز اہلکار رہوئے تھے۔

مشتبہ افراد کی ہلاکت نے بسا اوقات ایسی شکایات کو جنم دیا جو کہ خاص طور پر اُن کے اہل خانہ کی طرف سے سامنے آئیں کہ مشتبہ افراد مارے جانے کے وقت پولیس کی تحویل میں تھے یا پھر وہ پولیس کے لیے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھے۔

خیبر پختونخوا میں 26 مشتبہ افراد پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ پنجاب میں تقریباً 276 مشتبہ افراد پولیس مقابلے کا نشانہ بنے اور 322 گرفتار ہوئے جبکہ 27 پولیس اہلکار مارے گئے۔ پنجاب میں 2014 کے دوران 283 پولیس مقابلے ہوئے۔ تقریباً 59 مشتبہ مجرم اور 73 پولیس اہلکار زخمی ہوئے۔

بلوائی انصاف

بلوائی انصاف بشمول مختلف جرائم میں مشتبہ افراد کی مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ہلاکت بدقسمتی سے پاکستان میں نایاب چیز نہیں ہے۔ بعض اوقات ایسے واقعات سے انصاف کی فراہمی پر عدم اعتماد کی نشاندہی

کوٹ رادھا کشن، لاہور: اس مقام پر ہجوم نے مسیحی جوڑے کو آگ لگائی تھی

ہوتی تھی جبکہ بعض اوقات ان سے معاشرے کی بربریت کی عکاسی ہوئی۔

2014 میں بلوائی تشدد کا مظاہرہ زیادہ تر توہین رسالت یا قرآن پاک کی بے حرمتی کے الزامات کے بعد کیا گیا۔ اڈیالہ جیل راولپنڈی میں جیل کے ایک محافظ نے تضحیک مذہب کے الزام میں سزا یافتہ ایک قیدی پر فائرنگ کی۔ اسلام آباد میں واقع سنٹر برائے ریسرچ وسکیورٹی سٹڈیز (سی آر ایس ایس) کے مطابق 1990 سے لے کر اب تک کم از کم 60 لوگوں کو تضحیک مذہب سے متعلقہ واقعات میں ماورائے عدالت قتل کیا جا چکا ہے۔ فہرست میں وکلاء اور قانون میں ترمیم کا مطالبہ کرنے والے سیاستدان تک شامل ہیں۔

جولائی میں گوجرانوالہ میں احمدی کمیونٹی کے ایک فرد پر فیس بک پر تضحیک مذہب والا مواد آویزاں کرنے کا الزام لگایا گیا جس کے بعد ہجوم نے احمدیہ کمیونٹی کے تین افراد کو قتل کر دیا۔ ٹی وی چینلز پر نشر ہونے والی فوٹیج میں ڈنڈوں سے لیس ہجوم کو احمدیوں کے گھر جلانے سے قبل ان کے گھروں کے سامنے نعرے لگاتے ہوئے دکھایا گیا۔

نومبر میں، کوٹ رادھا کشن میں ایک ہجوم نے قرآن پاک کی تضحیک کے الزام میں ایک مسیحی

جوڑے کو مارا اور اُن کی نعشوں کو اینٹوں کے بھٹے میں پھینک دیا جہاں وہ کام کرتے تھے۔ وزیر اعظم نے ہجوم کے ہاتھوں ہونے والے اس بھیانک قتل پر ردّعمل کا اظہار کیا اور اِسے ''بلوائی قتل'' قرار دیا اور کہا کہ ذمہ داران کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

لاہور میں حملہ آوروں کے ایک گروہ نے ایک 25 سالہ لڑکی فرزانہ اقبال کو قتل کر دیا۔ اطلاعات کے مطابق حملہ آوروں میں لڑکی کا والد بھی شامل تھا۔ لڑکی کا قصور یہ تھا کہ اُس نے خاندان کی اجازت کے بغیر پسند کی شادی کی تھی۔

بعض واقعات میں محسوس ہوتا تھا کہ بلوائی انصاف کا سبب پولیس اور فوجداری نظام انصاف میں لوگوں کا عدم اعتماد ہے۔ اکتوبر میں ایک ٹی وی فوٹیج میں کراچی میں چار مبینہ ڈاکوؤں کی مشتعل ہجوم کے ہاتھوں پرتشدد ہلاکت دکھائی گئی اور سرگودھا میں غنڈوں کے ایک گینگ نے ایک پولیس اہلکار کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا جسے ٹی وی فوٹیج پر دکھایا گیا۔

سفارشات

1- پاکستان کو مؤثر تربیت اور ضروری ساز و سامان سے لیس پولیس کی ضرورت ہے جس کے پاس تحقیقات کے جدید طرائق کار اور وسائل ہوں تا کہ جرم اور دہشت گردی کے چیلنج پر قابو پایا جا سکے۔ تربیتی پروگرامز میں ٹیکنالوجی پر مبنی پولیسنگ، ہجوم پر کنٹرول، خفیہ معلومات کا حصول، نقل و حرکت اور رابطہ سازی پر توجہ دی جائے۔

2- پولیس کو کمیونٹیوں کے تعاون سے اور خفیہ معلومات کے حصول میں اُن کی معاونت حاصل کر کے مجرموں سے اپنا علاقہ واپس لینا چاہیے۔ متاثرہ آبادیوں میں تعیناتی کی بدولت پولیس مقامی کمیونٹیوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے، فریقین کی نشاندہی کرنے، مؤثر تحقیقات کرنے اور واقعات پر جوابی کارروائی کرنے کے حوالے سے فوج یا پیرا ملٹری فورسز سے بہتر حالت میں ہے۔

3- ریاست کو چاہیے کہ وہ دہشت گردوں، فرقہ وارانہ گروہوں اور اُن کے رہنماؤں کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتے۔ اُسے منافرت پھیلانے والی تقاریر و تحاریر کا بھی عزم اور قوت کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔ عقیدے کی بنا پر ہونے والے تشدد اور ظلم کا خاتمہ کرنا پڑے گا۔

4- حکام کو چاہیے کہ وہ پولیس کو سیاست سے پاک کریں، فوجداری نظام انصاف کو مستحکم کریں، بہتر نظم ونسق کو فروغ دیں اور معاشرے کو اسلحے سے پاک کرنے کے لیے اقدامات کریں۔

5- بنیادی عدالتی اصلاحات کی اشد ضرورت ہے جس کا مقصد قانونی نظام میں بہتری اور نظام انصاف میں شریک تمام عناصر کا تحفظ ہو تا کہ انصاف کے انتظام وانصرام کو یقینی بنایا جا سکے۔

6- انسداد دہشت گردی کے بیانیے اور حکمت عملی کی تشکیل کے لیے قومی مباحثے کی ضرورت ہے۔

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں

کسی بھی شخص کو جسے گرفتار کیا جاتا ہے' گرفتاری کی وجوہات بتائے بغیر [جتنا بھی جلدی ممکن ہو سکے] حراست میں نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اپنی مرضی کے وکیل سے مشورہ کرنے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہر وہ شخص جسے گرفتار کرنے کے بعد حراست میں رکھا گیا ہے' گرفتاری کے 24 گھنٹے کے اندر' مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔

آئین پاکستان - آرٹیکل- 10 (1)اور (2)]

ہر انسان کا احترام اور وقار اور بشرطیکہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے' خلوت اور تنہائی ناقابل دخل اندازی ہے۔

کوئی معلومات' شہادت' ثبوت حاصل کرنے کی خاطر' کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-14-(1)اور (2)]

کسی شخص کو اذیت رسانی یا ظالمانہ' غیر انسانی یا رسوا کن سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-5]

ہر شخص کو ہر کہیں قانون کے روبرو خود کو انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- 6]

کسی شخص کو غیر قانونی گرفتاری، حراست یا جلاوطنی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 7]

آزادی کے بعد چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود عمومی طور پر ملک میں قیدیوں کی حالت میں قابل ذکر فرق نہیں آیا۔ چھوٹی موٹی بہتری کے سوا، حکام نے جیل کے نظام میں مجموعی طور پر ایسی تبدیلی لانے پر کبھی توجہ نہیں دی جس کے ذریعے مجرموں کا سدھار ممکن ہو سکے۔ جیلوں میں قیدیوں کی تعداد میں بے پناہ اضافے کا حل نئی جیلوں کے قیام کی صورت میں تلاش کیا گیا۔ خاص طور پر پنجاب میں ایسا کیا گیا جہاں یہ مسئلہ سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ بہرحال تعزیری جبر کا معمول، جیلوں میں قیدیوں کی تعداد میں کمی

بیشی کا سبب بنتا ہے اور یہ تعزیری جبر سزا کی ایسی شکل ہے جو تا حال جاری ہے۔ قید کو سزا کے واحد طریقے کے طور پر اپنانے سے نہ صرف جیل میں مسائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس سے پورے خاندانی ڈھانچے کو بھی دھچکہ لگتا ہے۔ عام طور پر لوگ دیوانی، مثال کے طور پر جعلی چیک وغیرہ کے مقدمات میں الجھے رہتے ہیں۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ قید تنہائی کا متبادل مہیا کرنے پر توجہ دے۔ مثال کے طور پر کمیونٹی سروس ایک متبادل ہو سکتا ہے جس کے ذریعے سماجی خدمت ممکن ہے جس سے جیلوں پر دباؤ کم ہو سکتا ہے۔ ایسا مجرم جو زیر حراست نہیں ہے، وکیل دفاع تک اس کی رسائی ممکن ہوتی ہے، وہ کام کاج کر سکتا ہے، رزق کما سکتا ہے اور اپنے خاندان کی کفالت کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی غیر حاضری کے باعث خاندان پر مالی دباؤ بڑھے گا جس کے باعث بچوں کی مشقت میں اضافہ ہوگا۔ اگر کوئی آدمی استحصال کا شکار ہوتا ہے تو اس سے پورا سماجی ڈھانچہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے لوگوں کو معمولی جرائم کی بنا پر جیل بھیجتے وقت ان باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

جیلوں میں قید لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے خلاف مقدمے زیر سماعت ہوتے ہیں جن کی سزائیں ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہوتیں۔ عدالتوں کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ان قیدیوں کے لیے جن کے مقدمات زیر سماعت ہوں، کی آزادی ایک اہم ضرورت ہے چاہیے تو یہ کہ صرف غیر معمولی حالات میں ان لوگوں کو جیل بھیجا جائے جن کے مقدمات زیر سماعت ہوں۔ جیلوں پر دباؤ کم کرنے کے لیے ججوں کے لیے جیلوں کے دورے لازمی قرار دیئے جانے چاہئیں۔ ججوں کے ہفتہ وار دوروں کے دوران اُن قیدیوں کے مقدمات کی سماعت ہونی چاہیے جن کو عمومی حالات میں وکیل صفائی کی خدمات حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی ہے یا جن کے مقدمات الجھاؤ یا پیچیدگی کے باعث سالوں سے زیر سماعت ہوتے ہیں ان کی فوری سماعت کر کے وہیں پر ان کی رہائی کے احکامات جاری کیے جانے چاہئیں۔

مجرم کو اس کی سزا پوری ہونے تک جیل میں رکھا جاتا ہے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ مجرموں کی اصلاح یا ان کی بحالی میں اپنا کردار ادا کرنے میں بطور ادارہ جیل ناکام رہتے ہیں۔ لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ریاست سزا یافتہ مجرموں کو جیل خانوں میں بھیجنے کے بعد بھول جاتی ہے۔ جیلوں میں ان مجرموں کے لیے ووکیشنل ٹریننگ، اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے اور مجرموں کو قانون پسند شہریوں میں ڈھالنے کے مواقع بہت ہی کم ہوتے ہیں اور جب وہ رہا ہو کر واپس معاشرے میں جاتے ہیں تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ مجرمانہ ذہن کے مالک ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کم عمر مجرم بھاگ جائے تو جیل حکام جیلوں میں موجود سکول بند کر دیتے ہیں یا اس خوف سے جیلوں کے اندر فیکٹریاں بند کر دیتے ہیں کہ کہیں خام مال کو غلط طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ جیلوں کے اندر کڑی نگرانی اور سکیورٹی کو بہتر بنانے کی بجائے چند لوگوں کے گناہوں کی سزا تمام قیدیوں کو بھگتنا

جیلوں میں خواتین اور بچوں کی تعداد مردوں کی نسبت کم تھی

پڑتی ہے۔جیل حکام کو چاہیے کہ ایسے قیدیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ انہیں سہولتیں مہیا کی جائیں جو اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کے خواہش مند ہیں اور تعلیمی میدان میں شاندار کارکردگی دکھاتے ہیں یا بہترین ہنرمند کے طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

جیلوں میں صحت کے حوالے سے علاج معالجے پر صرف اس وقت توجہ دی جاتی ہے جب قیدیوں کی خوراک میں کوئی کراہت آمیز مواد نکل آئے یا ایسی خوراک کھانے کے باعث قیدی بے ہوش ہو جائیں یا دوا دارو نہ ملنے یا تاخیر سے ملنے کے باعث کسی قیدی کی موت واقع ہو جائے۔جیلوں میں ملنے والی خوراک شاذ و نادر ہی معیار کے مطابق ہوتی ہے اور جیل حکام اس حوالے سے احتیاط نہیں برتتے اور نہ ہی وہ جیل مینو پر عمل درآمد کرواتے ہیں۔قیدی غیر معیاری خوراک کی اکثر شکائتیں کرتے ہیں اور اپنا راشن خود خریدتے اور خود ہی پکاتے ہیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے 14-2013ء کے دوران پاکستان کی چند منتخب جیلوں کا ایک سروے کروایا۔اس سروے کے مطابق ایچ آر سی پی کو جیل ہسپتالوں میں بستروں کی کمی کے علاوہ سینکڑوں قیدی مریضوں کے لیے ادویات میسر نہ ہونے کی شکایات کا سامنا کرنا پڑا۔کسی بھی جیل میں کل وقتی خاتون ڈاکٹر نہیں پائی گئی۔ان خواتین قیدیوں کو جنہیں سنگین امراض لاحق تھے، مقامی ہسپتالوں میں بھیجنا پڑتا تھا۔یہ

بھی اطلاعات تھیں کہ جن خواتین قیدیوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جانا مقصود ہوتا تھا، انہیں عمومی طور پر جیل کے ہسپتالوں میں بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ جیل کی ہولناک بیرکوں میں رہنے سے بچ سکیں۔

ایچ آر سی پی کو صوبوں سے جیلوں میں قیدیوں کی تعداد سے متعلق دستاویزات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ان دستاویزات میں جیلوں میں موجود کل آبادی، منظور شدہ گنجائش، مجرموں، ملزموں، سزائے موت کے قیدیوں، خواتین اور نوعمر قیدیوں کی تعداد درج ہوتی ہے۔ دو برس تک ایچ آر سی پی متعدد درخواستوں کے باوجود سندھ سے یہ فہرست حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اسی حوالے سے 2014ء میں ایچ آر سی پی کو اپنے خطوط اور ٹیلی فون کالز کا جواب خیبر پختونخوا حکومت سے نہیں مل سکا حالانکہ یہ معلومات 2013ء کے رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کے تحت عوام کو فوری طور پر دستیاب ہونی چاہیے تھیں۔

غیر ملکی قیدیوں، جن کی زیادہ تر تعداد منشیات کی اسمگلنگ کے مقدمات میں ملوث ہوتی ہے، کے حالات زیادہ خراب نظر آئے اور اس کی بنیادی وجہ لسانی رکاوٹیں اور قانونی معاونت کا نہ ہونا ہے۔ ان کی اکثر تعداد کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کے سفارت خانوں نے انہیں بے یارومددگار چھوڑ دیا ہے۔ ان کے لیے وکیل دفاع تک نہیں کیا جاتا۔ بھارت میں پاکستانی قیدیوں اور پاکستان میں بھارتی قیدیوں کے ساتھ سلوک دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کے اتار چڑھاؤ سے جڑا ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کے ساتھ دشمن کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے نہ تو جیل حکام اور نہ ہی ساتھی قیدیوں میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

پھانسی کی سزا ساڑھے گیارہ برس تک غیر سرکاری طور پر عارضی معطّلی کا شکار رہی۔ 16 دسمبر کو پشاور کے آرمی پبلک سکول میں ہونے والے بم دھماکوں کے نتیجے میں دہشت گردوں کو عبرتناک سزائیں دینے کی آڑ میں یہ معطّلی ختم کر دی گئی۔ چنانچہ سال کے اختتام تک گیارہ مجرموں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ جرائم کے تفتیشی نظام میں موجود خامیوں کے باعث اس بات کا امکان موجود رہتا ہے کہ کسی بھی فرد کو غلط طور پر سزا مل جائے اور پھانسی کی سزا کے خلاف یہ ایک وزنی دلیل ہے۔ اگست میں چند مجرموں کے ڈیتھ وارنٹ جاری کیے گئے تھے اور امکان تھا کہ پھانسی کی سزا پر عمل درآمد رُک جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس اور سرکاری اعلان یا وضاحت کے بغیر ہی فیصلے کو برقرار رکھا گیا۔

جبری اور غیر اختیاری گمشدگیوں کا پریشان کن رجحان بلوچستان، خیبر پختونخوا اور سندھ میں جاری رہا جہاں درجنوں طالب علموں اور قوم پرست سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنوں کو اُٹھا کر غائب کر دیا گیا۔ ان پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ ان کی جانیں چلی گئیں اور پھر ان کی نعشوں کو دور دراز کے علاقوں میں پھینک دیا گیا۔ جبری اور غیر اختیاری گمشدگیوں کو انتہائی قبیح اور وحشیانہ جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ یہ عمل انسانی

قیدیوں کی پر ہجوم گاڑی کے گرد اُن کے رشتہ داروں / دوستوں کی بھیڑ

حقوق کی شدید خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ محض اس لیے نہیں کہ متعلقہ فرد پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اس عمل کے باعث لواحقین کن مشکلات سے گزرتے اور زندگی کے عذابوں کو بھگتنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پاکستان نہ صرف یہ کہ جبری گمشدگیوں کے خلاف رسمی معاہدے پر عمل درآمد میں کامیاب نہیں رہا بلکہ اس کی خلاف ورزی پر سزا دینے میں بھی ناکام رہا ہے۔ فوری انصاف مہیا کرنے کے قابل عدالتی نظام کی غیر موجودگی میں دہشت گردی کا توڑ کرنے کے لیے جبری گمشدگی کو بطور قانونی طریقہ استعمال کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ جرم چاہے کیسا بھی ہو، کسی بھی شخص کو غیر قانونی طور پر اٹھایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اسے برسوں تک غیر قانونی حراست میں رکھا جا سکتا ہے۔ جبری اور غیر اختیاری گمشدگیوں پر کام کرنے والے اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ نے 2012ء میں پاکستان کا دورہ کیا اور اس بدی کے خاتمے کے لیے حکومت کو بہت سی سفارشات بھی پیش کیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک سفارش پر بھی عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس حکومت نے انسانی حقوق کے معیارات اور آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے منافی قوانین منظور کیے۔

پاکستان میں قیدی:

پاکستان میں قیدیوں کی حالت ہمیشہ وحشت ناک ہی رہی ہے۔ سال 2014ء کے دوران جیلوں میں گنجائش سے کہیں زیادہ قیدیوں کی تعداد، قیدیوں کے لیے صحت کے مناسب انتظام کا فقدان، بے حد کم معیار کا کھانا، بدعنوانی، رشوت ستانی اور بے مہار تشدد کا سلسلہ گزشتہ برسوں کی طرح جاری رہا۔

نشہ آور ادویات اور جرائم کے حوالے سے اقوام متحدہ کے دفتر، یونائیٹڈ نیشنز آفس آن ڈرگز اینڈ کرائمز (یو این او ڈی سی) کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی جیلوں میں آٹھ سو کے قریب قیدی خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ قیدی خواتین کو حفظان صحت کے منافی حالات اور مناسب علاج معالجے کی سہولتوں کے فقدان کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ عام طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ قیدی خواتین کو جیل وارڈنوں کے ہاتھوں جنسی تشدد اور نفسانی درندگی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جیلوں کے سروے کے دوران یو۔ این۔ او۔ ڈی۔ سی کو معلوم ہوا کہ قیدی خواتین کی بڑی تعداد عمومی طور پر خودکشی کی علامات کا شکار پائی گئیں۔ اس کے علاوہ قیدی خواتین نیند کی بے قاعدگی اور بے نظمی کا شکار ہونے کے علاوہ دوسرے ذہنی امراض میں مبتلا دیکھی گئیں۔ پنجاب بھر کی کسی جیل میں بلاوے پر کوئی گائنا کالوجسٹ (امراضِ نسواں کی ماہر ڈاکٹر) میسر نہیں ہو سکتی جو قیدی خواتین کا علاج معالجہ کر پائے۔

فروری میں حکومت پنجاب نے 2014ء کے مالی سال کے لیے محکمہ جیل خانہ جات کو ایک ارب روپے کی رقم جاری کرنے کی منظوری دی۔ گزشتہ برس کے اس بجٹ میں سے ساٹھ لاکھ ننانوے ہزار روپے کی رقم نئے جیل خانوں کی تعمیر، سکیورٹی بیرکوں، مختلف آلات اور طبی سہولتوں پر خرچ کی گئی۔ 14-2013ء کے مالی سال کے لیے کل ایک ارب 9 لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی جس میں سے 81 لاکھ نوے ہزار روپے کی رقم سال بھر میں خرچ کی گئی۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ملک بھر میں جیلوں کا نظام انتہائی ابتری کا شکار ہے۔ اس کے باوجود جیلوں کے لیے مختص بجٹ میں سے 271 ملین روپے کی رقم کو بچا کر حکومت کو واپس دیا گیا۔

جیلوں میں گنجائش سے زائد قیدی: دو تہائی قیدیوں کے مقدمات زیرِ سماعت تھے:

علاقے	جیل خانوں کی تعداد	جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش	تمام جیلوں میں قیدیوں کی کل تعداد	قیدیوں کی تعداد جن کے مقدمات زیرِ سماعت ہیں
پنجاب	32	21,527	49,560	32,514
سندھ (2 ستمبر 2014ء تک)	25	12,416	18,726	15,248
بلوچستان	11	2,585	2,980	1,214
خیبر پختونخوا	22	7,982	اعداد و شمار میسر نہیں	اعداد و شمار میسر نہیں
گلگت بلتستان	7	700	307	212
ٹوٹل	**97**	**45,210**	**71,567**	**49,188**

علاقے	خواتین	کم سن قیدی (بچے)	جیلوں کی کل آبادی
پنجاب	887	764	49,560
سندھ (2 ستمبر 2014ء) تک	168	313	18,726
بلوچستان	24	46	2,980
خیبر پختونخوا	اعداد و شمار میسر نہیں	اعداد و شمار میسر نہیں	اعداد و شمار میسر نہیں
گلگت بلتستان	3	3	307
ٹوٹل	**1,082**	**1,126**	**71,567**

جیلوں میں گنجائش سے کہیں زیادہ قیدیوں کی تعداد کے باعث جہاں متعدد انتظامی مسائل پیدا ہوتے ہیں، وہیں قیدیوں کی صحت اور ان کی دیکھ بھال کے حوالے سے بھی تشویش کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ گلگت بلتستان کے سوا ملک بھر کی باقی تمام جیلوں میں سرکاری طور پر منظور شدہ تعداد سے کہیں زیادہ قیدی موجود ہیں۔ پنجاب میں قیدیوں کی تعداد سرکاری گنجائش سے 130 فیصد زیادہ ہے۔صورت حال یہ ہے کہ بعض بیرکوں میں کچھ قیدیوں کو کھڑے رہنا پڑتا ہے تاکہ باقی قیدی نیند پوری کر سکیں۔ بہت سے قیدی رات کے وقت غسل خانوں میں نہیں جا سکتے اس لیے کہ غسلخانوں کے راستے میں قیدی سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بُرے برتاؤ کی تعریف میں آتی ہے اور یہ سزا اس سزا سے ہٹ کر ہوتی ہے جو قیدیوں کو عدالتوں سے ملتی ہے اور جسے قیدیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔اس طرح گتھم گتھا ہو کر رہنے اور دن بھر سورج کی روشنی سے محروم رہنے کے سبب قیدی جلدی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس کے علاوہ قیدیوں کی عمومی صحت پر بھی انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

جیل خانہ جات کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل (ڈی آئی جی) نے 15 نومبر کو لاہور ہائی کورٹ کو بتایا کہ پنجاب میں ایک ماہ کے اندر چھ نئی جیلیں کام شروع کر دیں گی۔ یہ جواب ہائی کورٹ میں دائر کی جانے والی ایک پٹیشن کی سماعت کے دوران دیا گیا۔پٹیشن ایک وکیل نے پنجاب کی جیلوں میں گنجائش سے کہیں زیادہ قیدیوں کو رکھنے کے خلاف دائر کرائی تھی۔ ڈی آئی جی نے کہا تھا کہ ساہیوال میں ہائی سکیورٹی جیل، ڈسٹرکٹ جیل پاک پتن، ڈسٹرکٹ جیل بھکر، ڈسٹرکٹ جیل لیّہ، ڈسٹرکٹ جیل اوکاڑہ اور لاہور سنٹرل جیل میں فیملی رومز کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور ان کے لیے عملہ پہلے ہی بھرتی کیا جا چکا ہے۔عدالت نے ڈی آئی جی سے کہا کہ وہ صوبے میں زیرِ تعمیر مزید گیارہ جیلوں کی تفصیلات عدالت میں پیش کریں۔ سال کے اختتام تک ان میں سے کسی بھی جیل نے کام شروع نہیں کیا تھا۔ان نئی جیلوں سے متعلق اعلان مارچ 2012ء میں اس وقت کیا گیا

جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدی

تھا جب پنجاب کے دس اضلاع میں نئی جیلوں کے قیام کے لیے چالیس کروڑ روپے کا ابتدائی بجٹ منظور کیا گیا تھا۔ پنجاب اسمبلی کے ایک سیشن کے دوران وزیر جیل خانہ جات نے ایوان کو بتایا کہ پنجاب کی 14 جیلوں میں جام کرنے والے آلات نصب کر دیئے گے تھے جبکہ وعدہ یہ کیا گیا تھا کہ مالی سال کے اختتام تک صوبے کی تمام جیلوں میں یہ آلات نصب کر دیئے جائیں گے۔ ملتان اور فیصل آباد کی جیلوں میں 2014ء کے دوران فیملی رومز تعمیر کیے گئے۔

جیلوں میں حفظانِ صحت کے منافی حالات، غیر صحت مند خوراک کے علاوہ گنجائش سے کہیں زیادہ قیدیوں کی تعداد کے سبب صحت کے پیچیدہ مسائل اُبھر کر سامنے آئے۔ پنجاب اسمبلی کے ایک اجلاس کے دوران پنجاب کے وزیر جیل خانہ جات نے کہا کہ دسمبر 2014ء تک صوبے بھر کی جیلوں میں ایچ آئی وی کے 80، اور ایڈز کے 31 مریض تھے۔ وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ قیدیوں کی خوراک پر اُٹھنے والے اخراجات کو بڑھا کر 80.9 روپے فی قیدی کر دیا گیا ہے۔ تاہم پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے فیکٹ فائنڈنگ (حقائق معلوم کرنے والے) مشنوں کو 2013ء اور 2014ء میں پاکستان بھر کی 13 جیلوں میں حقائق جاننے کے دوران کھانے کے معیار میں بہتری دیکھنے میں ناکامی ہوئی۔ اکتوبر میں ڈسٹرکٹ جیل سوات میں مضرِ صحت کھانا کھانے سے سترہ قیدی بے ہوش ہوگئے۔ متاثرہ قیدیوں کو علاج کے لیے فوری طور پر سیدو شریف ہسپتال پہنچایا گیا جبکہ دو اہلکاروں کو ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔ ایچ آر سی پی نے

جیلوں میں فنونِ لطیفہ

جیلوں کے جو سروے کیے، ان کے مطابق جیلوں کے حالات میں بہتری کی بہت زیادہ گنجائش موجود ہے۔

جیلوں میں ہونے والے فسادات پر قابو پانا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً ایسی جیلوں میں جہاں نمایاں دہشت گردوں کو رکھا گیا ہو، فسادات پر قابو پانا بے حد مشکل ہو چکا ہے۔ 5 جنوری کو سنٹرل جیل پشاور میں طالبان کے دو گروہ متصادم ہو گئے۔ یہ تصادم نماز عصر پر ہوا۔ ایک گروہ باجماعت نماز پہلے ادا کرنا چاہتا تھا جبکہ دوسرا گروہ اس کو ایسا نہیں کرنے دے رہا تھا۔ جیل کے عملہ کو صورت حال پر قابو پانے میں آدھا گھنٹہ لگا لیکن اس دوران سات قیدی تصادم کے باعث زخمی ہو چکے تھے۔ فوجی جوان بھی جیل پہنچ گئے لیکن اس وقت تک صورت حال پر قابو پایا جا چکا تھا۔ خیال رہے کہ صرف دو روز قبل سکیورٹی فورسز نے جیل کی 18 گھنٹے تک تلاشی لی اور سکیورٹی کو بہتر بنانے کے لیے جیل ہی میں قیام پذیر تھیں۔

10 جنوری کو کوٹ لکھپت، جیل لاہور میں مسیحی اور مسلمان قیدیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ اس واقعہ سے چند ہفتے پہلے ایک مسلمان استاد نے ایک مسیحی پادری کو متنبہ کیا تھا کہ وہ جیل میں مسیحیت کی تبلیغ نہ کرے۔ ان دونوں کے درمیان بحث نے آخرکار جھگڑے کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجے میں مسیحیوں اور مسلمانوں میں تصادم ہو گیا۔ جیل ملازمین نے چند مسیحی قیدیوں کو علیحدہ بیرک میں بند کر دیا جس کے بارے میں انہوں نے اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دی، اور گھر والوں کو بتایا کہ جیل کے عملہ نے ان سے بدسلوکی کی تھی اور ڈنڈوں سے ان کی پٹائی بھی کی تھی۔ اس شکایت پر پولیس نے انہیں آدھے گھنٹے تک مارا جس سے 33

قیدی شدید زخمی ہو گئے۔ اس بارے میں اطلاع چند قیدیوں نے دی تھی۔ جیل حکام نے کہا کہ انہوں نے 5 مسیحی قیدیوں کے خلاف ایف آئی آر درج کرا دی تھی۔ بہرحال ایسی کوئی ایف آئی آر نہیں مل سکی اور نہ ہی جیل کے روزنامچہ میں اس تصادم کا کوئی ریکارڈ ملتا ہے۔

کالعدم تحریک طالبان پاکستان کی ترجمانی کے ایک دعویدار نے کراچی کے ایک مقامی اخبار کو ٹیلی فون کر کے بتایا کہ اس نے کراچی سنٹرل جیل کے حکام کو ٹیلی فون کے ذریعہ متنبہ کیا تھا کہ وہ ایک سو کے قریب طالبان قیدیوں پر تشدد کرنے اور ان سے بُرا سلوک روا رکھنے سے باز رہیں۔ اس شخص نے جیل حکام کو دھمکی دی کہ اس کا حشر ڈی ایس پی کرائم انویسٹی گیشن چودھری اسلم جیسا ہو گا جنہیں 9 جنوری 2014ء کو کراچی میں ان کی کار پر بم حملہ کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ ٹیلی فون کرنے والے نے کہا کہ سکھر جیل میں طالبان قیدیوں کو چھڑیوں سے مارا گیا اور انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا جبکہ سنٹرل جیل کراچی میں طالبان قیدیوں کو ان کے خاندان کے افراد سے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔ فون کرنے والے نے کہا کہ اگر طالبان قیدیوں کو ایک سے دوسری جیل منتقل کیا گیا تو وہ سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے بیٹے کو جو مئی 2013ء سے طالبان کے قبضے میں ہیں، ایسی جگہ منتقل کر دیں گے جہاں سے ان کی واپسی ناممکن ہو جائے گی۔

اس سب کچھ کے باوجود سال کے دوران کچھ مثبت کوششیں بھی کی گئیں جن میں ضرورت مند قیدیوں کو انصاف مہیا کرنے کے لیے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کو متعارف کرانا شامل ہے۔ 2010ء کی ابتداء میں پنجاب کی جیلوں میں خطرناک مجرموں کے مقدمات کی سماعت کے لیے ویڈیو کانفرنس کے لیے آلات نصب کیے گئے۔ تاکہ مجرموں کو عدالتوں میں لے جانے اور وہاں سے واپسی کے دوران لاحق ہونے والے خطرات کو بہت حد تک کم کیا جا سکے۔ یہ سہولت اس لیے بھی کارآمد ثابت ہوئی کہ اس سے قانونی نمائندگی کے بغیر قیدیوں کی شناخت کا طریقہ آسان ہو گیا اور ایسے قیدیوں کو مفت قانونی امداد مہیا کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔ تاہم کوٹ لکھپت جیل میں جہاں یہ نظام کافی عرصہ سے نصب کیا گیا تھا صحیح طور پر کام نہ کر سکا اور اس نظام میں موجود کچھ خامیاں سامنے آئیں۔ کئی گھنٹوں کی بجلی کی لوڈشیڈنگ کے باعث یہ نظام صحیح طور پر کام نہ کر سکا۔ چونکہ عدالتوں میں ہر روز سینکڑوں مقدمات کی سماعت ہوتی ہے اور اگر بجلی کا گھنٹوں انتظار کرنا پڑے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے کس قدر قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے۔

جیل سے فرار:

ملک میں جیلوں کے حوالے سے ہونے والی گفتگو عمومی طور پر جیلوں کی بہتر حفاظت کے اردگرد ہی گھومتی ہے جبکہ جیلوں کی دیکھ بھال اور جیلوں سے حقیقی یا فرضی فرار سال بھر کے دوران ایک بڑے مسئلہ کے

قیدیوں کو فرار کروانے کے لیے کھودی گئی سُرنگ سے متعلق بریفنگ

طور پر درپیش رہا۔ جیلوں میں زیر استعمال حفاظتی آلات یا تو ناقص پائے گئے یا پھر ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ نومبر کے آخر تک پنجاب کی پندرہ جیلوں میں فون جیمرز (فون پر ہونے والی گفتگو کو نا قابل فہم بنانے والے آلات) نصب کیے گئے۔ ان جیمرز کی تنصیب سے پہلے صورت حال یہ تھی کہ جیلوں میں قید نہ صرف بڑے مجرم سیل فون جرائم کے لیے استعمال کرتے تھے بلکہ دہشت گرد اپنی کارروائیاں جیلوں میں بیٹھ کر سیل فونوں کے ذریعے کرتے تھے جس نے حکام کو ہراساں کر دیا تھا۔ جیلوں کے ڈھیلے ڈھالے حفاظتی نظام میں مزید خرابی جیل حکام کی رشوت ستانی نے پیدا کی۔ جیلوں سے قیدیوں کے فرار کو پیسے لے کر ممکن بنایا جاتا اس کے علاوہ جیلوں کے اندر سیل فون استعمال کرنے کی اجازت بھی رشوت لے کر دے دی جاتی۔

خیبر پختونخوا کے ضلع ٹانک میں صدر پولیس سٹیشن سے دو قیدیوں کو آسانی کے ساتھ فرار کرا دیا گیا۔ 9 فروری کو جب قیدیوں کو نماز کی ادائیگی کے لیے کوٹھڑیوں سے نکال کر صحن میں لایا گیا تو تین قیدی تھانے کے سامنے والے گیٹ سے با آسانی فرار ہو گئے۔ ان کے فرار کا علم پولیس کو اس وقت ہوا جب نماز کے بعد ان کی گنتی کی گئی۔ ان میں سے ایک مفرور گرفتار کر لیا گیا جبکہ باقی دو قیدیوں کی تلاش آج تک جاری ہے۔ ان قیدیوں کا فرار بے حد آسان تھا۔ اس لیے کہ جوڈیشل لاک اپ میں 15 قیدیوں کی گنجائش تھی جبکہ فرار کے وقت اس لاک اپ میں وہ 62 قیدی رکھے گئے تھے جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

3 جنوری کو فوج نے پشاور کی سنٹرل جیل کی تلاشی لی۔ اس تلاشی کا سبب انٹیلی جنس ایجنسیوں کی وہ

اطلاعات تھیں جن کے مطابق دہشت گردوں نے وہ جیکٹس جیل میں قید طالبان قیدیوں کے درمیان تقسیم کی تھیں جن کے بارے میں خیال تھا کہ وہ دھماکہ خیز مواد سے بھری ہوئی تھیں اور ان جیکٹوں کو بعد میں خودکش حملوں میں استعمال کیا جانا تھا۔ 150 فوجی اہلکاروں نے رات دس بجے تلاشی کا کام شروع کیا اور ممکنہ چھپے ہوئے دھماکہ خیز مواد کو تلاش کرتے رہے۔ اس سے ایک روز قبل ایک طالبان قیدی نے ایک پولیس اہلکار سے درخواست کی تھی کہ وہ جیل کے گیٹ پر کچھ جیکٹس وصول کرلے۔ پولیس اہلکار نے وہ جیکٹس اپنی تحویل میں لے لیں لیکن قیدی طالبان تک منتقل نہیں کیں۔ سکیورٹی فورسز نے دھماکہ خیز مواد کے متعلق اطلاع کرنے والے آلات اور سونگھنے والے کتوں کے ساتھ اس آپریشن کا آغاز کیا، فوجی جوانوں نے قیدیوں سے ملنے والی ٹیلی فون سمیں اپنی تحویل میں لے لیں۔ کہا جاتا ہے کہ فوج نے دوروز تک جیل کا کنٹرول اپنے پاس رکھا اور بعد میں وقتاً فوقتاً وہاں چھاپے مارتے رہے۔ انہوں نے ایک پولیس کانسٹیبل کو حراست میں بھی لیا اور اس کو دہشت گرد قیدیوں کے ساتھ تعلق رکھنے کے الزام میں نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا۔ جیل انتظامیہ کو بتایا گیا کہ یہ آپریشن سکیورٹی ریہرسل سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ بعد میں یہ واقعہ اخبارات اور میڈیا کے دوسرے ذرائع کی زینت بنا لیکن میڈیا کو یہی بتایا گیا کہ شاید قیدی نے انتہائی سرد موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے جیکٹوں کی فراہمی کا آرڈر دیا تھا۔

اکتوبر میں رینجرز اہلکاروں نے کراچی میں جیل سے فرار کی بڑی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ فرار کے لیے ایک زیرزمین سرنگ کھودی گئی تھی۔ تقریباً پانچ ماہ قبل متعدد مشتبہ افراد نے سنٹرل جیل کراچی کے قریب غوثیہ کالونی میں ایک گھر خریدا تھا اور تقریباً ایک سو قیدیوں کو فرار کرانے کے لیے 45 میٹر طویل سرنگ کھودی۔ انٹیلی جنس رپورٹوں کے ذریعے مقامی پولیس کو اس سرنگ کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب جیل کی بیرکوں تک پہنچنے میں صرف دس میٹر لمبی کھدائی ہونا باقی رہ گئی تھی۔ خریدے گئے گھر سے یہ فاصلہ تقریباً 55 میٹر تھا۔ سندھ میں پاکستان رینجرز کے ایک نمائندے نے تصدیق کی کہ گرفتار کیے گئے افراد کا تعلق ایک کالعدم تنظیم سے تھا تاہم نمائندے نے گرفتار کیے گئے افراد کی تعداد نہیں بتائی۔ بعد میں جیل خانہ جات کے صوبائی وزیر اور جیلوں کے انسپکٹر جنرل نے بتایا کہ وہ مکان ایک پولیس کانسٹیبل سے مارکیٹ سے کہیں زیادہ داموں پر خریدا گیا تھا۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی سربراہی ہوم سیکرٹری کر رہے تھے۔ اس کمیٹی کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ وہ معلوم کرے کہ مجرموں کو کہیں جیل کے اندر سے تو مدد نہیں مل رہی تھی۔

4 فروری کو صوبہ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ کے دالبندین پولیس سٹیشن سے چار قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ چاروں قیدی قتل، چوریوں، ڈکیتیوں، اغوا اور دوسرے بہیمانہ جرائم میں ملوث

تھے اوران پر مقدمات چل رہے تھے۔ ان چھ افراد نے لاک اپ کی پچھلی دیوار توڑی اور 3 فروری کی رات کو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ غفلت برتنے پر پولیس کے گیارہ اہلکار معطل کر دیئے گئے۔ ان قیدیوں کو دوبارہ گرفتار کرنے کے لیے چاغی اور نوشکی کے اضلاع میں ان کی تلاش کی گئی لیکن آپریشن ناکام رہا۔

حراست کے دوران تشدد:

تعزیرات پاکستان کے مطابق تشدد کے ذریعے حاصل کی گئی شہادت کو عدالت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود حراست کے دوران تشدد ملک بھر کی جیلوں اور تھانوں میں آج بھی رائج ہے۔ تشدد کیا ہے؟ تعزیرات پاکستان میں اس کی تعریف ہونا ابھی باقی ہے۔ اس لیے اس سے متعلق تمام معاملات کو شدید جسمانی آزار کی شقوں کے تحت نپٹایا جاتا ہے۔ پولیس آرڈر 2002ء میں تشدد کی جو انتہائی محدود تعریف کی گئی ہے وہ پولیس اہلکاروں کی طرف سے ہونے والے تشدد کے زمرے سے آگے نہیں نکلتی اور وہ بھی اس وقت جب کسی زیرِ حراست شخص سے کچھ قبول کروانا ہو۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر قانون نافذ کرنے والے حکام رشوت لینے کے الزام کو قبول کروانے کے لیے تشدد کرتے ہیں تو یہ اس تشدد کی تعریف میں نہیں آتا جس پر تعزیر لگی ہے۔ تفتیش اور تحقیقات کے دوران ڈی این اے ٹیسٹنگ وغیرہ جیسے جدید ترین طریقوں کے عدم استعمال کے باعث تفتیشی ٹیم کے پاس جرم کو ثابت کرنے کا ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے اعترافِ جُرم۔ کسی بھی سال میں ہونے والی سزاؤں پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر مقدمات میں کسی بھی شخص کو سزا دینے کے لیے جو بنیادی شہادت استعمال کی گئی، وہ اعتراف ہی ہے۔ شاید پولیس حکام کے لیے سزا اور طول پکڑتے ہوئے مقدمے کے درمیان صرف ایک ہی چیز موجود ہے اور وہ ہے تشدد کے ذریعے اعتراف کروانا۔ حکومت کو اس کے متبادل اور تفتیش کے زیادہ پیچیدہ طریقے اختیار کرنے پر زیادہ توجہ دینے کے ساتھ ساتھ سرمایہ کاری بھی کرنی چاہیے تاکہ پولیس حکام کا یہ احساس جاتا رہے کہ کسی بھی ملزم سے جرم کا اعتراف کرانے کے لیے اس پر تشدد کرنا ان کا استحقاق ہے۔

حراست کے دوران نوجوانوں یا بظاہر صحت مند افراد کی حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث ہونے والی اموات کی شرح پریشان کن حد تک بڑھ چکی ہے۔ افراد، چاہے وہ ملزم ہوں یا بغیر کسی وجہ کے زبردستی گرفتار کیے گئے ہوں، عمومی طور پر پولیس کے ذریعے اٹھوا لیے جاتے ہیں اور چند روز کے اندر اندر ان کی نعشیں ان کے خاندانوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں، ان کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں خال خال ہی مشتہر کی جاتی ہیں اور کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ پولیس والوں کے خلاف جرم ثابت ہو یا ان کے خلاف مقدمہ چلایا

2014 کے دوران جیلوں میں 72 قیدی ہلاک ہوئے جبکہ 43 قیدی حادثات یا مختلف تصادموں کے دوران زخمی ہوئے

جائے۔

21 نومبر کو ایک شخص کو نشہ آور ادویات فروخت کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ اگلے ہی روز پولیس نے بتایا کہ حراست میں اس کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی نعش اس کے خاندان کے حوالے کر دی گئی۔ خاندان کے لوگوں نے لاہور میں گرین ٹاؤن پولیس سٹیشن کے سامنے مظاہرہ کیا اور ایس ایچ او (تھانیدار) کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا مطالبہ کیا۔ مظاہرین کے مطالبے پر توجہ دینے کی بجائے پولیس نے 10 مظاہرین کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ مظاہرہ اس وقت ختم ہو گیا جب ڈی آئی جی نے سٹی پولیس افسر (سی سی پی او) کو معاملے کی تحقیقات کا حکم دیا۔

جیل کے عملہ کی طرف سے قیدیوں کو مقدمات کی سماعت کے لیے عدالت میں لے جانے کے لیے رشوت طلب کرنے کی خبریں تھیں۔ جو لوگ رشوت نہیں دے سکتے تھے یا انہوں نے رشوت دینے سے انکار کر دیا تھا، انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جون میں سنٹرل جیل لاہور کے سپرنٹنڈنٹ نے ایک قیدی کو اس قدر مارا کہ اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ قیدی نے اس تشدد کے خلاف عدالت میں مقدمہ کر دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے جیل حکام سے کہا کہ وہ کمرۂ عدالت سے باہر چلے جائیں تا کہ قیدی اپنا بیان ریکارڈ کروا سکے۔ قیدی نے کہا کہ اگر قیدی جیل اہلکاروں کے مطالبے پورے نہ کریں تو قیدیوں کے سر کے بال اور بھنوئیں مونڈ دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان پر بہیمانہ تشدد کیا جاتا ہے۔ بہرحال، بعد میں قیدی نے تشدد میں ملوث جیل حکام کو معاف کر دیا۔

مئی میں چار ایم اے پاس 68 سالہ شخص کو قتل کے الزام میں سزا ہوئی اور اسے اڈیالہ جیل میں رکھا

گیا جہاں اس پر تشدد کیا گیا۔ اس کو ننگا کیا گیا جس پر اس نے جیل حکام کے رویہ کے خلاف احتجاج کیا۔ معمول کی تلاشی کے دوران جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اس کی دو واسکٹیں اٹھا کر لے گیا جس پر قیدی نے احتجاج کیا۔ اے ایس پی اس کو زبردستی صحن میں لایا اور دوسرے قیدیوں کے سامنے اس پر نہ صرف تشدد کیا بلکہ اس کو ننگا کر دیا اور اس کو غلیظ گالیاں دیں۔ قیدی کی بیٹی نے اسلام آباد ہائی کورٹ میں جیل حکام کے خلاف پٹیشن دائر کی۔ 28 مئی کو پٹیشن کی سماعت کے دوران جج نے آئی جی جیل خانہ جات کو ہدایت کی کہ وہ اس واقعہ کی تحقیقات کر کے اس کی رپورٹ عدالت میں پیش کرے۔ عدالت نے جیلوں میں رائج دوہرے معیار کے بارے میں بتایا اور کہا کہ جیلوں میں چند پسندیدہ قیدیوں کو تو ایل سی ڈی ٹیلی وژن بھی بیرکوں میں مہیا کر دیئے جاتے ہیں جبکہ باقی قیدیوں کو درد سے نجات دلانے والی گولیاں تک مہیا نہیں کی جاتیں۔ پٹیشن داخل کرنے والے قیدی نے بتایا کہ جیل کا عملہ اس سے باقاعدگی کے ساتھ رشوت طلب کرتا ہے اگرچہ وہ بی کلاس کا استحقاق رکھتا ہے لیکن اس کو سی کلاس کے قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔

قانون کے مطابق یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ پولیس سٹیشن کے جوڈیشل لاک اپ میں قیدیوں کے جسمانی ریمانڈ سے پہلے اور بعد میں ان کا طبی معائنہ کروائے۔ دوسری رپورٹ کی بنیاد پر عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ شادت قابل قبول بھی ہے یا نہیں اور ایسا تو نہیں کہ شہادت تشدد کے ذریعے حاصل کی گئی ہو۔ بہرحال میڈیکو۔لیگل رپورٹیں شاذونادر ہی درست ہوتی ہیں اور پولیس اہلکاروں کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ وہ اثر ورسوخ استعمال کر کے یہ رپورٹیں تیار کروا لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو میڈیکل افسر ملزموں کو دیکھے بغیر ہی رپورٹوں پر دستخط ثبت کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے معاملات کے باعث تشدد کا کھوج لگانا اور اس کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بھارتی اور پاکستانی قیدی:

بحیرۂ عرب میں پاکستان اور بھارت کی سمندری حدود کی خلاف ورزی پر دونوں ملک ایک دوسرے کے مچھیروں کو گرفتار اور ان کی کشتیوں کو اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ سمندری حدود واضح نہیں ہیں۔ ان میں سے بہت سے مچھیروں کو جیل بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے اپنے ملکوں کے حکام کے حوالے کرنے کے دن تک کم از کم ایک سال کا عرصہ جیلوں میں گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مئی میں بھارت نے 37 پاکستانی ماہی گیروں کو جب رہا کیا تو وہ 16 ماہ جیلوں میں گزار چکے تھے۔ پاکستان نے بھی اسی ماہ 151 بھارتی ماہی گیر رہا کیے جبکہ ماہی گیری والی 57 کشتیاں اس وقت بھارت کے حوالے کیں جب وزیراعظم نواز شریف بھارتی وزیراعظم نریندرا مودی کی حلف برداری کی تقریب میں شریک تھے۔ پاکستان کی طرف سے یہ

خیر سگالی کا پیغام تھا۔صرف دسمبر میں پاکستان کی سمندری سرحدوں کے اندر سے 58 بھارتی ماہی گیر گرفتار کیے گئے۔سال کے اختتام تک وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے جانے کے منتظر تھے۔

11 دسمبر کو ایک 30 سالہ بھارتی ماہی گیر ڈسٹرکٹ جیل ملیر میں قید کے دوران جاں بحق ہو گیا۔وہ دس ماہ قبل دوسرے ماہی گیروں کے ہمراہ پاکستان میری ٹائم سکیورٹی ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔سیشن جج کو جو ابتدائی رپورٹ پیش کی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ مرنے والے ماہی گیر کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔جیل کے میڈیکل افسر کے مطابق مرنے والا فشار خون اور دمے کا مریض تھا۔اس کی موت کا سبب اس وقت تک نہیں بتایا گیا جب تک اس کی لاش کا معائنہ نہیں کر لیا گیا اور اس کے کیمیائی معائنے کی رپورٹیں جاری نہیں کر دی گئیں۔

کئی مہینوں کی تاخیر کے بعد سربجیت سنگھ کے قتل کے مقدمہ میں کچھ پیش رفت ہوئی۔ بھارتی باشندے سربجیت سنگھ کو دہشت گردی کے الزام میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے 1991ء میں سزائے موت سنائی تھی۔حفاظتی اقدامات کے پیش نظر 10 ستمبر کو وڈیو لنک کے ذریعے لاہور کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے مقدمے کی سماعت پھر سے شروع کی اور استغاثہ کے گواہوں کو طلب کیا۔سربجیت سنگھ کو پاکستانی جیل میں سخت ترین حفاظتی اقدامات کے باوجود 2013ء میں پھانسی کے منتظر ایک ساتھی قیدی نے ہلاک کر دیا۔اس قتل کی تحقیقات کے لیے ایک رُکنی عدالتی کمیشن قائم کیا گیا۔کمیشن کی رپورٹ کے مطابق سربجیت سنگھ کے قاتل نے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے لاہور اور فیصل آباد میں ہونے والے بم دھماکوں میں سربجیت سنگھ کی وابستگی پر اس کو قتل کیا۔

سزائے موت:

سزائے موت کی غیر رسمی معطّلی 2008ء سے نافذ ہے۔ بہرحال اس عرصے کے دوران صرف پھانسی کی ایک سزا پر عمل درآمد ہوا۔ پھانسی کی اس سزا پر 19 دسمبر 2014ء کو عمل درآمد کیا گیا۔ پھانسی کی سزا کو ایک عارضی ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے معطل کیا گیا تھا اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق برسوں سے مطالبہ کرتا چلا آ رہا تھا کہ سزائے موت پر پابندی لگا دی جائے۔اوائل اگست میں لگتا تھا کہ سزائے موت پر عارضی پابندی کو ختم کر دیا جائے گا اس لیے کہ پاکستان مسلم لیگ ن کی حکومت کے ابتدائی بیانات اس کی طرف واضح اشارے کرتے تھے۔سبکدوش ہونے والے صدر آصف علی زرداری کے ساتھ وزیر اعظم نواز شریف کی ملاقات کے بعد فیصلہ کیا گیا تھا کہ سزائے موت پر عارضی پابندی جاری رہے گی۔اگرچہ انسانی حقوق کی

پاکستان کا شمار اُن ممالک میں ہوتا ہے جہاں سزائے موت کے قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

تنظیموں نے اس فیصلے کو سراہا تاہم انہوں نے حکومت پر اس حوالے سے تنقید کی کہ اس نے اس فیصلے کے اسباب عام نہیں کیے اور عوام کی رائے نہیں لی۔

16 دسمبر کو آرمی پبلک سکول پشاور پر ہونے والے دہشت گرد حملے کے بعد سزائے موت پر عائد عارضی پابندی کو اٹھا لیا گیا۔ 17 دسمبر کو صدر نے اعلان کیا کہ عارضی پابندی دہشت گردی میں ملوث مجرموں پر لاگو نہیں ہو گی۔ سال کے اختتام تک پاکستان بھر کی مختلف جیلوں میں گیارہ افراد کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ ان گیارہ میں سے کم از کم چھ افراد ایسے تھے جو 2004ء میں سابق صدر اور سابق چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف پر قاتلانہ حملے میں ملوث تھے۔ 23 دسمبر تک صدر ممنون حسین نے پھانسی کی سزا پانے والے 50 قیدیوں کی رحم کی اپیلیں مسترد کر دی تھیں۔

پنجاب اور سندھ کی حکومتیں 1978ء کے جیل قوانین میں شامل پھانسی سے متعلق قوانین میں ترمیم کرنے کے لیے تیار تھیں۔ اس ترمیم کا مقصد بلیک وارنٹ جاری ہونے کے ایک روز بعد مجرم کی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کو قانونی بنانا تھا۔ یہ سمجھا گیا کہ اس طرح جلد انصاف مہیا ہوتا تھا اور یہ عمل طریقہ کار اور قوانین کو عمومی طور پر نظرانداز کر کے اختیار کیا جاتا تھا۔ جیل قوانین کے تحت پھانسی کی سزا پر عمل درآمد بلیک وارنٹ جاری ہونے کے چودہ سے اکیس روز گزر جانے کے بعد کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے قواعد وضوابط کے باعث پھانسی پانے والے فرد کو معافی حاصل کرنے کے لیے وقت مل جاتا تھا اس لیے کہ اگر مقتول کا خاندان مجرم کو ڈیتھ وارنٹ جاری ہونے کے بعد بھی معاف کر دے تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔

25 دسمبر کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے ایک گفتگو کے دوران وزیر اعظم نواز شریف پر پھانسی کی سزا پر عمل درآمد روکنے اور اس سزا کو عارضی طور پر معطل رکھنے پر زور دیا۔ پشاور کے سکول کے المیہ پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے بان کی مون نے کہا کہ جہاں پاکستانی عوام کے جذبات کا احترام

ضروری ہے، وہیں اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ آزادانہ طور پر تحقیقات کرائی جائے تا کہ قانون کی بالادستی پر کسی قسم کا حرف نہ آئے۔

2004-2014ء کے دوران پاکستان میں سزائے موت

سال	تعداد افراد جن کو سزا دی گئی	تعداد افراد جن کو پھانسی دی گئی
2004ء	455	21
2005ء	362	52
2006ء	445	83
2007ء	319	134
2008ء	237	36
2009ء	277	0
2010ء	356	0
2011ء	313	0
2012ء	242	1
2013ء	227	0
2014ء	231	11
ٹوٹل	**3,463**	**338**

پاکستان دنیا کا وہ ملک ہے جہاں موت کے منتظر قیدیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ 2014ء کے اختتام تک یہ تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ 2014ء کے دوران موت کی سزا پانے والے 231 افراد میں سے 105 ایسے لوگ تھے جو قتل کے جرم میں پھانسی کے سزا یافتہ تھے۔ اگرچہ یہ واضح طور پر کہا گیا تھا کہ صرف انہی لوگوں کو پھانسی دی جائے گی جنہیں دہشت گردی کے الزامات کے تحت سزائیں سنائی گئی ہوں گی۔ لیکن شفقت حسین کے بلیک وارنٹ کے اجراء سے ظاہر ہوتا ہے کہ موت کی سزا پر عمل درآمد صرف بڑے جرائم تک محدود نہیں رہے گا۔ 2004ء میں جب شفقت حسین کو انسداد دہشت گردی کی عدالت نے موت کی سزا دی تھی تو اس وقت شفقت کی عمر 15 برس تھی۔ عدالت نے یہ سزا اس اعترافِ جرم پر دی تھی جو نو روزہ بہیمانہ تشدد کے بعد حاصل کیا گیا تھا جس کی شہادت شفقت کی میڈیکو لیگل رپورٹوں سے ملتی ہے۔ اس کے جرم کا تعلق کسی بھی طور پر دہشت گردی سے نہیں تھا۔ سال کے اختتام پر شفقت کا ڈیتھ وارنٹ جاری ہونا تھا لیکن اس وقت دنیا بھر کے انسانی حقوق کے متعدد گروہوں نے اس کے خلاف مہم چلائی۔ اگست 2013ء میں دوسرے سات افراد سمیت اس کی پھانسی کی سزا پر عملدرآمد ہونا تھا لیکن پھانسی کے روز سے

صرف ایک ہفتہ قبل سزا پر عمل درآمد منسوخ کر دیا گیا۔

2011ء میں مذہبی، سیاسی پارٹی جماعت اسلامی نے صدر کو ایک خط لکھا جس میں پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کے قاتل، جس نے قتل کا خود اعتراف کیا تھا، ممتاز قادری کو معاف کرنے کی درخواست کی۔

2014ء کے دوران پاکستان میں موت کی سزا کے مجرم

علاقہ	مجرموں کی تعداد
پنجاب	5,779
بلوچستان	98
سندھ	اعداد وشمار میسر نہیں
خیبر پختونخوا	اعداد وشمار میسر نہیں
گلگت بلتستان	19
کل تعداد	**5,896**

خط میں کہا گیا کہ ممتاز قادری کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا جائے اس لیے کہ اس نے ''عوامی مفاد'' میں ''لوگوں کے جذبات'' کے پیش نظر یہ قتل کیا تھا۔

20 دسمبر 2014 کو جاری ہونے والے بیان میں جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل نے مختلف موقف اپناتے ہوئے کہا کہ موت کی سزا نے معاشرے میں قانون کے احترام اور تقدس کا احساس پیدا کیا۔ سیکرٹری جنرل نے مزید کہا کہ ''قاتل، دہشت گرد اور انسانیت کے دشمن'' کسی رعائت کے مستحق نہیں ہوتے۔ قاتلوں اور دہشت گردوں کے ساتھ سلوک میں دوہرا معیار اختیار کرنے سے سزائے موت پر سوال اُٹھنے لگے۔

جنوری میں ایک ستر سالہ پاکستانی نژاد برطانوی شہری محمد اصغر کو راولپنڈی کی ایک عدالت نے رسالت مآب کی شان میں گستاخی کرنے کے الزام میں موت کی سزا سنائی تھی۔ محمد اصغر طویل عرصے سے ذہنی بیماری کا شکار تھا۔ 1993ء سے اس کے ڈپریشن کا علاج ہو رہا تھا۔ 2010ء میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اصغر اختلال اور شیزوفرینیا کا مریض تھا۔ ابتدائی طور پر اسے 2010ء میں اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب اس نے خطوط لکھے جن میں اس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اصغر نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ وہ پیغمبر تھا۔ اس نے یہ دعویٰ جج اور پراسیکیوٹروں کی موجودگی میں کیا تھا۔ نفسیاتی مرض کے متعدد ثبوتوں کے باوجود اس کو دماغی طور پر صحیح قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور نتیجتاً اس کو موت کی سزا دے دی گئی۔ برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون سمیت برطانیہ اور پاکستان کے سیاستدانوں، پروفیسروں اور

بلوچستان اور پاکستان کے دیگر علاقوں میں جبری گمشدگیوں کے خلاف ریلی

انسانی حقوق کے متعدد گروہوں نے اصغر کی معافی کے لیے اپیلیں کیں۔ اس کے خاندان کے لوگوں نے اپیل کی اصغر اڈیالہ جیل میں غیر محفوظ ہے اس لیے کہ اس قسم کے واقعات میں ہجوم بذات خود فیصلہ کر دیتا ہے۔ 28 اکتوبر کو اڈیالہ جیل کے ایک محافظ نے اصغر کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا۔ بعد کی تفتیش اور تحقیقات سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ محافظ ممتاز قادری کے سیل میں دو ہفتے تک فرائض انجام دیتا رہا تھا۔ اس دوران قادری اس محافظ کو مسلسل مذہبی تعلیم دیتا رہا اور اس کو اکساتا رہا کہ جیل میں قید ایسے مجرموں کو قتل کر دے جو رسول پاکؐ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوئے ہوں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق برسوں سے یہ مطالبہ کرتا چلا آ رہا ہے کہ اُن جرائم کی تعداد کم کر دی جائے جن پر موت کی سزا مقرر ہے۔ 2014ء تک ایسے جرائم کی تعداد دو درجن تھی جن پر موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ان جرائم میں زنا، ریلوے کے نظام کو نقصان پہنچانا اور عورت کو ننگا کرنا شامل ہیں۔ یہ دلیل کہ موت کی سزا بہیمانہ جرائم کو روکنے میں مدد دیتی ہے، اس دلیل سے غلط ثابت کی جاتی ہے کہ موت کی سزا پانے والوں کی تعداد کم ہوسکتی ہے۔ ان برسوں کے دوران جب پھانسی کی سزا عارضی طور پر معطل تھی، عدالتوں نے موت کی سزائیں دینا تو جاری رکھیں لیکن ان کی تعداد میں کافی کمی ہوئی۔ مثال کے طور پر 2004ء میں 455 افراد کو موت کی سزائیں سنائی گئیں جبکہ 2014ء میں یہ تعداد کم ہوکر 231 رہ گئی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان برسوں کے دوران بہیمانہ جرائم میں کمی واقع ہوئی تھی۔

گمشدگیاں/بلاوجہ حراست

جبری اور غیر اختیاری گمشدگیوں کی صورت میں انسانی حقوق کی پامالی کے واقعات 2014ء میں بھی اسی طرح جاری رہے۔ 2013 میں سپریم کورٹ کی طرف سے جبری گمشدگیوں کے ذمہ داروں کے خلاف عدالتی کارروائیوں میں کافی تیزی آئی لیکن یہ تیزی اس وقت خواب بن کر رہ گئی جب پنجاب کے سوا پاکستان کے دوسرے تمام علاقوں سے جبری گمشدگیوں کے واقعات میں تیزی آئی۔ 2014ء کے اختتام تک پورے ایشیا میں صرف فلپائن ایک ایسا ملک تھا جہاں جبری گمشدگیوں کے خلاف خصوصی قانون موجود تھا۔ پہلے تو جبری گمشدگیوں کے واقعات کے حوالے سے بلوچستان پہچانا جاتا تھا اور اب حال ہی میں یہ داغ خیبر پختونخوا پر بھی لگ چکا ہے۔ بہرحال سال 2014ء کے دوران اس خطرناک رجحان نے سندھ کا رُخ کر لیا۔ اس تشویشناک انسانی حقوق کی پامالی کو روکنے کے لیے اقدامات کرنے کی بجائے پاکستان میں ان جرائم کے مرتکب اداروں کو قانونی ڈھال مہیا کرنی شروع کر دی گئی ہے۔ جبری اور غیر اختیاری گمشدگیوں پر اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ کی 2012ء کی سفارشات مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء منظور کروایا جو حقیقت میں انسانی حقوق کے گروپوں، سول سوسائٹی، گمشدہ افراد کے خاندانوں اور ملک کے تمام متعلقہ شہریوں کی شکست تھی۔

لوگوں کو انصاف مہیا کرنے اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اور سزا سے استثناء کے حوالے سے حکومت کی سنجیدگی پر جولائی میں اس وقت سوال اٹھائے گئے جب قومی اسمبلی نے تحفظ پاکستان بل 2014ء کی منظوری دی۔ اس بل کی منظوری کے ایک ہفتے بعد ہی قومی اسمبلی کے ایک رکن نے اس ایکٹ کو اسلام آباد ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ پٹیشن میں کہا گیا کہ بل آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی شقوں کے منافی ہے۔ اس قانون کا مقصد پاکستان کی سلامتی کے خلاف شروع کی جانے والی جنگ سے ملک کو تحفظ دینا تھا۔ مزید برآں اس کا مقصد پاکستان کی سلامتی کے خلاف اقدامات کو روکنا اور جرائم کے خلاف مقدمات کی تیز تر سماعت کو یقینی بنانا تھا حالانکہ یہ شقیں تو پہلے ہی تعزیرات پاکستان سمیت دوسرے متعلقہ قوانین میں موجود ہیں۔ تحفظ پاکستان ایکٹ میں بہت سی شقوں میں پاکستان کے کسی بھی شہری کو اس کے متعدد بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، یہاں تک کہ کسی بھی شخص، چاہے وہ محض شبہ ہی کا شکار کیوں نہ ہو، کو موت کی سزا ہو سکتی ہے۔ مسلح افواج اور اس کے ذیلی اداروں کی ملکیت کو نقصان پہنچانے کے الزام میں کسی بھی فرد کو گرفتار کیا جا سکتا ہے یا اس کو موقع پر ہی گولی ماری جا سکتی ہے جبکہ اس کے برعکس مسلح افواج کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی

فرد کو قید یا نظر بند رکھ سکتی ہیں اور اس مقصد کے لیے اس شق کہ ''پاکستان کی سلامتی کے مفاد میں حکومت کسی بھی فرد کی نظر بندی کی وجوہات بتانے سے انکار کر سکتی ہے یا اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نظر بند سے متعلق کسی بھی قسم کی اطلاع فاش نہ کرے''، کو استعمال کر سکتی ہے۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات کے مطابق جبری اغوا یا ریاست کے ایجنٹوں کی طرف سے کسی کو اس کی آزادی سے محروم کرنا اور پھر اس واقعہ کے بارے میں اطلاع مہیا کرنے سے انکار جبری گمشدگی کے زمرے میں آتا ہے۔ آئینی ضمانتوں کی

ایک لڑکا اپنے والد کی تصویر تھامے ہوئے جو 2010 میں لاپتہ ہو گیا تھا

واضح خلاف ورزی کے باوجود یہ قانون منظور کیا گیا جس کے ذریعے استبدادی گرفتاری، نظر بندی اور جبری گمشدگی کو مؤثر قانونی شکل دے دی گئی ہے۔

جبری گمشدگیوں کے بارے میں قائم کیے گئے تحقیقاتی کمیشن نے 2014ء کے اختتام پر وزارت داخلہ کو رپورٹ پیش کی، جس کے مطابق جبری گمشدگیوں کے 1265 مقدمات کمیشن میں زیر سماعت تھے۔ 2014ء میں وزارت داخلہ کے مطابق 155 جبری گمشدہ افراد کی لاشیں ملیں، جن میں سے 67 افراد بلوچ تھے۔ سپریم کورٹ کے ایک جج کا یہ کہا ریکارڈ پر ہے کہ ''ہر مقدمے میں، جس کی سماعت عدالت عظمیٰ نے کی، انٹیلی جنس کے محکمے ملوث پائے گئے۔'' مکمل دستاویز والے ان مقدمات اور سرکاری سطح پر تسلیم شدہ اعداد و شمار کے باوجود، ایک بھی ایسا مقدمہ نہیں تھا جس کے بارے میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس میں سکیورٹی فورسز یا انٹیلی جنس ایجنسیوں کو کسی فرد کی آزادی کو غیر قانونی طور پر سلب کرنے، بے ضابطہ

گرفتاریاں کرنے اور غیر قانونی نظر بندی کے حوالے سے عدالتی تحقیقات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون اور شہری وسیاسی حقوق سے متعلق بین الاقوامی معاہدے (آئی سی سی پی آر) کے تحت پاکستانی حکام پر لازم ہے کہ انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کی تحقیقات کریں۔ سی آئی ای ڈی صرف اکتوبر میں 56 افراد کے بارے میں جان سکی لیکن ان کے خلاف استغاثہ اور جرائم دانستہ طور پر اوجھل رکھے گئے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے نتائج کے اعتبار سے پاکستان کے 48 اہم اضلاع کی جانچ کی۔ ایچ آر سی پی کے اعداد وشمار کے مطابق 2014ء کے دوران جبری گمشدگی کے 129 واقعات سامنے آئے جن میں سے 106 کا تعلق بلوچستان کے نو اضلاع سے تھا۔ نومبر میں ان پانچ افراد کی لاشیں ملیں جو جولائی میں غائب کیے گئے تھے۔ یہ لاشیں خیبر پختونخوا کے شہر نوشہرہ کے ملحقہ گاؤں کوٹریان کے کھیتوں سے دستیاب ہوئیں۔ یہ لاشیں بوری بند تھیں جن کے پوسٹ مارٹم سے انکشاف ہوا کہ ان کی موت زہر خورانی سے ہوئی اور یہ زہر ان کے جسموں میں انجکشنوں کے ذریعے داخل کیا گیا تھا۔ ان کی شناخت ان کے شناختی کارڈوں سے ہوئی جو ان کی قمیضوں کی جیبوں سے ملے تھے۔ مرنے والے سبھی لوگ ایک جیسا ہی لباس پہنے ہوئے تھے جو انہوں نے چار ماہ قبل گمشدگی کے وقت پہن رکھا تھا۔ ان میں سے دو افراد اصغر علی اور ارشاد علی کو متعدد جرائم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا لیکن 2010ء میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے انہیں رہا کر دیا تھا۔ ایک تیسرے فرد دوالفقار ولد فضل الٰہی پر کار چرانے کا الزام تھا لیکن جولائی 2014ء میں اسے اٹھایا گیا تو اُس وقت وہ ضمانت پر تھا۔ باقی دو افراد مشتاق احمد جان اور نور رحمان کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ عدالتوں میں مقدمہ آگے نہیں بڑھے گا۔ خاص طور پر جرم کے ارتکاب پر سزاؤں کے حوالے اس میں پیش رفت نہیں ہوگی۔ چنانچہ ان تمام افراد کو جبری طور پر اغوا کر کے ماورائے عدالت قتل کر دیا گیا۔

یکم جنوری کو عدالتِ عظمیٰ نے وزارت دفاع سے یونیورسٹی آف لاہور کے انجینئرنگ کے طالب علم عتیق الرحمان کی گمشدگی سے متعلق جواب طلب کیا۔ عتیق الرحمان جولائی 2012ء میں شیخوپورہ سے غائب ہوا۔ جبری گمشدگیوں سے متعلق تحقیقاتی کمیشن نے عدالت میں اپنی جو رپورٹ پیش کی اس میں کہا گیا تھا کہ بظاہر یہ جبری گمشدگی کا معاملہ تھا اور اس کی ذمہ دار انٹیلی جنس ایجنسیاں تھیں۔ ملٹری انٹیلی جنس (ایم آئی) اور انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) نے جو رپورٹ پیش کی اس میں کہا گیا کہ انہیں عتیق الرحمان کی گمشدگی کے بارے میں کوئی علم نہیں اور نہ ہی ان اداروں کو اس کا کوئی اتا پتا ہے۔ جولائی 2012ء میں عتیق الرحمان کو اس کے ایک دوست کا فون آیا جو اس کو ملنا چاہتا تھا۔ وہ ایک قریبی دوکان میں ملے جہاں سے ان دونوں کو

پنجاب پولیس کے اہلکاروں، چند سفید پوشوں اور چند کمانڈوز نے اٹھالیا اور انہیں الگ الگ کاروں میں لے کر غائب ہو گئے۔ عتیق الرحمان کے دوست کو چند ماہ بعد چھوڑ دیا گیا۔ عتیق الرحمان کے دوست نے رہائی کے بعد بتایا کہ دونوں کو الگ الگ جگہ پر قید میں رکھا گیا تھا۔

جنوری کے آخر میں صوبہ بلوچستان کے ضلع تُوتک میں ایک مقامی کسان کو اپنے گھر کے قریب کچھ انسانی اعضاء ملے۔ جب سکیورٹی فورسز کے لوگ وہاں پہنچے اور آس پاس کی زمین کھودنا شروع کی تو وہاں ایک اجتماعی قبر ملی۔ اس کے فوراً بعد بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نے اس کی تحقیقات کے لیے ایک عدالتی کمیشن تشکیل دے دیا۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق اجتماعی قبروں سے 17 لاشیں برآمد ہوئیں۔ انسانی حقوق کے گروپوں اور گمشدہ افراد کے خاندانوں نے کہا کہ یہ تعداد گم ہونے والے افراد کی تعداد سے کہیں کم ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے کمیشن کی تحقیقات کو رد کر دیا جس کے مطابق ان گمشدگیوں میں مسلح افواج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ حکام نے اجتماعی قبروں کے مقام کو گھیرے میں لے کر لوگوں کی آمدورفت پر پابندی لگا دی۔ چنانچہ انسانی حقوق کے کسی بھی گروپ کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں دی گئی تاکہ یہ تنظیمیں کوئی غیر جانبدارانہ تفتیش و تحقیق نہ کر پائیں۔ بلوچستان میں گمشدہ افراد کے لیے کام کرنے والی تنظیموں اور گروپوں نے کہا کہ توتک کی اجتماعی قبریں ان بے شمار قبروں میں سے ہیں جو پورے صوبہ بلوچستان میں موجود ہیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے 2014ء کے دوران سندھ میں جبری گمشدگیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر بے حد تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق 2014ء کے دوران سندھ سے گیارہ سیاسی فعال کارکنوں کو غائب کیا گیا تھا۔ جن لوگوں کو اٹھایا گیا اور بعد میں جنہیں زمین میں دفن کر دیا گیا، وہ سب کے سب نوجوان لوگ تھے اور جن کا تعلق قوم پرست سیاسی جماعتوں سے تھا۔ مارے جانے والوں میں سندھ یونیورسٹی کے طلبہ، جئے سندھ متحدہ محاذ کے فعال کارکن، جئے سندھ قومی محاذ کے کارکن اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ متعدد مقدمات میں ایجنسیوں اور سکیورٹی فورسز کے ان واقعات میں ملوث ہونے کی تصدیق یا تو عینی شاہدوں نے کی یا پھر اس کی تصدیق ان ہتھکنڈوں اور طریق کار سے ہوئی جو قوم پرست نوجوانوں کے خلاف ہمیشہ سے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ 30 اکتوبر کو جئے سندھ قومی محاذ کے فعال کارکن وحید لاشاری اپنی ہمشیرہ کے ساتھ بس کے ذریعے سفر کر رہا تھا۔ جب اسے قنبر شہداد کوٹ ضلع سے اٹھالیا گیا۔ گولیوں سے چھلنی اس کی لاش ملیر کراچی کے ایک گٹر سے ملی۔ 18 ستمبر کو ایک اٹھائیس سالہ سندھی نوجوان رانو خان کو پولیس نے اس کے گاؤں پر چھاپہ مار کر گرفتار کر لیا۔ جب گاؤں کے باشندے اور رانو کے خاندان کے افراد اگلے روز تھانے گئے تو پولیس والے چھاپہ مارنے اور رانو خان کی گرفتاری سے صاف مکر

گئے۔سیشن جج کی طرف سے رانو خان کی رہائی کے احکامات کے باوجود اس کے ٹھور ٹھکانے کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

بشیر قریشی کے بھائی مقصود قریشی سمیت جے ایس کیو ایم کے تین فعال کارکنوں کی جلتی ہوئی لاشیں 21 مارچ کو حیدر آباد میں جلی ہوئی کار سے ملیں۔ واقعہ کی تحقیقات سے کچھ بھی پتہ نہ چل سکا حالانکہ پارٹی نے واضح طور پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔

پاکستان نے تا حال جبری گمشدگیوں کے خلاف بین الاقوامی میثاق پر دستخط نہیں کیے اور نہ ہی ابھی تک پاکستان نے اپنے قوانین میں اس کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جبری گمشدگیوں کی آئین پاکستان کے آرٹیکل 9 اور 10 کے تحت تحقیقات کروائے اور ذمہ داروں کے خلاف مقدمے چلائے۔ آئین کے یہ آرٹیکل کسی بھی شخص کو اس کی زندگی یا اس کی آزادی سے محروم کرنے کے خلاف اقدامات کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اور آمرانہ طور پر گرفتاری یا نظر بندی کے خلاف تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کو ریاست کی طرف سے زرِ تلافی ملنا چاہیے جنہیں غیر اختیاری طور پر گرفتار کر کے غیر قانونی قید میں رکھا جاتا ہے یا اسے غائب کر دیا جاتا ہے۔ ایسے قوانین بنائے جائیں جو ریاستی جرائم کے خلاف شہریوں کو تحفظ مہیا کریں اور انہیں مناسب معاوضہ ادا کرنے کا موجب بنیں تاکہ قانون پر ایسے لوگوں کا اعتماد پختہ اور انصاف پر ان کا اعتماد بحال ہو سکے۔

نظر بندی کے مراکز:

برسوں تک ہزاروں افراد کو قانون کے دائرے سے باہر غیر قانونی نظر بندی میں رکھا جاتا رہا۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں ایسے بے شمار خفیہ مراکز تھے جہاں لوگوں کو قید میں رکھا جاتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ ان قیدیوں کا نہ تو سرکاری طور پر کوئی ریکارڈ تیار کیا جاتا تھا اور نہ ہی ملک بھر کی کسی عدالت تک ان قیدیوں کی رسائی ممکن تھی، انہیں بس اٹھا لیا جاتا تھا اور برسوں تک انہیں فاٹا اور پاٹا کے لیے بنائے گئے حفاظتی قوانین کے تحت قید رکھا جاتا تھا۔ ان قیدیوں کو کسی قسم کا تحفظ حاصل نہیں تھا جو ملک بھر کے باقی علاقوں میں قیدیوں کو حاصل تھا، نہ تو ان کے خاندان کے افراد انہیں مل سکتے تھے، اور نہ ہی انہیں تشدد یا قید میں ہونے والی موت کی صورت میں کسی قسم کی تحقیقات کی اپیل کا حق حاصل تھا۔

2014ء میں پشاور ہائی کورٹ نے کوہاٹ کے نظر بندی مرکز کے سربراہ کو حکم دیا کہ وہ ان چار نظر بندوں کی موت کے بارے میں رپورٹ پیش کرے جن کی لاشیں پوسٹ مارٹم کرائے بغیر ہی لواحقین کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ لواحقین نے شکایت کی تھی کہ ان کے پیاروں کی لاشوں پر تشدد کے واضح نشان تھے۔ انہوں نے خصوصاً ایک عمر رسیدہ شخص کا حوالہ دیا جس نے بتایا کہ اس کے بیٹے کی ٹانگیں سیاہ ہو چکی تھیں اور اس

کی وجہ زہر خورانی یا بجلی کے جھٹکے ہو سکتے ہیں۔ عدالت نے فاٹا کے ایڈیشنل چیف سیکرٹری اور صوبائی سیکرٹری داخلہ کو ہدایت کی کہ کسی بھی نظر بند یا محبوس شخص کی موت کی صورت میں اس کی لاش اس وقت تک ورثاء کے حوالے نہ کی جائے جب تک اس کی موت کا سبب معلوم نہ ہو جائے۔ عدالت نے نظر بندی مرکز کے انچارج اور کوہاٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کہ پوسٹ مارٹم کیوں نہیں کرایا گیا تھا۔ جب اکتوبر میں ان دونوں کا جواب ہائی کورٹ کو ملا تو اسے عدالت نے فوری طور پر مسترد کر دیا۔ عدالت میں موت کے جو سرٹیفکیٹ پیش کیے گئے ان میں کہا گیا تھا کہ اموات قدرتی تھیں اور طبی سہولتیں فراہم ہونے کے باوجود نظر بند صحت یاب نہیں ہو پائے تھے۔ حکام پوسٹ مارٹم رپورٹیں عدالت میں پیش نہ کر سکے تھے۔ 18 نومبر کو عدالت کے احکامات کی تعمیل نہ کرنے کی پاداش میں عدالت نے ان دونوں افسروں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ سال کے اختتام تک موت کے سرٹیفکیٹ پیش نہیں کیے جا سکے تھے۔

نومبر میں پشاور ہائی کورٹ نے گمشدہ افراد کے خاندانوں کی چھ پٹیشنیں اس بنا پر خارج کر دی تھیں کہ ان افراد کے بارے میں پتہ چل گیا تھا کہ انہیں فاٹا کی مہمند ایجنسی میں گلانئی کے نظر بندی مرکز میں محبوس رکھا گیا تھا۔ ان نظر بندوں کو ایکشن ان ایڈ آف سول پاورز ریگولیشن 2011ء کے تحت محبوس کیا گیا تھا اور انہیں 'خطرناک' (بلیک) قرار دے دیا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ حکام کے پاس دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ان کے ملوث ہونے کے ثبوت موجود تھے۔ اس لیے عدالتیں مقدمے کی مزید سماعت نہیں کر سکتی تھیں۔ محض افسروں کی طرف سے یہ بیان دینا کہ فلاں شخص ان کی حراست میں ہے، کافی نہیں۔ اور نہ ہی ایسا اقدام کرنے والے افسر کے حق میں کوئی قانون کام آ سکتا ہے جس سے اس کا اقدام جائز اور قانونی قرار دیا جا سکے۔ تاہم اس سب کچھ کے باوجود نظر بندوں پر تشدد کا عمل جاری ہے بلکہ ماورائے عدالت قتل بھی اسی طرح ہو رہے ہیں۔

سفارشات

1- حکومت جبری گمشدگیوں کی فوری طور پر فہرست مرتب کرے، جبری گمشدگی کو غیر قانونی قرار دے اور انسانی حقوق کی ایسی شدید خلاف ورزیوں کے ذمہ دار افراد کے خلاف قانونی کارروائی کرے۔

2- پاکستان جبری گمشدگی سے تمام افراد کو تحفظ دینے سے متعلق بین الاقوامی معاہدے کی فوری طور پر توثیق کرے۔

3- چونکہ پاکستان نے سی اے ٹی کی 2012ء میں توثیق کی تھی، اس لیے اس کو قانون کی شکل دیتے ہوئے اس میں ایسی شقیں شامل کرے جن کے ذریعے تشدد کا شکار ہونے والے افراد کو زرِتلافی اور تاوان ادا کیا جائے۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات کے مطابق ایسے تمام لوگ زرِ تلافی اور تاوان کے حق دار ہیں جنہیں قانون کے مطابق انصاف مہیا کرنے سے انکار کیا جائے۔ ایسی شقیں رکھی جائیں جن کے مطابق ایسے افراد کو تاوان ادا کیا جائے جنہیں غائب کر دیا گیا تھا، یا آمرانہ طریقے سے گرفتار اور نظر بندی کیا گیا تھا یا ان کے کسی قریبی عزیز کو گرفتار کیا گیا تھا۔

4- انسانی حقوق کے گروپوں کو نظر بندی کے اِن مراکز کے معائنے کی اجازت دی جانی چاہیے تاکہ ان مراکز میں نظر بند افراد کو قانونی امداد مہیا ہو سکے۔

5- عدالتی نظام متبادل تعزیری قوانین مرتب کرے تاکہ جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کا مسئلہ حل ہو سکے۔

3

بنیادی آزادیان

نقل وحرکت کی آزادی

ہرشہری کو پاکستان میں رہنے، داخل ہونے اور آزادانہ پورے ملک میں گھومنے پھرنے، ملک کے کسی بھی حصے میں رہائش اختیار کرنے یا مستقل طور پر آباد ہونے کا حق حاصل ہے۔ البتہ یہ حق قانون کے تحت مفاد عامہ میں جائز طور پر عائد کی گئی کسی بھی پابندی سے مشروط ہے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 15]

ہر شخص کو کسی بھی ریاست کی حدود میں گھومنے، پھرنے، سفر کرنے اور رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو اپنے ملک سمیت، کسی بھی ملک کو چھوڑنے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-17(2,1)]

کسی بھی فرد کی آزادانہ اور بے روک ٹوک نشو ونما کے لئے نقل وحرکت کی آزادی ایک بنیادی شرط ہوا کرتی ہے، اس لیے کہ متعدد دوسرے انسانی حقوق کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے۔ ہر انسان کا یہ قانونی حق ہے کہ وہ کسی بے جا پابندی کے بغیر ریاست کی حدود کے اندر جہاں چاہے آئے جائے۔ اس کو یہ بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس ملک میں چاہے رہائش اختیار کرے اور جب چاہے اس ملک کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن واپس آجائے۔

بطور ریاست پاکستان، شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی معاہدے کا حصہ ہے اس لیے اس بات کا مجاز ہے کہ وہ کسی بھی فرد کی نقل وحرکت کی حدود متعین کرے لیکن یہ حدود نہ صرف یہ کہ اس بین الاقوامی معاہدے (انٹرنیشنل کووینٹ آن سول اینڈ پولیٹیکل رائٹس، آئی سی سی پی آر) کے آرٹیکل 12(3) میں دی گئی مطلوبہ ضرورت کے مطابق ہوں بلکہ اس معاہدے میں تسلیم شدہ دوسرے حقوق سے بھی مطابقت رکھتی ہوں۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی نے (عمومی تبصرہ 270 میں) کہا ہے کہ آرٹیکل 12 پر روک ٹوک یا پابندی کے حوالے سے حقوق استثنائی ہونے چاہئیں اور کسی قسم کی پابندی سے نقل وحرکت کی آزادی کے حصول

کی نفی نہیں ہونی چاہیے۔

پاکستان کا آئین ایسے انفرادی حق کو تسلیم کرتا ہے تاہم اس کا دار ومدار اس پر ہے کہ کوئی فرد اپنا انفرادی حق کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اگر پابندی کا جواز موجود ہو تو پھر آئین پاکستان، ریاست کو یہ قانونی جواز مہیا کرتا ہے کہ عوامی مفاد میں ملک کے اندر آزادانہ نقل وحرکت، ملک میں رہائش رکھنے اور ملک کے کسی بھی حصے میں بسنے پر پابندی عائد کردے۔

2014ء کے دوران پاکستان میں آرٹیکل 12 میں درج حقوق پر بالواسطہ یا بلاواسطہ سمجھوتہ کیا گیا۔ یہ سمجھوتہ مسلح تصادم اور چند علاقوں میں حکومتی دائرہ اختیار کی عدم موجودگی، عمومی لاقانونیت، اہدافی حملوں، سفری ذرائع کی عدم دستیابی یا ان کی کمی کے باعث لوگوں کی سفر نہ کرنے کی مجبوری، اندرون ملک دور دراز کے علاقوں کے لیے ہوائی پروازوں میں کمی، غیر محفوظ زمینی سفر سمیت متعدد دوسرے عوامل کے باعث کیا گیا۔ شہریوں کی نقل وحرکت کی آزادی، عمومی طور پر متاثر ہوتی رہی جس کے باعث سفر، دشواریوں کا شکار رہا۔ مزید برآں سفری اخراجات میں بے پناہ اضافہ اور سڑکوں کی حالت زار بھی نقل وحرکت میں مانع رہی۔

آزادانہ نقل وحرکت کے حق اور رہائش کے لیے اپنی پسند کی جگہ کے انتخاب کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فرد ریاست کے کسی بھی حصے میں رہائش رکھنے میں آزاد ہے۔ اس استحقاق کی پرکھ اُن واقعات نے کی جن کے باعث شہریوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے گھروں سے فرار ہونا پڑا۔ بنیادی طور پر وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں خصوصاً شمالی وزیرستان ایجنسی کی بڑی آبادی نے جون 2014ء میں اور خیبر ایجنسی سے اکتوبر 2014ء میں اس وقت اپنے گھر چھوڑے جب عسکریت پسند گروہوں کے خلاف دو اضلاع میں فوجی کارروائیاں کی گئیں۔ فاٹا سے اپنے گھر چھوڑنے والے افراد کو سندھ اور پنجاب کے صوبوں میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے مبالغہ کی حد تک بیان بازی کی گئی اور یہ صورت حال 2014ء کے دومہینوں، جون اور جولائی میں خصوصی طور پر پیش آئی۔

قرضوں میں جکڑے لاکھوں افراد عملی طور پر غلامی کے بندھنوں میں جکڑے رہے۔ پنجاب اور خیبر پختونخوا میں اینٹوں کے بھٹوں اور سندھ میں کھیتوں میں جبری مشقت کرنے کا مرض بہت عام ہے۔

گزشتہ برسوں کی طرح 2014ء میں ماہ محرم کے دوران بہت سے شہروں میں متعدد مذہبی رہنماؤں کے داخلے پر حکومت نے پابندی عائد کردی تاکہ فرقہ وارانہ نفرت کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔ سال میں ایک مرتبہ لگائی جانے والی اس پابندی کے سوا مذہبی رہنماؤں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

ملک چھوڑنے کے حق کی راہ میں جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کے بارے میں کچھ متاثرہ افراد

قدرتی آفات اور مسلح تصادم جبراًداخلی نقل مکانی کا سبب بنے

کا کہنا تھا کہ ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں افراد کے ناموں کو شامل کرنا درحقیقت باہر کے سفر کے حوالے سے آمرانہ روّیہ ہے۔ ایسے کچھ معاملات میں عدالتوں نے ان پابندیوں کو حکومت کے من مانے فیصلے قرار دیا۔ ملک کے اندر شہریوں کو پاسپورٹ کے اجراء یا بیرون ملک پاکستانی سفارت خانوں کے ذریعے پاسپورٹوں کے حصول میں غیر ضروری تاخیر پر ذرائع ابلاغ نے کافی لے دے کی جس کے نتیجے میں اعلیٰ عدالتوں نے صورت حال کا نوٹس لیا۔

فاٹا کے حصوں اور صوبہ خیبر پختونخوا کے چند اضلاع میں عسکری انتہا پسندوں کے خلاف سکیورٹی فورسز کی کارروائیوں کے دوران کرفیو کے نفاذ، کراچی میں ہڑتال کی ترغیب اور وفاقی حکومت کی طرف سے اسلام آباد میں کسی حد تک دومربوط احتجاجوں اور دھرنوں کو ناکام بنانے کی کوشش کے باعث اگست سے لے کر سال کے تقریباً اختتام تک نہ صرف یہ کہ کاروبار بند رہے بلکہ شہریوں کی نقل وحرکت کی آزادی بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔

نسبتاً سستے ایندھن کے طور پر سی این جی کی سردی کے مہینوں میں مکمل نایابی اور باقی مہینوں کے دوران ہفتے میں پانچ دن تک اس کی عدم دستیابی نے خصوصاً پنجاب اور اس سے کم شدت کے ساتھ سندھ میں سفر کو بہت مہنگا بنا دیا جس کے باعث متوسط آمدنی والے بہت سے شہری انتہائی ضروری سفر کرنے سے محروم

رہے۔ میڈیا کی رپورٹوں سے لگتا تھا جیسے دیہی علاقوں اور چھوٹے شہروں میں بنیادی سہولتیں دستیاب نہ ہونے کے باعث شہریوں کی بڑی تعداد روزگار کمانے کے لیے بڑے شہروں میں جانے سے محروم رہی۔

آمد ورفت کی آزادی:

اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کونسل نے 1999ء میں کہا تھا کہ ہر ملک کے شہری کو آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 12 کے تحت اپنی ریاستی حدود میں پسند کی جگہ پر رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے اور ہر ایسے فرد کو جبری منتقلی کی تمام شکلوں کے خلاف تحفظ حاصل ہے۔ قدرتی آفات سے لے کر مسلح تصادم اور جرائم پیشہ گروہوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی دہشت کے علاوہ دوسرے متعدد عوامل کے باعث لاکھوں پاکستانیوں کو دوسرے علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ نقل وحرکت کی آزادی کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں اور مشکلات نے تصادم کے باعث دوسری جگہوں پر منتقل ہونے والوں کی زندگیوں کو انتہائی مشکل بنا دیا۔ (اس حوالے سے مہاجرین سے متعلق باب بھی دیکھئے)

شمالی وزیرستان اور فاٹا میں خیبر کے اضلاع کو عسکری انتہا پسندوں سے صاف کرنے کے لیے فوجی آپریشن کیے گئے لیکن ان کے باعث دس لاکھ سے زیادہ افراد کو ان کے گھروں سے نکلنا پڑا۔ جون کے آخر اور جولائی کے شروع میں پنجاب اور سندھ کے صوبوں سے یہ اطلاعات آئیں کہ فاٹا سے نکلنے والے شہریوں کو ان دوصوبوں کی حکومتوں نے اپنے ہاں بسانے سے انکار کر دیا ہے۔ جون کے وسط میں سندھ کے وزیر اطلاعات نے کہا کہ سندھ کے باہر سے آنے والے افراد کو صوبوں کے درمیان سرحدوں پر رجسٹر کیا جائے گا اور متعلقہ حکام ایسے افراد کی آمد کے مقصد اور اس آدمی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے اور مطمئن ہونے کے بعد ہی ان کے داخلے کا فیصلہ کریں گے جس کے ہاں وہ فرد یا افراد قیام پذیر ہوں گے۔ صوبائی وزیر اطلاعات نے ان شہریوں پر زور دیا کہ کسی قسم کی مشکلات سے بچنے کے لیے وہ سفر کے دوران اپنے پاس اپنے شناختی کارڈ رکھیں۔ تاہم قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف نے جو سندھ میں برسر اقتدار پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں، جولائی کے شروع میں کہا کہ آئین ہر پاکستانی کو نقل وحرکت کی آزادی دیتا ہے اور کوئی بھی شخص کسی بے گھر ہونے والے فرد کو ملک کے کسی بھی حصے میں آنے جانے سے نہیں روک سکتا۔ پنجاب حکومت نے بھی فوری طور پر اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے افراد کو پنجاب میں آنے سے روکنے کی تردید کر دی۔

تاہم جولائی کے دوران سندھ کی قوم پرست جماعتوں کی بڑی تعداد نے سندھ بچاؤ تحریک کا اعلان کر دیا اور اس تحریک کا مقصد، اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کو سندھ میں داخل ہونے سے روکنا تھا۔

اس کے علاوہ کئی روز تک پنجاب اور سندھ کے درمیان ٹریفک روک دی گئی۔ مظاہرین نے پورے ایک دن تک پنجاب سے سندھ آنے والی ٹریفک کو مکمل طور پر روکے رکھا۔ اگلے روز گھوٹکی اور کندھ کوٹ کے بائی پاس پر دھرنے دیئے گئے۔ بہر حال اس روز مظاہرین نے صرف ان بسوں، کوچز اور ٹرکوں کو روکے رکھنے پر اکتفا کیا جن پر بے گھر ہونے والے افراد سوار تھے جبکہ دوسری گاڑیوں کو گزرنے کی اجازت دے دی گئی۔

سفری تحفظ:

ریل گاڑیوں یا ریل کی پٹریوں کو نشانہ بنانے کے متعدد واقعات سال کے دوران درپیش آئے۔ اس قسم کی تخریب کاری نے تشویش ناک صورت حال پیدا کر دی اس لیے کہ عمومی طور پر لوگ ریل گاڑی کے ذریعے سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ خاص طور پر ایک سے دوسرے صوبے میں جانے کے لیے سفر کا یہی ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے۔ بلوچستان میں سرکش گروہوں نے مسافر ٹرینوں کو بلا امتیاز نشانہ بنانے کی ذمہ داری قبول کی۔ ان مجرمانہ کارروائیوں میں اپریل میں ہونے والا وہ دھماکہ بھی شامل ہے جو بلوچستان کے ضلعی ہیڈ کواٹر سبّی کے ریلوے سٹیشن پر کیا گیا جہاں ایک ٹرین کو نشانہ بنایا گیا۔ اس دھماکے میں 16 افراد جاں بحق اور 40 افراد زخمی ہوئے۔ اسی ماہ کے دوران ضلع بولان میں ایک مسافر ٹرین پر مسلح حملہ آوروں نے بے دریغ فائرنگ کی جس سے تین افراد جاں بحق اور چھ دوسرے زخمی ہوئے۔ فروری کے مہینے میں کراچی کے قریب ریلوے کی پٹڑی پر دھماکہ ہوا جس میں ایک لڑکی جاں بحق اور 23 افراد زخمی ہوئے۔ اس سے پہلے بھی سندھ میں ریلوے لائنوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا اور یہ شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان وارداتوں میں ذیلی علیحدگی پسند گروپ ملوث تھے۔ تاہم ان وارداتوں میں انسانی جانوں کا نقصان نہیں ہوا۔

ریلوے کی پٹڑیوں یا ٹرینوں پر جو حملے ہوئے یا حملے کی جو وارداتیں کی گئیں وہ سندھ میں نواب شاہ، کوٹری اور حیدر آباد، پنجاب میں رحیم یار خان اور بلوچستان کے کچھ علاقوں میں ہوئیں۔ اس کے علاوہ ملک کے متعدد علاقوں میں گاڑیوں اور شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد پر حملے کیے گئے۔ 21 جنوری کو بلوچستان کے ضلع مستونگ میں ایران سے واپس آنے والے زائرین کی دو بسوں کو خودکش حملہ آوروں نے نشانہ بنایا جس میں 28 افراد جاں بحق اور چالیس زخمی ہوئے۔ زائرین پر اس سے قبل ہونے والے حملوں کو سامنے رکھتے ہوئے برسوں پہلے زائرین کے قافلوں کو سرکاری سکیورٹی کے بغیر ایران جانے اور واپس آنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ 21 جنوری کو جس قافلے پر حملہ کیا گیا اس کے ساتھ تعینات سکیورٹی فورسز کی بسوں کو بھی نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ سکیورٹی فورسز کے چار افراد زخمی بھی ہوئے۔ کالعدم عسکری تنظیم لشکر جھنگوی نے

خضدار، بلوچستان میں ایران سے شیعہ زائرین کو واپس لانے والی دو بسوں پر خودکش حملہ

اس واقعہ کی ذمہ داری کا دعویٰ کیا اور متنبہ کیا کہ وہ اس قسم کے مزید حملے کرے گی۔ 21 جنوری کو ہونے والا یہ دوسرا حملہ تھا جو تین ہفتوں کے دوران شیعہ زائرین پر کیا گیا۔ اس سے قبل یکم جنوری کو کوئٹہ کے ہزار گنج کے علاقے میں بارود سے لدی ہوئی گاڑی نے شیعہ زائرین کو ایران لے جانے والی بس کو ٹکر ماردی۔ اس حملے میں ایک شخص جاں بحق اور 34 زائرین زخمی ہوئے۔ ایک کالعدم عسکریت پسند تنظیم نے اس حملہ کی ذمہ داری قبول کی۔ (''سوچ، ضمیر اور مذہب کی آزادی'' کے حوالے سے باب کو ملاحظہ کیجئے)

مسئلہ کا حل:

24 جنوری کو حکومت بلوچستان نے حفاظتی تدابیر کے طور پر شیعہ زائرین کی بسوں کو بلوچستان سے ایران جانے اور واپس آنے پر پابندی عائد کر دی۔ متبادل کے طور پر ایران سے واپس آنے والے زائرین کے لیے سی 130 کی پروازوں کا انتظام کیا گیا جن کے ذریعے 301 زائرین کو ایران سے کوئٹہ واپس لایا گیا۔ خطرہ تھا کہ تفتان۔ کوئٹہ ہائی وے پر زائرین کی بسوں پر حملے ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے قانون کے نفاذ کے ذمہ دار افراد کے کڑے پہرے میں 301 زائرین کو بسوں کے ذریعے ایرانی سرحد سے دالبندین کے ہوائی

اڈے پر لایا گیا جہاں سے انہیں ہوائی جہازوں کے ذریعے کوئٹہ لایا گیا۔

9 جون کو حکومت نے 8 جون کو ایرانی سرحد کے قریب تفتان میں دو ریستورانوں پر چار مسلح افراد کے حملہ کے بعد شیعہ زائرین کے بذریعہ سڑک ایران جانے پر پابندی عائد کر دی۔ اس حملے میں وطن واپس آنے والے تیس شیعہ زائرین جاں بحق ہوئے تھے۔ زائرین کی لاشوں اور زخمیوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے تفتان سے کوئٹہ لایا گیا۔

15 جنوری کو ہزارہ قبیلے کے سینکڑوں شیعہ افراد نے بذریعہ سڑک ایران کے سفر پر عائد کی جانے والی پابندی کے خلاف کوئٹہ میں زبردست مظاہرہ کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ بذریعہ سڑک سفر کرنے پر پابندی لگانے کی بجائے بلوچستان کے راستے ایران اور عراق کو سفر کرنے والے زائرین کی حفاظت کا بہتر بندوبست کیا جائے۔ مظاہرین کا کہنا تھا کہ ہر زائر ہوائی سفر کا خرچ برداشت نہں کر سکتا۔ اواخر اکتوبر میں حکومت ایسے شیعہ زائرین کے، لیے کراچی سے ایران تک بحری سفر کے اجراء پر غور کر رہی تھی جن کا مطالبہ تھا کہ زائرین کی حفاظت کے لیے بہتر اقدامات کیے جائیں۔ بحری سفر کے سبب بلوچستان میں دہشت گردی کے خطرات سے بچا جا سکتا ہے۔ اس وقت فیری سروس کے اجراء کے لیے وزارتِ امور خارجہ کی طرف سے اعتراض نہ ہونے کے سٹیفکیٹ کا انتظار تھا۔ پورٹس اینڈ شپنگ کے وزیر نے کہا کہ کاغذی کام اور دوسرے ضروری انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور این او سی کے اجراء کے ساتھ ہی یہ سروس شروع کر دی جائے گی۔ تاہم 2014ء کے اختتام تک تو فیری سروس شروع نہ ہو سکی تھی۔ ملک کے دوسرے حصوں کی سڑکوں پر بھی عقیدے کی بنیاد پر ہونے والے حملوں کی اطلاعات موصول ہوتی رہی ہیں۔ 2 اکتوبر کو گلگت کے قریب ایک مسافر بس سڑک میں نصب کیے گئے بم دھماکہ سے تباہ ہو گئی جس میں تین افراد جاں بحق اور نو افراد زخمی ہو گئے۔ تمام مسافر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی بس وادئ ہراموش جا رہی تھی جہاں کی تمام تر آبادی کا تعلق شیعہ مسلک سے ہے۔ پولیس نے اس حملے کو فرقہ وارانہ قرار دیا تھا۔

قافلے اور محافظ دستے:

مسافر بسوں کے قافلے بنانے اور بسوں کے محافظ دستوں کا نظام صرف بلوچستان تک محدود نہیں رہا۔ 12-2011ء میں ہونے والے دہشت گردی کے حملوں کے بعد گلگت۔بلتستان میں مسافر بسوں اور ویگنوں کے لیے قافلے کی صورت میں سفر کرنا اس وقت لازمی قرار دے دیا گیا تھا جب مسلح افراد نے بسوں کو روکا اور تصدیق کرنے کے بعد شیعہ مسافروں کو قتل کر دیا تھا۔ تاہم ان دھمکیوں اور خطرات کا توڑ کرنے کے

کوہستان میں کاروان مخالف ٹرانسپورٹروں کی جانب سے شاہراہ قراقرم کی بندش

لیے مؤثر اقدامات نہیں کیے گئے اور نہ ہی گاڑیوں پر حملہ کرنے والے لوگوں کا پتہ چلایا جا سکا۔

اپریل میں گلگت۔بلتستان کی دو ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشنوں نے اس علاقے اور راولپنڈی کے درمیان بس سروس معطل کر دینے کی دھمکی دی۔ وہ ایسے نظام پر ناخوش تھے جس میں چالیس مسافر بسوں کو قافلہ بننے اور محافظ دستوں کی فراہمی میں گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ قافلوں کی صورت میں سفر کرنے کے باعث سفر کا وقت دوگنا ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال سے پہلے یہ سفر پندرہ گھنٹوں میں مکمل ہو جاتا تھا لیکن اب تیس گھنٹے لگنے لگے تھے۔ گلگت۔بلتستان کے دوسرے اضلاع مثلاً سکردو، استور اور گھانچے تک کے سفر میں بہت زیادہ وقت خرچ ہونے لگا تھا۔ ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشنوں کا مزید کہنا تھا کہ سکیورٹی خدشات کی وجہ سے بیشام میں رات کو آٹھ گھنٹے قیام کرنا پڑتا تھا۔ جس کے سبب مسافروں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے کہ علاقے میں مناسب ہوٹل نہیں تھے۔

فاصلوں کی طوالت:

اہم شاہراہوں کی تکمیل یا ان کی مرمت میں ناکامی نے ملک کے کئی علاقوں میں پہلے کی نسبت سفر کو نہ صرف طویل بلکہ دشوار بنا دیا ہے اور اس حوالے سے کسی صوبے یا علاقے کو استثناء حاصل نہیں ہے۔ ملک میں ایسے مقامات کی کمی نہیں جہاں ناہموار سڑکوں یا سڑکوں کے عدم وجود کے باعث کچھ کلومیٹرز کا سفر آج بھی ایک

مواری کے علاقہ داروخوار میں ایک ندی سے گزرنے والی دیر چترال روڈ کے ناہموار حصہ کی بندش کی وجہ سے پھنسی ہوئی مسافر اور مال بردار گاڑیاں

دن میں طے ہوتا ہے۔ جون میں مسافر بسیں اور ٹرک لواری ٹاپ میں تقریباً چار روز تک پھنسے رہے اس لیے کہ ایک ندی سے گزرنے والی دیر۔ چترال روڈ کا ایک حصہ ناپختہ تھا جس کے باعث یہاں ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ خواتین اور بچے اس ویران علاقے میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے پاس نہ تو خوراک تھی اور نہ ہی پینے کا پانی۔ یہ روٹ موسم سرما میں برف باری کے باعث ہفتوں نہیں مہینوں بند رہتا ہے جس کی وجہ سے چترال کے باشندوں کا ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ رابطہ منقطع رہتا ہے۔ جنوری میں میڈیا رپورٹس کے مطابق آرمی انجینئرنگ کور کو ہدایت کی گئی کہ لواری ٹاپ روٹ کو کھلا رکھا جائے۔ موسم سرما میں چترال کے رہائشی پاکستان کے دوسرے علاقوں کو افغانستان سے گزر کر جاتے تھے۔ بہر حال پاک۔ افغان سرحد بند ہونے کے بعد ضلع چترال کے باسیوں کو لواری ٹاپ روٹ اپنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ مارچ میں دوبارہ برف باری کے باعث یہ راستہ ایک بار پھر بند ہو جاتا ہے۔

ملک کے کچھ حصوں میں چند شاہراہوں پر سفر تکلیف دہ ہو گیا۔ خصوصاً رات کے وقت امن وامان کی انتہائی خراب صورت حال کے سبب ان سڑکوں پر کم کم ہی سفر کیا جاتا ہے۔ ہوائی سفر اتنا مہنگا ہو چکا ہے کہ آبادی کا ایک مختصر سا حصہ ہی اس کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔ اندرون ملک آنے جانے کے ہوائی سفر کے اخراجات کم سے کم تنخواہ کے برابر ہیں۔ ہوائی سفر کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل لوگوں کو بھی

پروازوں میں معمول کی اور غیر اعلانیہ تاخیر یا منسوخی کے باعث تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاخیر کی نسبت وقت پر پروازوں کی روانگی غیر معمولی صورتِ حال لگتی ہے اور ریاستی ملکیت کی ائیر لائن کے حوالے سے تو یہ صورتِ حال معمول سا بن چکی ہے۔

گلگت بلتستان کے پہاڑی علاقے میں پروازوں کی آمدورفت کا انحصار صرف اور صرف موسم پر ہوتا ہے اور اس کا متبادل ایک واحد سڑک ہے جہاں تو دے گرنا غیر معمولی بات نہیں اور جہاں سفر میں پورا ایک دن خرچ ہوتا ہے اور بعض اوقات تو اس سے بھی کہیں زیادہ وقت لگتا ہے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق دیہی علاقوں اور قصبوں میں شہریوں کی ایک بڑی تعداد اس لیے بڑے شہروں کو انتقال کرنے پر مجبور ہوتی ہے کیونکہ ان کے علاقوں میں بنیادی ضرورتیں خصوصاً صحت اور تعلیم کی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ وہاں جرائم زیادہ اور روزگار کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر سڑکیں اچھی حالت میں ہوتیں اور شہروں کے ساتھ مواصلاتی رابطہ بہتر ہوتا تو یہ لوگ اپنے علاقے چھوڑ کر شہروں کا رُخ نہ کرتے۔

سکیورٹی آپریشنوں کے دوران کرفیو کے نفاذ نے شہریوں کی نقل و حرکت، خصوصاً فاٹا میں جہاں سکیورٹی فورسز عسکریت پسند گروپوں کے خلاف آپریشن میں مصروف تھیں، کی راہ میں مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ فروری میں حکام نے شمالی وزیرستان (بشمول میر علی، میران شاہ، دتہ خیل، رزمک اور دوسالی) کے زیادہ تر علاقوں میں کرفیو لگا دیا تھا اور یہ کرفیو غیر معینہ مدت کے لیے تھا اور سکیورٹی فورسز کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ کرفیو کی خلاف ورزی کے مرتکب کسی بھی فرد کو گولی مار سکتی تھیں۔ کرفیو کے نفاذ کا اعلان لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے کیا گیا اور وہ بھی اس وقت جب لوگ حکومت اور طالبان کے درمیان گفتگو میں تعطل آنے کے باعث گھروں کو چھوڑ کر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ (''مہاجرین'' کے باب کا مطالعہ کریں)۔

کرفیو وقفے وقفے سے شمالی وزیرستان کے متعدد حصوں میں نافذ رہا اور جون میں اس میں کمی کی گئی اور وہ بھی صرف اس مقصد کے لیے کہ شمالی وزیرستان میں طالبان اور دوسرے عسکریت پسندوں کے خلاف شدید کارروائی، جس کی بہت دنوں سے توقع کی جا رہی تھی، سے پہلے عام شہری اپنے علاقوں سے نکل سکیں۔

رہائش گاہ کے چناؤ کی آزادی:

اقوام متحدہ کی انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی نے اپنی 27 ویں عمومی رائے میں کہا ہے کہ ریاست کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی پسند کے رہائشی علاقے کا انتخاب آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 12 کے تحت ہر فرد کا حق ہے اور ہر فرد کو اس آرٹیکل کے تحت جبری بے دخلی کی تمام اقسام کے خلاف تحفظ حاصل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ملک کے متعدد علاقوں میں شہریوں کو تحفظ کے حق سے محروم رکھا گیا۔ اس میں موسم گرما میں آنے

والے سیلابوں کے متاثرین اور فاٹا کے لوگ شامل ہیں جہاں انتہا پسند عسکریت پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن کے دوران دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کو اپنے گھروں سے بھاگنا پڑا۔ فاٹا میں تصادم کے باعث بے دخلی کے شکار ہونے والے اس حق سے محروم رہے کہ وہ اپنی مرضی کے علاقے میں رہائش اختیار کرسکیں اس لیے کہ انہیں ملک کے اندر اپنی پسند کی منزل خصوصاً سندھ میں، تک سفر کرنے میں بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شہریوں کے بعض گروہوں کو حفاظتی وجوہات کے باعث ان علاقوں میں رہائش اختیار کرنا پڑی جہاں رہنے پر انہیں مجبور کیا گیا۔ ان گروہوں میں بلوچستان کی شیعہ ہزارہ کمیونٹی کے لوگ شامل تھے۔ انہیں کوئٹہ کی دو آبادیوں میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے کراچی اور اس جیسے بڑے شہروں میں شیعہ خاندان کو انہی علاقوں میں رہائش رکھنا پڑی جن میں شیعہ آبادی زیادہ ہے۔

کچھ شہروں میں، مثال کے طور پر گلگت میں تو صورت حال ایسی ہو چکی تھی کہ مدمقابل فرقہ سے تعلق رکھنے والے شہریوں کے لیے بعض علاقے ممنوعہ قرار دے دیئے گئے تھے۔ کراچی کی صورت یہ تھی کہ کسی جرائم پیشہ گروہ یا سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے مدمقابل گینگ یا سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے علاقے ''نو گو ایریاز'' بن چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے علاقوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ کراچی کے بہت سے علاقے طالبان کے تسلط میں ہیں اور حالت یہ ہے کہ پولیس ان علاقوں میں داخل نہیں ہوسکتی۔

بلوچستان میں نام نہاد آبادکاروں، غیر بلوچ افراد خصوصاً پنجابیوں اور سندھیوں کے خلاف ہونے والی پُرتشدد کارروائیوں نے یہاں کئی نسلوں سے آباد خاندانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں جا کر رہائش اختیار کریں۔ اطلاعات کے مطابق کوئٹہ کی شیعہ ہزارہ کمیونٹی کے ارکان ان پرتشدد کارروائیوں کے باعث ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بے شمار پاکستانی مسیحیوں کے بارے میں اطلاعات ملی ہیں کہ پاکستان سے بھاگ کر تھائی لینڈ میں جا کر آباد ہونے والے یہ لوگ انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

ملک چھوڑنے کی آزادی:

2014 کے دوران ملک سے باہر جانے کے خواہشمند افراد کو پاسپورٹ کے اجراء میں کچھ تاخیر، ایگزٹ کنٹرول لسٹ کے آمرانہ استعمال اور حکومت کے بارڈر کنٹرول سسٹم کے باعث مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے ملکوں میں پاکستانی مشنوں کے پاس مطلوبہ سہولت نہ ہونے کے باعث مشین ریڈ ایبل پاسپورٹ جاری نہ کر سکنے سے پیدا ہونے والی شکایات کا عدالتِ عظمیٰ نے نوٹس لیا اور حکومت کو ہدایت کی کہ درخواست

دہندگان کو مشین ریڈیبل پاسپورٹ جاری کرنے کے لیے فوری اقدامات کرے۔ ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر اعتراض کرنے والوں نے اس قانون پر سخت تنقید کی جس کے ذریعے عدالتی نظر ثانی کے بغیر ہی ملک سے باہر جانے کا حق چھین لیا گیا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس قانون کے تحت نہ صرف یہ کہ جرائم میں ملوث یا بدعنوانی کی تحقیقات میں شامل افراد کو ملک سے باہر جانے سے روکا گیا بلکہ ان لوگوں کو بھی ملک سے باہر جانے سے روکا گیا جن پر قانون کو پامال کرنے کا محض شبہ ہے۔ ان کی تشویش کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی یا دوسرے مخالفین کو بدسلوکی کا نشانہ بنانے اور انہیں ہراساں کرنے کے لیے یہ قانون استعمال کیا گیا۔ ہرگاہ کہ ای سی ایل میں ناموں کو شامل کرنے کے اقدام کو اکثر اوقات عدالتوں میں چیلنج کیا گیا اور 2014ء کے دوران اس پر عدالتی فیصلے بھی آئے لیکن اس قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے کسی قسم کے اقدامات نہیں کیے گئے۔

بیرون ملک سفر میں رکاوٹیں:

کراچی کے ہوائی اڈے اور طیّارے پر حملے اُن رکاوٹوں کا مظہر ہیں جو ہوائی سفر خصوصاً بین الاقوامی سفر میں 2014ء کے دوران درپیش رہیں۔ 8 جون کو کراچی کے جناح انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر دہشت گردوں کے حملے میں 36 افراد جاں بحق ہوئے، ان میں ہلاک ہونے والے دس دہشت گرد بھی شامل تھے۔ ممنوعہ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس حملے کے نتیجے میں چند فضائی کمپنیوں نے کراچی میں اپنی پروازیں بند کردیں۔ میڈیا رپورٹوں سے لگتا ہے جیسے متعدد فضائی کمپنیاں اپنی کراچی کی پروازوں پر پابندی لگانے پر سوچ بچار کر رہی ہیں۔

24 جون کو پشاور کے ہوائی اڈے پر سعودی عرب سے آنے والے پی آئی اے کے طیارے پر

ہوائی جہازوں اور ہوائی اڈوں پر حملوں سے ہوائی سفر میں نئے خطرات سامنے آئے

حکومت نے سڑکوں پر کنٹینر کھڑے کر کے احتجاجی مارچ کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کی

ہونے والے حملے میں ایک خاتون جاں بحق اور طیارے کے عملے کے دو افراد زخمی ہوئے۔ اس حملے کے بعد تقریباً تمام بین الاقوامی فضائی کمپنیوں نے جو پشاور سے پروازیں چلا رہے تھے، پشاور کے ہوائی اڈے پر اپنی پروازیں مسافروں اور عملے کے ارکان کی حفاظت کے نام پر بند کر دیں۔ بہت سی فضائی کمپنیوں نے اپنی پشاور کی پروازوں کو اسلام آباد منتقل کر دیا۔ ان میں سے بہت سی فضائی کمپنیوں نے ایک ماہ بعد اپنی پروازیں بحال کر دیں۔ قطر ائیرویز جس نے جولائی کے آغاز میں اپنی پروازیں بحال کر دی تھیں، 16 دسمبر کو آرمی پبلک سکول پشاور پر حملے کے بعد جس میں 135 طلبہ سمیت 150 افراد جاں بحق ہوئے تھے، آئندہ اعلان تک پشاور کو جانے اور وہاں سے آنے والی اپنی پروازوں کو بند کر دیا۔

مئی میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے ملک میں پولیو کے واقعات میں اضافہ کے پیش نظر پاکستان میں سخت سفری پابندیاں عائد کر دیں۔ ایک بیان میں ڈبلیو ایچ او نے کہا کہ پاکستان کیمرون اور شام ایسے ممالک تھے جہاں سے 2014ء کے دوران پولیو کا وائرس دوسرے ممالک کو منتقل ہوا۔ ڈبلیو ایچ او نے اس مرض کے خلاف لڑنے کے لیے نئے رہنما اصول جاری کیے جن میں سفارش کی گئی کہ بیرون ملک سفر کرنے والے پاکستانیوں کے لیے پولیو ویکسی نیشن سٹیفکیٹ پیش کرنا ضروری ہوگا۔ چونکہ ڈبلیو ایچ او اپنے طور پر سفری پابندیاں عائد نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے دوسرے ممالک کو بیرون ملک سفر کرنے کے خواہش مند پاکستانیوں کے لیے سفر کو پہلے کی نسبت اور زیادہ مشکل بنانے کے لیے کہا۔

نقل وحرکت کو محدود کرنا:

اگست میں پنجاب اور وفاقی حکومتوں نے دو سیاسی جماعتوں پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کی طرف سے اسلام آباد کی طرف کیے جانے والے احتجاجی مارچوں اور مظاہروں کی روک تھام کے لیے جو اقدامات کیے ان سے شہریوں کو نقل وحرکت میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پی ٹی آئی 2013ء کے انتخابات میں منظّم دھاندلی کے خلاف اور پی ٹی اے موجودہ سیاسی نظام کو سدھارنے اور 17 جون کو لاہور میں پی ٹی اے کے متعدد کارکنوں کی ہلاکت کے ذمہ دار افراد کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے احتجاجی مظاہرے کر رہی تھیں۔ پی ٹی اے کے یہ کارکن 17 جون کو لاہور میں پولیس سے ہونے والے تصادم میں جاں بحق ہو گے تھے۔ شروع میں تو حکومت نے سڑکوں پر بڑے بڑے کنٹینر لگا کر راستے روک دیئے اور یوں شہروں کے درمیان سفر ناممکن ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی پٹرول کی قلت نے (چاہے یہ قلت جان بوجھ کر پیدا کی گئی تھی یا اتفاقیہ تھی) جلتی پر تیل کا کا کام کیا جس کے باعث شہریوں کی نقل وحرکت انتہائی محدود ہو کر رہ گئی۔ دونوں جماعتوں نے اسلام آباد میں ایک دوسرے کے قریب دھرنے دیئے۔ وفاقی دارالحکومت کے مصروف علاقوں میں دھرنوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کارکنوں کی صف بندی کے باعث عام لوگوں کی نقل وحرکت بُری طرح متاثر ہوئی۔ دھرنوں کے باعث اعلیٰ عدلیہ کے ارکان کے لیے بھی وقت پر دفاتر میں پہنچنا بے حد مشکل ہو گیا۔

''موسمی'' بندشیں:

گزشتہ برسوں کی طرح 2014ء کے دوران بھی محرم کے مہینے میں فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کے لیے حکام نے سینکڑوں مذہبی رہنماؤں کے متعدد اضلاع میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ پابندی کا اعلان اواخر اکتوبر اور شروع نومبر میں کیا گیا۔ جس کا مقصد ان اضلاع میں فرقہ وارانہ نفرت کو پھیلنے سے روکنے اور امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے مذہبی رہنماؤں کے داخلے پر پابندی لگانا تھا۔ تاہم رواج کے مطابق ان مذہبی رہنماؤں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ سوائے اس کے کہ کچھ اضلاع میں مہینے بھر کے دوران ان کے داخلے پر پابندی رہی۔

خواتین کی نقل وحرکت پر بندشیں:

ریاست کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ نقل وحرکت کی آزادی کو عوام سے تحفظ مہیا کرے بلکہ نجی مداخلت سے بھی اس کو تحفظ دے۔ اس فرض میں کوتاہی کے کئی واقعات سامنے آئے۔ جولائی میں خواتین کی

چیچہ وطنی میں ایک شخص نے چھ ماہ میں پچاس سے زیادہ خواتین کو عوامی مقامات پر چُھرا مارا

نقل وحرکت کے حق میں دخل اندازی کے واقعات اس وقت رونما ہوئے جب ان خواتین کے ساتھ ان کے مرد رشتہ دار نہیں تھے۔ جولائی میں بلوچستان میں خواتین پر تیزاب پھینکنے کے واقعات ہوئے حالانکہ پہلے بلوچستان میں ایسے واقعات کا تصور ہی نہیں تھا۔ جب یہ واقعات ہوئے تو خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی وجہ صوبے میں مذہبی انتہا پسندی میں اضافہ تھا جس کا مقصد خواتین کو اس قدر ہراساں کرنا تھا کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ مستونگ میں 22 جولائی کو دو موٹر سائیکل سواروں نے سرنج کے ذریعے دو نوجوان بچیوں پر تیزاب چھڑکا۔ یہ لڑکیاں مارکیٹ سے گھر واپس جا رہی تھیں۔ اس واقعہ سے ایک روز قبل کوئٹہ میں دو موٹر سائیکلوں پر سوار افراد نے 18 سے 50 سال تک کی عمر کی چار خواتین کو نشانہ بنایا۔ جونہی وہ سریاب کوئٹہ کے علاقے میں ایک مارکیٹ میں عید کی خریداری کے لیے داخل ہوئیں تو ان پر تیزاب پھینکا گیا۔

پاکستان میں ہر سال تیزاب پھینکنے کے سینکڑوں واقعات ہوتے ہیں جن کا نشانہ عمومی طور پر خواتین ہوتی ہیں۔ ان حملوں کا نشانہ بننے والے مرد و خواتین کے چہرے بگڑ جاتے ہیں اور عموماً نشانہ بننے والے بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ عرصہ دراز سے ہمارا معاشرہ اس قسم کے حملوں کا شکار رہا ہے اور یہ حملے عام طور پر خاندان کی ''غیرت'' کے نام پر کیے جاتے ہیں۔ ان حملوں کی شکار خواتین پر خاندان کی عزت برباد کرنے کا

الزام عائد کیا جاتا ہے۔شادی کی تجویز رد کرنے پر بھی لڑکیوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ان حملوں کا شکار ہونے والی زیادہ تر خواتین حملہ آوروں کو جانتی پہچانتی ہیں۔لیکن جولائی میں بلوچستان میں وقوع پذیر ہونے والے دو واقعات کی وجوہات اس سے مختلف تھیں۔بلوچستان میں سیاسی اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں، جو اپنی معتدل مزاجی کے ساتھ ساتھ سیاست میں خواتین کی شرکت کے حامی ہونے کی پہچان رکھتے ہیں، کا کہنا ہے کہ ان حملوں کا مقصد خوف کی فضا پیدا کرنا ہے تاکہ خواتین کو تعلیمی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں سے دور رکھا جا سکے۔کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ حملے اخلاقیات کے نام پر کیے جاتے ہیں۔

لیکن پنجاب کے ضلع ساہیوال میں خرید وفروخت کے لیے جانے والی خواتین پر ہونے والے ایسے ہی حملے کرنے والے شخص نے یہی کہا کہ اس نے تباہ ہوتی اخلاقیات کے تحفظ کے لیے ایسا کیا۔مئی میں پولیس نے چیچہ وطنی میں عوامی مقامات پر تقریباً پچاس خواتین کو چاقو مارنے والے شخص کو چھ ماہ کی تگ ودو کے بعد گرفتار کیا۔اس نے اعتراف کیا کہ اس نے مردوں کے بغیر سڑکوں پر یا مارکیٹوں میں آنے والی خواتین پر حملے کئے اس لیے کہ ''وہ معاشرے میں بیہودگی پھیلا رہی تھیں''۔اس واقعہ کی تحقیقات کرنے والے پولیس افسروں نے میڈیا کو بتایا کہ ملزم کو مقامی مذہبی رہنماؤں نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ نیک، اخلاقی اور مذہبی مقصد کے لیے ایسا کرے گا۔ملزم نے تحقیقاتی افسروں کو بتایا کہ ''ایسے حملوں نے چیچہ وطنی میں بیہودگی کو کنٹرول کیا ہے، میرے حملوں کے خوف کے باعث اب خواتین بازاروں سے دور رہنے لگی ہیں''۔

سفارشات

☆ حکومت کی فوری ضرورت یہ ہے کہ وہ پورے ملک میں شہریوں کی نقل وحرکت کی آزادی کو یقینی بنانے کی ذمہ داری پوری کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ پاکستان میں کوئی ممنوعہ علاقہ نہیں ہے۔اس کے علاوہ حکومت تمام علاقوں میں ریاستی بالادستی کو مستحکم کرے اور لوگوں کو یہ احساس دلائے کہ وہ ملک بھر میں بلا خوف وخطر نقل وحرکت کر سکتے ہیں۔

☆ نقل وحرکت کی آزادی کو نہ صرف سرکاری بلکہ نجی مداخلت سے بھی تحفظ دیا جائے۔خصوصی کوششیں کی جائیں جن سے لوگوں کو یقین دلایا جا سکے کہ خواتین کو اُن حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو انہیں آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 12 کے تحت حاصل ہیں۔

☆ ای سی ایل کو مشتہر کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ وجوہات بھی مشتہر کی جائیں جن کے باعث کسی فرد کے نام کو ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کیا گیا ہے اور ای سی ایل کا آمرانہ استعمال روکا

جائے۔ پاسپورٹوں کے اجراء میں تاخیر کے عمل کو دور کرنے کی ضرورت ہے اور بیرون ملک تمام پاکستانی مشنوں میں مشین ریڈیبل پاسپورٹ جاری کرنے کی سہولت مہیا کی جانی چاہیے۔

☆ تمام شہریوں کو گھروں یا علاقوں سے جبری بے دخلی کی تمام شکلوں کے خلاف تحفظ دیتے ہوئے اپنی مرضی کی جگہوں پر رہائش اختیار کرنے کے ان کے حق کو محفوظ بنانے کے لیے خصوصی کوششیں کی جائیں۔ جبری مشقت کے خلاف قوانین کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے اس لیے کہ معاشرے کے محروم اور پسماندہ طبقات حقیقتاً غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

☆ شہریوں کو ان کی استطاعت کے مطابق قیمتوں پر نقل و حرکت کے وسائل یا ایندھن مہیا کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں تا کہ وہ اندرون ملک سہولت کے ساتھ کہیں بھی آ جا سکیں۔ ٹرین اور ہوائی سفر کو مزید باکفایت اور قابل اعتبار بنایا جائے۔

سوچ، ضمیر اور مذہب کی آزادی

پاکستان کے عوام کی خواہش ہے کہ ایک ایسا نظام وجود میں لایا جائے، جس میں بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ ان حقوق میں سماجی مساوات، مساوی مواقع کی فراہمی، سب کے لیے یکساں قانون، سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، فکر وضمیر اور اظہار رائے کی آزادی، ایمان، عقیدے، عبادت اور تنظیم سازی کی آزادیاں بھی شامل ہیں۔ یہ حقوق اور آزادیاں قانون اور اخلاق عامہ کی حدود کے تابع ہوں گی۔

آئین پاکستان [دیباچہ]

قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، الف: ہر شہری کو اپنے مذہب پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہوگا اور ب: ہر مذہبی گروہ، فرقے اور مسلک کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہبی ادارے قائم کرے، انھیں برقرار رکھے اور چلائے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 20]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں، سب کی عزت اور حق برابر ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل عطا کیے گئے ہیں، انھیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک اور رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 1]

ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، اور یہ آزادی بھی، کہ کوئی شخص تنہا یا کچھ افراد مل کر اجتماعی طور پر، نجی حدود میں یا سر عام، تعلیم و تبلیغ، اعمال و عبادات کے ذریعے اپنے مذہب کا اظہار کریں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 18]

کسی شخص پر اس طرح کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا کہ اس کا عقیدہ اور مذہب اختیار کرنے کی آزادی مجروح ہو۔

کسی ریاست، ادارے، افراد کے گروہ یا فرد کی طرف سے کسی شخص کے ساتھ اس کے مذہب اور عقیدے کے باعث کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

مذہب کی بنیاد پر ہر طرح کے امتیازی سلوک اور عدم برداشت کے خاتمے کے لیے اقوام متحدہ کا اعلامیہ

[آرٹیکل : 1 (2) اور 2 (1)]

پاکستان کی کل آبادی کا صرف تین فیصد حصہ مذہبی اقلیتوں پر مشتمل ہے۔ سال 2014ء کے دوران اقلیتوں کو بدسلوکی اور برے برتاؤ کا تسلسل کے ساتھ سامنا رہا۔ امتیازی قوانین، جارحیت، مذہبی اقلیتوں کو تحفظ دینے میں ریاست کی ناکامی اور عصبیت نے ستم رانی اور تشدد کے واقعات میں اضافہ کیا۔

اقلیتوں کے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے وفاقی حکومت نے کوئی قانون سازی نہیں کی۔ چاروں صوبائی اسمبلیوں میں سے خیبر پختونخوا وہ واحد صوبہ تھا جس کی اسمبلی نے اقلیتوں سے متعلق دو بل منظور کئے۔ ان قوانین کے تحت غیر مسلموں کو تحفظ ملنے کے علاوہ ان کی املاک کے انتظام وانصرام میں حکومتی مدد بھی ملتی ہے۔

انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم کے حوالے سے کام کرنے والے امریکی کمیشن نے جو رپورٹ شائع کی، اس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان ان ممالک میں سرفہرست ہے جہاں مبینہ طور پر مذہب پر حملہ کرنے والوں کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اگرچہ عدالتوں نے مذہب کی بے حرمتی کے الزام پر موت کی سزائیں سنائی ہیں لیکن تاحال ریاست کی طرف سے ایسے کسی ''مجرم'' کو پھانسی پر لٹکایا نہیں گیا۔ لیکن ایسے ملزموں پر نہ صرف یہ کہ ہجوم نے حملے کئے بلکہ یہ افراد ایسے واقعات کے بارے میں ہمہ وقت چوکس رہنے والوں کے تشدد کا شکار ہوئے۔ جن لوگوں پر مذہب کی بے حرمتی کے الزامات لگے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مذہبی بے حرمتی سے متعلق قوانین کے تحت مسیحیوں، ہندوؤں اور سکھوں کی نسبت احمدی زیادہ تعداد میں گرفتار کئے گئے۔

پاکستان بھر میں مذہبی اقلیتوں اور چھوٹے مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک خاصی تعداد تشدد پسند گروہوں کا نشانہ بنی۔ بلوچستان اور ملک کے دوسرے حصوں میں ذکری فرقہ کے افراد پر دو حملے ہوئے جن کے نتیجے میں کافی تعداد میں ذکری خاندان بلوچستان سے پاکستان کے دوسرے حصوں میں منتقل ہوگئے۔ مسیحیوں اور ہندوؤں کے نمائندوں نے بتایا کہ مسیحی اور ہندو اپنی جانوں کے تحفظ کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ لے رہے ہیں۔

نیشنل ڈیٹا بیس اور ریگولیشن اتھارٹی (نادرا) کے مطابق 14 مسیحی، 29 ہندو، دس بہائی اور چار بودھی خاندان فاٹا میں دہشت گردوں کے خلاف فوجی آپریشن سے بے گھر ہونے والے خاندانوں میں شامل ہیں۔ بے گھر ہونے والے کچھ خاندانوں نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ خیبر پختونخوا کے شہر بنوں میں قائم بے گھروں کے کیمپوں جہاں انہوں نے پناہ لی تھی، میں امتیازی سلوک کا بری طرح شکار ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ خوراک کی تقسیم والے مراکز پر انہیں نظرانداز کردیا جاتا تھا۔

اپنے عقیدے کی بنیاد پر کمزور طبقات کے لیے کام کرنے والے ہیومن رائٹس کمیشن کے ایکسپرٹ گروپ نے 2014ء کے دوران دو اجلاس کئے۔ یہ ایسا فورم ہے جس نے مختلف مذہبی اقلیتوں کے نمائندوں کو ان کے عقیدے کے حوالے سے درپیش چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے یکجا کیا۔ جولائی میں ہونے والے پہلے اجلاس میں مذہبی اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر ہونے حملوں پر تفصیلی غوروخوض کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان

قانون کا بڑھتا ہوا اثر

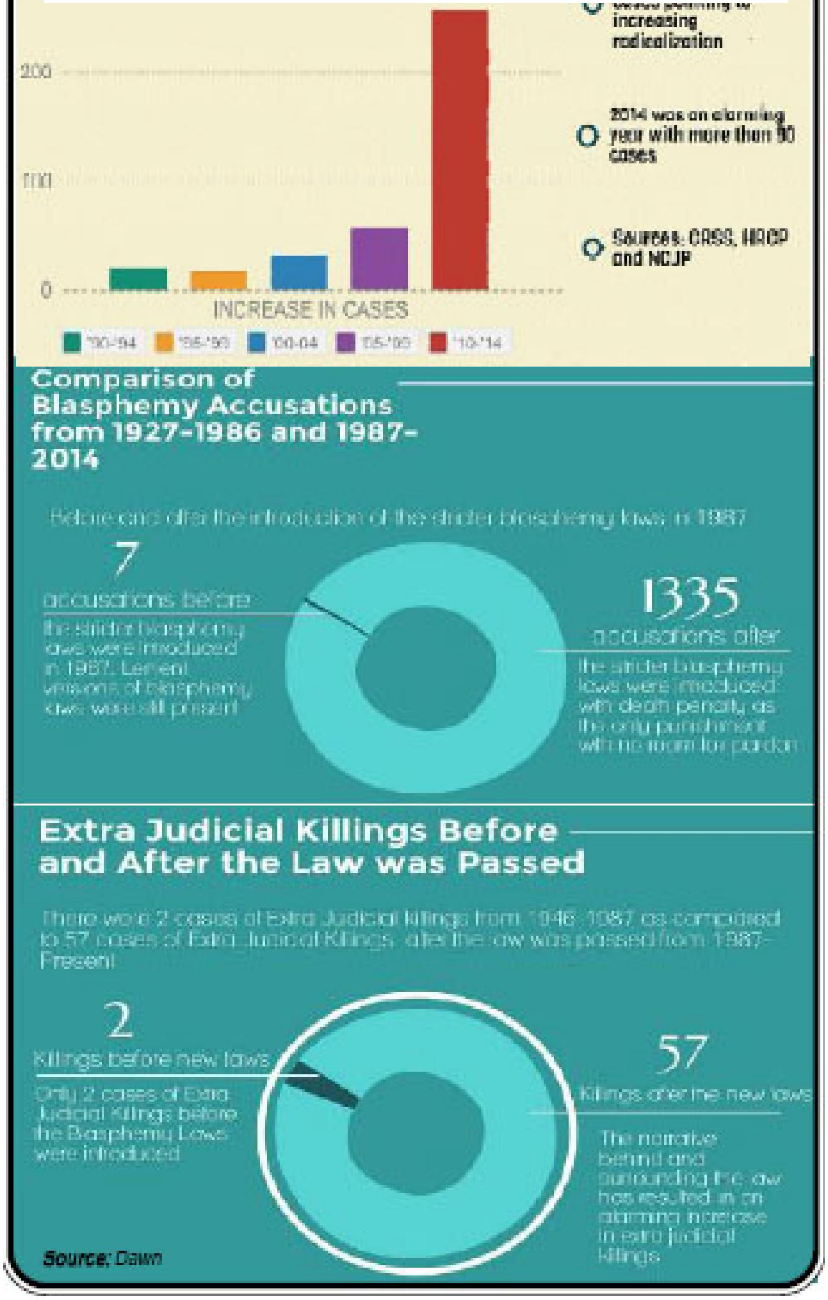

ذریعہ معلومات: روزنامہ ڈان

حملوں کے اسباب پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔نومبر میں ہونے والے اپنے دوسرے اجلاس میں ماہرین کے گروپ نے مذہبی اقلیتوں اور فرقوں کے ارکان کے لیے انصاف تک رسائی کے مختلف پہلوؤں پر بحث ومباحثہ کیا۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے جنوری میں پیرس میں قائم انسانی حقوق کی بین الاقوامی فیڈریشن (انٹرنیشنل فیڈریشن آف ہیومن رائٹس) کے ساتھ ایک مشاورتی اجلاس کیا جس میں ملک بھر سے مذہبی اقلیتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔اس مشاورتی اجلاس کا مقصد ان کے عقیدے کے حوالے سے ان چیلنجوں کے جوابات جاننا تھا جو انہیں درپیش تھے۔ان لوگوں نے جن اہم مسائل پر گفتگو کی ان میں عقیدے کی بنیاد پر امتیازی برتاؤ اور ان کی زندگیوں کے تمام پہلو جن کا تعلق سیاست اور قانون سے لے کر تعلیم اور ملازمت تک کے شعبوں سے تھا، شامل تھے۔ہندوؤں اور مسیحیوں کے لیے زبردستی کی گفتگو باعث پریشانی تھی۔ایک شریک گفتگو سکھ نے خیبر پختونخوا کے کچھ حصوں (خصوصاً مالاکنڈ ڈویژن) میں عسکریت پسندوں کو جزیہ ادا کرنے کی بات کی۔اس نے بتایا کہ رہائش کے علاقے میں داخل ہونے یا وہاں سے نکلنے پر یہ جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

مذہبی اقلیتی گروہ

پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کو درپیش کچھ اہم رجحانات، تصادمات اور چیلنج درج ذیل ہیں:

سکھ

پاکستان بابا گرونانک کی جائے ولادت ہے جو سکھ مذہب کے بانی ہیں۔لیکن سکھوں کے لیے پاکستان خصوصاً خیبر پختونخوا میں ان کے لیے زندگی انتہائی دشوار گزار ہو چکی ہے۔اس کی وجہ اہدافی قتل وغارت گری اور اغواء کی وارداتیں ہیں جن کا سامنا سکھوں کو کرنا پڑتا ہے۔کافی سکھ خاندان راولپنڈی اور اس جیسے دوسرے شہروں اور علاقوں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں جہاں ان کی زندگیوں کو مستقل طور پر خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور جہاں وہ نسبتاً محفوظ فضا میں کاروبار کر سکتے ہیں۔

3 ستمبر کو شہیداں بازار مردان میں نامعلوم افراد نے حملہ کر کے ایک سکھ کو اس کی دکان کے اندر قتل کر دیا۔اس واقعہ کے صرف دو روز بعد 6 ستمبر کو نامعلوم مسلح افراد نے ہشت نگری پشاور میں تین سکھوں کی دکانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی جس کے نتیجے میں کریانے کی دکان کا سکھ مالک قتل ہو گیا جبکہ دو دوسرے سکھ تاجر شدید زخمی ہو گئے۔پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی حملہ آور روپوش ہو گئے۔اس واقعہ کے خلاف سکھ کمیونٹی کے ارکان نے بازاروں میں احتجاج کیا اور اپنے تحفظ کے لیے اقدامات کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا۔

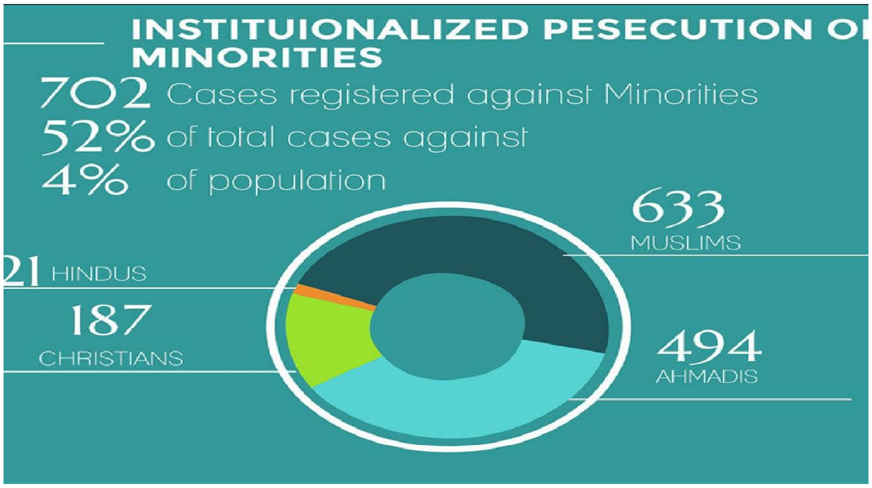

خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں سے اغواء کی خبریں بھی سال بھر کے دوران آتی رہیں۔ ڈان نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق اغوا کرنے والے عموماً تاوان کی رقم اتنی زیادہ مقرر کرتے ہیں کہ مغوی کے خاندان والے ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے نتیجتاً مغوی سکھ ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ فروری میں ڈیرہ اسماعیل خان سے دو سکھ تاجر اغواء کر لئے گئے۔ اغواء کرنے والوں نے چالیس لاکھ روپے تاوان کی رقم وصول کرنے کے بعد دونوں سکھ تاجروں کو رہا کر دیا۔

اگرچہ اب پشاور بھی سکھ برادری کے لیے محفوظ شہر نہیں رہ گیا اس کے باوجود فاٹا کے علاقے سے پانچ سو سکھ خاندان پشاور منتقل ہو گئے۔ یہ منتقلی فاٹا میں دہشت گردوں کے خلاف ہونے والے فوجی آپریشن کے پیش نظر ہوئی۔ مظاہروں کے دوران سکھوں نے کہا کہ وہ عبادت کرنے کے لئے گوردواروں اور اپنے دوسرے مذہبی مقامات پر جانے سے ڈرنے لگے ہیں اس لئے کہ وہاں پر حفاظتی انتظامات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ متعدد سکھوں کو اپنی دکانیں بند کرنا پڑیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں، خصوصاً لڑکوں کو سکول نہیں بھیجتے اس لیے کہ اپنی پگڑیوں کے باعث وہ فوری طور پر پہچان لیے جاتے ہیں۔

8 مئی کو گرو گرنتھ صاحب کا ایک نسخہ اس ہال سمیت جلا دیا گیا جہاں یہ نسخہ رکھا جاتا ہے۔ یہ واقعہ شکار پور میں جے رام داس دربار میں وقوع پذیر ہوا۔ اس سے صرف ایک روز قبل کراچی کی لی مارکیٹ کے بھاگ ناری گردوارہ میں گورو گرنتھ صاحب کے ایک نسخے کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ اس سے پہلے سندھ کے مختلف علاقوں سے سکھوں کی مذہبی کتب کی بے حرمتی کی خبریں تواتر کے ساتھ آتی رہی ہیں۔ 14 نومبر کو ایک مندر میں ایک ہندو گورو گرنتھ صاحب کے صفحات پھاڑتے ہوئے پکڑا گیا۔ ہندو مندروں میں سکھوں کی مذہبی

پشاور میں سکھوں کا احتجاج

کتب رکھنا ایک پرانا رواج ہے۔ پاکستان سکھ کونسل کے سربراہ رمیش سنگھ نے کہا ''اگر یہ لوگ ہماری کتابوں کی تعظیم نہیں کر سکتے تو ہماری مذہبی کتابیں ہمیں واپس کر دیں''۔

اس واقعہ کے حوالے سے سندھ سے لے کر خیبر پختونخوا تک سکھ برادری نے اسلام آباد میں پارلیمنٹ کا گھیراؤ کر لیا۔ مظاہرین سکھوں کے مقدس مقامات کی حفاظت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پاکستان سکھ کونسل نے ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کی اور متنبہ کیا کہ اگر اس واقعہ کے ذمہ داروں کو گرفتار نہ کیا گیا تو سکھ برادری پورے ملک میں احتجاجی مظاہرے کرے گی۔ 15 مئی کو قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومت پر زور دیا گیا کہ مذہبی اقلیتوں کے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے حفاظتی پولیس تعینات کی جائے۔

گرو نانک صاحب کا یوم ولادت منانے کے لیے بھارت سے ایک ہزار سے زائد سکھ پاکستان آئے۔ متروکہ وقف املاک ٹرسٹ کو توقع تھی کہ تین ہزار سکھ یاتری پاکستان آئیں گے لیکن ان میں سے کئی پاکستان نہیں آئے۔ اس کی وجہ واہگہ بارڈر پر ہونے والا بم دھماکہ ہو سکتا ہے۔ سکھ یاتریوں کی حفاظت اور ان کی دیکھ بھال کے لیے پنجاب حکومت نے گوردواروں پر حفاظتی انتظامات میں معمول سے کہیں زیادہ اضافہ کر دیا۔

سندھ میں ہندوؤں کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرنے کے واقعات سال بھر جاری رہے۔ایسے زیادہ تر واقعات کا تعلق ہندو لڑکیوں سے تھا جنہیں اغواء کیا گیا، انہیں زبردستی اسلام قبول کروایا گیا اور پھر ان کی شادیاں مسلمان مردوں سے کروائی گئیں۔آل پاکستان ہندو پنچائت کے سیکرٹری جنرل کا کہنا ہے کہ سندھ میں ہر سال تقریباً ایک ہزار لڑکیوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔اوراب تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہندو بچوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جانے لگا ہے۔4 فروری کو گھر گھر کھلونے اور برتن بیچنے والی دو نوعمر ہندو بچیاں شام کو اپنے گھروں کو واپس نہ لوٹیں۔تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مسلمان مرد کے ساتھ ہیں جس نے انہیں بطور مسلمان لڑکیاں عدالت میں پیش کیا ہے۔عدالت نے دونوں بچیوں کو اس بنا پر دارالامان بھجوا دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ہاتھوں اذیت برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔بعد میں ان میں سے ایک لڑکی کو والدین کے حوالے کر دیا گیا۔بچوں کو سکولوں میں بھی امتیازی سلوک کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب بہت سے ہندو والدین نے اپنے بچوں کے مسلمانوں والے نام رکھنے شروع کر دیئے ہیں۔

مذہب کی جبری تبدیلی کو روکنے کے لیے فوری طور پر جو قدم اٹھانے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہندو میرج لاء کا مسودہ تیار کیا جائے۔ ہندو پرسنل قوانین خصوصاً ہندو میرج لاء مدون نہ ہونے کے باعث ہندو برادری غم و غصے کا اظہار کرتی چلی آ رہی ہے۔2011ء میں ہندو میرج بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا لیکن یہ تا حال منظور نہیں ہو سکا۔سپریم کورٹ نے بھی حکومت کو ہدایت کی تھی کہ ہندو شادیوں کا اندراج کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں۔مسلمان اور مسیحی، حکومت سے شادی کے سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہندوؤں کے پاس ایسی کوئی دستاویز نہیں ہوتی جس سے ان کی شادی کا ثبوت مل سکے۔ایک دفعہ منظور ہو گیا تو ہندو میرج ایکٹ سے نہ صرف یہ کہ ہندو کمیونٹی کو تحفظ مل جائے گا بلکہ جبری طور پر مذہب تبدیل کرنے کے واقعات میں بھی بہت زیادہ کمی آنے کے ساتھ ساتھ پولیس بھی انہیں ہراساں نہیں کر پائے گی۔مزید برآں اس قانون کے بننے سے طلاق اور وراثت کے معاملات بھی حل کرنے میں انہیں مدد ملے گی۔

بلوچستان میں ہندو برادری عمومی طور پر اغواء کرنے والوں کا آسان ہدف ہے۔یہ لوگ ہندو تاجر یا ہندو کاروباریوں کو اٹھا لیتے ہیں اور پھر ان کے گھر والوں سے تاوان طلب کرتے ہیں۔28 مئی کو مسلح افراد نے پانچ بچوں کو سکول سے گھر واپس جاتے ہوئے اغواء کر لیا۔وہ ایک ہندو تاجر کے بیٹے اور بیٹیاں تھیں پولیس نے چار مشتبہ افراد کو گرفتار کیا مگر ان بچوں کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل پایا۔صوبے میں عدم تحفظ کے باعث بہت سے ہندو خاندان پاکستان کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔

لاڑکانہ میں ہندوؤں کے مندروں پر آتش گیر حملہ

پاکستان مسلم لیگ (ن) کے رکن اسمبلی اور پاکستان ہندو کونسل کے سربراہ رمیش کمار منکوانی کے مطابق اس تکلیف دہ صورتحال کے سبب ہر سال تقریباً پانچ ہزار ہندو پاکستان سے بھارت منتقل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سندھ میں بہت سی ہندو لڑکیاں اغواء کر لی جاتی ہیں اور اغواء کرنے والے انہیں زبردستی مسلمان کر کے ان سے جبری طور پر شادیاں کر لیتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مذہب کی جبری تبدیلی کے واقعات کو روکنے کے لیے موثر قوانین بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

فاٹا میں طالبان کے خلاف ہونے والے فوجی آپریشن کے سبب ہندو برادری کے ایک سو سے زائد ارکان کو اپنے گھر چھوڑنے پڑے۔ اخباری خبروں کے مطابق 29 ہندو خاندانوں کو خیبر پختونخوا کے شہر بنوں میں آئی ڈی پیز کے ساتھ پناہ لینا پڑی۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی خاندان کو شہر میں موجود کسی بھی حکومتی کیمپ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ ایک سرکاری افسر نے بتایا کہ ان خاندانوں نے خود کو رجسٹر نہیں کروایا تھا تاہم ان خاندانوں کے حوالے سے اقدامات تیزی کے ساتھ کئے جا رہے ہیں تا کہ ان کا مسئلہ حل ہو سکے۔ ان ہندو خاندانوں میں سے ایک خاندان نے بتایا کہ اقلیتوں کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا جاتا جو بے گھر ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

سال 2014ء کے دوران ہندوؤں کے متعدد متبرک مذہبی مقامات پر حملے کئے گئے۔ 26 جنوری کو دو نامعلوم مسلح افراد نے پشاور کے ایک ہندو مندر کی حفاظت پر مامور ایک پولیس اہلکار کو مار دیا۔ پولیس کو شبہ تھا کہ یہ حملہ دہشت گردوں نے کیا تھا۔ 15 مارچ کو نصف شب سے ذرا پہلے لاڑکانہ سندھ میں ایک ہجوم نے اس افواہ کے بعد کہ ایک ہندو نے قرآن پاک کے ایک نسخہ کی بے حرمتی کی تھی، مندر کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔ مقامی اسلامی مدرسے کے سینکڑوں طلبہ نے مندر اور کمیونٹی سنٹر کا گھیراؤ کر کے انہیں شدید نقصان پہنچایا۔ ہجوم نے مندر اور کمیونٹی سنٹر کی عمارتوں کو آگ لگا کر راکھ بنا دیا۔ اس سے قبل مندر میں داخل ہو کر ان مظاہرین نے ہندو دیوتاؤں کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ بہر حال پولیس جلد ہی موقع پر پہنچ گئی اور جس ہندو پر قرآن پاک کی بے حرمتی کرنے کا الزام لگایا گیا تھا، اس کو پولیس نے اپنی وردی پہنا کر وہاں سے بھگا دیا۔ 17 مارچ کو بدین میں ایک مندر پر حملہ کیا گیا۔ 28 مارچ کو حیدرآباد میں ہندوؤں کے ایک چھوٹے مندر کو جلا دیا گیا۔ 30 مارچ کو تھر پارکر میں فقیر پار براہم آشرم کی بے حرمتی کی گئی۔ 21 نومبر کو ضلع ٹنڈو محمد خان سندھ میں ایک مندر پر کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے آگ لگا دی۔ مندر میں موجود ہنومان دیوتا کے بت اور چند مذہبی کتب کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

پاکستان ہندو کونسل نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوؤں کے 1400 ایسے مذہبی مقامات ہیں جنہیں حکومتی توجہ کی اشد ضرورت ہے۔ راولپنڈی میں فوج ہندوؤں کے ایک مندر کو گرا کر وہاں فوجی بیرکیں اور ایک تعلیمی ادارے کے لیے عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ فوج چاہتی ہے کہ گریسی لائنز ایریا میں موجود مندر کے آس پاس رہائش پذیر ہندوؤں کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ ہندو برادری نے حکم امتناع حاصل کر لیا اور اب فوج نے پھر سے آبادکاری کی پیش کش کی ہے۔

مارچ میں کلفٹن کراچی میں ایک غیر مجاز ترقیاتی منصوبے سے 160 سالہ پرانے شری رتنیشور مہادیو مندر کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ بحریہ ٹاؤن نے اپنے ایک منصوبے کے رہائشیوں کی آسانی کے لیے ایک فلائی اوور کی تعمیر کے لیے اس مندر کو جانے والی سڑکوں کو کھودنا شروع کر دیا تھا۔ کھدائی کرنے والی بھاری مشینوں کے چلنے سے اس زیرزمین تاریخی مندر کی چھت کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی طرف سے لکھے گئے ایک خط کی بنیاد پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے ازخود نوٹس لیتے ہوئے متعلقہ حکام کو طلب کر لیا۔ اس وقت مقدمہ سندھ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے جس نے بحریہ ٹاؤن کے کرتا دھرتاؤں کو حکم دیا کہ وہ مندر کے ان حصوں کی مرمت کروائیں جنہیں نقصان پہنچا ہے اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ جو بھی تعمیراتی کام ہو وہ اس مندر سے کافی دور ہو۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے پشاور چرچ میں جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو زرتلافی کی عدم ادائیگی سے متعلق ایک پٹیشن پر حکومت کو ہدایت کی کہ وہ اقلیتوں کی عبادت گاہوں کے تحفظ کو یقینی بنائیں اور اقلیتوں کا ایک کمیشن تشکیل دیں۔ ایچ آر سی پی نے سندھ میں ہندو مندروں کی تباہی کے حوالے سے ایک رپورٹ عدالت میں پیش کی۔ ہندو برادری کے رہنماؤں نے حکومت سے کہا کہ دیوالی پر قومی تعطیل کا اعلان کرنے کے علاوہ ہندو ملازمین کو بونس ادا کیا جائے۔ پاکستان ہندو کونسل نے حکومت پر زور دیا کہ دیوالی والے دن سینٹ کا اجلاس منعقد نہ کریں۔ حکومت نے کونسل کی اس درخواست پر اتفاق کیا اور 2014ء میں پہلی بار دیوالی کے روز سینٹ میں تعطیل ہوئی۔ وزیر اعلیٰ سندھ نے اعلان کیا کہ تمام سرکاری ہندو ملازمین کو ایک چھٹی اور بونس دیا جائے گا۔ وفاقی حکومت نے دیوالی کے تہوار کی سرپرستی کی اور بہت سی سیاسی جماعتوں، پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان تحریک انصاف نے دیوالی منائی۔

مسیحی

سال کے دوران مسیحیوں کے ساتھ توہین رسالت کے بہت سے واقعات منسوب ہوئے جس کے باعث بہت سے مسیحیوں کو آزار پہنچایا گیا۔ پاکستان میں موجود توہین مذہب کا قانون ملزموں کے لیے انتہائی خوفناک ہے۔ اس جرم پر تو ملزم کی گرفتاری اور عدالت میں مقدمہ چلنے سے پہلے ہی لوگ فیصلہ کر دیتے ہیں اور ملزم مار دیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے خوفناک مثال شمع اور سجاد ہیں جنہیں لوگوں نے پتھر مار مار کر ہلاک کر کے اینٹیں پکانے والی بھٹی میں پھینک کر راکھ بنا دیا۔ یہ واقعہ 4 نومبر کو کوٹ رادھا کشن میں پیش آیا۔ آبادی کے لوگوں نے سنا تھا کہ اس مسیحی جوڑے شمع اور سجاد نے قرآن پاک کی توہین کی تھی۔ مقامی مولویوں نے لاؤڈ سپیکروں پر اعلان کے ذریعے مسلمان آبادی کو اکسایا، انہیں اشتعال دلایا۔ شمع اور سجاد اینٹوں کے ایک بھٹے پر کام کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسیحی جوڑے کو حملے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔ چنانچہ وہ بھٹہ مالک کے پاس گئے تاکہ اس سے چھٹی لے کر وہاں سے چلے جائیں۔ لیکن بھٹہ مالک نے انہیں کمرے میں بند کر دیا اور انہیں کہا کہ وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جا سکتے جب تک قرض کی تمام رقم واپس نہیں کر دیتے۔ ہجوم کو معلوم ہو گیا کہ وہ کمرے میں بند ہیں۔ چنانچہ ہجوم نے انہیں لاٹھیوں اور اینٹوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا اور بعد میں ان کی لاشیں دہکتی ہوئی بھٹی میں پھینک دیں۔ شمع کو پانچواں بچہ ہونے والا تھا۔ انہیں مارنے والوں میں سے کچھ کو کئی روز بعد گرفتار کیا گیا۔

پنجاب کے گاؤں تورے والا کے رہنے والے مسیحی اپنے مرنے والے ایک عزیز کو دفنانے کے لئے جگہ تلاش کر رہے تھے اس لیے کہ ان کے اپنے قبرستان میں کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ ایک مسلمان زمیندار نے

طلباء مسیحی جوڑے کو جلا کر راکھ کرنے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

انہیں دو ایکڑ کا رقبہ اس مقصد کے لیے تحفتاً دے دیا۔ لیکن 2 ستمبر کو تقریباً پانچ سو مسلمانوں نے مسیحیوں پر حملہ کر دیا اور کہا کہ اس زمین پر چند مسلمانوں کی قبریں پہلے سے موجود ہیں۔ زمیندار جس کا خاندان کئی نسلوں سے اس پلاٹ کا مالک تھا، مسلسل اصرار کرتا رہا کہ اس جگہ پر کوئی قبر نہیں تھی۔ اگلے روز ہمسائیگی میں رہنے والے چند مسلمانوں نے 53 مسیحیوں پر توہین مذہب کا الزام لگا دیا اور پولیس ایک دو سالہ بچے سمیت آٹھ افراد کو گرفتار کر کے لے گئی۔ تاہم ایک ہفتے بعد الزامات واپس لے لئے گئے۔ اس واقعہ کے بعد گاؤں کی مسیحی برادری نے اپنے مُردے قبروں سے بھرے ہوئے پہلے قبرستان میں ہی دفنانے شروع کر دیئے۔

''دی موومنٹ فار سالیڈیریٹی اینڈ پیس ان پاکستان'' نے اپریل میں ایک رپورٹ شائع کی جس میں انکشاف کیا گیا کہ پاکستان میں ہر سال تقریباً 700 مسیحی خواتین کو اغواء کر کے انہیں زبردستی مسلمان بنایا جاتا ہے اور پھر ان کی شادیاں مسلمان مردوں سے کر دی جاتی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق جب مغوی خواتین کو اغوا کرنے والوں کے خلاف مغویوں کے خاندانوں کی طرف سے ایف آئی آر درج کروائی جاتی ہے تو اغواء کرنے والے جوابی ایف آئی درج کروا دیتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ لڑکی نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔ اس قسم کے زیادہ تر معاملات میں عدالتی کارروائی کے دوران لڑکیاں اغواء کرنے والوں کے قبضے میں ہی رہتی ہوں۔

ایکسپریس ٹربیون کی ایک رپورٹ کے مطابق مسیحی برادری کے متحرک اور فعال ارکان نے بتایا کہ دھمکیوں، ستم رانی اور عدم تحفظ کے باعث ہزاروں مسیحی ملک چھوڑ گئے ہیں۔ان میں سے بہت سے تھائی لینڈ گئے کیونکہ وہاں جانا نسبتاً آسان اور کم خرچ تھا۔تھائی لینڈ کی مسیحی برادری کے چند نمائندوں نے کہا کہ تھائی لینڈ میں تقریباً دس ہزار پاکستانی مسیحی پناہ کے طلبگار ہیں۔

کئی افراد مشتعل ہجوم کا نشانہ بنے

میکائیل ٹاؤن، کورنگی، کراچی میں پچھلے برس تک مسیحی اور مسلمان برادریاں ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت سے رہتی آئی تھیں تا آنکہ پچھلے برس 23 ستمبر کو ان کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔اس ٹاؤن میں تقریباً 2000 مسیحی رہائش پذیر ہیں۔پشاور کے ایک چرچ پر ہونے والی دہشت گردی میں کئی مسیحی ہلاک ہوگئے تھے۔ان ہلاکتوں کے خلاف میکائل ٹاؤن کے مسیحیوں نے احتجاج کیا۔ ہمسائیگی میں رہائش پذیر مسلمانوں نے الزام لگایا کہ چند مسیحیوں نے ایک مسجد پر پتھر پھینکے جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان ہاتھا پائی ہوگئی۔اس جھڑپ میں ایک مسلمان جاں بحق ہوگیا۔مسیحیوں کا کہنا تھا کہ جاں بحق ہونے والا مسلمان خود اپنے ہی لوگوں کے پاؤں تلے کچلا گیا تھا۔اس کے بعد مسلمانوں نے مسیحیوں کے گھروں کو توڑ پھوڑ کر آگ لگادی۔تقریباً تین سو مسیحی خاندانوں کو میکائیل ٹاؤن سے بھاگنا پڑا تھا اور وہ اپنے گھروں میں واپس آنے سے خوفزدہ تھے۔کراچی کے ایسٹ ڈسٹرکٹ کے ڈسٹرکٹ کمشنر نے دونوں برادریوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے ایک اجلاس بلایا لیکن مسیحیوں کو واپس آنے کے لیے جو شرائط منظور کرنا پڑیں وہ بے حد غیر متوازن تھیں۔ٹاؤن کا نام ''میکائیل ٹاؤن'' سے تبدیل کرکے ''خلفائے راشدین کالونی'' رکھ دیا گیا۔مسیحیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے چرچ کے باہر سے لاؤڈ سپیکر ہٹالیں۔اس فساد میں زخمی ہونے والے تین مسلمانوں کو زرِتلافی ادا کیا گیا جبکہ زخمی ہونے والے کسی بھی مسیحی کو کچھ نہیں دیا گیا۔آج تک مسیحیوں کے گھروں پر حملہ کرنے والوں کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کی گئی۔مسیحی برادری کو خبردار کردیا گیا تھا کہ اس لڑائی میں جاں بحق ہونے والے مسلمان کے مقدمہ میں مسیحی برادری کوئی شہادت پیش نہیں کرے گی۔وہ مسیحی جنہیں اب بھی طعن و تشنیع کا کا سامنا کرنا پڑتا ہے مسلمانوں کا سامنا کرنے سے گریز کریں گے تا کہ کوئی جھگڑا نہ ہو۔ اس کے علاوہ مسیحی اپنے سر جھکا کر رکھیں گے۔بچوں تک کو محرومی کا شکار کردیا گیا ہے اور انہیں کھیل کے میدان میں کرکٹ کھیلنے کی اجازت نہیں۔

مسیحی قوانین نوآبادیاتی دور میں بنائے گئے تھے ان میں بہتری کی ضرورت ہے۔اگست میں وفاقی حکومت نے طویل مشاورت کے بعد کرسچین میرج اور کرسچئن ڈیئوورس (طلاق) ایکٹ میں ترامیم تجویز کی

تھیں۔ یہ مشاورت مسیحی تنظیموں کے راہنماؤں کے ساتھ کی گئی تھی۔ مجوزہ کرسچین میرج ایکٹ میں سے چرچ آف انگلینڈ، چرچ آف سکاٹ لینڈ اور رومن کیتھولک چرچ کے کردار کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ شادی کرنے والے افراد کی عمر 18 برس سے کم نہیں ہونی چاہیے اور ہر چرچ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شادی کو باضابطہ بنائے۔ مجوزہ کرسچین ڈائیورس ایکٹ میں نو وجوہات یا اسباب کی بنا پر شادی ختم ہو سکے گی۔ اس سے قبل صرف بدکاری کی بنیاد پر طلاق ہو سکتی تھی۔ مسیحی برادری نے حکومت پر زور دیا کہ مسیحی خواتین کے لیے وراثت کے قوانین بھی تیار کروائے جائیں۔

تقریباً 114 مسیحی خاندانوں کو فاٹا میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر بنوں میں قائم کیے گئے آئی ڈی پیز کے کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس بے گھری کی وجہ علاقے میں دہشت گردوں کے خلاف فوجی آپریشن سے پیدا ہونے والی صورت حال تھی۔ بعض خاندانوں نے بتایا کہ سرکاری کیمپوں میں ان کو امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا اور خوراک کی تقسیم کے وقت انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔

احمدی:

1974ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے احمدیوں کو پاکستان میں غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ ان پر خود کی بطور مسلمان شناخت کروانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے علاوہ ان پر اپنے عقیدے کی تبلیغ کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس حوالے سے ہونے والے مختلف تحقیقی کاموں سے واضح ہوتا ہے کہ احمدی پاکستان کا وہ مذہبی گروہ ہے جس پر سب سے زیادہ تشدد کیا گیا اور جس کے ارکان پر زندگی تنگ کر دی گئی۔

27 جولائی کو گوجرانوالہ میں ایک ہجوم ایک احمدی کے خلاف توہین مذہب کا مقدمہ درج کروانے کے لیے تھانے گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے فیس بک پر توہین مذہب کا ارتکاب کیا تھا۔ اسی دوران گوجرانوالہ میں ایک اور ہجوم اُس احمدی کے پڑوس میں گیا اور آٹھ گھروں کو آگ لگا کر راکھ کر دیا۔ دھوئیں سے ہونے والی گھٹن کے باعث ایک احمدی خاتون اور دو لڑکیاں جاں بحق ہوگئیں۔ ہجوم نے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں اور ایمبولینسوں کو ان گھروں تک نہیں پہنچنے دیا۔ اس تشدد کو روکنے کے لیے پولیس نے بے دلی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ اس سال کے دوران احمدیوں کے خلاف یہ واحد حملہ نہیں تھا۔ سال کے دوران احمدیوں پر جو حملے کیے گئے ان میں گیارہ احمدی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ خلیل احمد پر الزام تھا کہ وہ توہین رسالت کا مرتکب ہوا تھا اور اس الزام میں وہ تھانے میں بند تھا۔ 16 مئی کو ایک شخص تھانے میں داخل ہوا اور گولی مار کر خلیل احمد کو ہلاک کر دیا۔ حملہ آور گرفتار کر لیا گیا۔ 26 مئی کو کینیڈین۔ امریکن ماہر امراض قلب

گوجرانوالہ میں ایک احمدی پر تضحیک مذہب کا الزام عائد کر کے احمدیوں کی املاک لوٹ لی گئیں

ڈاکٹر مہدی علی قمر کو دو نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ڈاکٹر مہدی اپنی کمیونٹی کی خدمت کے لیے آئے ہوئے تھے اور ربوہ کے قبرستان میں گھوم رہے تھے۔

احمدیوں کی بعض عبادت گاہوں پر بھی حملے کیے گئے۔ 23 جنوری کو چند نامعلوم افراد نے احمدیوں کی ایک عبادت گاہ کو آگ لگا دی۔ تاہم اس واقعہ میں عمارت کے دروازے کو نقصان پہنچا۔ 26 جنوری کو کچھ لوگوں نے فیصل آباد میں احمدیوں کی ایک عبادت گاہ کا گھیراؤ کر لیا اور اس پر کندہ مذہبی تحریروں کو مٹا دیا۔ 18 فروری کو رحیم یار خان میں پولیس کی معیت میں کچھ لوگوں نے احمدیوں کی زیر تعمیر عبادت گاہ کو گرا کر تباہ کر دیا۔ اس ماہ کے دوران نارووال میں پولیس نے احمدیوں کو عبادت گاہ تعمیر کرنے سے روک دیا۔ مزید برآں احمدیوں کے قبرستانوں کی وقتاً فوقتاً بے حرمتی کی جاتی رہی۔

مختلف تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں احمدیوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا گیا اور انہیں ہراساں کیا جاتا رہا۔ انہیں ملازمت کے مساوی مواقع نہیں دیئے گئے۔ اس کے علاوہ قومی اور مقامی انتخابات میں بھی انہیں حصہ لینے سے روکا گیا۔ میڈیا میں ان کے خلاف پراپیگنڈہ جاری رہا۔ پوسٹروں پر، ریلیوں میں،

احمدیوں کے خلاف احتجاج میں شامل ہونے کی اپیل

پمفلٹوں وغیرہ میں احمدیوں کے خلاف زہر اگلا جاتا رہا۔ 22 دسمبر کو جیو ٹی وی پر عامر لیاقت حسین کے پروگرام میں عارف اویسی نے احمدیوں کو تمام مسلمانوں اور پاکستان کے مشترکہ دشمن قرار دے دیا۔ اس پروگرام کے نشر ہونے کے ایک ہفتے کے اندر اندر گوجرانوالہ میں ایک احمدی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

توہین رسالت سے متعلق قانون:

2014ء کے دوران تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی (توہین رسالت سے متعلق قانون) کے تحت 12 مقدمات درج کیے گئے۔ پاکستان میں جس وقت کسی شخص پر توہین رسالت کا الزام لگتا ہے، اس (مرد یا عورت) کی زندگی اسی وقت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ عمومی طور پر توہین رسالت کے ملزموں کو لوگ خود ہی مار دیتے ہیں یا غضبناک ہجوم اُنہیں زندہ جلا دیتا ہے۔ تاہم جن ملزموں کو پولیس بروقت گرفتار کر لیتی ہے، وہ خوش قسمت کہلاتے ہیں۔ عام طور پر پولیس توہین رسالت کے ملزموں کو ابتدائی تحقیقات سے پہلے ہی گرفتار کر لیتی ہے۔ اس کا ایک مقصد تو غضبناک ہجوم کو خوش کرنا اور دوسرا مقصد ملزم کو ہجوم کے ''انصاف'' سے بچانا ہوتا ہے۔ لیکن اب تو پولیس کی حراست بھی محفوظ نہیں رہی۔ 70 سالہ محمد اصغر برطانیہ سے واپس آیا تھا۔ وہ نفسیاتی مریض تھا۔ اس کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے کے الزام میں توہین رسالت کے قانون کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ اس کو پولیس اہلکار نے کئی گولیاں ماریں۔ اس کو فوری طور پر ہسپتال منتقل کیا گیا۔ پولیس اہلکار کو جب اس کے دوسرے ساتھیوں نے روکنے کی کوشش کی تو وہ چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا ''میں توہین رسالت برداشت نہیں کر سکتا اور ایسا کرنے والے کو قتل کرنا چاہتا ہوں''۔ ایک مسیحی پاسٹر جسے توہین رسالت میں گرفتار کیا گیا تھا، محمد اصغر کے سیل میں اسی کے ساتھ قید تھا۔ اس پولیس اہلکار کی فائرنگ سے وہ پاسٹر بھی جان سے گیا۔

4 نومبر کو قرآن پاک کے نسخہ کی توہین الزام میں ہجوم نے یک مسیحی جورے شمع اور سجاد کو مار مار کر نہ صرف ہلاک کر دیا بلکہ بعد میں ان کی نعشیں بھی جلا دیں۔ یہ واقعہ لاہور کے نواحی علاقے کوٹ رادھا کشن میں پیش آیا۔ جہاں یہ دونوں میاں بیوی اینٹوں کے بھٹے پر جبری مشقت کرتے تھے۔ عدالتِ عظمیٰ، وزیراعظم اور وزیراعلیٰ نے واقعہ کا نوٹس لیا اور واقعہ کے ذمہ داروں کو جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔

امیر ہوں یا غریب، پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہوں یا بااثر خاندانوں سے، توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے بچ نکلنے کا امکان بہت ہی کم ہوتا ہے۔ سابق گلوکار اور ٹی وی کی ممتاز شخصیت جنید جمشید کے خلاف توہین رسالت کا مقدمہ درج کیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنے ٹی وی پروگرام کے دوران ایسے فقرے ادا کیے جو توہین رسالت کی تعریف میں آتے تھے۔ انہوں نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں انہوں نے اپنے فقروں پر معافی مانگی اور درگزر کرنے کی درخواست کی۔ بہرحال اگر کوئی شخص توہین رسالت کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر پاکستان کے توہین رسالت سے متعلق قانون کے تحت اسے معافی نہیں مل سکتی۔ اس صورت حال کے پیش نظر جنید جمشید ملک سے فرار ہوگئے اور لندن میں جا کر پناہ لی۔

توہین رسالت کے مقدمات میں ملزموں کی وکالت کرنے والے وکلاء اور مقدمات کی سماعت کرنے والے جج بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) ملتان میں کام کرنے والے ممتاز وکیل راشد رحمان جو جنوبی پنجاب کے لیے ایچ آر سی پی کے کوآرڈی نیٹر تھے، کو اپریل میں کھلی عدالت میں جج کے سامنے توہین رسالت کے ایک ملزم کی وکالت کرنے پر دھمکیاں دی گئیں۔ ملزم کی وکالت کرنے کے لیے کوئی وکیل تیار نہیں ہوتا تھا، جس پر راشد رحمان نے ملزم کے دفاع کا فیصلہ کیا۔ 7 مئی کو رات پونے نو بجے کے قریب دو نامعلوم حملہ آور ایچ آر سی پی کے دفتر میں قانونی مشورہ لینے کے بہانے آئے۔ دفتر کے اندر داخل ہوتے ہی دونوں نے راشد رحمان پر فائرنگ کر دی۔ ایک گولی ان کے سر میں لگی جس سے وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ ان پر پانچ گولیاں برسائی گئیں۔ حملے میں ایک ساتھی وکیل اور راشد رحمان کا ایک موکل شدید زخمی ہو گئے۔ چہلک پولیس اسٹیشن ملتان میں مقدمہ درج کیا گیا۔ قاتلوں کو پکڑنے میں تا حال کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ لوگ گرفتار کیے گئے جنہوں نے جج کی موجودگی میں کھلی عدالت میں راشد رحمان کو دھمکیاں دی تھیں۔

2013ء میں ساون مسیح پر الزام لگایا گیا کہ اس نے ایک مسلمان دوست کے ساتھ جھگڑا کرنے کے دوران ایسے فقرے استعمال کیے جو توہین رسالت کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ الزام لگنے کے بعد غضبناک ہجوم نے لاہور کے قریب مسیحیوں کے ایک رہائشی علاقے جوزف کالونی پر حملہ کر دیا اور متعدد گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ مارچ میں ساون مسیح کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ جس کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ اسی طرح ایک مسیحی جوڑے شفقت ایمنوئیل اور شگفتہ کوثر نے توہین رسالت پر مشتمل فقرے ایس ایم ایس کے ذریعے لوگوں کو بھیجے۔ ان دونوں کا تعلق گوجرہ سے تھا اور یہ واقعہ 2013ء میں پیش آیا۔ ان سزاؤں کے خلاف عیسائی کمیونٹی نے لاہور کے کچھ علاقوں میں مظاہرے کیے۔ چار سال قبل ایک مسیحی خاتون آسیہ بی بی کو توہین رسالت کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے اکتوبر میں اس کی سزائے موت کو برقرار رکھا۔ اس نے نومبر میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ بے قصور ثابت ہو کر رہائی پانے کے باوجود توہین رسالت کے ملزم ہجوم کی طرف سے ملنے والے ''انصاف'' کے خوف سے اپنے گھروں کو واپس نہیں جا سکتے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں پناہ لینی پڑی۔

فرقہ وارانہ تشدد:

عسکریت پسند گروہوں کی طرف سے ہونے والے فرقہ وارانہ حملوں نے تعداد میں فرقہ وارانہ ٹکراؤ کے معاملات کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ جن عسکری گروہوں نے ان حملوں کی ذمہ داری قبول کی یا جن پر ایسے حملے کرنے کا شک ہے، ان میں لشکر جھنگوی، جیشِ اسلام، تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) اور سپاہ صحابہ سرفہرست ہیں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (پی آئی پی ایس) کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان بھر میں 2014ء کے دوران فرقہ وارانہ تشدد سے جڑے دہشت گردی کے کل 144 واقعات ہوئے۔ ان کے علاوہ فرقہ وارانہ تصادمات کے تین واقعات ہوئے۔

2014ء کے دوران ہزارہ قبیلہ سے تعلق رکھنے والے متعدد شیعہ حضرات کے قتل کے بعد عسکریت پسند گروپوں نے بلوچستان میں ذکری فرقہ کے لوگوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ جولائی میں ذکری فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو لے جانے والی ایک بس پر خضدار بلوچستان کے علاقے میں حملہ کیا گیا جس میں سات افراد شدید زخمی ہو گئے۔ 29 اگست کو ایک بار پھر ذکری فرقہ کے لوگوں کو اواران، بلوچستان میں نشانہ بنایا گیا۔ واقعہ کے مطابق تین نامعلوم مسلح افراد نے اواران میں ذکریوں کے ایک مقبرے پر حملہ کیا۔ گولیاں لگنے سے مقبرے میں موجود چھ ذکری جاں بحق ہو گئے۔ متعدد ذکری خاندان ان اہدافی حملوں کے باعث بلوچستان چھوڑ کر پاکستان کے دوسرے علاقوں میں جا بسے۔

23 اکتوبر کو آٹھ ہزار شیعہ حضرات نامعلوم افراد کی فائرنگ سے جاں بحق ہو گئے۔ حملہ آور ان کی بس پر چڑھ گئے اور ان پر فائرنگ کر دی۔ کسی نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول نہیں کی لیکن شبہ ہے کہ اس واقعہ کی ذمہ داری لشکر جھنگوی پر ہے اس لیے کہ پہلے بھی یہی ہزارہ شیعہ حضرات پر حملے کرتے رہے ہیں۔ 4 اکتوبر کو ایک خودکش حملہ آور نے ہزارہ ٹاؤن، کوئٹہ کے عید بازار میں ہجوم پر حملہ کر دیا۔ اس میں پانچ افراد جاں بحق جبکہ 20 شدید زخمی ہوئے۔

جنوری میں مستونگ بلوچستان میں شیعہ زائرین کو لے جانے والی بسوں پر لشکر جھنگوی کے جنگجوؤں نے حملہ کر کے 23 افراد کو قتل اور 32 کو شدید زخمی کر دیا۔ جاں بحق ہونے والوں میں بچے اور خواتین بھی شامل تھیں۔ اس واقعہ کے خلاف ملک بھر میں شیعہ آبادی کے ساتھ ساتھ سنی آبادی نے بھی احتجاجی مظاہرے کئے۔ نئے سال کے پہلے روز عسکری گروہ جیش الاسلام نے ایران سے کوئٹہ سفر کرنے والے شیعہ زائرین کی بس پر خودکش حملہ کر دیا جس میں تین شیعہ زائرین جاں بحق اور 34 زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے والوں میں وہ

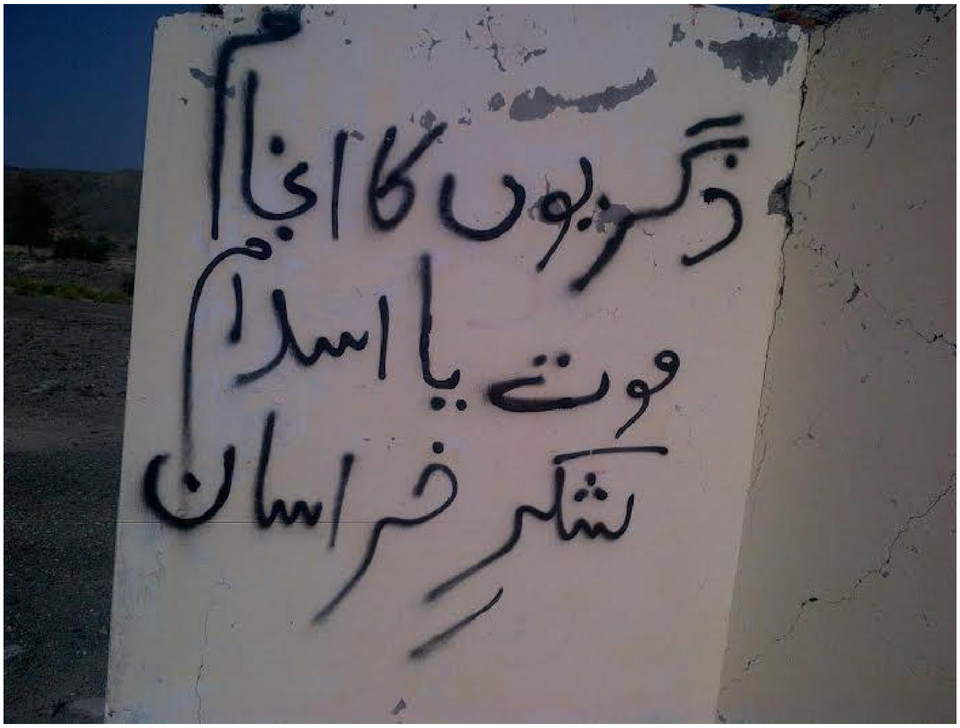

ذکریوں کو قتل کی دھمکیاں

پولیس اہلکار بھی شامل ہیں جو بس کی حفاظت پر مامور تھے۔ 21 جنوری کو شیعہ زائرین کو ایران سے کوئٹہ لے جانے والی بس پر بم مارے گئے۔ اس حملے میں عورتوں اور بچوں سمیت 20 افراد زخمی ہو گئے۔

مارچ میں ہنزہ۔نگر، گلگت بلتستان میں اسماعیلی فرقے کے لوگ جشن نوروز (نیا مذہبی سال) منانے کے لیے جمع ہوئے جہاں پر شیعہ اور سنی فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے حملہ کر کے انہیں منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔ جن حملہ آوروں کو پولیس نے گرفتار کیا، انہوں نے بعد میں بتایا کہ انہوں نے اسماعیلیوں پر حملہ اس لیے کیا کہ ان کے خیال میں اسماعیلی لوگ علاقے میں فحاشی کو فروغ دے رہے ہیں۔

2 اکتوبر کو چند شیعہ خواتین و حضرات ایک وین میں سفر کر رہے تھے۔ گلگت۔سکردو روڈ پر ہراموش گاؤں کے قریب ان پر بم سے حملہ کیا گیا۔ واقعہ میں پانچ خواتین، دو مرد اور تین بچے زخمی ہوئے۔ مقامی پولیس نے بتایا کہ یہ فرقہ وارانہ حملہ تھا۔ نومبر میں بدین، سندھ میں شیعہ سنی فساد ہو گیا۔ محرم کے جلوس کی گزرگاہ کے حوالے سے شیعہ حضرات اور اہل سنت والجماعت (اے ایس ڈبلیو آئی) کے کارکنوں کے درمیان ہونے والی تلخی بڑھتے بڑھتے تصادم کی شکل اختیار کر گئی۔ دونوں اطراف کے لوگوں نے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا اور ڈنڈے برسائے۔ اس تصادم میں دس افراد زخمی ہوئے۔ 9 محرم کو اورکزئی ایجنسی، فاٹا میں دوپہر کے وقت

کوئٹہ کے مضافاتی علاقے اختر آباد میں ایک خودکش بمبار نے مسافر بس کے ساتھ دھماکہ خیز مواد سے بھری گاڑی ٹکرادی

امام بارگاہ کے بالکل قریب سڑک کے کنارے بم دھماکہ ہوا جس میں دو افراد جاں بحق اور 28 افراد زخمی ہوئے۔ چند روز بعد لوئر اورکزئی میں ایک سڑک پر سے گزرنے والے ماتمی جلوس پر حملہ کیا گیا۔ عسکریت پسندوں نے ہجوم پر بم اور راکٹوں سے حملہ کیا۔ اس حملہ میں دو افراد جاں بحق اور سات شدید زخمی ہوئے۔

دسمبر میں امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آئی ایس او) کے سینکڑوں کارکن ڈگری کالج فار بوائز گلگت کے ہال میں ایک مذہبی دن منانے کی غرض سے جمع تھے کہ سنی فرقہ کے ایک سو سے زائد طلبہ نے ہال کے باہر جمع ہو کر شیعوں کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ دونوں گروپوں نے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا۔ فائرنگ کی گئی جس میں تین طالب علم زخمی ہو گئے۔ مقامی انتظامیہ اور پولیس نے تصادم کو روکنے کے لیے مداخلت کی۔ پولیس نے فساد کرنے، زخمی کرنے سمیت متعدد الزامات پر مشتمل 17 طالب علموں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ اس تصادم کے بعد پولیس نے کالج کیمپس خالی کروایا اور وہاں سے چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد نامعلوم افراد کالج میں داخل ہوئے اور تین کلاس رومز اور لائبریری کے ایک حصہ کو آگ لگا دی۔

2014ء کے دوران عسکریت پسندوں نے متعدد مزاروں پر حملے کیے۔ 7 جنوری کو ایک صوفی بزرگ ایوب شاہ بخاری کے مزار پر چھ افراد کی لاشیں ملیں جن کے گلے کاٹ دیئے گئے تھے۔ یہ مزار کراچی کے مضافاتی علاقے میں ہے اور تین آدمی اس مزار پر مرمت کا کام کر رہے تھے جبکہ بقیہ تین افراد وہ تھے جو وہاں دوسرے تیسرے روز فاتحہ خوانی کے لیے آتے تھے۔ پولیس کو لاشوں کے پاس ایک تحریر ملی جس میں

پاکستانی طالبان نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اور تحریر میں لوگوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ مزاروں پر جانا بند کردیں۔ 9 فروری کو چھ سے آٹھ نامعلوم مسلح افراد جو موٹر سائیکلوں پر سوار تھے، نے بابا پیر مہربان شاہ کے مزار پر موجود افراد پر کسی امتیاز کے بغیر فائرنگ کردی۔ اس حملے میں آٹھ زائرین جاں بحق اور ایک درجن سے زائد زخمی ہوئے۔ یہ مزار بھی کراچی کے مضافات میں واقع ہے۔

20 جون کو اسلام آباد میں چن پیر بادشاہ کے مزار پر ایک بم پھٹا جس میں 32 افراد زخمی ہوئے۔

26 اگست کو مستونگ، بلوچستان میں شیخ تقی کے مزار پر بم دھماکہ ہوا جس میں ایک مرد اور ایک عورت زخمی ہوگئے۔

28 جنوری کو پولیس کو پشاور میں غازی بابا کے مزار کے قریب ایک بم ملا جسے ناکارہ بنادیا گیا۔

6 ستمبر کو نامعلوم افراد نے سرگودھا میں ایک مزار پر حملہ کیا اور ایک مذہبی رہنما کو قتل اور اس کے بھائی کو، جو بریگیڈیئر تھا زخمی کردیا۔ اس واقعہ میں ایک اور آدمی بھی زخمی ہوا۔ مزار پر ہونے والے میلے میں شریک سات دوسرے افراد بھی زخمی ہوئے۔ قاتل بچ رہے اور بہت کم واقعات ایسے ہیں جن کے ذمہ دار گرفت میں آسکے۔

سفارشات

☆ حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ توہین رسالت سے متعلق قانون کا غلط استعمال نہ ہو۔ توہین رسالت کے مقدمات کی سماعت کرنے والے ججوں، پیروی کرنے والے وکلاء اور گواہوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ پولیس توہین رسالت کے مبینہ مرتکب افراد کے خلاف مقدمہ درج کرنے سے پہلے ابتدائی تفتیش ضرور کرے۔

☆ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت مذہبی اقلیتوں کو مجموعی طور پر نشانہ بنانے والے عسکری گروہوں کے ساتھ نمٹے۔ اس کے علاوہ سکیورٹی فورسز کو چاہیئے کہ وہ کمزور اور پسماندہ اقلیتوں کو بروقت تحفظ دینے میں اپنا موثر کردار ادا کرے۔

☆ حکومت کالعدم انتہا پسند تنظیموں کی نفرت انگیز تقریروں اور سرگرمیوں پر قابو پائے اور انہیں لگام دے۔

☆ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان تحمل، ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ دینے کے لیے اقدامات کئے جائیں۔

☆ کرسچیئن میرج ایکٹ اور کرسچیئن ڈائیوورس ایکٹ جیسے رائج فرسودہ قوانین کو آج کے حالات کے مطابق ڈھالا جائے اور ہندو میرج بل جیسے نئے قوانین اسمبلیوں سے جلد از جلد منظور کروا کر نافذ کئے جائیں۔

اظہار رائے کی آزادی

ہر شہری کو تقریر کرنے اور آزادی سے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ پریس آزاد ہوگا۔ یہ آزادیاں ان معقول پابندیوں کے تابع ہوں گی، جو عظمت اسلام، ملک کی سلمیت یا ملکی دفاع یا غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات یا امن عامہ یا اخلاقیات کے تحفظ یا توہین عدالت یا جرم کے ارتکاب کو روکنے، یا اس کی ترغیب کے امکانات کے پیش نظر قانون کے مطابق عائد کی جائیں گی۔

آئین پاکستان [آرٹیکل - 19]

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور ظاہر کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ، بغیر کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہ سکے اور جس ذریعے سے بھی چاہے، ملکی سرحدوں سے بالاتر ہو کر خیالات و معلومات کی جستجو کر سکے، وصول کر سکے، ارسال کر سکے۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلان [آرٹیکل - 19]

اظہار رائے کی آزادی کے علاوہ پریس کی آزادی اور معلومات کی آزادی انسانی حقوق کے حصول کے لیے ناگزیر ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کے آرٹیکل 19 کے چار اہم عناصر یہ ہیں: بغیر مداخلت کے اپنی رائے رکھنے کا حق، معلومات حاصل کرنے کا حق، معلومات وصول کرنے کا حق اور معلومات کو دوسروں تک پہنچانے کا حق۔ اظہار رائے کی آزادی کے بغیر دیگر حقوق زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اظہار رائے کی آزادی ایک ایسے تصور کے طور پر جانا جاتا ہے کہ ہر فرد کو بیرونی مداخلت کے بغیر جیسے کہ سنسر شپ اور انتقامی کارروائی، دھمکیوں اور ایذا رسائی کے خوف کے بغیر کسی بھی میڈیا کے ذریعے اور کسی بھی ملک سے اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا قدرتی حق حاصل ہے۔ قانون کی حکمرانی، معلومات کی آزادی، آزاد، خودمختار اور تکثیری میڈیا اور سرگرم سول سوسائٹی اظہار رائے کی آزادی کے فروغ کے لیے لازمی شرائط ہیں۔ انٹرنیٹ اور ورلڈ وائڈ ویب کی آمد کے نتیجے میں آزادی اظہار کے حامیوں کو یقین ہونے لگا ہے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے سادہ تقریر اور جمالیاتی اظہار سے سیاسی و مذہبی مباحثوں تک، اظہار رائے کی مکمل

آزادی سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ تاہم آزادی اظہار کا گلا گھونٹنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں جن میں اشاعت یا نشریات کے لیے لائسنس کی نامنظوری یا آن لائن موادتک عدم رسائی، جسمانی یا جذباتی طور پر دھمکا کا، ناجائز بہتان لگانا یا کسی کو بدنام کرنے کے لیے توہین آمیز تحریر شائع کرنا اور امتناعی قوانین اور ضوابط شامل ہیں۔

2014ء میں پاکستانی عوام کو قانون کی حکمرانی، معلومات کی آزادی، آزاد خودمختار اور تکثیری میڈیا اور سول سوسائٹی کے حوالے سے متعدد چیلنجوں اور پابندیوں کا سامنا رہا جو کہ اظہار رائے کی آزادی کے لیے اولین شرائط ہیں۔

قانون کی حکمرانی

قانون کی حکمرانی معاشرے اور ریاست کے درمیان ایک منصفانہ رشتہ قائم کرنے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جب قانون کی حکمرانی ہوتی ہے تو حکام دیگر لوگوں کے علاوہ غیر محفوظ لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے مجاذ ہوتے ہیں۔ ناانصافی، عدم تحفظ اور محرومی سیاسی عدم استحکام اور تشدد کا باعث بنتی ہے، لہذا بے چینیوں اور سماجی تفرقات کو ختم کرنے اور لوگوں کو روزگار کے حصول کا اعتماد دینے کے لیے قانون کی حکمرانی قائم کرنا ضروری ہے۔

2014ء میں پاکستان میں مسلح تشدد اور عدم تحفظ آزادی اظہار کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں ہونے والے پرتشدد جرائم کے باعث افراد کمیونٹیوں اور ریاست میں عدم اعتماد برقرار رہا۔ اس کا سب سے زیادہ اثر اقلیتوں اور خواتین پر پڑا۔

مختلف اقسام کے قانونی نظام کی موجودگی جیسے کہ عام ملکی قانون جن کے تحت ملک کا نظم ونسق چلایا جاتا ہے قبائلی علاقوں کے لیے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) اور غیر رسمی قبائلی عدالتوں، کا نتیجہ غیر مساوی برتاؤ کی صورت میں نکلا اور یہ اکثر اوقات من مانے اور غیر منصفانہ فیصلوں کا باعث بنا۔

پولیس اور سکیورٹی فورسز نے آزادانہ طور پر طاقت کا اندھا دھند یا بے حد استعمال جاری رکھا۔ ماورائے عدالت ہلاکتیں، جبری گمشدگیاں، ایذارسانی اور دیگر خلاف ورزیاں عام تھیں (امن عامہ سے متعلق باب دیکھیے) خواتین نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اختیارات کو وسیع کرتے ہوئے انہیں بغیر ٹرائل کے حراست، الیکٹرانک نگرانی، تلاشیوں اور گرفتاریوں اور جان لیوا طاقت کے استعمال کا موقع دیا جس کا مقصد بظاہر دہشت گردی اور دیگر سنگین جرائم پر قابو پانا تھا۔

ہیومن رائٹس واچ کا کہنا ہے کہ: ''ان اختیارات کی بدولت قانون نافذ کرنے والے اداروں کی

ذرائع ابلاغ پر اکثر اوقات کسی خاص ایجنڈے کے فروغ کا الزام عائد کیا جاتا رہا

جانب سے کی جانے والی خلاف ورزیوں پر باآسانی پردہ ڈالا جا سکتا ہے اور ان سے اظہار رائے کی آزادی، خلوت اور پرامن اجتماع اور شفاف ٹرائل کے حقوق کی پامالی کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ متعدد مذہبی اور لسانی اقلیتوں اور دیگر محروم طبقات کو کئی طرح کے امتیازی سلوک کا سامنا رہا۔ بالخصوص غیر مسلم اور مسلم اقلیتیں توہین مذہب کے قوانین کے تحت پرتشدد حملوں اور ایذا رسانی کا شکار رہیں۔ میڈیا واچ ڈاگ ''رپورٹرز وِدآؤٹ بارڈرز (آر ایس ایف) کے مطابق ''توہین مذہب کو جرم قرار دینے سے دنیا کے تقریباً نصف ممالک میں معلومات کی آزادی خطرے میں پڑ گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات انتہا پسند ان صحافیوں یا بلاگرز کو بھی نشانہ بناتے ہیں جو ان کے خیال میں ان کے مذہب کا مناسب احترام نہیں کرتے۔ پاکستان کے توہین مذہب قانون کا استعمال ایک نامور ٹی وی چینل جیو ٹی وی کے خلاف اس وقت کیا گیا جب ٹی وی کے ایک مارننگ شو کی میزبانی پر اسلام کی انتہائی قابل احترام شخصیات کا تمسخر اڑانے کا الزام عائد کیا گیا۔ جیو ٹی وی کے مالک اور میزبان شائستہ لودھی کو انسداد دہشت گردی ایک کے تحت قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔

مئی میں مسلح افراد نے انسانی حقوق کے وکیل اور ملتان میں ایچ آر سی پی کے ریجنل کوآرڈینیٹر کو قتل کر دیا۔ اس وقوعے کا سبب بظاہر توہین مذہب کا ارتکاب کرنے والے ملزموں کی نمائندگی کرنے کا انتقام تھا۔ جب انہیں قتل کیا گیا اس وقت وہ توہین مذہب کے ایک ملزم، ایک یونیورسٹی کے لیکچرار جنید حفیظ کا مقدمہ لڑ رہے تھے اور انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔

نیاز مانہ میگزین کے ایڈیٹر اور ناشر شعیب عادل لاہور میں اپنا گھر چھوڑ کر بیوی اور بچوں کے ہمراہ کہیں روپوش ہو گئے۔ عادل کو ایک کتاب کے حوالے سے توہین مذہب کے الزامات اور دھمکیوں کا سامنا تھا جو انہوں نے 2007ء میں شائع کی تھی۔ یہ کتاب پاکستان کے ایک مذہبی اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والے جج نے لکھی تھی۔ اگرچہ فرد کی زندگی اور سلامتی کے حق کی خلاف ورزیوں سمیت دیگر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں عام تھیں تاہم ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کے قانون کی حکمرانی سے متعلق 2014ء کے گوشوارے ظاہر کرتے ہیں کہ اپنے علاقائی اور معاشی طور پر ہم پلہ ممالک کی نسبت پاکستان میں اظہار رائے اور اجتماع کی آزادیوں کو زیادہ تحفظ حاصل تھا۔

رپورٹ میں کہا گیا کہ: ''پاکستان کو قانون کی حکمرانی کے حوالے سے اہم ترین چیلنج کا سامنا ہے اس کا تعلق امن وامان اور سلامتی سے ہے، جس کا سبب اندرونی تنازعات، دہشت گردی، جرائم اور ذاتی تنازعات کے حل کے لیے تشدد کا استعمال ہے''۔

صحافیوں کے بین الاقوامی اتحاد نے پاکستان کو میڈیا کے لیے خطرناک ترین ملک قرار دیا ہے۔ پاکستان میں صرف 2014ء میں 14 صحافی اور میڈیا کے ملازمین جاں بحق ہوئے جس سے اظہار رائے کی آزادی کے تصور کی نفی ہوتی تھی۔ 2014ء میں 8 صحافی جاں بحق ہوئے جن کے نام یہ ہیں؛ شان ڈاہر (لاڑکانہ)؛ جیون آرائیں (گھمبٹ خیر پور)؛ ارشاد مستوئی (کوئٹہ)؛ افضل خواجہ (اوستہ محمد؛ جعفر آباد)؛ یعقوب شہزاد (حافظ آباد)؛ ندیم حیدر (حافظ آباد)؛ شہزاد اقبال (میانوالی) اور ابرار تنولی (ایبٹ آباد)۔ سال کے دوران میڈیا کے چھ ملازمین بھی جاں بحق ہوئے جن کے نام یہ ہیں: محمد مصطفیٰ (لاہور)؛ محمد عبدالرسول اور محمد یونس (کوئٹہ)؛ وقار عزیز خان، خالد خان اشرف آرائیں (کراچی)۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے اپنی رپورٹ میں 17 جنوری کو کراچی اور 28 اگست کو کوئٹہ میں ہونے والے واقعے کو میڈیا پر حملوں کی بدترین مثالیں قرار دیا۔ 17 جنوری کو کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں ایکسپریس کی ڈیجیٹل سیٹلائٹ نیوز گیدرنگ (ڈی ایس این جی) وین پر حملے میں ایکسپریس نیوز کے تین ملازمین جاں بحق ہوئے تھے۔ 28 اگست کو نامعلوم حملہ آوروں نے بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے سیکرٹری جنرل اور اے آر وائی نیوز کے اسائنمنٹ ایڈیٹر ارشاد مستوئی کے دفتر میں داخل ہو کر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی جس کے نتیجے میں ارشاد مستوئی کے علاوہ رپورٹر عبدالرسول اور اکاؤنٹنٹ یونس جاں بحق ہو گئے۔

گزشتہ پانچ سالوں کے دوران بلوچستان میں تیس سے زائد صحافی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن چکے ہیں۔ یہ اعداد وشمار صوبے کے پیچیدہ ماحول میں صحافیوں کو درپیش خطرات کی ایک بار پھر نشاندہی کرتے ہیں

پریس کلب کوئٹہ میں صحافیوں کے قتل کے خلاف احتجاج

جہاں بقاء کا انحصار باغی تنظیموں، وفاداریاں تبدیل کرنے والے متحارب قبائل، انتہا پسند گروہوں، سکیورٹی فورسز، سیاسی جماعتوں اور عدالتوں کی موجودگی میں حساس، متوازن طرزِ عمل پر ہے۔ ان سب کے صحافیوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے کشیدگی زدہ علاقوں جیسے کہ خضدار میں جز وقتی نامہ نگاروں اور رپورٹروں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ میڈیا کی کچھ رپورٹس کے مطابق ٹارگٹ کلنگ کے نتیجے میں خضدار پریس کلب کے اراکین کی تعداد 20 سے کم ہو کر 7 اور قلات پریس کلب کے اراکین کی تعداد دس سے کم ہو کر 4 رہ گئی ہے۔ زیادہ تر صحافی یا تو صحافت چھوڑ چکے ہیں یا پھر کوئٹہ منتقل ہو گئے ہیں۔

میڈیا واچ ڈاگ ''رپورٹرز وِد آؤٹ بارڈرز'' کی میڈیا کی آزادی سے متعلق فہرست میں پاکستان 180 میں سے 159 ویں نمبر ہے۔ گزشتہ سال اسی گروپ کی فہرست میں پاکستان کا 158 واں نمبر تھا۔ سکیورٹی کی غیر یقینی صورتحال، دہشت گردی سے متعلق سرگرمیوں کے خطرے اور بے پناہ سیاسی رسوخ کو پاکستان میں میڈیا کی آزادی کے فقدان کا سبب قرار دیا گیا۔

مارچ میں ایکسپریس کے اینکر رضا رومی کی کار پر فائرنگ کے نتیجے میں ان کا ڈرائیور جاں بحق ہو گیا۔

اپریل میں جیو ٹی وی کے ایک سینئر رپورٹر حامد میر پر موٹر سائیکل پر سوار مسلح افراد نے اس وقت فائرنگ کی جب وہ کراچی ایئرپورٹ سے اپنے دفتر جا رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس حملے میں بچ گئے، اور ان کی

ایک سرجری کرنا پڑی، تاہم ان پر حملہ کرنے والوں کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا اور ان کی زندگی اب بھی خطرے میں ہے۔ انہیں قتل کرنے کی یہ کوشش اس وقت ایک بڑے تنازعے کی شکل اختیار کرگئی جب حامد میر کے بھائی نے یہ الزام عائد کیا کہ اس حملے کا منصوبہ انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) میں موجود ''چند عناصر'' نے بنایا تھا۔

جون میں ملتان میں نامعلوم مسلح افراد نے روز نامہ جنگ کے ریذیڈینٹل ایڈیٹر پر اس وقت حملہ کیا جب وہ کام کے بعد اپنے گھر جا رہے تھے۔ انہیں بندوق کے بٹ مارے گئے جس کے نتیجے میں ان کے سر، کندھوں، ٹانگوں اور جسم کے دیگر حصوں پر شدید زخم آئے۔

2 جولائی کو خیبر پختونخوا کے دارالحکومت میں ایکسپریس نیوز ٹی وی کے بیورو چیف جمشید بھگون کے گھر پر تیسری مرتبہ دھماکہ خیز مواد سے حملہ کیا گیا۔

25 اگست کو حزب اختلاف پاکستان تحریک انصاف کے کارکنوں نے آج نیوز کے عملے کے کم از کم چار اراکین کو اس وقت تشدد کا نشانہ بنایا جب وہ پی ٹی آئی کے قائد عمران خان کی تقریر کی کوریج میں مصروف تھے۔ ان میں ڈیجیٹل سیٹلائٹ کے ذریعے خبریں اکٹھا کرنے والے انجینئر اقبال، کیمرہ مین عثمان، اقبال اور مسمارت شامل تھے۔ یہ افراد معمولی زخمی ہوئے اور انہیں ہسپتال میں طبی امداد دی گئی۔

سب سے زیادہ افراد 25 اگست کو زخمی ہوئے جب پولیس اور حزب اختلاف پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کی قیادت میں مظاہرے کرنے والے افراد کے درمیان تصادم کے نتیجے میں 38 صحافی، کیمرہ مین اور دیگر افراد زخمی ہوئے۔ میڈیا کے زخمی ہونیوالے افراد میں سماء ٹی وی کے کیمرہ مین خرم نیاز، عجب خان اور اویس قاضی، وقت ٹی وی کے کیمرہ مین عاطف یوسف اور عمران اقبال، ڈی ایس این جی آپریٹر محمد زاہد، ڈرائیور جمیل کیانی، دنیا ٹی وی کے رپورٹر عیسیٰ نقوی اور اسد ایوب، ڈی ایس این جی انجینئر عدنان، ٹی وی کیمرہ انجم فاطمی، اے آر وائی نیوز کے کیمرہ مین آصف عبداللہ اور اقبال زیب، ڈان نیوز کے کیمرہ مین کاشف عباسی اور نوشاد عباسی، رپورٹر یاسر ملک اور ثمر عباس، کیمرہ مین اشفاق حسین، ایکسپریس نیوز کے کیمرہ مین عامر عالم، ماجد شاہ اور عثمان افضل، آج ٹی وی کے رانا طارق، ہارون خورشید اور غلام علی شامل تھے۔ ان سب کو مار پیٹ کا نشانہ بنایا گیا حالانکہ انہوں نے اپنے پریس کارڈز کے ذریعے اپنی شناخت بھی کرائی تھی۔ پولیس نے دنیا بھر میں میڈیا سے تعلق رکھنے والے مرد و خواتین کے تحفظ سے متعلق روایات کا ڈھٹائی سے تمسخر اڑایا۔

اگست میں کالم نگار کامران شفیع اور ان کے اہل خانہ کو دو دھمکی آمیز میل موصول ہوئیں۔

یکم ستمبر کو پی ٹی آئی اور پی اے ٹی سے تعلق رکھنے والے مظاہرین نے ریاستی کے زیرِ ملکیت پاکستان ٹیلی ویژن (پی ٹی وی) کے دفاتر پر حملہ کیا۔ انہوں نے کنٹرول روم پر قبضہ کر لیا اور کچھ دیر کے لیے پی ٹی وی کی نشریات معطل کر دیں۔

30 نومبر کو دو ٹی وی چینلوں سے تعلق رکھنے والے 30 صحافیوں اور ٹیکنیشنز پر حملہ کیا گیا اور ان کے سیٹلائٹ ٹرکوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ پی ٹی آئی کے اراکین کی جانب سے مبینہ طور پر پھینکے گئے چھوٹے دھماکہ خیز مواد کے نتیجے میں ڈان نیوز کا کیمرہ مین زخمی ہو گیا جبکہ ایک گرنیڈ پھٹنے کے نتیجے میں دنیا نیوز کے دو ٹیکنیشن زخمی ہو گئے۔ جنہیں فوری طور پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ 3 دسمبر کو ریاست کی زیرِ ملکیت ریلوے کے ذریعے غیر قانونی ہتھیاروں اور دھماکہ خیز مواد کی نقل و حمل کو منظرِ عام پر لانے پر ایک نجی ٹی وی چینل اے آر وائی کی تحقیقاتی ٹیم کو گرفتار کر کے ان پر جرم سرزد کرنے کا الزام عائد کیا۔ اے آر وائی کا کہنا تھا کہ ریلوے پولیس نے اس کے دو تفتیشی صحافیوں آصف قریشی اور ذوالقرنین شیخ کو نہ صرف گرفتار کیا بلکہ ان پر حملہ بھی کیا۔ ریلوے حکام نے سکیورٹی اہلکاروں کی اس سنگین غلطی کی تحقیقات کرنے کی بجائے میڈیا کی ٹیم کے خلاف بھی مقدمہ درج کر لیا۔

اے آر وائی نیوز کا کہنا تھا کہ اس کے پروگرام نے غیر قانونی ہتھیاروں کی کراچی سے لاہور نقل و حمل کے لیے ریلوے حکام کو رشوت لیتے ہوئے پکڑا تھا۔ ریلوے کے جنرل منیجر جاوید انور نے بعد ازاں صحافیوں کو بتایا کہ ریلوے کے جن ملازمین نے ہتھیاروں اور دھماکہ خیز مواد کی نقل و حرکت میں مدد کی تھی انہیں معطل کر دیا گیا تھا۔

8 دسمبر کو فیصل آباد میں پی ٹی آئی کے کارکنوں نے جیو نیوز کی اینکر پرسن ماریا میمن، رپورٹر عرفان اللہ اور حماد احمد کے ساتھ اس وقت ناروا سلوک کیا اور ان پر لاٹھیاں برسائیں جب وہ ان کی احتجاجی ریلی کی کوریج کر رہے تھے۔ حملے میں ان کی ڈی ایس این جی وین کو نقصان پہنچا۔ پی ٹی آئی کے مشتعل کارکنوں نے ان کی وین پر سپرے گن سے اشتعال انگیز نعرے بھی لکھ دیئے۔

12 دسمبر کو کراچی میں جب عمران خان نے اپنی تقریر ختم کی اور احتجاجی ریلی کے مقام سے روانہ ہو گئے، تو پی ٹی آئی کے کارکنوں نے جیو نیوز کی ٹیم کی رپورٹر سدرہ ڈار، عائمہ ملک اور اب تک ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین زبیر میمن کو ہراساں کیا۔ انہوں نے جیو نیوز کی ڈی ایس این جی وین پر پتھر اور بوتلیں پھینکیں۔ انہوں نے سینئر تجزیہ نگار مظہر عباس اور جیو نیوز کے عملے کے دیگر افراد پر بھی لاٹھیاں اور خالی بوتلیں اور پتھر پھینکے۔ انہوں نے ایک خاتون رپورٹر سدرہ کو بھی ہراساں کیا اور ان کے خلاف نازیباں زبان استعمال کی۔

15 دسمبر کو لاہور میں پی ٹی آئی کے کارکنوں نے جیو نیوز کی ٹیم پر اس وقت حملہ کیا جب وہ ان کے احتجاجی مظاہرے کی کوریج کر رہی تھی۔ پی ٹی آئی کے کارکنوں نے انہیں ہراساں کیا اور رپورٹنگ سے روکا۔ جیو نیوز کا کہنا تھا کہ مظاہرین نے ان کی اینکر پرسن ثناء میر، سہیل وڑائچ، رپورٹر جواد ملک، امین حفیظ، احمد فراز اور کیمرہ مین خواجہ عامر پر پتھروں اور کانچ کی گولیوں سے حملہ کیا اور ان پر غلیلوں کے ذریعے بھی پتھراؤ کیا۔ پی ٹی آئی کے کارکنوں نے رپورٹر ثناء مرزا پر بوتلیں پھینکیں اور انہیں ہراساں کیا اور ایسے مخالفانہ نعرے لگائے کہ وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ انہوں نے جیو نیوز کی ڈی ایس این جی وین پر پتھروں کی بارش کردی۔ لاہور کے لبرٹی چوک میں بھی مظاہرین نے جیو کی ٹیم کو دھمکایا اور انہیں اپنی کوریج جاری رکھنے سے روکا۔

اے آر وائی نیوز نے بھی شکایت کی کہ حکمران سیاسی جماعت پی ایم ایل۔این کے کارکنوں نے ان کی ڈی ایس این جی وین پر اس وقت گندے انڈے پھینکے جب وہ لاہور میں پی ٹی آئی کے احتجاج کی کوریج کر رہے تھے۔

2014ء کے دوران ایک مثبت پیش رفت اس وقت دیکھنے میں آئی جب یکم مارچ کو جیو ٹی وی کے صحافی ولی بابر کے قتل میں ملوث ہونے کے جرم میں چھ افراد کو سزا سنائی گئی جنہیں جنوری 2011 میں کراچی میں قتل کردیا گیا تھا۔

معلومات کے حصول کی آزادی

معلومات کے حصول کا حق ایک عالمگیر انسانی حق ہے جو اقوام متحدہ کے منشور کا حصہ ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی 1946 کے اعلان کے مطابق: ''معلومات کی آزادی ایک بنیادی انسانی حق ہے اور یہ ان تمام حقوق کے لیے ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے جن کے لیے اقوام متحدہ نے خود کو وقف کر رکھا ہے''۔ یہ حق معلومات کی زیادہ سے زیادہ تشہیر، کم سے کم استثنا، طریق کار تک آسان، فوری اور سستی رسائی، اپیلوں کے آزادانہ طریق اور جرمانوں اور نگرانی کے ذریعے موثر نفاذ اور قابل رسائی نظم و نسق کو یقینی بناتا ہے۔ یہ حق ریاست اور شہریوں کے درمیان تعلق کو مضبوط بناتا ہے۔

پاکستان کے آئین کا آرٹیکل 19 کہتا ہے کہ: ''ہر شہری کو عوامی اہمیت کے معاملات میں معلومات تک رسائی کا حق حاصل ہوگا''۔ لیکن 2014ء کے آخر تک ملک کی معلومات کے حق سے متعلق صورتحال قطعی مثالی نہیں تھی۔

2011ء میں ایشیائی ترقیاتی بنک نے پاکستان کے لیے ایک جامع ایکشن پلان کی منظوری دی

اسلام آباد میں جھڑپوں کے دوران زخمی ہونے والے ایک صحافی کو طبی عملہ ہسپتال منتقل کر رہا ہے

جس میں عدالتی اور انتظامی اصلاحات شامل تھیں۔ معلومات کی آزادی سے متعلق قانون سازی کو اصلاحاتی پروگرام کا حصہ سمجھا گیا۔ اس پس منظر میں جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے 2002ء میں معلومات کی آزادی سے متعلق موجودہ آرڈیننس کی منظوری دی۔ بعدازاں پارلیمنٹ نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے اس کی توثیق کردی جس کے تحت فوجی آمر کے بنائے گئے تمام قوانین کو جائز قرار دے دیا گیا۔

چونکہ یہ قانون ایک آرڈیننس کے ذریعے بنایا گیا تھا۔ اس لیے اس پر کبھی بھی پارلیمنٹ میں بحث نہیں ہوئی۔ یہ قانون دو سال تک غیر فعال رہا۔ مگر سول سوسائٹی اور شراکت داروں کی ایک مستحکم مہم کے بعد 2004ء میں نہ صرف اس کے ضوابط تشکیل دیئے گئے بلکہ انہیں شائع بھی کیا گیا۔ یہ ایکٹ ایک بہت کمزور قانون سمجھا جاتا ہے اور اس کی خامیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے موجودہ قانون کو بہتر بنانے کے لیے 2008ء میں پارلیمنٹ میں ایک بل متعارف کرایا۔ سال کے آخر تک اس بل کی منظوری ہونا باقی تھی۔

بلوچستان اور سندھ نے معلومات کی آزادی سے متعلق آرڈیننس 2002ء کو بلوچستان معلومات کی آزادی سے متعلق ایکٹ 2005ء اور سندھ معلومات کی آزادی سے متعلق ایکٹ 2006 کی شکل میں پھر سے دہرایا۔ یہ قوانین بلوچستان اور سندھ میں رائج رہے۔

2013ء میں صوبہ خیبر پختونخوا اور پنجاب نے بالترتیب خیبر پختونخوا معلومات تک رسائی کا ایکٹ

2013ء اور پنجاب معلومات تک رسائی کا ایکٹ 2013ء کے نام سے معلومات تک رسائی سے متعلق قانون بنائے۔ موجودہ قوانین کے تحت معلومات سے متعلق جمع کرائی گئی درخواستوں پر بھی حکومت، بالخصوص وفاقی حکومت، بلوچستان وسندھ کی صوبائی حکومتوں کا ردعمل مایوس کن تھا۔ مرکز برائے امن وترقیاتی منصوبہ جات (سی پی ڈی آئی) کے مطابق پنجاب کا قانون سب سے زیادہ سخت ہے۔ جس کے تحت تمام شعبے 14 دن کے اندر درخواستوں کا جواب دینے کے پابند ہیں۔ سی پی ڈی آئی کا کہنا تھا کہ: ''ہم نے اعلیٰ حکام کے ردعمل کی آزمائش کے لیے یکم مارچ 2014ء سے 30 اکتوبر 2014ء تک معلومات سے متعلق 1231 درخواستیں بھیجیں، جن میں سے 749 درخواستیں پنجاب، 409 خیبر پختونخوا، 31 سندھ، 2 بلوچستان اور چالیس وفاقی حکومت کے اداروں کو بھیجی گئیں۔ ہمیں صرف 142 جوابات موصول ہوئے جن میں سے پنجاب کی جانب سے 48، خیبر پختونخوا کی جانب سے 91، سندھ کی جانب سے ایک اور حکومت اور بلوچستان حکومت کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

سی پی ڈی آئی کا کہنا تھا کہ پہلے مرحلے کے بعد ملک بھر میں 771 شکایات درج کرائی گئیں۔ ان میں سے 462 شکایات پنجاب، 256 خیبر پختونخوا، 24 سندھ اور 29 وفاقی حکومت کے شعبوں میں درج کرائی گئیں۔ ان شکایات کے اٹھارہ مزید جوابات موصول ہوئے جن میں سے 53 جوابات پنجاب، اٹھارہ خیبر پختونخوا اور دس وفاقی حکومت کی جانب سے موصول ہوئے لیکن سندھ کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

ایک 25 سالہ کمپیوٹر آپریٹر صباحت غزنوی نے ایک ملازمت کے لیے درخواست دینے اور اس ملازمت کو حاصل کرنے کے لیے اس قانون کو کامیابی سے استعمال کیا جس کی حکومت نے تشہیر نہیں کی تھی۔ پنجاب میں معلومات سے متعلق ایک درخواست پر کارروائی نہ کرنے پر وہاڑی کے ایک ضلعی افسر کی 60 دن کی تنخواہ کاٹ لی گئی۔ پنجاب کا انفارمیشن کمیشن خیبر پختونخوا کے کمیشن کے بعد تشکیل دیا گیا تھا لیکن اس نے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کی، حالانکہ یہ کمیشن کسی بجٹ اور کام کرنے کی باقاعدہ جگہ کے بغیر کام کر رہا تھا۔

جون میں فوج نے شمالی وزیرستان میں طالبان باغیوں کے خلاف ایک آپریشن کا آغاز کیا اور باقاعدگی کے ساتھ تازہ ترین خبریں پہنچائیں۔ لیکن ان علاقوں تک آزاد میڈیا کی عدم رسائی کا مطلب یہ تھا کہ فوج کے حملوں کے اثرات کے بارے میں صرف قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے۔

آزاد، خودمختار اور تکثیری میڈیا

سال 2014ء

ایک بڑے نیوز چینل کو زبردستی آپریٹرز کی فہرست سے نکال دیا گیا۔ ایک سیاسی شخصیت نے صحافیوں کو دھمکیاں دیں اور میڈیا کے ذریعے کس قسم کی رپورٹنگ کی جاسکتی ہے، قومی اسمبلی نے اس سے متعلق پابندیاں عائد کرنا چاہئیں۔ میڈیا کے اہم مسائل کا تعلق مبینہ ''توہین آمیز'' مواد سے تھا، جس کی وجہ سے جز وقتی نامہ نگار عام طور پر رسمی ملازمت کے تحریری احکام کے بغیر کام کرتے رہے جس کی وجہ سے نہ صرف ان کی زندگی خطرے میں تھی بلکہ ان کی جانب سے مالی بدعنوانی کا بھی امکان تھا۔ میڈیا کو کوریج سے متعلق سخت جرمانوں اور مکمل پابندیوں کا سامنا رہا جس کے باعث بہت سے میڈیا اداروں کو اپنی بقاء کے لیے اپنی ہی سنسرشپ کرنی پڑی۔

مالکان اور نیوز منیجرز نے ریٹنگ بڑھانے کی ہوس اور ناظرین کی تعداد میں اضافے کے نشے میں صحافیوں کو حملوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ان صحافیوں کو حفاظتی سامان جیسے کہ بلٹ پروف جیکٹیں اور ہیلمٹ بھی فراہم نہیں کیئے گئے تھے۔

پریس

مارچ میں نیویارک ٹائمز کے بین الاقوامی شمارے کی تقریباً نو ہزار کاپیوں کے مرکزی صفحے سے پاکستان کے القاعدہ کے ساتھ تعلقات سے متعلق ایک مضمون کو حذف کر دیا گیا۔ مرکزی صفحے کی تصویر جو کہ بالکل خالی تھی، سوشل میڈیا پر پھیل گئی۔ یہ فیصلہ مبینہ طور پر نیویارک ٹائمز کے پاکستان میں نیویارک ٹائمز کے ڈسٹری بیوشن پارٹنر دی ایکسپریس ٹربیون نے کیا تھا جو ایک انتہا پسند گروہ کے حملوں کا نشانہ بنتا رہا تھا۔ ایکسپریس ٹربیون نے اس کے بعد بھی بین الاقوامی شمارے کے مواد میں تبدیلی کی جب اس کے ایک ایسے مضمون کو حذف کر دیا گیا جس میں پاکستانی حکام اور جنگجو اسلامی انتہا پسندوں کے درمیان تعلقات کی چھان بین کی گئی تھی۔ تاہم یہ مضمون انٹرنیٹ پر دستیاب تھا۔ ایکسپریس ٹربیون نے اسی موضوع پر نیویارک ٹائمز کے بین الاقوامی شمارے کے ایک اور مضمون کو بھی حذف کر دیا جو اس شمارے میں ہر روز شائع کیا جاتا ہے۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک مصنف نے اپنے ایک کالم میں راشد رحمان کے کیس پر گفتگو کی۔ مئی میں جیو ٹی وی کے مالک جنگ گروپ جو خود پر لگائے گئے توہین رسالت کے الزامات اور انٹیلی جنس ایجنسی کا مقابلہ کر رہا تھا، نے اپنے دو اخبارات روزنامہ جنگ اور دی نیوز کے پہلے صفحے پر معافی نامہ شائع کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ حامد میر پر ہونے والے حملے کی کوریج ''ناجائز، تکلیف دہ اور جذبات انگیز تھی''۔ دو ہندوستانی صحافیوں کو پاکستان سے

21مارچ کو پاکستان میں بین الاقوامی نیویارک ٹائمز کا چھپنے والا سرورق کچھ اس طرح تھا

بے دخل کر دیا گیا۔ دی ہندو کی نامہ نگار مینا مینن اور دی پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نامہ نگار سنیہش الیکس فلپ کو یہ کہا گیا کہ ان کے ویزوں کی تجدید نہیں کی جائے گی۔ انہیں سات دن کے اندر ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔

نشریات

6 جون کو پاکستان الیکٹرانک میڈیا اور ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) نے جیو کو بند کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس پر جرمانہ عائد کیا۔ ادارے کا کہنا تھا کہ اگر چینل نے پندرہ دن کی بندش ختم ہونے تک ایک کروڑ روپے جرمانہ ادا نہ کیا تو اس کی نشریات بند رہے گی۔ جون میں پاکستان براڈ کاسٹ ایسوسی ایشن نے جیو کی رکنیت معطل کر دی۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جیو کو بند کرنے کی غرض سے چلائی جانے والی عداوت پر مبنی مہم پر تشویش کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسی منفی مہم سے میڈیا کی آزادی خطرے میں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بات سے قطع نظر کہ ایچ آر سی پی یا کوئی اور جیو کے ادارتی فیصلے کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ توہین رسالت کے الزامات کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر نکلنے پر اکسانا ایک انتہائی خطرناک رجحان تھا۔

اس کا مزید کہنا تھا: ''ایچ آر سی پی اس امر کی نشاندہی کرنے پر مجبور ہے کہ خوف کی جو فضا قائم کی گئی ہے اس نے جیو کے لیے کام کرنے والے صحافیوں کی زندگیوں کو انتہائی غیر محفوظ بنا دیا ہے۔ انہیں دھمکایا جا رہا ہے اور متعدد کو حملوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر اس فتنہ کو جاری رہنے دیا گیا تو اس رجحان میں اضافہ ہوگا اور یہ

صورتحال قابو سے باہر ہو سکتی''۔

''ایچ آر سی پی کو اس بات پر حیرت ہے کہ کیبل آپریٹرز نے پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) کی ہدایات کے بغیر جیو پر کس طرح غیر قانونی پابندی عائد کی۔ کمیشن امید کرتا ہے کہ حکام اس معاملے کی تحقیقات کریں گے، اگر انہوں نے یہ کام پہلے نہیں کیا، اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو سزا دیں گے''۔ ایچ آر سی پی نے حکومت سول سوسائٹی اور میڈیا کی تنظیموں سے مطالبہ کیا کہ وہ صورتحال کو ٹھنڈا کرنے اور خوف و حراس کو ختم کرنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کریں تاکہ ذرائع ابلاغ کی آزادی کو مزید حملوں سے بچایا جا سکے۔

فروری میں دو نیوز چینلوں آج اور وقت ٹی وی پر ایک ہی رات کو دستی بموں سے حملہ کیا گیا۔ کراچی میں آج نیوز کے دفاتر کے باہر ہونے والے دھماکے میں ایک سکیورٹی گارڈ زخمی ہوا اور وقت ٹی وی کے دفاتر کے باہر دھماکہ خیز مواد برآمد ہوا۔

میڈیا سے متعلق قوانین

نیوز چینلز نے اچھی اور ذمہ دار صحافت کے اصولوں کی معمول کے مطابق خلاف ورزی کی، ان میں سے کئی چینلوں نے ایسا اپنے مالکان کے اداراتی اثر ورسوخ کے باعث کیا۔ اور جیو۔ جنگ گروپ بھی ان سے مختلف نہیں تھا جس نے اپنے ادارے کی آزادی کو اپنے حکومت بدلنے کی خوش فہمی پر قربان کر دیا۔ اس کے باوجود حامد میر پر حملے اور جیو، جنگ گروپ اور آئی ایس آئی کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ کے نتیجے میں میڈیا کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا، اس کی آزادی پر قدغنیں لگیں، جیو کو تنہا کرنے کے معاملے پر میڈیا کی تنظیمیں پھوٹ کا شکار ہو گئیں، اور عوام میں میڈیا کی ساکھ متاثر ہوئی۔

اخبارات کی رسد اور ٹی وی چینلوں کی نشریات بری طرح متاثر ہوئیں۔ اس کے علاوہ مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے الزامات جس کے بعد جیو انٹرٹینمنٹ پر جرمانہ عائد کیا گیا تھا اور اس کی نشریات بھی بند کر دی گئی تھیں، اور جیو۔ جنگ گروپ نے معافی بھی مانگی تھی، پر جنگ گروپ کے خلاف کی جانے والی قانونی کارروائی میں ایذا رسانی کا رنگ نمایاں تھا۔ ایچ آر سی پی نے نشاندہی کی کہ میڈیا کی صفوں میں پیدا ہونے والی پھوٹ سخت جدوجہد کے بعد میڈیا کو ملنے والی آزادی کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔ ایچ آر سی پی کا کہنا تھا کہ: ''افسوسناک امر یہ ہے کہ متحارب میڈیا چینلز آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کر رہے ہیں اور انہیں اس بات کا ادراک نہیں ہے کہ وہ بھی اس سازش کا حصہ بن رہے ہیں یا وہ کتنی خطرناک مثال قائم کر رہے ہیں اور یہ کہ یہی آگ انہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ ان طاقتوں کو بے لگام چھوڑنا کسی کے بھی مفاد میں نہیں جو

حامد میر پر حملے کی مذمت کے لیے پاکستان کے کئی شہروں میں احتجاجی مظاہرے ہوئے

کسی کو جوابدہ نہیں ہیں۔ اسلام آباد میں دو دھرنوں کی حد سے زیادہ میڈیا کوریج سے اس رائے کو تقویت ملی کہ کسی انقلاب کو روکنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ٹی وی چینلز بند کر دیئے جائیں۔ لوگوں نے میڈیا کی جانب سے جانبداری کا مظاہرہ کئے جانے کی شکایت کی۔ نیوز اینکرز پر اشتعال انگیزی پر اکسانے کا الزام عائد کیا گیا، جبکہ کچھ اینکرز نے مظاہرہ میں مظاہرین کے طور پر حصہ لیا۔

انٹرنیٹ

انسانی حقوق کی ایک تنظیم ''فریڈم ہاؤس'' کے مطابق پاکستان ان ممالک کی فہرست میں شامل ہے جنہیں یہ تنظیم انٹرنیٹ کی دنیا میں آزاد تصور نہیں کرتی۔ فروری 2014ء میں ناراض کھلاڑیوں، جنہوں نے تیز رفتار انٹرنیٹ کنکشنز اور گیموں کی رکنیت کے لیے معاوضہ ادا کیا تھا، نے بتایا کہ انہیں ایکس پاکس لائیو، پلے سٹیشن نیٹ ورک اور گیم رینجرز تک عارضی رسائی حاصل نہیں تھی۔

پاکستان میں سال کے آخر تک یوٹیوب پر پابندی برقرار رہی اور یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ یہ پابندی ''غیر معینہ مدت تک'' برقرار رہے گی۔ ملک میں اس ویڈیو شیئرنگ سائٹ کو ستمبر 2012ء میں اس وقت بلاک کیا گیا تھا جب اس نے ''مسلمانوں کی معصومیت'' نامی فلم چلائی تھی۔ اسلام کا مذاق اڑانے پر اس فلم کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے کئے گئے۔ ایک ایسی سائٹ جو کروڑوں افراد کے لیے معلومات اور تفریح کا ذریعہ ہے حکام کی جانب سے اس پر بندش برقرار رکھنے سے اس بات کی عکاسی ہوتی تھی کہ ریاست شہریوں کے

معلومات تک رسائی کے حق کے حوالے سے کس قسم کا رویہ رکھتی تھی۔ اگر چہ قابل لوگوں نے اس پابندی کو نظر انداز کرنے کے ذرائع تلاش کر لئے تھے تاہم حکام کا کہنا تھا کہ ان کے پاس یوٹیوب کو بلاک کرنے کے سوا توہین آمیز مواد کو حذف کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

مئی میں ٹوئٹر نے اعلان کیا کہ یہ پاکستان میں وہ تمام پوسٹ بلاک کر دے گا جن میں ''توہین مذہب پر مبنی'' مواد موجود ہے۔ یہ ٹوئٹر کی اس سنسر شپ پالیسی کا حصہ ہے جو 2012ء میں پاکستان کے لیے شروع کی گئی تھی۔

نفرت انگیز تقریر اظہار رائے کی آزادی کے لیے شدید خطرے کا باعث ہے۔ اور 2014ء میں اس نے انٹرنیٹ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جون میں پاکستان کے ڈیجیٹل حقوق کے گروپ ''بائٹس فار آل'' نے ''نفرت انگیز تقریر'' کے عنوان سے ایک تحقیق کا آغاز کیا۔ پاکستان سائبر سپیس کی جانب سے ایک تحقیق کا آغاز کیا گیا جس کا مقصد انٹرنیٹ پر نفرت انگیز مواد کے پاکستان پر اثرات کا جائزہ لینا تھا، چاہے یہ ملالہ کے خلاف انٹرنیٹ پر چلائی جانے والے انتہائی منظم ہو، یا اس کا تعلق راولپنڈی کے فسادات کے دوران میڈیا کی جانب سے فرقہ وارانہ تفرقات کو بڑھاوا دینے سے ہو، چاہے اس کا تعلق فیس بک پر پوسٹیں چلانے پر مبینہ توہین مذہب کے مرتکب ہونے والے ایک پروفیسر کی گرفتاری سے ہو، یا پھر یہ میڈیا کے افراد کے خلاف سوشل میڈیا پر چلائی جانے والی تازہ ترین مہم ہو۔ اس نے کہا کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر نفرت انگیز تقریر کا بے قابو پھیلاؤ خطرناک حدوں کو چھو رہا تھا، جس سے معاشرے کو کئی سطحوں پر خطرات کا سامنا تھا۔ بائٹس فار آل کا کہنا تھا: ''یقیناً اس مسئلے کو حل کرنے کی ضرورت ہے مگر ایسا رجعت پسندانہ کارروائی جیسے کہ ریاست کی جانب سے سنسر شپ اور پابندیوں کے بغیر کیا جانا چاہئے''۔

2014ء میں جنگجوؤں، حتیٰ کہ دہشت گرد گروہوں کی نفرت انگیز تقاریر کو بلاک کرنے کے حوالے سے ملک کا ریکارڈ غیر متاثر کن رہا۔

اس تحقیق کے مطابق دو بڑے گروہ جو فیس بک پر نفرت انگیز تقریر کے نشانے پر تھے وہ سیاست دان (38 فیصد) اور میڈیا گروپ کے اراکین (دس فیصد) تھے۔ سیاست دانوں اور میڈیا پر یہ حملے فیس بک کے پیجز پر موجود مجموعی نفرت انگیز تقاریر کا نصف تھے۔ ٹوئٹر پر مجموعی ریکارڈ میں سے بیس فیصد میں ریاستی اداروں کو نشانہ بنایا گیا تھا، جن میں سے سب سے زیادہ سیاستدانوں (گیارہ فیصد) اور میڈیا (سات فیصد) کو نشانہ بنایا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ اور سیاست دانوں اور میڈیا کے لیے کام کرنے والے افراد کو درپیش خطرات کے تناظر میں نفرت انگیز تقریر کی یہ بلند شرح خاص طور پر باعث تشویش ہے۔

اسلام آباد پولیس نے لال مسجد کے خطیب کے طالبان حامی بیانات کے خلاف سول سوسائٹی کے احتجاج کو روک دیا۔ پولیس کے اس اقدام کا سبب مبینہ طور پر یہ تھا کہ یہ احتجاج ''اپنی حدوں سے تجاوز'' کر گیا تھا۔ طالبان کے ہاتھوں پشاور میں سکول کے بچوں کے قتل عام پر گفتگو کے دوران لال مسجد کے خطیب نے جنگجوؤں کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ فوج اور طالبان ''بھائی'' ہیں انہیں مل جل کر رہنا چاہیے۔ سول سوسائٹی کا کہنا تھا کہ عزیز جیسے طالبان حامیوں کو اپنے نفرت انگیز پیغامات کو پھیلانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔

مظاہرے کے مقام پر موجود ایک پولیس آفیسر عصمت اللہ جونیجو کا کہنا تھا کہ مظاہرین کو ان کے آزادی اظہار کے حق سے محروم نہیں کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ: ''ہر پاکستانی کو آزادی اظہار کا حق حاصل ہے مگر مظاہرین اپنی حدوں سے تجاوز کر گئے تھے''۔ انہوں نے مزید کہا کہ: ''انہوں نے لاؤڈ سپیکر کا استعمال کیا اور خطیب کے خلاف بلاواسطہ طور پر نعرے لگائے جو غیر قانونی تھا''۔ ہم نے صرف مظاہرین کو علاقے سے منتشر کیا تا کہ لال مسجد مدرسے کے طلباء اور مظاہرین کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو ختم کیا جا سکے۔

اہل سنت والجماعت کے جنرل سیکرٹری عبدالرحمان معاویہ نے مظاہرین کے خلاف ایف آئی آر

سول سوسائٹی کے کارکن راشد رحمان کے قتل کے خلاف اسلام آباد میں احتجاج کرتے ہوئے

درج کرادی۔''امن عامہ'' کی صورتحال کوخراب کرنے پر چندمظاہرین کوگرفتار کیا گیا لیکن وزیرداخلہ چودھری نثار نے انہیں فوری طور پر رہا کرنے کاحکم دیا۔

سفارشات

1۔ حکومت کوصحافیوں پر ہونے والے حملوں کے خلاف سخت قانونی کارروائی کرنی چاہیئے تا کہ سزا سے استثنا کے ماحول کا خاتمہ کیا جا سکے۔حکومت میڈیا کی تنظیموں،سول سوسائٹی اور سیاسی گروہوں کومل کر پاکستان میں اظہاررائے کی آزادی اور میڈیا کے تحفظ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا چاہیئے۔

2۔ اقوام متحدہ کی ہدایات کے مطابق معلومات کی آزادی سے متعلق قوانین کواور زیادہ مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔معلومات کی آزادی سے متعلق قوانین میں بہتری سے ملک میں نظم ونسق کا معیار بہتر ہوگا۔

3۔ پاکستان میں انٹرنیٹ پرنفرت انگیز تقاریر کے پھیلاؤ کوروکنے کے لیےایک ایسا کثیر جہتی طریقہ کار اپنانے کی ضرورت ہے جوشعور دے،آگہی پیدا کرے اورنفرت اور عدم رواداری کی حوصلہ شکنی کرے،قانون کے ذریعےنفرت انگیزتقریر کی شدیداورخطرناک اقسام کی ممانعت کرے اورانہیں جرم قراردے،اورآزادانہ اظہاراورمعلومات کے بنیادی انسانی حقوق کےتحفظ کی ضمانت دے۔

4۔ مرکزی فریقین کے ساتھ بامقصد مشاورت کے بعد نشریاتی میڈیا کے مواد کے لیے بہتر ضوابط۔واضح اصول،بہتر نفاذ،زیادہ شفافیت اورنفاست۔کی ضرورت ہے۔

5۔ میڈیا کوکام کے ایک بہتر اخلاقی ماحول کےفروغ کے لیےموثر ضابطہ اخلاق تشکیل دینے چاہئیں۔ میڈیا کےخلاف شکایات کےحل کے لیےموثر طریق کارتشکیل دیئے جانے چاہئیں۔

اجتماع کی آزادی

ہر شخص کو پرامن طور پر بغیر کسی ہتھیار کے 'اجتماع کرنے کا حق حاصل ہوگا' بشرطیکہ اس سلسلے میں مفاد عامہ کے پیش نظر کوئی معقول قانونی پابندی عائد نہ کردی گئی ہو۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 16]

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ آزادی سے پرامن اجتماع منعقد کرے اور تنظیم بنائے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- 20 (1)]

اجتماعات شہریوں کو حکومت کا احتساب کرنے اور یہ فیصلہ کرنے کا حق دیتے ہیں کہ حکومت کا نظم و نسق کیسے چلایا جانا چاہئے۔ایک جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف پرامن اجتماع کی اجازت دے بلکہ اسے ریاستی اہلکاروں کی بے جا مداخلت سے بھی محفوظ رکھے۔ معلومات کی آزادی کا اجتماع کی آزادی سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لیے حکومت کو تمام ذرائع سے لوگوں کی معلومات تک رسائی کو آسان بنانا چاہئے۔ان ذرائع میں انٹرنیٹ بھی شامل ہے جو لوگوں کو اجتماعات کی منصوبہ بندی اور ان کے انعقاد کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کی آبادی کو ایسے تحفظات اور شکایات ہوسکتی ہیں جو وہ حکومت کے نوٹس میں لانا چاہتی ہوں۔لیکن حکام کے تکبر اور گھمنڈ کے باعث جائز خدشات رکھنے والے لوگ اپنے معاملات سڑکوں پر لے آتے ہیں تاکہ ان کی شنوائی ہو سکے۔اس سے پہلے کہ لوگ احتجاجی مظاہروں اور سول نافرمانی کا آغاز کریں، ان کی شکایات کے ازالے کے لیے ایک منظم طریق کار وضع کیا جانا چاہئے۔

2014ء کے دوران ملک میں بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کیے تاہم حکومت بیشتر مظاہرین کی اجتماع کی آزادی کو یقینی نہ بنا سکی جس کی قومی اور بین الاقوامی قوانین میں ضمانت دی گئی ہے۔اس نے پر

امن اجتماع کے حق کے استعمال کے حوالے سے مظاہرین کے مختلف گروہوں میں تفریق روا رکھی۔ گزشتہ سالوں کی طرح 2014ء میں بھی غفلت اور ناقص حکمت عملی کے باعث معمول کے انتظامی مسائل اور بنیادی حقوق کے مطالبات شدید نوعیت اختیار کر کے عوامی مظاہروں میں تبدیل ہو گئے۔

لوگوں نے بنیادی سہولیات گیس، بجلی، پیٹرول اور کم قیمت خوراک کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ بلوچستان اور ملک کے دیگر علاقوں میں لاپتہ افراد کے رشتہ دار اپنے عزیزوں کی بازیابی کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ معذوری کے شکار افراد نے مطالبہ کیا کہ انہیں بھی سماجی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ لاہور کے قریب ایک گاؤں میں توہین مذہب کے الزام پر تشدد کے بعد اینٹوں کی بھٹے میں زندہ جلائے جانے والے مسیحی جوڑے کے قتل کی بھی شدید مذمت کی گئی اور بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ لیکن سال کے دوران میڈیا کی زیادہ تر توجہ 2013ء کے عام انتخابات میں ہونے والی مبینہ دھاندلی کے خلاف حزب اختلاف کی جماعت پاکستان تحریک انصاف اور ایک مذہبی و سیاسی جماعت پاکستان عوامی تحریک، جس کی پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی نہیں، کے سیاسی مظاہروں پر ہی مرکوز رہی۔ عوامی تحریک کا مطالبہ تھا کہ نواز شریف ٹیکنوکریٹس کی سربراہی میں قائم کی جانے والی ''قومی حکومت'' کو اقتدار منتقل کریں جو اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں پچاس فیصد کمی کرے، آمدن کے فرق کو کم کرے اور دہشت گردی کا خاتمہ کرے۔

چند تجزیہ نگاروں کا یہ ماننا تھا کہ اگر حکومت دھاندلی کی تحقیقات کے لیے ایک ٹربیونل تشکیل دے دیتی تو ریلیوں اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار سے بچا جا سکتا تھا۔ حکومت کا پی اے ٹی کے احتجاج کو روکنے کے لیے لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن میں پی اے ٹی کے قائد طاہر القادری کی رہائش گاہ کے باہر کنٹینر کھڑے کرنا ریاست کی بے جا مداخلت تھی۔ 2014ء کے دوران ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں کے دوران گولیوں، آنسو گیس، ربڑ کی گولیوں، واٹر کینن اور لاٹھیوں کا حد سے زیادہ استعمال اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ مظاہرین کا تحفظ حکومت کی ترجیحات میں شامل نہیں تھا۔ 17 جون کو پولیس نے طاہر القادری کے گھر کے اطراف میں کھڑی کی گئی رکاوٹوں کو ہٹانے کی کوشش کی جس کے بعد پولیس اور پی اے ٹی کے کارکنوں کے درمیان شدید تصادم ہوا جس کے نتیجے میں پی اے ٹی کے کم از کم 11 کارکن ہلاک اور سو سے زائد زخمی ہو گئے۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس نے طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے ربڑ کی گولیوں کی بجائے اصلی گولیوں کا استعمال کیا۔ ایچ آر سی پی نے 18 جون کو اپنے ایک بیان میں طاہر القادری کی پاکستان آمد کے موقعے پر پولیس کی جانب سے ان کے گھر کے اطراف سے کنٹینر ہٹائے جانے پر سوال اٹھایا جو وہاں کئی سالوں سے موجود تھے۔ محض کنٹینر ہٹانے کے نتیجے میں اتنی بڑی تعداد میں ہلاکتیں نہیں ہونی چاہئے تھیں، جس

سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس اقدام کے پس پردہ سیاسی محرکات کارفرما تھے۔ یہ بات واضح تھی کہ طاہر القادری نے ایک بیان میں حکومت کے خلاف انقلاب لانے کا اعلان کیا تھا جس سے حکومت کو خطرہ محسوس ہوا۔

بین الاقوامی معاہدے اور ملکی قوانین یہ کہتے ہیں کہ پر امن اجتماعات میں شرکت رضا کارانہ طور پر اور کسی دباؤ کے بغیر ہونی چاہیے۔ البتہ ایسی اطلاعات سامنے آئیں، جن کی ایچ آر سی پی نے تصدیق نہیں کی، کہ پی اے ٹی اور پی ٹی آئی کے دھرنوں میں شامل ہونے والے چند لوگوں کے ساتھ دھرنوں میں شرکت کے عوض معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ دھرنوں میں بہت سے مہینے گزارنے کے بعد کئی خاندان اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے لیکن احتجاجی مظاہرے میں موجود قائدین نے مبینہ طور پر انہیں واپس جانے کی اجازت نہ دی۔ دسمبر میں ایک خاتون نے طاہر القادری اور پی اے ٹی کے دیگر قائدین کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں دائر کر دی۔ مذکورہ خاتون کا یہ کہنا تھا کہ پی اے ٹی نے اس کے واجبات ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کا اسے اسلام آباد کے دھرنے میں شرکت کرنے کے بدلے میں وعدہ کیا گیا تھا۔ درخواست گزار حاجن مومنہ نے موقف اختیار کیا کہ پی اے ٹی کے کارکنان نے اس کے علاوہ دیگر خواتین کے شناختی کارڈ اپنے پاس رکھ لیے تھے تاکہ دھرنے میں ان کی حاضری کو یقینی بنایا جا سکے اور ہر خاتون کو دھرنے میں ایک دن بیٹھنے کے عیوض 3500 روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ جب 70 دن بعد دھرنا ختم ہوا اور ان خواتین نے لاہور میں پی اے ٹی کے دفتر میں اپنے واجبات کا تقاضہ کیا تو پی اے ٹی کے کارکن مبینہ طور پر ان کے ساتھ بری طرح پیش آئے۔ جج نے 25 دسمبر کو تھانہ فیصل ٹاؤن کے ایس ایچ او سے وضاحت طلب کی۔ کراچی میں سیاسی اجتماعات کے حوالے سے ایسی سرگرمیوں کی اطلاعات تسلسل کے ساتھ منظر عام پر آتی رہی ہیں جہاں یہ الزام عائد کیا جاتا رہا کہ جلسے میں لوگوں کی حاضری کو یقینی بنانے کے لیے گھر گھر جا کر شناختی کارڈ اکٹھے کیے جاتے ہیں اور جلسے کے مقام پر واپس کر دیے جاتے ہیں۔

بجلی اور ایندھن کی قلت کے خلاف مظاہرے

ملک بھر میں روزانہ بجلی کی 60 فیصد یعنی 24 گھنٹوں کے دوران پندرہ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ اور تقریباً 6000 میگا واٹ کا شارٹ فال جاری رہا اور لوگوں نے 45 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت میں بغیر بجلی کے موسم گرما کی شدت کو برداشت کیا۔ توانائی کے مختلف شعبوں کے عہدے دار یہ دعویٰ کرتے رہے کہ بجلی کا شارٹ فال 2300 میگا واٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ ملک میں بجلی کی پیداوار ضرورت کی 49 فیصد تھی جبکہ قدرتی گیس کی فراہمی بھی طلب کے مقابلے میں کم رہی۔

بڑھتے ہوئے شارٹ فال اور مہنگی بجلی فراہم کرنے والی نجی کمپنیوں کو ٹھیکے دینے کے باعث بڑھتی

لوگ توانائی کے بحران کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

ہوئی لاگت کو پورا کرنے کے لیے ہر سال بجلی کی قیمتوں میں اضافہ ناگزیر تھا۔ اگست میں لوگوں نے شکایت کی کہ انہیں ناجائز طور پر بجلی کے زائد بل بھیجے گئے جس کے نتیجے میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ستمبر میں اسلام آباد کے تاجروں نے بجلی کے زائد بل بھیجنے پر اسلام آباد الیکٹرک سپلائی کمپنی (آئیسکو) کے خلاف احتجاج کیا۔ ایسے ہی احتجاجی مظاہرے فیصل آباد، لاہور، گوجرانوالہ اور دیگر شہروں میں بھی کیے گئے۔

11 ستمبر کو گوجرانوالہ اور گجرات میں بجلی کی سولہ سے بیس گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ عید کے دوران بھی جاری رہی جس سے گھروں میں کھانا بنانا ناممکن ہوگیا۔ علاقہ مکینوں نے لوڈ شیڈنگ اور بجلی کے زائد بلوں کے خلاف واپڈا اور گوجرانوالہ الیکٹرک سپلائی کمپنی (جیپکو) کے دفاتر کے سامنے احتجاج کیا۔

موسم سرما کے دوران لوگوں کو گیس کی کمی کا سامنا رہا۔ 16 دسمبر کو راولپنڈی کے رہائشیوں نے ٹائر جلا کر احتجاجی مظاہرہ کیا اور حکام کے خلاف نعرے بازی کی۔ چونکہ دسمبر میں گیس کی فراہمی زیادہ تر رہائشی علاقوں میں کم رہی اس لیے ایسے احتجاجی مظاہرے ملک بھر میں جاری رہے۔

حملوں کے خلاف مظاہرے

سال کا آغاز حسب معمول شیعہ ہزارہ برادری کے خلاف بے حسی پر مبنی تشدد سے ہوا۔ 21 جنوری کو بلوچستان کے علاقے مستونگ میں شیعہ ہزارہ زائرین کی دو بسیں خودکش حملے اور بلا امتیاز فائرنگ کا نشانہ

بنیں جس کے نتیجے میں کم از کم 28 افراد جاں بحق اور 37 زخمی ہو گئے۔ حملے کی ذمہ داری ایک فرقہ وارانہ گروہ لشکر جھنگوی نے قبول کی۔ متاثرین کے خاندانوں اور شیعہ ہزارہ برادری کے دیگر اراکین نے کوئٹہ میں علمدار روڈ پر شدید سردی میں تقریباً 60 گھنٹوں تک دھرنا دیا۔ متاثرین کے خاندانوں نے گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی انصاف کی فراہمی تک میتوں کو دفنانے سے انکار کر دیا۔ ''کامیاب'' مذاکرات کے بعد دھرنا ختم کر دیا گیا مگر اس کے باوجود اکتوبر میں شیعہ ہزارہ برادری کو تین مرتبہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ تینوں واقعات کوئٹہ میں پیش آئے۔ لسانی اور مذہبی اقلیتوں پر مسلسل حملوں اور چند جنگجو گروہوں کی جانب سے ان حملوں کی ذمہ داری قبول کرنے کے باوجود حکومت پر تشدد واقعات کے ذمہ داروں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے میں ناکام رہی۔ مذہبی اقلیتوں کو نشانہ بنانے والے جنگجو گروہوں کا تعاقب کرنے میں حکومت کی لاپرواہی یہ ظاہر کرتی تھی کہ یا تو وہ نااہل تھی یا پھر جرم میں برابر کی شریک۔

16 دسمبر کو پشاور کے آرمی پبلک سکول پر طالبان کے وحشیانہ حملے کے نتیجے میں 150 سے زائد افراد اپنی زندگیوں سے محروم ہو گئے جن میں کم از کم 132 کم سن طلبہ شامل تھے۔ اس واقعے کے بعد پاکستان بھر میں جذبات انگیز مظاہرے کیے گئے۔ سب سے زیادہ طویل عرصے تک جاری رہنے والا اور منظم احتجاج اسلام آباد میں لال مسجد کے سامنے کیا گیا، جس کے خلاف فوج نے 2007ء میں ایک آپریشن کیا تھا۔ فوج کے مطابق اس آپریشن کا مقصد مسجد کے اندر موجود مسلح جنگجوؤں کا مقابلہ کرنا تھا۔ مسجد کے امام مولانا عبدالعزیز نے، جو اپنے انتہا پسندانہ نظریات کے لیے جانے جاتے ہیں، پشاور حملے کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔

مولانا کو طالبان کے لیے ہمدردانہ خیالات رکھنے پر جوابدہ بنانے کے لیے سول سوسائٹی کے سینکڑوں اراکین، طلبہ، صحافی اور سیاستدانوں نے لال مسجد کے باہر جمع ہو کر ''اپنی مسجد کو آزاد کراؤ'' کے نام سے ایک تحریک شروع کی، اور مطالبہ کیا مولانا پشاور حملے کی مذمت کریں۔ مسجد انتظامیہ کی درخواست پر سڑک بلاک کرنے اور مسجد انتظامیہ کے خلاف نفرت انگیز تقریر کرنے پر مظاہرین کے خلاف دفعہ 144 کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا۔ اس احتجاج کے جواب میں مولانا عبدالعزیز نے مظاہرین کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے احتجاج ختم نہ کیا تو ان پر خودکش حملے کیے جائیں گے۔ اس پر مظاہرین نے تھانہ آبپارہ کی جانب مارچ کیا تاکہ مولانا عبدالعزیز پر مجرمانہ دھمکی دینے پر تعزیرات پاکستان کے سیکشن (2) 508 کے تحت مقدمہ درج کرایا جا سکے۔ بعد ازاں جب مظاہرین تھانے کے باہر خیمہ زن ہو گئے تو شام کے وقت مقدمہ درج کر لیا گیا۔ تاہم مظاہرین نے مولانا کی گرفتاری تک دھرنا جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ پولیس نے 26 دسمبر تک کی مہلت مانگی

شیعہ زائرین کے قتل کے خلاف علمدار روڈ کوئٹہ پر دھرنا

اور جب 26 دسمبر کو شام چھ بجے یہ مہلت ختم ہوگئی تو پولیس نے وعدہ کیا کہ ملزموں کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔ تاہم سال کے آخر تک کوئی کاروائی نہیں کی گئی تھی۔ ''اپنی مسجد کو آزاد کراؤ'' تحریک کے قائد کو مبینہ طور پر ٹی ٹی پی کے ترجمان احسان اللہ احسان کی جانب سے ایک دھمکی آمیز کال موصول ہوئی جس میں دھمکی دی گئی کہ اگر انہوں نے دھرنا ختم نہ کیا تو انہیں سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ لال مسجد کے باہر احتجاج کرنے والوں سے اظہار یکجہتی کے لیے لاہور، کراچی اور فیصل آباد میں احتجاجی مظاہرے کیے گئے اور شمعیں روشن کی گئیں۔

جنوری میں سیالکوٹ میں متعدد افراد نے، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق پی ٹی آئی اور سنی تحریک سے تھا، قرآن اور ایک مسجد کی مبینہ بے حرمتی پر احتجاج کرتے ہوئے دکانوں اور بازاروں کو زبردستی بند کرا دیا۔ مظاہرین نے ٹائر جلائے اور علامہ اقبال چوک کو چھ گھنٹوں تک بند کیے رکھا۔ ملزم نے، جس کا مبینہ طور پر دماغی توازن درست نہیں تھا، مسجد میں چند صفوں کو آگ لگائی جس نے قرآن کے چند نسخوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ انٹیلی جنس ایجنسیوں نے ملزم کو تفتیش کے لیے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا تھا۔

4 جنوری کو ایک شیعہ حامی سیاسی و مذہبی تنظیم مجلس وحدت مسلمین نے شیعہ برادری کے خلاف بڑھتے ہوئے ٹارگٹ حملوں اور قاتلوں کی گرفتاری میں حکومت کی ناکامی کے خلاف لاہور، راولپنڈی، فیصل آباد، گوجرانوالا اور ملتان سمیت کئی شہروں کے علاوہ لندن میں احتجاج کیا۔ ان حملوں کو روکنے کے مطالبات

'اپنی مسجد واپس لو' کے نام سے اسلام آباد میں احتجاج

کے باوجود 21 جنوری کو بلوچستان کے علاقے مستونگ میں شیعہ مظاہرین پر ایک اور جان لیوا حملہ ہوا جس میں 26 افراد جاں بحق ہوگئے۔

جنوری میں سابق گورنر سلمان تاثیر کی برسی کے موقع پر سول سوسائٹی کی جانب سے شمعیں روشن کرنے کی ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں صحافیوں اور سیاسی جماعتوں کے اراکین نے مرحوم کے حق میں تقاریر کیں۔ اسی طرح عاشقان ممتاز قادری فورم نے بھی سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کی حمایت میں ایک ریلی منعقد کی جس میں مدرسوں کے 250 طلبا نے شرکت کی۔

16 جون کو کوئٹہ کی شیعہ ہزارہ برادری نے بدامنی کے شکار صوبہ بلوچستان کے راستے ایران سفر کرنے پر پابندی عائد کرنے کے خلاف احتجاج کیا۔ مظاہرین نے مطالبہ کہ یہ پابندی اٹھائی جائے اور عراق اور ایران میں مقدس مقامات کا سفر کرنے والے زائرین کو بہتر سیکیورٹی فراہم کی جائے۔ یہ پابندی دورافتادہ قصبے تفتان میں زائرین کے خلاف دہشت گردی کے واقعات کے بعد لگائی گئی تھی۔ چار خودکش بمباروں نے دو ریستورانوں کو نشانہ بنایا، جس کے نتیجے میں 24 زائرین جاں بحق ہوگئے جو اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ مظاہرین نے پابندی ہٹانے پر زور دیا کیونکہ وہ ہوائی جہاز کے مہنگے سفر کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ایسے اقدامات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ نہ صرف یہ کہ حکومت اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی بلکہ اس نے اس کا کھلے عام اعتراف بھی کیا۔ خطرات سے دوچار لوگوں کو یہ کہہ کر اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ان بے لگام واقعات سے بچنے کے لیے یا تو اپنے لیے پرائیویٹ سیکیورٹی کا انتظام کریں یا پھر خود کو گھروں میں قید کرلیں۔

کالی ماتا کالونی کے باشندے ٹنڈو محمد خان کی طرف جانے والی شاہراہ پر ہنومان مندر پر حملے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

فروری میں سول سوسائٹی اور انسانی حقوق کی متعدد تنظیموں نے حکومت کے طالبان سے مذاکرات کرنے کے فیصلے کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے کیے۔ مظاہروں میں شامل مقررین کا کہنا تھا کہ دہشت گرد بے شمار کارروائیوں میں ملوث ہیں اس لیے ان کے ساتھ امن مذاکرات کامیاب نہیں ہوں گے۔ انہوں نے ملک سے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ایک سخت فوجی آپریشن کا مطالبہ کیا۔ خواتین کے حقوق کی تنظیموں نے بھی طالبان سے مذاکرات کے لے منتخب کردہ ٹیم میں خواتین کی عدم شمولیت پر برہمی کا اظہار کیا۔ ان کا یہ کہنا تھا طالبان کے دور حکومت میں ان کی بربریت کا سب سے زیادہ خواتین نشانہ بنیں اور اگر طالبان ملک کے کسی حصے پر قابض ہوگئے تو اس کا سب سے زیادہ نقصان خواتین کو ہوگا۔

2014ء کے دوران مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو کئی طرح کے خطرات کا سامنا رہا۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق صرف سندھ میں 11 مندروں اور گرجاؤں پر حملے کیے گئے۔ 24 مئی کو سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے تقریباً 300 افراد اسلام آباد میں پارلیمنٹ کی عمارت میں داخل ہوگئے اور اپنی مقدس کتاب کی بے حرمتی کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کے اس اقدام کو حفاظتی کمزوری قرار دیا گیا جس کے باعث ایوان کی کاروائی عارضی طور پر معطل ہوگئی۔ اس واقعے کو سیکیورٹی کی ایک بڑی خامی قرار دیا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد قائد ایوان نے مظاہرین سے مذاکرات کیے جس پر احتجاج ختم کر دیا گیا۔

29 مارچ کو صوبہ سندھ کے شہر لاڑکانہ کی کالی ماتا کالونی کے مکینوں نے مندر جلائے جانے پر احتجاج کیا۔ انہوں نے ٹائر جلائے اور ٹنڈو محمد خان روڈ پر ٹریفک کو بلاک کر دیا۔ ان کا مطالبہ تھا مذہبی اقلیتوں کو

بہتر سیکیورٹی فراہم کی جائے۔اس واقعے سے صرف ایک ہفتہ پہلے لاڑکانہ میں قرآن پاک کی مبینہ بے حرمتی پر بھی ایک ایسا ہی حملہ کیا گیا اور املاک کو آگ لگادی گئی تھی۔

سیاسی احتجاج

سال کے دوران ملک کی تاریخ کا سب سے طویل عرصہ تک جاری رہنے والا احتجاج دیکھنے میں آیا۔اگست اور ستمبر کی درمیانی مدت کے دوران سیاسی فضاء پر پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے احتجاج اور دھرنوں کا غلبہ رہا۔ پی ٹی آئی نے 2013ء کے انتخابات میں مبینہ دھاندلی کے خلاف ریلیوں کا آغاز 14 اگست کو کیا تھا۔ پی اے ٹی کی انقلاب مارچ کے نام سے مشہور ریلیوں کا مقصد وزیراعظم کی برطرفی کے علاوہ ملک کے سیاسی نظام کی تبدیلی تھا۔اسلام آباد کا ریڈ زون، جہاں پارلیمنٹ ہاؤس جیسے اہم ریاستی ادارے واقع ہیں، اس کے بالکل قریب واقع ڈی چوک میں احتجاج کرنے کا مقصد ایک واضح پیغام دینا تھا۔انہیں اپنے اجتماع کی آزادی کے اظہار کا حق حاصل تھا مگر انہوں نے وزیراعظم ہاؤس میں داخل ہونے کی امید میں ریڈ زون پر دھاوا بول کر نہ صرف اپنے حقوق سے تجاوز کیا بلکہ پولیس کو بھی انتقامی کاروائی کرنے کا موقع دیا۔19 اگست کی رات کو پی ٹی آئی کے قائد عمران خان نے مظاہرین کو ریڈ زون کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔یکم ستمبر کو مظاہرین پاکستان ٹیلی ویژن (پی ٹی وی) کے مرکزی دفتر میں داخل ہوگئے۔انہوں نے نشریات معطل کردیں، املاک کو نقصان پہنچایا اور عملے کو ہراساں کیا۔ پی ٹی آئی کے احتجاج کے تیسرے مرحلے میں عمران خان نے ملک کے تمام بڑے شہروں کو بند کرنے کے لیے ایک شیڈول کا اعلان کیا۔8 دسمبر کو جب فیصل آباد کو بند کیا گیا تو حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ن) کے کارکنوں نے بھی پی ٹی آئی کے اعلان کردہ علاقوں میں ایک ریلی نکالی۔دونوں جماعتوں کے کارکنوں کے درمیان تصادم ہوا جس کے نتیجے میں پی ٹی آئی کا ایک کارکن ہلاک جبکہ دیگر 14 افراد زخمی ہوئے۔اگرچہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے کارکن ریلی کے لیے کوئی اور مقام بھی منتخب کرسکتے تھے تاہم اپنے کارکنوں کو تشدد پر اکسانے پر پی ٹی آئی کی قیادت کو بھی موردالزام ٹھہرایا گیا۔وزیراعلیٰ نے واقعے کی تحقیقات کا حکم دیا اور مقتول کے بھائی کی مدعیت میں تعزیرات پاکستان کے ضابطہ کے علاوہ انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت ایک مقدمہ درج کرلیا گیا۔ کارکن کے ہلاکت کے جواب میں پی ٹی آئی کے کارکنوں نے ملک بھر میں احتجاج کیا۔کراچی، اسلام آباد اور لاہور میں مرکزی شاہراہیں بند کردی گئیں۔اسی طرح 16 دسمبر کو بھی لاہور میں 28 مرکزی مقامات کو بند کردیا گیا۔پی ٹی آئی کے کارکنوں نے سڑکوں پر ٹائر جلائے، خاردار تاریں بچھادیں اور لاہور کی مرکزی شاہراہوں پر رکاوٹیں کھڑی کردیں۔

21 اگست کو لاہور ہائی کورٹ (ایل ایچ سی) نے ایک درخواست کی سماعت کرنے سے انکار کر دیا جس میں پی اے ٹی کے آزادی مارچ کے خلاف ایک حکم امتناعی جاری کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ درخواست گزار نے الزام لگایا کہ مارچ اور دھرنے پاکستان میں انارکی پھیلانے کی ایک بین الاقوامی سازش تھے۔ اس نے احتجاج کے اغراض و مقاصد کی تحقیقات کے لیے ایک عدالتی کمیشن تشکیل دینے کی درخواست کی۔ عدالت نے یہ دلائل دیتے ہوئے درخواست مسترد کر دی کسی بھی فرد کو پرامن دھرنے اور احتجاج سے نہیں روکا جا سکتا۔

ایسی اطلاعات بھی سامنے آئیں کہ پارلیمنٹ کے سامنے ڈی چوک میں مظاہرہ کرنے والے افراد کے لیے کیے گئے انتظامات ناکافی اور غیر مناسب تھے۔ کوئی مناسب پناہ گاہ موجود نہ ہونے کے باعث مظاہرین کو سارا دن جھلسا دینے والی گرمی میں اپنے قائدین کا انتظار کرنا پڑتا جو خود غروب آفتاب کے بعد ہی دھرنے میں آتے تھے۔ علاقے میں بیت الخلاء کی عدم موجودگی بھی پریشانی کا سبب بنی، خاص طور پر خواتین کے لیے۔ آس پاس کوئی مارکیٹ نہ ہونے کے باعث دھرنے کے شرکاء کو روزمرہ استعمال کی اشیاء کی خریداری کے لیے طویل فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گھر کے آرام کو چھوڑ کر سڑکوں پر احتجاج کرنے والوں کو یقیناً مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ پارٹی قائدین جن کی وہ مخلصانہ طور پر پیروی کرتے ہیں انہیں ان کے تحفظ اور فلاح کے لیے باقاعدہ انتظامات کرنے چاہئیں تھے۔

21 اگست کو سپریم کورٹ نے شاہراہ دستور پر رکاوٹ پیدا کرنے پر پی ٹی آئی کے چیئر مین اور پی اے ٹی کے سربراہ کو نوٹس جاری کیے۔ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن (ایس سی بی اے) نے یہ پٹیشن چیف جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں قائم کردہ پانچ رکنی بنچ کو جمع کرائی۔ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا یہ کہنا تھا کہ وکلاء اور جج وقت پر عدالت پہنچنے سے قاصر تھے جس کے باعث مقدمات التوا کا شکار تھے۔ ایس سی بی اے کے صدر نے یہ پٹیشن آرٹیکل 184(3) کے تحت جمع کروائی جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ اس سیاسی رکاوٹ کی وجہ سے قومی زندگی کے تمام شعبے متاثر ہو رہے تھے۔

جنوری کے شروع میں متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے ایک تقریر میں کہا کہ اگر اردو بولنے والوں کے حقوق غصب کیے گئے تو وہ ایک الگ صوبے حتیٰ کہ الگ ملک کا بھی مطالبہ کر سکتے ہیں۔ ان کے اس بیان کے خلاف سندھ کے متعدد علاقوں میں مظاہرے کیے گئے۔ مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ ایم کیو ایم کے سربراہ سندھی بولنے والی آبادی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور سندھ کو پاکستان سے الگ کرنے کے مطالبے پر معافی مانگیں۔

تشدد

2014ء کے دوران تشدد اور مظاہرین کے خلاف طاقت کے حد سے زیادہ استعمال کی کئی مثالیں دیکھنے کو ملیں۔ ان دعووں کے باوجود کہ ہجوم پر قابو پانے کے لیے ربڑ کی گولیاں درآمد کی گئی تھیں، بڑی تعداد میں ہونے والی ہلاکتیں، جن کا ثبوت گولیوں کے زخموں کی صورت میں موجود تھا، یہ ظاہر کرتی تھیں کہ لوگوں پر اصلی گولیاں چلائی گئیں جن کا مقصد ممکنہ طور پر گولی مار کر قتل کرنے کا احکامات کو بجالانا تھا۔ پولیس نے صنف کا لحاظ کیے بغیر غیر مسلح شہریوں کے علاوہ معذوری کے شکار افراد سے نپٹنے کے لئے غیر معمولی سفاکی کا مظاہرہ کیا جو جائز مطالبات کے ساتھ انصاف مانگ رہے تھے۔ پولیس نے نوجوانوں اور بزرگوں میں کوئی تمیز نہ رکھتے ہوئے ہجوم پر قابو پانے کے لیے لاٹھیوں کا بے دریغ استعمال کیا۔ نیوز چینلز نے ایسی کئی ویڈیو جاری کیں جن میں بہت سے پولیس اہلکاروں کو کسی ایک شخص کو لاٹھیوں سے تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے دکھایا گیا جو گرنے کے باعث اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ ایسے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا مقصد امن قائم کرنا اور صورتحال پر قابو پانا نہیں بلکہ انتقام لینا تھا۔

پنجاب پولیس نے پاکستان عوامی تحریک (پی اے ٹی) کے قائد طاہر القادری کے گھر کے باہر سے رکاوٹیں ہٹانے کے لیے ایک آپریشن کیا جس کے نتیجے میں 11 افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوگئے۔ 16 جون کو، جب طاہر القادری نے لاہور پہنچنا تھا، طاہر القادری کے گھر کے باہر سے رکاوٹیں ہٹانے کے لیے ایک آپریشن کا اعلان کیا گیا جو کئی سالوں سے وہاں موجود تھیں۔ جب پولیس نے رکاوٹیں ہٹانے کی کوشش کی، جو کہ پولیس کے مطابق سرکاری املاک پر تجاوزات کے زمرے میں آتی تھیں، تو پی اے ٹی کے کارکنوں اور پولیس کے درمیان جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ پولیس نے مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کے گولے پھینکے۔ پولیس کے مطابق 27 پولیس اہلکار زخمی ہوئے جبکہ 53 افراد کو گرفتار کیا گیا۔ تحقیقات کے دوران پولیس نے کہا کہ جب پی اے ٹی کے کارکنوں نے فائرنگ کا آغاز کیا تو سپرینٹنڈنٹ پولیس (ایس پی) نے ہوائی فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ 25 اگست کو انسپکٹر جنرل (آئی جی) پنجاب پولیس نے ایس پی عہدے کے گیارہ افسروں کے تبادلے کے احکامات جاری کیے۔ ان میں سے تین افسر جھڑپوں کے وقت ماڈل ٹاؤن میں موجود تھے۔ اگرچہ غیر قانونی احکامات دینے والے اعلیٰ پولیس افسروں کی معطلی ایک شروعات ہے تاہم یہ عمل یہیں ختم نہیں ہونا چاہیے۔ ذمہ داروں کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے اور انہیں سزا دی جانی چاہئے۔ پولیس کو ہجوم پر قابو پانے کے جدید طریق کار سے متعلق تربیت فراہم کی جانی چاہئے جن کے ذریعے

نابینا افراد نے وزیر اعلیٰ ہاؤس کے سامنے پُر امن احتجاجی مظاہرہ کیا اور پولیس نے اُن پر لاٹھی چارج کیا

پولیس اور مظاہرین دونوں کی سلامتی کو یقینی بنایا جا سکے۔

28 اپریل کو ڈیفنس آف ہیومن رائٹس پاکستان کی چیئر پرسن آمنہ جنجوعہ نے لاپتہ افراد کے رشتہ داروں کے ہمراہ جبری اور غیر اختیاری گمشدگیوں کے خلاف اسلام آباد کے ڈی چوک میں مظاہرہ کیا۔ جب مظاہرین نے ریڈ زون میں واقع ایوان پارلیمنٹ پہنچنے کی کوشش کی تو پولیس نے ہوائی فائرنگ کی، آنسو گیس استعمال کی اور لاٹھی چارج کیا۔ البتہ خواتین پولیس اہلکاروں نے محترمہ جنجوعہ کے ساتھ گرفتاری کے دوران جو برتاؤ کیا وہ خاص طور پر باعث تشویش تھا۔ صحافی واقعے کی فلم بندی کے لیے فوراً وہاں پہنچے اور خواتین پولیس اہلکاروں کے محترمہ جنجوعہ سے ناروا سلوک کے مناظر ٹی وی پر براہ راست نشر کیے گئے۔ یہ دیکھا گیا کہ پولیس نے انہیں دھکے دیے، ان کے کپڑے اور بال کھینچے، انہیں پولیس وین میں پھینکا اور تیزی کے ساتھ انہیں لے گئے۔ واقعے کی فلم بندی کرنے والے صحافیوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے کیمرے چھینے اور توڑ دیے گئے اور کئی صحافی زخمی ہوئے۔ بعد ازاں اس روز وزیر اعظم نے ایک بیان جاری کیا کہ وہ پولیس تشدد پر ناخوش ہیں۔ انہوں نے تمام مظاہرین کی رہائی کا حکم دیا۔

3 دسمبر کو معذور افراد کے عالمی دن کے موقع پر بینائی سے محروم افراد نے لاہور پریس کلب کے سامنے مظاہرہ کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ معذور افراد کے لیے ملازمت کا کوٹہ بڑھایا جائے۔ جب مظاہرین نے وزیر اعلیٰ ہاؤس کی جانب پیش قدمی شروع کی تو پولیس نے انہیں روکنے کی کوشش کی کیونکہ اسی راستے سے کچھ

دیر میں صدر کا قافلہ گزرنا تھا۔ پولیس کے بہیمانہ ردعمل کو ایک ایسے گروہ کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا گیا جو اپنی معذوری کے باعث پہلے ہی شدید محرومی کا شکار تھا۔ پانچ پولیس اہلکاروں کو معطل کر دیا گیا لیکن بصارت سے محروم مظاہرین کے اصل مطالبات اس افراتفری میں گم ہو کر رہ گئے۔

پابندیاں

اجتماع کی آزادی کا حق، جس کی تمام شہریوں کو بلا امتیاز ضمانت دی گئی ہے، محض چند گروہوں کو حاصل رہا۔ لاپتہ افراد کے رشتے داروں پر مشتمل ایک گروہ وائس فار مسنگ پرسنز (وی بی ایم پی) نے جبری اور غیر ارادی گمشدگیوں کے خلاف اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے دفتر میں اپنی شکایات درج کرانے کے لیے کوئٹہ سے اسلام آباد تک پیدل مارچ کیا۔ درجن کے قریب یہ غیر مسلح افراد جو صرف اپنے لاپتہ رشتہ داروں اور دوستوں کی تصاویر پکڑے ہوئے تھے، انہیں سفر کے دوران کئی مقامات پر دھمکایا گیا، اور واپس جانے اور احتجاج ختم کرنے کو کہا گیا۔ پنجاب کے شہر وزیر آباد میں نامعلوم افراد نے رات کے وقت مبینہ طور پر مظاہرین کو دھمکانے کے لیے ان کے کیمپ کو گھیرے میں لے لیا۔ فروری میں ماما عبدالقدیر، جو کہ لانگ مارچ کی قیادت کر رہے تھے، کو دھمکی آمیز فون کالز اور ایس ایم ایس موصول ہوئے، جن میں خبردار کیا گیا کہ انہیں راولپنڈی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جو دارالحکومت اسلام آباد کے قریب ہونے کے علاوہ پاکستان کی مسلح افواج کا سرکاری ہیڈکوارٹر بھی تھا۔ سول سوسائٹی نے ان دھمکیوں کی پرزور مذمت کی اور بالآخر مارچ میں وائس فار بلوچستان مسنگ پرسنز کے اراکین بحفاظت دارالحکومت میں داخل ہو گئے۔ دوسری جانب 5 دسمبر کو جنگجو تنظیم لشکر طیبہ کے سیاسی ونگ جماعت الدعوۃ نے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں ایک دو روزہ کانفرنس منعقد کی۔ اس نے ملک میں شریعت کے مکمل نفاذ اور پاکستان کے دشمنوں کے خلاف جہاد شروع کرنے کا مطالبہ کیا۔ پاکستان کی بھارت کے ساتھ امن قائم کرنے کی کوششوں کے خلاف بھی تقاریر کی گئیں۔

پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے تقریباً پانچ ماہ تک جاری رہنے والے احتجاج کے دوران پولیس نے لوگوں کو بے بنیاد الزامات کی بنا پر قید میں رکھنے کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ ان گرفتاریوں کو جو مینٹیننس آف پبلک آرڈر (ایم پی او) 1960ء اور سی آر پی سی کی دفعہ 144 کے تحت عمل میں آئیں، کھلم کھلا ایذا دہی قرار دیا گیا۔ حکومت کی جانب سے بنیادی آزادیوں کو سلب کرنے کی ایسی مہم ایک خطرناک مثال قائم کر دیتی ہے۔ اگست کے دوران پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے 1980 کارکن پنجاب کی مختلف جیلوں میں قید تھے۔

جبری گمشدگیوں کے خلاف بلوچستان سے اسلام آباد تک لانگ مارچ

اسی طرح چند ہفتوں کے دوران گرفتار کیے گئے تین سے چار ہزار افراد کو یہ کہہ کر رہا کر دیا گیا کہ ان کے خلاف الزامات کمزور تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کارکنوں کو لاہور، گوجرانوالا، ملتان، فیصل آباد اور راولپنڈی کی جیلوں میں رکھا گیا۔ لاہور کے تمام داخلی راستوں پر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی جو پارٹی کارکنوں کی گاڑیوں کی مکمل تلاشی لیتی۔ اس اقدام کو کارکنوں کو لاہور میں منعقد کردہ ریلیوں میں شرکت سے روکنے کی غیر ضروری کوشش قرار دیا گیا۔ جدید جمہوری معاشروں میں زمانہ امن کے دوران انسدادی حراست سے متعلق آئین کے آرٹیکل 10 کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔

وکلاء، محنت کش، صحافی، اساتذہ

پولیو کارکنوں، وکلاء، انسانی حقوق کے محافظوں اور اساتذہ پر حملے سزا کے خوف کے بغیر جاری رہے۔ ان حملوں کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے کیے گئے جن میں حملہ آوروں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کا مطالبہ کیا گیا۔ کسانوں کے حقوق اراضی سے متعلق مطالبات، جو وہ گزشتہ کئی دہائیوں سے کر رہے ہیں، اس سال بھی جاری رہے لیکن پارلیمنٹ میں زرعی اصلاحات پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ زمینوں کی غیر منصفانہ تقسیم اور لینڈ مافیا کی جانب سے زمینوں پر قبضے تھر کے صحرا سے مرید کے تک جاری رہے۔

لاہور میں نرسوں کا احتجاج

یکم جنوری کو کسانوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے نیٹ ورک ''سندھ لینڈ ریفارمز موومنٹ'' (ایس ایل آر ایم) نے بے زمین کسانوں کو زرعی زمین دینے کے لیے عوامی ریلیاں منعقد کیں۔ ان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ 1977ء کے ایکٹ مطابق زرعی اصلاحات کی جائیں۔ وہ صوبائی حکومتیں جنھوں نے گزشتہ سالوں میں اراضی کی غیر مساوی تقسیم کے باوجود سپریم کورٹ سے زرعی اصلاحات سے متعلق موجودہ صورتحال کو برقرار رکھنے کی درخواست کی ان میں پنجاب اور سندھ کی حکومتیں پیش پیش تھیں۔

صحافیوں نے پاکستان میں اردو کے ایک نمایاں خبر رساں چینل جیو نیوز کے صحافی حامد میر پر حملے کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے کیے اور شمعیں روشن کیں۔ انہیں 19 اپریل کو کراچی میں ان کی کار پر حملہ کر کے نشانہ بنایا گیا جس کے دوران انہیں چھ گولیاں لگیں۔ اس حملے کے بعد حامد میر کے بھائی نے حملے کا ذمہ دار پاکستان کی معروف انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کو ٹھہرایا۔ جیو نیوز نے اس وقت کے آئی ایس آئی چیف کی بمع الزامات تصاویر نشر کیں۔ اس کے نتیجے میں وزارت دفاع نے میڈیا کے قومی انضباطی ادارے پر زور دیا کہ جیو کا لائسنس معطل کر دیا جائے۔ اس درخواست پر پاکستان میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) نے جون میں جیو کا لائسنس 15 دن کے لیے منسوخ کر دیا اور اس پر ایک کروڑ روپے جرمانہ عائد کیا۔ تاہم سال کے آخر تک کئی علاقوں میں جیو دستیاب نہیں تھا۔ صحافیوں اور کارکنوں نے جیو کی بندش کو معلومات اور میڈیا کی آزادی کی کھلی

ملک بھر کے صحافیوں نے حامد میر پر قاتلانہ حملے کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے اور شمعیں روشن کیں

خلاف ورزی قرار دیا۔ ستمبر میں صحافیوں، سیاسی جماعتوں کے نمائندوں، اور سول سوسائٹی کے اراکین نے جیو کی غیر قانونی بندش کے خلاف حیدر آباد میں مظاہرہ کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس پابندی کو ''پریس کی آزادی پر حملہ'' قرار دیا۔

9 فروری کو مظفر گڑھ کے علاقے کوٹلہ لغاری سے تعلق رکھنے والے درجنوں کسانوں نے اپنی زمینوں پر کوئلے سے چلنے والے پاور پلانٹ تعمیر کرنے کے حکومتی فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ مظاہرین نے دھرنا دیا اور ٹریفک کو سات گھنٹوں تک روکے رکھا۔ اس علاقے میں پہلے ہی تین پاور پراجیکٹ کام کر رہے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے باعث علاقے کی فضاء میں آلودگی پھیلانے والے کیمیائی اجزاء شامل ہو گئے تھے جس سے وہاں کی ہوا کا معیار خراب ہو چکا تھا۔ کسانوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت ان کی زرعی زمین اور روزگار کو تباہ کرنے کی بجائے بنجر زمین استعمال کرے جو علاقے کے قریب ہی موجود ہے۔ اس منصوبے کے لیے تقریباً سوا ایکڑ نجی اراضی کا انتخاب کیا گیا جبکہ ایک بہت بڑا بنجر علاقہ جو کہ حکومت کی زیر ملکیت تھا، اسے چھوڑ دیا گیا۔

14 فروری کو خواتین اساتذہ نے خود کو صوبے میں جاری پولیو ویکسی نیشن مہم میں جبری طور پر شامل کیے جانے کے خلاف پشاور پریس کلب کے سامنے مظاہرہ کیا۔ آل فیمیل ٹیچرز ایسوسی ایشن نے شیر شاہ سوری

ایچ آر سی پی کے کوآرڈی نیٹر راشد رحمان کے قتل کے خلاف احتجاج

روڈ کو کچھ دیر تک بلاک کیے رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت پولیو کے قطرے پلانے والوں کا تحفظ کرنے میں ناکام ہوچکی تھی۔ حتیٰ کہ پولیو کارکنان کی حفاظت پر مامور سیکیورٹی اہلکار بھی محفوظ نہیں تھے اور وہ ان کا تحفظ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ 2014ء میں پاکستان میں پولیو کے 237 کیس سامنے آئے جو کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ تھے۔ میڈیا کی اطلاعات کے مطابق پاکستان میں دسمبر 2012ء سے لے کر 2014ء کے آخر تک 30 پولیو کارکن جبکہ ان کی حفاظت پر مامور 30 سیکیورٹی اہلکار ہلاک ہوئے۔

ستمبر میں کراچی کے علاقے بوٹ بیسن میں درجنوں اساتذہ نے تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے خلاف نو دن تک احتجاج کیا۔ جون 2012ء میں اس وقت کے وزیر تعلیم نے تقریباً 3500 اساتذہ کی تقرری کی تھی لیکن انہیں دو سال سے تنخواہیں نہیں دی گئی تھیں۔ احتجاج کے نویں دن پی پی پی نے ایک وزیر کو حکومت کی آخری پیشکش کے ساتھ بھیجا جس کے بعد احتجاج تشدد کا رنگ اختیار کر گیا۔ حکومت نے تجویز کیا تھا کہ مقرر کردہ تمام اساتذہ نیشنل ٹیسٹنگ سروس (این ٹی ایس) کا امتحان پاس کریں جس کے بعد 1425 ملازمتیں موجود ہوں گی۔ اس کے بعد اساتذہ دوبارہ درخواست دے سکتے ہیں اور اہلیت کے مطابق ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ تاہم انہوں نے واجبات کا کوئی ذکر نہ کیا جس پر مظاہرین طیش میں آ گئے۔ جب انہوں نے بلاول ہاؤس جانے کی کوشش کی تو پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا اور انہیں منتشر کرنے کے لیے واٹر کینن کا استعمال کیا۔

8 مئی کو دو مسلح افراد نے عدالت میں توہین مذہب کے ایک ملزم کا دفاع کرنے پر ایچ آر سی پی پنجاب کے کو آرڈینیٹر اور انسانی حقوق کے کارکن راشد رحمان کو ملتان میں گولی مار کر قتل کر دیا۔ وکلاء، کارکنوں، صحافیوں اور خاص طور پر سول سوسائٹی نے راشد رحمان کے قتل کے علاوہ ان پر ہونے والے جان لیوا حملے سے پہلے ان کی سیکیورٹی کے لیے حکومت کو لکھے گئے خطوط کا کوئی مناسب جواب نہ ملنے کے خلاف پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ریلیاں نکالیں۔ ان کے قتل سے کچھ روز پہلے ایک وکیل اور چند جنگجوؤں نے انہیں کھلی عدالت میں دھمکیاں دی تھیں۔ حکام کو کئی خطوط لکھنے کے باوجود حملے کو روکنے یا مجرموں کو پکڑنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے تھے۔ ملتان میں ہونے والے مظاہروں کی قیادت انسانی حقوق کی ممتاز کارکن عاصمہ جہانگیر نے کی۔ کراچی میں ہونے والے مظاہرے میں جوائنٹ ایکشن فورم (جے اے ایف)، ایچ آر سی پی اور پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (پائلر) کے اراکین نے حصہ لیا۔

لاہور میں ایڈہاک نرسوں نے اپنی ملازمتوں کی مستقلی کے لیے حکومت اور شعبہ صحت کے خلاف کوپر روڈ پر مظاہرہ کیا۔ احتجاج کے پانچویں دن 15 مارچ کو نرسوں نے اپنا احتجاج درج کرانے کے لیے پنجاب اسمبلی کی جانب مارچ کیا جس پر لیڈی کانسٹیبلز نے ان پر لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ پولیس نے نرسوں پر تشدد کیا جس کے باعث کئی نرسیں زخمی ہوگئیں۔ زخمی ہونے والی نرسوں میں ایک حاملہ نرس بھی شامل تھی جس کی حالت اس حملے کے بعد مزید خراب ہوگئی۔ پولیس نے دس نرسوں کو گرفتار بھی کر لیا اور انہیں ایف آئی آر درج کیے بغیر ریس کورس ویمن پولیس اسٹیشن کے حوالات میں بند کر دیا۔ اس پرتشدد حملے کے بعد لاہور کے تمام ہسپتالوں کی نرسوں نے پولیس تشدد کے خلاف احتجاج کیا۔

سماجی مسائل پر ہونے والے مظاہرے

4 نومبر کو صوبائی دارالحکومت سے چالیس کلومیٹر کی دوری پر واقع ضلع قصور کے شہر کوٹ رادھا کشن میں مقامی دیہاتیوں پر مشتمل ایک ہجوم نے قرآن پاک کی بے حرمتی کے الزام پر ایک مسیحی جوڑے کو تشدد کر کے ہلاک کر دیا اور پھر ان کی نعشوں کو اینٹوں کے بھٹے میں جلا دیا جہاں وہ کام کرتے تھے۔ معاشرے کے تمام حلقوں نے اس بہیمانہ وقوعے کی مذمت کی۔ اس واقعے کے بعد پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کے بارے میں ایک بحث چھڑ گئی۔ وقوعے کے فوراً بعد سول سوسائٹی کے اراکین نے اس بھٹے کا دورہ کیا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے مقتولین کی یاد میں وہاں پھول رکھے اور موم بتیاں جلائیں۔ 9 نومبر بروز اتوار اسلام آباد میں سیکڑوں مسیحی سڑکوں پر نکل آئے اور اس حملے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس موقعے

پیپٹ کا احتجاجی دھرنا

پر عالمی اقلیت اتحاد کے ایک رکن کا کہنا تھا کہ مجرموں کو سزا سے استثنا حاصل تھا جس کے باعث ہجوم کی جانب سے حملے مسلسل جاری تھے۔ 27 نومبر کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران اراکین قومی اسمبلی نے اس واقعے کی مذمت کی اور مجرموں کو عبرتناک سزائیں دینے کا مطالبہ کیا۔ ایم کیو ایم اور پی اے ٹی سمیت مختلف سیاسی جماعتوں نے واقعے کے خلاف مظاہرے کیے اور شمعیں روشن کیں۔

28 اکتوبر کو کوئٹہ میں ہزارہ برادری سے تعلق رکھنے والی ایک سات سالہ بچی کو تشدد کے بعد گلا دبا کر قتل کر دیا گیا اور بعد ازاں اس کی نعش کو اس کے گھر کے قریب کچرے میں پھینک دیا گیا۔ کوئٹہ پولیس کے سربراہ کے مطابق بچی سے زیادتی کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے چھوٹے سے جسم پر تشدد کے نشانات اور اس کی گردن پر رسی کے نشانات یہ ثابت کرتے تھے کہ بچی ایک اذیت ناک موت کا شکار ہوئی تھی۔ پولیس کی ظاہری کاہلی کو دیکھتے ہوئے واقعے کے خلاف 8 نومبر کو آئی جی پولیس بلوچستان کے دفتر کے باہر احتجاج کیا گیا۔ انہوں نے اس جرم کے ذمہ داروں کی گرفتاری میں ناکامی پر پولیس کے خلاف نعرے لگائے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ یہ صورتحال سال کے آخر تک جاری رہی۔ ایسے واقعات کا جاری رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو حکومت ان حملوں کے ذمہ داروں کو حاصل سزا سے استثنا کو ختم کرنے پر آمادہ نہیں یا پھر وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتی۔

مئی میں متحرک بلوچ سٹوڈنٹ لطیف جوہر بلوچ نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جانب سے بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن۔آزاد (بی ایس او۔اے) کے سربراہ زاہد بلوچ کے مبینہ اغوا کے خلاف بھوک ہڑتال

شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز نے خوراک سنٹر پر خوراک کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف احتجاج کیا اور کوہاٹ۔بنوں شاہراہ بلاک کر دی

کی جو 45 دن تک جاری رہی۔ انہوں نے 46 ویں دن اس وقت بھوک ہڑتال ختم کی جب لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے کام کرنے والے دیگر افراد نے اسے بھوک ہڑتال ختم کرنے پر قائل کر لیا۔ جوہر نے کراچی پریس کلب کے باہر کیمپ لگایا ہوا تھا، ان کی صحت آہستہ آہستہ بگڑنے لگی تھی اور ان کا وزن نمایاں طور پر کم ہو گیا تھا۔ وزیر اعلیٰ بلوچستان نے ان سے ملاقات کی اور اغوا کے خلاف ایف آر درج کرانے کا وعدہ کیا۔

14 جون کو فیصل آباد کے نواحی علاقے چک 61 کے مکینوں نے اپنے گاؤں کے دو افراد کے قتل پر کوئی کارروائی نہ کرنے پر پولیس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سڑک کو بلاک کر دیا۔ انہوں نے نعشوں کو سڑک پر رکھ کر لاہور فیصل آباد روڈ کو چھ گھنٹوں تک بلاک کیے رکھا۔ مظاہرین کا یہ دعویٰ تھا کہ چار سے پانچ افراد نے مذکورہ نوجوانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور پولیس کو اطلاع دینے کے باوجود سیکیورٹی فورس کا کوئی بھی اہلکار جائے وقوعہ پر نہ پہنچا اور حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس نے مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا۔ چند مظاہرین نے ہوائی فائرنگ کی لیکن کوئی بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ بعد ازاں علاقے کے ایس ایچ او نے مظاہرین سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ مجرموں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔

30 جنوری کو بائیں بازو کی ایک جماعت عوامی ورکرز پارٹی نے سیکیورٹی فورسز کی جانب سے بلوچستان میں جاری آپریشن کے خلاف لاہور اور اسلام آباد میں مظاہرے کیے۔ پارٹی کے کارکنوں نے فرنٹیئر کور بلوچستان کے خلاف نعرے لگائے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ان آپریشنوں میں شفافیت اور کھلے پن کا فقدان تھا۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ حراست میں لیے گئے افراد کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلایا جائے تاکہ

بے گناہ شہری نشانہ نہ بنیں۔ مظاہرین نے بلوچستان کے علاقے توتک میں اجتماعی قبریں ملنے کے واقعے کی تحقیقات کا بھی مطالبہ کیا۔

5 مارچ کو سوات کے علاقہ منگورہ میں لاپتہ افراد کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کی بحفاظت بازیابی کا مطالبہ کیا جو کہ چار سالوں سے لاپتہ تھے۔ انہوں نے لاپتہ رشتے داروں کی تصاویر اور شناختی کارڈ ہاتھوں میں لیے کانجو سے سیدو شریف تک مارچ کیا۔ بعد ازاں جب پولیس نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ ان کے خدشات متعلقہ حلقوں تک پہنچا دیئے جائیں گے تو انہوں نے احتجاج ختم کر دیا۔

ستمبر میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن (پلر) اور پاکستان دلت یکجہتی نیٹ ورک (پی ایس ڈی این) نے ہندو برادری کے ساتھ مختلف طریقوں سے امتیاز برتنے کے خلاف کراچی پریس کلب کے باہر احتجاج کیا۔ اسی ماہ کے شروع میں عمرکوٹ میں دو ہندو دوکانداروں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اغوا برائے تاوان اور جبری تبدیلی مذہب کے واقعات بلا روک ٹوک جاری تھے اور ان جرائم کا ارتکاب بلا خوف و خطر کیا گیا۔ ان واقعات کے باعث ہندو برادری، بالخصوص وہ جو سندھ میں رہتی ہے، خود کو پہلے سے زیادہ غیر محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔ پاکستان کی مذہبی اقلیتیں سیاسی نمائندگی اور اثر و رسوخ نہ رکھنے کے باعث اکثر تشدد اور جنسی تشدد کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔

15 اگست کو آپریشن ضرب عضب کے نتیجے میں شمالی وزیرستان سے بے دخل ہونے والے درجنوں خاندانوں نے پشاور پریس کلب کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ انہیں پھر سے اپنے علاقوں میں آباد کیا جائے اور آپریشن کو بند کیا جائے جس کی وجہ سے وہ بے گھر ہوئے تھے۔ اس آپریشن کے نتیجے میں بے دخل ہونے والے زیادہ تر افراد نے موسم گرما کی تعطیلات کے دوران بنوں کے سکولوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ تاہم جب اگست میں سکول کھلنے کا وقت آیا تو انہیں سکول کی عمارتیں خالی کرنے کو کہا گیا۔ انہیں اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت بھی نہ دی گئی حالانکہ سکیورٹی فورسز کا یہ دعویٰ تھا کہ انہوں نے ان کے رہائشی علاقوں، مثال کے طور پر میر علی، میران شاہ اور دیگر تحصیلوں سے دہشت گردوں کا صفایا کر دیا تھا۔

ستمبر میں بلوچستان کے ضلع پنجگور، خاران، گوادر، کیچ، وڈھ، اور دیگر اضلاع میں ہڑتال کے باعث کاروباری اور تجارتی سرگرمیاں رک گئیں۔ ضلع پنجگور، خضدار، کیچ اور آواران میں نعشوں کی برآمدگی کے خلاف ہونے والی اس ہڑتال کا اعلان بلوچ ورنا موومنٹ اور بلوچ قوم پرست تنظیموں پر مشتمل ایک سیاسی اتحاد بلوچ نیشنل فرنٹ (بی این ایف) کی جانب سے کیا گیا تھا۔ قوم پرست جماعتوں کے مختلف کارکنوں کا یہ

دعویٰ تھا کہ تین افراد کو اغوا کیا گیا اور بعد ازاں انہیں غیر قانونی حراست کے دوران ہلاک کر دیا گیا۔ 26 ستمبر کو پنجگور میں ایک دریا کے قریب ٹاٹ کی دو بوریوں میں تقریباً ایک سال پرانی انسانی باقیات برآمد ہوئیں۔ ان باقیات کو ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے لاہور اور کراچی بھیجا گیا تاہم قوم پرست تنظیموں کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ باقیات لاپتا افراد کی تھیں۔ بعد ازاں 29 ستمبر کو مسخ شدہ نعشوں کی برآمدگی کے نئے سلسلے کے خلاف چاغی، نوشکی، خاران، آواران، بولان اور حب وغیرہ میں ہڑتالیں اور مظاہرے کیے گئے۔

20 جون کو بلوچستان کے ضلع پنجگور میں ہزاروں افراد، جن میں خواتین اور بچوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی، نے نجی سکولوں کی مسلسل پانچ دن تک بندش کے خلاف سڑکوں پر مظاہرے کیے۔ مظاہرین نے پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نجی سکولوں کو بہتر سیکیورٹی فراہم کی جائے۔ اس احتجاج اور مظاہرے کا سبب تنظیم الاسلام الفرقان (ٹی آئی ایف) کی جانب سے جاری ہونے والی دھمکی تھی جس میں اس نے تنبیہ کی تھی کہ مخلوط اور مغربی طرز کے تعلیمی اداروں کو فوری طور پر بند کر دیا جائے۔

سفارشات

☆ حکومت کو چاہیے کہ وہ پرامن اجتماع میں شامل افراد کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے علاوہ انہیں تحفظ بھی فراہم کرے جو حقیقی جمہوریت کی نشانی ہے۔

☆ پولیس کو ہجوم پر قابو پانے کے ایسے جدید طریق کار کی تربیت فراہم کی جانی چاہیے جس سے پولیس کے علاوہ مظاہرین کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جا سکے۔

☆ لوگوں کے پرامن اجتماع کے حق کو دبانے کے لیے ضابطہ فوجداری کے سیکشن 144 اور مینٹیننس آف پبلک آرڈر (ایم پی او)، 1960ء کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ گرفتاری اور حراست سے متعلق قانون پر نظرثانی کی جانی چاہیے کیونکہ انسدادی حراست کی جدید جمہوری معاشروں میں کوئی جگہ نہیں۔

☆ حکومت کے شکایت کے طریق کار کو بہتر بنایا جائے تاکہ شہریوں کی شکایات کا بروقت ازالہ کیا جا سکے۔

انجمن سازی کی آزادی

ہرشہری کوتنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ اس سلسلے میں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، ملک کی سالمیت، امن عامہ یا اخلاق کے مفاد میں قانون کے تحت کوئی معقول پابندی عائد نہ کی گئی ہو۔ آئین پاکستان [آرٹیکل- 17]

ہرشخص کو پرامن اجتماع کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی ہے۔ کسی شخص کو کسی تنظیم میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 20-2,1]

اپنے عقیدے، صنف، پیشے اور سیاسی وابستگی کے باعث کمزور ترین طبقات کے لیے پُرامن انجمن سازی کے عمل میں شریک ہونے کی آزادی کافی حد تک محدود ہے۔ ٹریڈ یونینوں اور غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) جیسے گروپوں کو غیر ضروری ریاستی مداخلت کا شکار ہونا پڑتا ہے جبکہ دوسرے گروپوں کو غیر ریاستی اداکاروں کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اس طرح پرامن انجمن سازی کا حق استعمال کرنے سے انہیں روک دیا جاتا ہے۔ براہ راست تشدد یا پھر معاشرے میں موجود پدری روّیوں اور سماجی قواعد وضوابط کے ذریعے انجمن سازی کے عمل میں ان طبقات کی شرکت کو ناممکن بنایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ریاست کے فرائض میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ریاست کا یہ فرض ہے کہ ان طبقات کے حقوق کا تحفظ کرے اور مؤثر طور پر غیر ریاستی اداکاروں کو ان کی غیر قانونی اور ناپسندیدہ سرگرمیوں سے باز رکھے۔

2014ء کے دوران سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور رہنماؤں کے خلاف تشدد کی کارروائیوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ صوبہ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں 2014ء کے دوران 134 فعال سیاسی کارکن قتل کیے گئے۔ کراچی میں ہونے والے آپریشن کے حوالے سے سندھ رینجرز کی جو رپورٹ اگست 2014ء میں شائع ہوئی تھی، اس میں بتایا گیا تھا کہ ستمبر 2013ء سے جولائی 2014ء تک کے عرصے میں

178 دہشت گرد ہلاک اور 2787 دہشت گرد گرفتار کیے گئے۔ سیاسی اجتماعات خصوصاً ایسی جماعتوں جو اپنے آزادانہ یا ترقی پسند ایجنڈے کے حوالے سے پہچان رکھتی ہیں، کے اجتماعات کو اپنے لیے خطرناک گردانتے ہوئے دہشت گرد تنظیموں نے انہیں اپنی ہٹ لسٹ پر رکھا۔

ورکروں اور مزدوروں کو ٹریڈ یونینیں قائم کرنے یا پہلے سے موجود ان ٹریڈ یونینوں میں شامل ہونے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جو سودے کاری کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ صنعتی تعلقات کے ایکٹ جس کے ذریعے یونینوں کو باضابطہ بتایا جاتا ہے، کے مطابق مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو مزدور کی تعریف سے ہی باہر کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ تمام مزدوروں کو ایسوسی ایشن قائم کرنے کے حق کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ تمام افراد کو تمام سطحوں پر ایسوسی ایشن بنانے کا حق دے لیکن حکومت نے گھریلو مزدور، اپنے لیے خود کام کرنے والے محنت کشوں اور زرعی محنت کشوں کو مزدور کی تعریف ہی سے باہر کر دیا ہے۔

انجمن سازی کی آزادی کے حوالے سے سول سوسائٹی کے حق کو محدود کرنے کے لیے ریاست کی توجیہہ اور منطق وہی رہی جو گزشتہ برسوں کے دوران تھی، حکام، خصوصاً سکیورٹی فورسز کا نکتہ نظر یہ تھا کہ انجمن سازی قومی سلامتی اور امن وامان کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ ''ریاست کی سالمیت'' اور ''قومی مفاد'' جیسی اصطلاحات انجمن سازی کے حق کو محدود کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ریگولیشن آف فارن کنٹری بیوشن بل 2013ء کے نفاذ کے ذریعے حکومت نے الزام لگایا کہ غیر سرکاری اداروں میں جوابدہی کا فقدان ہے چنانچہ ان غیر سرکاری اداروں کی وسائل خصوصاً غیر ملکی امداد تک رسائی کو محدود تر کر دیا گیا۔

اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی کے لیے اقوام متحدہ کے خصوصی روئداد نویس جو انسانی حقوق کے 28 آزاد ماہرین میں ایک ہیں، نے 2010ء، 2012، اور 2013ء میں پاکستان کا دورہ کرنے کی درخواستیں کیں لیکن ان کی کسی بھی درخواست کو پذیرائی نہ مل سکی۔ روئداد نویس نے 2010ء 2012ء اور 2013ء میں ملنے والے مشترکہ الزام پر مشتمل ان چار خطوط سے متعلق حکومت کو لکھا۔ حکومت نے فاٹا کی خیبر ایجنسی میں ایچ آر سی پی کے کوآرڈی نیٹر مسٹر زرطیف آفریدی کے مبینہ قتل سے متعلق روئداد نویس کے خط کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ جہاں تک باقی چھ مراسلوں کا تعلق ہے ان کے حوالے سے ریکارڈ پر یہ بات ہے کہ ان کی موصولی کا اعتراف تو کیا گیا لیکن ان مراسلوں میں جو نکات اٹھائے گئے تھے ان کے تفصیلی جوابات بھیجنے میں حکومت ناکام رہی۔

ٹریڈ یونینوں پر پابندیاں:

ٹریڈ یونینیں ایک عرصہ سے پاکستان کے تمام محنت کش مردوں اور عورتوں کے لیے بنیادی انسانی اور لیبر حقوق کا مطالبہ کرتی چلی آ رہی ہیں۔اس مطالبے کے نتیجے میں ٹریڈ یونین رہنماؤں اور ان کے ارکان پر حملے کیے گئے اور انہیں جیلوں کی ہوا کھانا پڑی۔نہ صرف یہ کہ ٹریڈ یونینوں سے وابستہ افراد پر جسمانی تشدد کیا گیا بلکہ انہیں قید کی طویل سزائیں دی گئیں۔اس کے علاوہ لیبر یونینوں کے قیام اور ان کے فرائض کی ادائیگی پر خفیہ طور پر پابندیاں لگادی گئیں۔محنت کشوں کی انجمن سازی کے حق کے حوالے سے پاکستان کی بین الاقوامی ذمہ داری کی یہ صریحاً خلاف ورزی اور وعدہ خلافی ہے۔

2010ء میں 18ویں آئینی ترمیم اور متفقہ فہرست (کنکرنٹ لسٹ) کے خاتمہ کے بعد وزارت محنت کو صوبوں کے حوالے کر دیا گیا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ محنت کشوں کی فلاح و بہبود، تلافی کی رقم کی ادائیگی، ہیلتھ انشورنس، پنشن اور ٹریڈ یونینوں سے متعلق امور صوبوں کو منتقل ہو گئے لیکن اس منتقلی کے باوجود محنت کشوں کو حقوق مہیا کرنے کی وہ ذمہ داری وفاقی حکومت کے پاس ہی رہی جس کی ضمانت وفاقی حکومت نے عالمی ادارے کو دے رکھی ہے۔عالمی سطح پر یہ ذمہ داری وفاقی حکومت کے ساتھ ہی جُڑی ہوئی ہے۔ اختیارات کی صوبوں کو تقسیم کے نتیجے میں ٹریڈ یونینوں کے قیام اور آجروں اور اجیروں کے درمیان تعلقات کو باضابطہ بنانے سے متعلق قانون انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ ہر صوبے میں نافذ کیا گیا۔یہ قانون خیبر پختونخوا میں 2010ء، پنجاب میں 2010ء، سندھ میں 2013ء، بلوچستان میں 2011ء اور وفاقی دارالحکومت میں 2012ء میں نافذ کیا گیا۔یہ قانون بنیادی طرپر مزدوروں کی انجمن سازی کی آزادی کی ضمانت سے متعلق اور بین الاقوامی معیار کے مطابق ہے۔اس کا اطلاق فاٹا میں نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ یہ قانون قبائلی علاقوں میں محنت کشوں کو سودے کاری کے حق سے محروم رکھتا ہے۔کام والی جگہ پر تحفظ کے فقدان اور لیبر قوانین کی صریحاً خلاف ورزی کی جاتی ہے۔خصوصاً فاٹا میں کانوں میں کام کرنے والے محنت کش تو اس حق سے قطعی طور پر محروم رکھے گئے ہیں۔بہرحال ملک کے باقی حصوں میں محنت کشوں کو تحفظ دینے والے قوانین فاٹا میں کام کرنے والے محنت کشوں پر لاگو نہیں ہوتے۔مزید برآں پولیس، مسلح افواج، پی آئی اے کا سکیورٹی سٹاف، سرکاری ہسپتال کا عملہ، سرکاری تعلیمی اداروں کے ملازمین، اپنے لیے کام کرنے والے محنت کش، گھروں میں کام کرنے والے محنت کش اور کھیت مزدور ٹریڈ یونین بنانے کے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ٹریڈ یونینوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں جو ان پر متحرک ہونے اور محنت کشوں کو آزادانہ طور پر یونین میں

آل پاکستان ہائیڈرو الیکٹرک سنٹرل لیبر یونین کے اراکین نجکاری کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

شامل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ قانون کے مطابق کسی ایک ادارے میں محنت کش ایک سے زائد یونینوں کا رکن نہیں بن سکتا۔ رجسٹریشن کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ ادارے کے 75 فیصد ملازمین متعلقہ ٹریڈ یونین کی رکنیت رکھتے ہوں۔ یونین کے تمام ارکان اسی کارخانہ یا ادارے میں کام کرتے ہوں یا اس کے ملازم ہوں۔ اگر کسی ادارے میں دو یا دو سے زیادہ یونینیں موجود ہوں، تو پھر ہر یونین کے لیے لازم ہے کہ ملازمین کی ایک چوتھائی تعداد اس کی رکن ہو۔

ایک بل ڈومیسٹک ورکرز (ایمپلائمنٹ رائٹس) بل 2013ء کو جنوری 2014ء میں سینیٹ میں پیش کیا گیا۔ سینیٹ نے یہ بل نظر ثانی کے لیے قانون اور انصاف سے متعلق قائمہ کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ یہ بل صرف وفاقی علاقے کے لیے تھا لیکن جب یہ منظور ہو گیا تو یہ باقی صوبوں کے لیے قانونی نظیر بن گیا۔ اس بل کے تحت گھریلو ملازمین کو مزدور تسلیم کرتے ہوئے یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ اپنی یونینوں کو صنعتی تعلقات کے آرڈر کے تحت رجسٹر کروائیں۔ ایک تخمینہ کے مطابق پاکستان بھر میں غیر رسمی گھریلو ملازمین کی تعداد 85 لاکھ ہے۔ بہر حال ملک نے انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے رسمی معاہدہ نمبر 189 کی توثیق ابھی کرنی ہے جو گھریلو محنت کشوں کے تحفظ سے متعلق ہے۔

فیصل آباد کی لیبر قومی موومنٹ (ایل کیو ایم) سے منسلک چھ پاور لوم ورکرز، جن میں سے ہر ایک کو ننانوے ننانوے سال قید کی سزا ہوئی تھی، سال 2014ء کے دوران جیل میں قید کاٹتے رہے۔ ان چھ محنت کشوں پر اُن چار بھائیوں کو قتل کرنے کی کوشش کا الزام تھا جو اس پاور لوم فیکٹری کے مالک تھے جن میں یہ چھ محنت کش مزدوری کرتے تھے۔ 2011ء میں تنخواہوں میں 17 فیصد اضافے سے متعلق حکومتی اعلان کے بعد اس پاور لوم کے مزدروں کو یہ اضافہ نہ دیا گیا جس پر محنت کشوں نے احتجاجی مظاہرہ کیا جس کے دوران چاروں مالکان کو مظاہرین نے بُری طرح زدوکوب کیا۔ ایل کیو ایم کے چودہ رہنماؤں اور 150 نامعلوم افراد کے خلاف وقوعہ سے تین روز بعد ایف آئی آر درج کرائی گئی۔ ابتدائی رپورٹ میں بندوق کے فائر کا ذکر نہیں کیا گیا تھا لیکن واقعہ کے تین ماہ بعد یہ الزام ایف آئی آر میں شامل کرلیا گیا۔ انسداد دہشت گردی کی عدالت نے اے ٹی اے (اینٹی ٹیررسٹ ایکٹ) کی دفعہ 7 کے تحت چھ افراد کو مشترکہ طور پر 594 سال کی سزائے قید سنائی۔ ایل کیو ایم کی نئی قیادت نے لاہور ہائی کورٹ میں ان افراد کی ضمانت کے لیے اپیل کی۔ 2014ء کے اختتام تک ان کی ضمانتیں نہیں ہوسکی تھیں۔ اس غیر معمولی اور تکلیف دہ سزا کے بارے میں مزدور رہنماؤں نے کہا کہ اس سزا کا مقصد محنت کشوں کو ذلیل کرنا اور دوسری ٹریڈ یونینوں کو اپنے حقوق کے حوالے سے ان کے حوصلوں کو پست کرنا ہے۔

سیاسی وابستگیوں کے باعث نشانہ بنایا گیا:

سال بھر کے دوران سیاسی وابستگیوں کے باعث افراد کو نشانہ بنانے کے واقعات تسلسل کے ساتھ پیش آتے رہے۔ کراچی میں تو اس قسم کا تشدد بہت ہی عام رہا۔ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں سال بھر کے دوران 134 فعال سیاسی کارکن قتل کر دیئے گئے۔ کانفلکٹ / وائلنس رپورٹ 2014ء (آویزش / تشدد سے متعلق رپورٹ 2014ء) جسے اسلام آباد کے سنٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز (سی آر ایس ایس) نے شائع کیا میں کہا گیا ہے کہ 2014ء میں 186 سیاست دانوں اور پارٹی کارکنوں کے علاوہ مذہبی تنظیموں سے وابستہ 52 افراد قتل ہوئے۔ ان حملوں کا سب سے زیادہ شکار عوامی نیشنل پارٹی ہوئی جس پر 16 حملے کیے گئے۔ اس کے بعد پاکستان مسلم لیگ نواز کا نمبر آتا ہے جس پر چھ حملے ہوئے۔ یہ اعداد و شمار پاکستان سکیورٹی رپورٹ میں شائع ہوئے ہیں۔ رپورٹ پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (پی آئی پی ایس) نے مرتب کرکے شائع کی۔

اورنگی ٹاؤن کراچی میں ڈسٹرکٹ ویسٹ کے اے این پی کے صدر ڈاکٹر ضیاالدین کو نامعلوم حملہ آوروں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ پچاس سالہ ڈاکٹر ضیاالدین عشاء کی نماز ادا کر کے مسجد سے واپس گھر آ

اے این پی اور این وائی او کے کارکن اپنے رہنما اور کراچی ویسٹ کے صدر ڈاکٹر ضیاالدین کی ٹارگٹ کلنگ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

رہے تھے جب موٹر سائیکل سوار نامعلوم حملہ آوروں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ستمبر 2013ء میں بھی ان کے گھر کے باہر بم نصب کیا گیا تھا جس کو بم ڈسپوزل سکواڈ نے بروقت ناکارہ بنا دیا تھا۔ طالبان نے انہیں بار بار دھمکیاں دی تھیں اور ان سے دس لاکھ روپے کی رقم کا بطور بھتہ مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر ضیاالدین کو اے این پی چھوڑ دینے کا بھی کہا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو نتائج کی ذمہ داری خود ان پر ہوگی۔ ایسی سنجیدہ قسم کی دھمکیوں کے باوجود انہیں اضافی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو تحفظ فراہم کرے خاص طور پر ایسے لوگوں کو جو موت کی دھمکیوں کے باوجود جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لیے اپنا سیاسی عمل جاری رکھتے ہیں۔ 28 اگست کو کراچی میں غیر اعلانیہ چھاپوں کے دوران چار سیاسی جماعتوں کے 150 رہنماؤں کو حراست میں لے لیا گیا۔ حراست میں لیے جانے والے رہنماؤں کا تعلق عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی)، متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم)، پاکستان سنی تحریک (پی ایس ٹی)، پیپلز امن کمیٹی (پی اے سی) اور کچھی برادری کی نمائندہ تنظیم کراچی رابطہ کمیٹی سے تھا۔ یہ اطلاعات بھی تھیں کہ جب قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں بعض پارٹی کارکنوں کو گرفتار نہ کر سکیں تو انہوں نے ان کے گھر کے افراد کو حراست میں لے لیا، گرفتار کیے جانے والے کچھ سیاسی کارکن بزرگ شہری تھے۔ ان میں اے این پی کے بابا ظاہر شاہ بھی تھے جن کی عمر ستّر برس تھی۔ پولیس حکام نے کہا کہ چھاپے جرائم پیشہ عناصر کے خلاف مارے گئے تھے۔ گرفتار کیے جانے والے افراد کی فہرست چھاپوں کے ساتھ ساتھ تیار کی جاتی رہی اور اس فہرست میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے حالیہ انتخابات میں منتخب ہونے والے ارکان اور جانے پہچانے پارٹی کارکنان بھی شامل تھے۔

جے یو آئی۔ایف کے رہنماڈاکٹر خالد محمود کے خلاف احتجاج

کراچی رینجرز نے متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیوایم) کے تنظیم نو سے متعلق 24 ستمبر کے اجلاس پر چھاپہ مارا جو تنظیم کے دفتر واقع ابوالحسن اصفہانی روڈ پر ہو رہا تھا۔رینجرز نے متعدد پارٹی کارکنوں کو گرفتار کرنے کے بعد انہیں کسی نامعلوم جگہ پر منتقل کر دیا۔رینجرز کے پاس گرفتاری کے وارنٹ نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے ان چھاپوں اور گرفتاریوں کے بارے میں کوئی توجیح پیش کی۔سندھ اسمبلی کے ایک رکن اور ایم کیوایم کے پارٹی ورکر کو دفتر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ایم کیوایم کی رابطہ کمیٹی نے اس اقدام کو غیر قانونی اور بلاسبب قرار دیا۔نومبر کے ایک ہفتے کے دوران کراچی کے لیاری کے علاقے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چھ ارکان کو دو سابقہ کونسلروں سمیت گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں ہلاک کر دیا گیا۔16 دسمبر کو اسلام آباد میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ایک کارکن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ابتدائی تفتیش سے معلوم ہوا کہ کچھ افراد نے مرحوم کی کار کو روکا اور اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔پوسٹ مارٹم کے دوران اس کے جسم میں سے بارہ سے تیرہ گولیاں نکالی گئیں۔

18 دسمبر کو چنیوٹ میں ایم کیوایم کے ضلعی نائب صدر سید اصغر عباس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ نامعلوم حملہ آور موٹر سائیکل پر سوار تھے جبکہ مرحوم اصغر عباس اپنے گھر سے مارکیٹ جا رہے تھے۔

دسمبر کے دوران کراچی کے علاقے پیرآباد پولیس اسٹیشن کی حدود میں پی ٹی آئی کا ایک کارکن نذیر اللہ پیرآباد کے تھانے میں پولیس تشدد کے باعث جاں بحق ہو گیا۔ پولیس نے یہ کہہ کر تشدد کی تردید کی کہ نذیر اللہ کراچی کے اورنگی ٹاؤن میں سڑک کے کنارے بے ہوش پایا گیا تھا جسے پولیس نے ہسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹروں نے اسے مردہ قرار دے دیا۔ پی ٹی آئی کے کارکنوں اور رہنماؤں نے اس کے خلاف کراچی پریس کلب کے باہر زبردست احتجاج کیا اور ریڈزون کی طرف جانے کی کوشش پر مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا گیا۔

جمعیت العلمائے اسلام ایف کے سندھ کے سیکرٹری جنرل اور 2006ء سے 2012ء کے دوران سینیٹر بننے والے خالد محمود سومرو کو 29 نومبر کو سکھر میں نامعلوم حملہ آوروں نے ایک مسجد کے باہر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ بنیادی طور پر خالد محمود سومرو کا تعلق لاڑکانہ سے تھا لیکن وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے سکھر آئے ہوئے تھے۔ جے یو آئی ایف کے اس رہنما پر پہلے بھی چھ مرتبہ حملے ہو چکے ہیں۔

جمعیت العلمائے اسلام (ف) کے ایک رہنما مولانا مالک زر کو 22 دسمبر کو اورنگی کالونی کراچی میں گولی مار کر شدید زخمی کر دیا گیا۔ ان پر چار بار گولیاں برسائی گئیں۔ انہیں تشویشناک حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ جمعیت کے اس رہنما پر گزشتہ چند برسوں کے دوران اس قسم کے کئی حملے ہو چکے تھے ان میں وہ دو حملے بھی شامل ہیں جو پارٹی کے سربراہ پر ہوئے تھے۔

طلباء کی یونینیں

جنرل ضیاالحق نے مارشل لا آرڈر کے تحت 1984ء میں طلبہ یونینوں پر جو پابندی لگائی تھی، وہ پابندی اب اپنی موزونیت کھو چکی تھی اس لیے کہ یونیورسٹیاں طلبہ کی قوت کو مؤثر طور پر استعمال کرنے میں بُری طرح ناکام ہو چکی تھیں اور نہ ہی ان کی تجدید کر پائی تھیں۔ اگرچہ وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو نے 1988ء میں پابندی اٹھا لی تھی لیکن بعدازاں سپریم کورٹ کے فیصلوں نے سٹوڈنٹس یونینوں کی کارکردگی کا دائرہ بہت ہی محدود کر دیا تھا۔ بڑے طریقے کے ساتھ سیاسی عمل میں طلبہ کی شرکت کی حوصلہ شکنی کی گئی جبکہ صرف ''قابل قبول'' طلبہ گروپوں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہ اجازت بھی 1993ء کے بعد دی گئی۔ طلبہ یونینوں پر پابندیوں اور انہیں محدود کرنے کے باعث تعلیمی اداروں میں تشدد کو ہوا ملی اور یونیورسٹیوں کے انتظامی امور میں مداخلت اور سیاسی طور پر اکھاڑ پچھاڑ معمول کا حصہ بن گئی۔

29 مارچ 2008ء کو وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے طلبہ یونینوں کی بحالی کا اعلان کیا اور ان کے اس فیصلے کی حمایت پارلیمنٹ نے کی۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ موجود رہا کہ کیا حکومت تکمیل پذیر

جمہوری ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور کیا وہ پاکستان کے نوجوانوں کو درپیش مسائل اور معاملات کو طے کر پائے گی؟ اس کے علاوہ کیمپس میں بعض سیاسی جماعتوں کے سٹوڈنٹس ونگز کے ارکان کی طرف سے کیے جانے والے تشدد اور ڈرانے دھمکانے کے مختلف واقعات نے اس تصور کو تقویت دی کہ جن معاملات کے باعث پابندی عائد کی گئی تھی، ان پر توجہ نہیں دی گئی تھی۔ گزشتہ برسوں کے دوران ایسی رپورٹیں بھی ملتی رہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے ہوسٹلوں سے کثیر القومی دہشت گرد گروپ القاعدہ کے ارکان گرفتار کیے گئے تھے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے بتایا تھا کہ جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ نے ان لوگوں کو پناہ دے رکھی تھی۔

سال بھر کے دوران اساتذہ پر طلبہ کے تشدد اور کیمپسوں میں غنڈہ گردی میں ملوث ہونے کی خبریں شائع ہوتی رہیں۔ ان خبروں کے مطابق 19 مارچ کو اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان جنہیں کچھ روز قبل یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا، نے پنجاب یونیورسٹی میں ہونے والے کھیلوں کو درہم برہم کر دیا اور توڑ پھوڑ کی۔ اس سے قبل یونین کے ارکان نے کالج کے پرنسپل کو ایک دھمکی آمیز خط بھیجا تھا جس میں پرنسپل سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ کھیلوں کے مقابلے روک دیئے جائیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے پندرہ ارکان زبردستی کالج کے احاطے میں گھس گئے، وہاں سینئر اساتذہ کے ساتھ بدتمیزی کی، طلبہ سے ان کے ہینڈ بیگ اور موبائل فون چھین لیے۔ اس کے علاوہ ایک سینئر استاد کی گاڑی کو توڑ پھوڑ دیا۔ جب پنجاب کے وزیر تعلیم کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے وہاں پولیس کا دستہ بھجوایا تا کہ وہ کیمپس میں پیدا کی جانے والی افراتفری پر قابو پائے۔ جونہی پولیس پہنچی، یہ شر پسند گروپ غائب ہو گیا اور اس واقعہ کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں کیا گیا۔

اسی طرح 16 نومبر کو پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان نے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کی کار پر حملہ کر دیا۔ جمعیت طلبہ نے اس استاد کو ایک روز قبل دھمکی دی تھی۔ لاء کالج کے اساتذہ نے شکایت کی تھی کہ سٹوڈنٹس یونین کے ان ارکان کے خلاف مقدمات درج کروائے گئے تھے کہ انہوں نے یکم ستمبر کو یونیورسٹی کے ہال کونسل کے چیئر مین پر فائرنگ اور 17 اکتوبر کو ایک لیکچرار کی کار پر فائرنگ کی تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان نے 11 نومبر کو ایک اور اسسٹنٹ پروفیسر کے گھر پر حملہ بھی کیا تھا۔ ان واقعات کے ذمہ داروں کے خلاف نہ تو مقدمے درج کیے گئے اور نہ ہی انہیں گرفتار کیا گیا جس کے باعث ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ کسی بھی تنظیم سے منسلک ہو کر جرائم کرنے والے ایسے عناصر کے خلاف سخت ترین قانونی کارروائی ہونی چاہیے لیکن ایسے عناصر کی سزا متعلقہ ایسوسی ایشن کو نہیں ملنی چاہیے۔

کیمپس میں ہونے والے تشدد کے واقعات کو تمام طلبہ تنظیموں پر پابندی کی بنیاد نہیں بنایا جانا چاہیے۔

غیر سرکاری تنظیموں، انسانی حقوق کے حامیوں اور صحافیوں پر حملے:

مسلسل تیسرے برس بھی 2014ء کے دوران پاکستان صحافیوں کے لیے انتہائی خطرناک ملک قرار دیا گیا۔ صحافیوں کی بین الاقوامی تنظیم انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس (آئی ایف جے) جس کا صدر دفتر بیلجیم میں ہے، نے جو رپورٹ شائع کی اس میں پاکستان کو صحافیوں کے لیے انتہائی خطرناک ملک قرار دیا گیا ہے۔ فاٹا اور بلوچستان کے شورش زدہ اضلاع (جیسے خضدار وغیرہ) میں صحافیوں کے لیے خطرات دوسرے علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ ان علاقوں میں صحافیوں کو نشانہ محض اس وجہ سے بنایا گیا کہ ان کا تعلق صحافت سے تھا چاہے وہ پریس کلبوں سے متعلق تھے یا اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے 2014ء کے دوران پاکستان کے 48 ایسے اضلاع کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں جو تشدد کے واقعات کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایچ آر سی پی کے مطابق 2014ء کے دوران صحافیوں اور انسانی حقوق کے حامیوں پر 19 حملے ہوئے۔ غیر سرکاری تنظیمیں اور ان میں کام کرنے والے عملے کے ارکان پر انتہا پسندوں نے کئی حملے کیے اور انہیں نقصان پہنچایا گیا۔ ان پر یہی الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ مغربی ایجنڈے کو فروغ دے رہے تھے۔ وہ کیا کرتے تھے اور کیا نہیں کرتے تھے، اس کا خیال نہیں کیا گیا۔ ان پر حملے صرف اس لیے کئے گئے کہ وہ غیر سرکاری تنظیموں کے لیے کام کرتے تھے۔ 15 ستمبر کو قدرتی آفات اور انسان کے ہاتھوں آنے والی تباہی سے متاثرہ افراد کی بحالی کے منصوبے پر کام کرنے والی ایک عالمی تنظیم کے دو ارکان پر نامعلوم افراد نے حملہ کیا۔ حملے کے وقت یہ دونوں گلگت بلتستان کے غذر ضلع کی سوسُوت /پنگل چراگاہ میں ایک سروے کر رہے تھے۔ یہ دونوں افراد ایک گلیشیئر پر آنے والی تباہی کے اسباب پر تحقیقات کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کے دو سپاہی بھی تھے کہ اچانک چار مسلح نقاب پوشوں نے ان پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ جب پولیس والوں نے جوابی فائرنگ کی تو وہ چاروں حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔

2013ء میں پارلیمنٹ میں حزب اختلاف نے این جی اوز اور آئی این جی اوز کو ملنے والی امدادی رقوم کو باقاعدہ بنانے کا فیصلہ کیا جس کے مطابق ان اداروں کو ملنے والی امداد کی جانچ پڑتال ضروری ہوگی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر ان تنظیموں کی سرگرمیاں قومی مفاد کے منافی پائی گئیں تو ان کی رجسٹریشن منسوخ کر دی جائے گی۔ اس ریگولیشن بل جو ریگولیشن آف فارن کنٹری بیوشن بل 2013ء کہلاتا تھا، کو این جی اوز کی کارکردگی میں

ریاست کی طرف سے خواہ مخواہ کی دخل اندازی قرار دیا گیا۔ اس بل کے تحت این جی اوز اور وفاقی حکومت کے اکنامک افیئرز ڈویژن (ای اے ڈی) کے درمیان نیا (ایم او یو) معاہدہ ہونا ضروری قرار دے دیا گیا۔ کام کرنے والی تمام این جی اوز اور آئی این جی اوز کے لیے ایم او یو کی تصدیق اور توثیق کے لیے تمام درخواستیں وزارت داخلہ، متعلقہ صوبائی حکومت اور دلچسپی رکھنے والے متعلقہ اداروں کی طرف سے ہونے والی جانچ پڑتال کے بعد منظور کی جائیں گی۔

بل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملنے والی غیر ملکی امداد کو خفیہ رکھنے کی صورت میں متعلقہ این جی او کے سربراہ کو ایک سال قید کی سزا ہو گی۔ مزید برآں حکومت این جی او کے ریکارڈ اور اکاؤنٹس کی جانچ پڑتال کے لیے ایک افسر مقرر کر سکتی ہے تاکہ شفافیت کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس بل کے تحت آئی این جی اوز اور این جی اوز کے لیے شرائط عائد کر دی گئی ہیں کہ وہ بیرونی امداد کو وفاقی حکومت کی شرائط اور ہدایات کے مطابق استعمال کریں گی اور حکومت دیکھے گی کہ متعلقہ این جی اوز یا آئی این جی اوز ان مقاصد کے لیے اور ان مقامات پر کام کر رہی ہیں یا نہیں جن کی وفاقی حکومت نے منظوری دے رکھی ہے۔ چند شقیں خاص طور پر تکلیف دہ ہیں۔ اس کی وجہ ان شقوں میں استعمال کی گئی مبہم اصطلاحات ہیں۔ مثال کے طور پر یہ فقرہ کہ ''...... بغاوت کے پراپیگنڈے میں ملوث نہیں ہوں گی'' اور ...... ملنے والی امدادی رقوم ایسے ناپسندیدہ مقاصد کی طرف منتقل نہیں کی جائیں گی جو عوامی مفاد میں نہ ہوں''۔ یہ بل اگر قانون بن گیا تو اس سے تمام غیر ملکی امداد یا غیر ملکی ذریعے سے ملنے والے عطیات کو ایک ضابطہ میں لانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ تمام آئی این جی اوز اور این جی اوز کے لیے لازمی ہو جائے گا کہ وہ غیر ملکی فنڈز کے استعمال کی حکومت سے پیشگی اجازت حاصل کریں۔ اس کے علاوہ اس بل کے قانون بن جانے کی صورت میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو جائے گا کہ وہ یکطرفہ طور پر این جی اوز کو غیر ملکی فنڈز حاصل کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دے یا کسی بھی وقت اجازت نامہ منسوخ کر دے اور متعلقہ این جی او پر کام کرنے کی وسیع تر پابندیاں عائد کر دے۔

مقامی این جی اوز اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے مجوزہ بل کے بارے میں سخت تشویش کا اظہار کیا اور کہا ہے کہ یہ بل اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی (یو این ایچ آر سی) کی اس قرارداد کے منافی ہے جس کی توثیق 22 مارچ 2013ء کو اسمبلی میں کی گئی تھی۔ یہ قرارداد غیر ملکی امداد وصول کرنے پر پابندیاں لگانے کی حکومتی اقدام کی شدید مخالفت کرتی ہے۔ یہ بل سینیٹ میں پیش کیا جا چکا ہے تاہم وہاں سے اس کی منظوری ہونا ابھی باقی ہے۔

کالعدم تنظیمیں:

پاکستان میں کام کرنے والی کالعدم تنظیموں کی تعداد 2014ء میں بھی متنازعہ رہی اس لیے کہ ہر رپورٹ میں ان کی تعداد مختلف نظر آتی ہے۔ نیشنل انٹرنل سکیورٹی پالیسی کے مطابق حکومت نے سلامتی سے متعلق جو دستاویز شائع کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ ملک میں تقریباً ساٹھ کالعدم تنظیمیں پاکستان میں کام کر رہی تھیں۔ تاہم بعد کی رپورٹوں کے مطابق وزیرِ داخلہ نے بتایا کہ صرف پنجاب میں 95 سے زائد کالعدم تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ کالعدم قرار دیئے جانے کے اعلانات کے باوجود چند عسکری اور انتہا پسند تنظیموں نے بے خوفی کے ساتھ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

کالعدم تنظیم لشکرِ جھنگوی کے رہنما ملک محمد اسحاق دسمبر میں رہائی کے لیے بالکل تیار بیٹھا تھا لیکن عین وقت پر اس کی رہائی کے احکامات تبدیل کر دیئے گئے اور اسے دو ہفتے کے جوڈیشل ریمانڈ پر واپس جیل بھیج دیا گیا۔ شنید ہے کہ ایسا اس کی رہائی کے احکامات کے خلاف اٹھنے والے شور کے باعث کیا گیا۔ ایک خیراتی تنظیم جماعت الدعوۃ پاکستان میں کھلے عام کام کرتی رہی ہے اور کر رہی ہے اور اسے عوامی حمایت بھی حاصل ہے حالانکہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے اس پر مالیاتی پابندیاں عائد ہیں۔ دفاعِ پاکستان کونسل جو مذہبی اور چھوٹی سیاسی جماعتوں پر مشتمل اتحاد ہے، نے ریلیاں نکالیں، اگرچہ ملک بھر میں 2014ء کے دوران نکالی جانے والی ریلیوں کی تعداد 2013ء کے مقابلے میں کم تھیں، تاہم غیر واضح اور مبہم مقصد ''پاکستان کا تحفظ کرو'' کے نعرے پر نکلنے والی ریلیوں میں لوگوں نے شرکت کی۔

سفارشات

1- سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور رہنماؤں کے خلاف تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات خصوصاً کراچی کی صورتحال پر قابو پایا جائے اور حملہ آور جس بے خوفی کے ساتھ حملے کرتے ہیں، اس کے خلاف ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ سیاسی جماعتوں کے ساتھ منسلک افراد کو قانون کے تحت اضافی تحفظ فراہم کیا جائے۔

2- انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے افراد، صحافیوں اور این جی اوز کے کارکنوں کو قتل کرنے، ان پر حملے کرنے یا ان کی توہین کرنے اور دھمکیاں دینے والے افراد کے خلاف حکومت مقدمے چلائے۔ اجتماع کی آزادی اور انجمن سازی کی آزادی سے متعلق اقوامِ متحدہ کے خصوصی روئداد نویس کی طرف سے انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں اور این جی اوز کے کارکنوں کو خوفزدہ

کرنے اور انہیں قتل کرنے والوں کے خلاف اقدامات کرنے کے بارے میں جو مراسلہ حکومت پاکستان کو بھیجا گیا ہے، اس پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جائے۔

3- انتہا پسند گروہوں پر پابندی عائد کرنے کا حکومتی فیصلہ بے حد خوش آئند ہے۔ حکومت اس پابندی کو مؤثر بنائے اور طاقت کے قانونی استعمال کو ان کالعدم تنظیموں کے خلاف بروئے کار لائے جو اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور جلوس نکالتی رہتی ہیں۔

4

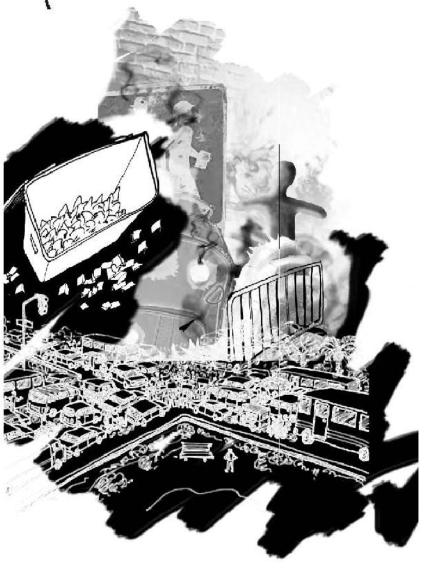

فروغ جمهوریت

سیاسی عمل میں شرکت

ریاست اپنے اختیارات، عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے، اس کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔

بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت دی جائے گی جہاں تک کہ قانون اور اخلاق عامہ اس کی اجازت دیں۔

آئین پاکستان [دیباچہ]

ریاست علاقائی سطح پر منتخب نمائندوں کے ذریعے مقامی حکومت کے (بلدیاتی) اداروں کی حوصلہ افزائی کرے گی، اور ان (بلدیاتی) اداروں میں کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کو خصوصی نمائندگی دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-32]

۔۔۔ یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے یقینی بنایا جائے، ورنہ انسان عاجز آ کر جبر و استبداد اور ظلم کے خلاف خود بغاوت پر مجبور ہو جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [ابتدائیہ]

تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-1]

ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طریقے سے منتخب کیے گئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق حاصل ہے۔

عوام کی مرضی حکومت کے اختیار و اقتدار کی بنیاد ہو گی۔ اس مرضی کے اظہار کے لیے متعین مدت کے بعد ایسے حقیقی انتخاب منعقد کرائے جائیں گے، جن میں عام اور مساوی حق رائے دہی کا استعمال خفیہ رائے شماری یا اس جیسے کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-21]

انسانی حق کے طور پر سیاسی شرکت

کسی بھی سیاسی نظام میں شرکت انسان کا بنیادی حق ہے۔ سیاسی شرکت سے شہریوں کو نہ صرف یہ کہ حکومتی امور میں اپنی رائے دینے کا موقع ملتا ہے بلکہ اس سے اقلیتی اور نمائندگی سے محروم رکھے جانے

والے طبقات جن میں خواتین شامل ہیں، کو بھی حمایت حاصل ہو جاتی ہے اور یوں پُر تشدد سیاسی تغیر و تبدل کو روکنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

سیاسی شرکت کا مطلب محض ووٹ ڈالنا نہیں ہے۔ یہ بولنے کی آزادی کے ساتھ ساتھ اجتماع اور کسی گروہ یا ادارے میں شرکت اور عوامی معاملات کو چلانے کے عمل میں حصہ لینے کی اہلیت پر محیط ہے۔ سیاسی شرکت میں اظہار رائے کی آزادی، اکٹھے ہونے اور ایسوسی ایشن بنانے جیسے حقوق شامل ہیں جو جمہوریت کے لیے لازمی شرائط ہیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ریاست سیاسی شرکت کے حق کے استعمال میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر رہی، انسانی حقوق کا قانون ریاستوں کی اس بارے میں بھی ہمت افزائی کے طور پر ایسے اقدامات تجویز کرتا ہے کہ جن سے ناخواندگی، افلاس اور تشدد جیسی مشکلات پر قابو پانا ممکن ہوتا ہے۔ یہ وہ مشکلات ہیں جو لوگوں کو سیاسی عمل میں شرکت سے دور رکھنے کے علاوہ افراد اور گروہوں کو اپنے استحقاق کا استعمال موثر طور پر کرنے سے روکتی ہیں۔ انسانی حقوق کے معیارات بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تمام مرد و خواتین کو یہ مساوی حق حاصل ہے کہ وہ سیاسی زندگی کے تمام معمولات میں بھرپور شرکت کریں۔

عمومی جائزہ:

سال 2014ء کے دوران پاکستان میں سیاسی شرکت کی بہت سی شکلیں سامنے آئی ہیں۔ بظاہر سیاسی شرکت کے اپنے حق کو استعمال کرنے کے نام پر حزبِ اختلاف کی جماعت پاکستان تحریک انصاف نے 2013ء کے انتخابات میں وسیع پیمانے اور باضابطہ طور پر ہونے والی دھاندلی کے خلاف پاکستان بھر میں دھرنے دیئے اور ریلیاں نکالیں۔ اس عمل میں پاکستان عوامی تحریک بھی کسی حد تک شریک ہوئی۔ پاکستانی عوامی تحریک نے انقلاب کے ذریعے موجودہ نظام کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جس طریقے سے یہ احتجاج کیے گئے اور حکومت نے جس قسم کے ردّعمل کا اظہار کیا، یا ردعمل دیا ہی نہیں اس سے یہ نکتہ نمایاں ہوتا ہے کہ سیاسی معاملات میں پُر امن شرکت کے حق اور ریاست کی طرف سے امن و امان کو بحال رکھنے کی ذمہ داری کے درمیان توازن قائم کرنا ضروری ہے۔

حکومت مخالف مظاہرے:

2013ء کے عام انتخابات، جن کے نتیجے میں مرکز میں پاکستان مسلم لیگ نواز کی حکومت قائم ہوئی، تنازعہ کا سبب بنے رہے۔ اگرچہ زیادہ تر قومی و بین الاقوامی مبصرین نے ان انتخابات کو عمومی طور پر پچھلے انتخابات کی نسبت منصفانہ قرار دیا، لیکن پاکستان تحریک انصاف نے کہا کہ ان انتخابات میں وسیع پیمانے پر اور

پی ٹی آئی کے چیئرمین عمران خان اور پیٹ کے سربراہ ڈاکٹر طاہرالقادری اسلام آباد میں ایک احتجاجی ریلی کے دوران

منظّم طریقے سے دھاندلی کی گئی تھی۔ اس نے پاکستان مسلم لیگ نواز، اُس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری، الیکشن کمیشن، پنجاب کی نگران حکومت اور ایک طاقتور میڈیا ہاؤس پر الزام لگایا کہ انہوں نے ساز باز اور گٹھ جوڑ کر کے لوگوں کے حق رائے دہی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔

پاکستان تحریک انصاف نے حکومت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ چار انتخابی حلقوں میں ووٹوں کا آڈٹ 14 اگست 2014ء تک کروا دے۔ 14 اگست پاکستان کا یوم آزادی ہے۔ تحریک انصاف نے زور دیا کہ سپریم کورٹ ایک کمیشن قائم کر کے تحقیقات کروائے۔ حکومتی بے عملی کے جواب میں عمران خان کی قیادت میں سیاست کرنے والی تحریک انصاف کے علاوہ ڈاکٹر طاہرالقادری کی پاکستان عوامی تحریک نے احتجاجی لہر پیدا کر دی، انہوں نے ریلیاں نکالیں اور دھرنے دیئے۔ یاد رہے کہ پاکستان عوامی تحریک وہ سیاسی جماعت ہے جس کی پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی نہیں ہے لیکن انقلاب لانے کے لیے ان کا اپنا ایجنڈا ہے۔ ان احتجاجوں اور دھرنوں نے چار ماہ سے زیادہ عرصے تک پورے ملک کو اپنی گرفت میں لئے رکھا اور پورے ملک کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ قادری کے حامیوں نے 17 جون کو پولیس کے ساتھ جو جھڑپیں کیں ان میں کم سے کم 11 افراد جاں بحق ہو گئے جن میں ایک پولیس افسر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ پولیس کی طرف سے ماڈل ٹاؤن لاہور میں قادری کی رہائش گاہ اور پارٹی سیکرٹریٹ کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹانے کی مزاحمت کے دوران

جھڑپوں میں سینکڑوں افراد زخمی بھی ہوئے۔ اس واقعہ نے حکومت مخالف مظاہروں کو مہمیز دی جس کے نتیجے میں 14 اگست کو ہزاروں افراد نے لاہور سے اسلام آباد کی طرف مارچ کیا اور اسلام آباد میں کیمپ لگا لئے۔

سول نافرمانی کی ترغیب:

دھرنے کے شروع ہونے کے فوری بعد پاکستان تحریک انصاف نے پورے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کا مقصد نواز شریف کو وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دینے پر مجبور کرنا تھا۔ عمران خان نے اپنے حامیوں پر زور دیا کہ وہ ٹیکسوں اور یوٹیلٹی بلوں کی ادائیگی روک دیں جس کا مقصد بقول عمران خان کے غیر قانونی حکومت کو مفلوج کرنا تھا۔

شاہراہ دستور پر ہیجانی حملہ:

20 اگست کو پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک نے اپنے مظاہروں کو اسلام آباد کے ''ریڈ زون'' میں منتقل کر دیا اور پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر احتجاجی کیمپ لگا کر بیٹھ گئے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور والے واقعے کے بعد مزید تصادمات سے بچنے کے لیے حکومت نے مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ریڈ زون میں پولیس کی بھاری نفری اور مسلح افواج کی تعیناتی کے باوجود احتجاج کرنے والوں کو دھرنا دینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ دونوں اطراف نے اتفاق کیا کہ وہ ریڈ زون کی کسی ہائی سکیورٹی والی عمارت میں داخل نہیں ہوں گے۔

تاہم 31 اگست کو دونوں فریق اپنے وعدوں سے مکر گئے اور مظاہرین نے پارلیمنٹ ہاؤس اور وزیراعظم کی رہائش گاہ پر ہلّہ بول دیا۔ اس ہلّے کے نتیجے میں کم از کم تین افراد جاں بحق اور سینکڑوں افراد اس وقت زخمی ہو گئے جب لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے لیس مظاہرین اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا۔ اگلی صبح کو اس وقت پھر تصادم ہوا جب مظاہرین پاکستان ٹیلی ویژن کے ہیڈ کوارٹرز میں داخل ہو گئے جس کے نتیجے میں پی ٹی وی کی نشریات عارضی طور پر معطل ہو گئیں۔

کاروباری بندش/شٹ ڈاؤن:

وفاقی دارالحکومت میں دھرنوں اور سول نافرمانی کے اعلان کے بعد پی ٹی آئی نے 16 دسمبر کو (بعد میں تاریخ تبدیل کر کے 18 دسمبر کر دی گئی تھی) ملک بھر میں کاروبار بند (شٹ ڈاؤن) کرنے کا اعلان کیا۔ پی ٹی آئی نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس کے بعد بھی اگر مئی 2013ء کے انتخابات کا آزادانہ آڈٹ کروانے کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو پھر معینہ وقفوں سے بڑے شہروں میں کاروبار بند کروائے جائیں گے۔

نظر بندی، گرفتاریاں اور طاقت کا استعمال:

حکومت نے احتجاجوں پر انوکھے ردِعمل کا اظہار کیا۔ 14 اگست کو اسلام آباد کی طرف ہونے والے مارچ کو روکنے کے لیے لاہور آنے اور شہر سے باہر جانے والے متعدد راستوں کو کنٹینر کھڑے کر کے بند کر دیا گیا۔ اس کا مقصد مظاہرین کو دھرنوں میں شامل ہونے سے روکنا تھا۔ مزید برآں پاکستان عوامی تحریک اور پاکستان تحریک انصاف کے درجنوں کارکنوں کو حفاظتی نظر بندی کا سامنا کرنا پڑا۔

پارلیمنٹ پر حملہ کے بعد حکومت کے غلط ردِّعمل نے نئی شکل اختیار کی۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کے رہنماؤں سمیت دونوں جماعتوں کے کارکنوں کے خلاف ایف آئی آرز یا پولیس کی شکایات اینٹی ٹیررازم ایکٹ (اے ٹی اے) مجریہ 1997ء کے تحت درج کی گئیں۔ احتجاج کرنے والے متعدد افراد کو ضمانت پر رہا ہونے سے پہلے ہی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

اور آخری بات یہ کہ بڑھتے ہوئے احتجاجی ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے حکومت نے پولیس پر انحصار کیا۔ باوجود کئی بار خبردار کرنے کے، ماڈل ٹاؤن لاہور کے واقعے میں انسانی جانوں کے ضیاع سمیت بہت سے واقعات سے واضح ہو گیا کہ ہماری پولیس بنیادی تربیت نہ ہونے کے باعث پُرامن ہجوم پر قابو پانے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ مثال کے طور پر 8 دسمبر کو پی ٹی آئی نے فیصل آباد میں مکمل ہڑتال کا اعلان کر رکھا تھا۔ اس میں پی ٹی آئی کا ایک کارکن پاکستان مسلم لیگ (ن) کے حامیوں کے ساتھ تصادم کے دوران جاں بحق ہو گیا۔ بہت سے مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ پولیس نے صحافیوں اور رپورٹروں پر بھی ڈنڈے برسائے۔

پاکستان عوامی تحریک نے 21 اکتوبر کو دھرنا ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے ملک بھر میں احتجاج شروع کر دیا۔ عمران خان نے پشاور شہر کے پبلک آرمی سکول پر طالبان کے حملے کے بعد، جس میں 132 طلبہ سمیت 150 افراد جاں بحق ہو گئے تھے، 17 دسمبر کو اپنی مہم کے خاتمے کا اعلان کیا۔ ان کا اعلان اس وقت سامنے آیا جب ان کی جماعت نے وزیرِاعظم کے استعفیٰ دینے پر دباؤ ڈالنے کے لیے ملک بھر میں ہڑتال کا اعلان کر رکھا تھا۔

سیاسی شرکت کے استحقاق کے اظہاریے

سال 2014ء کے دوسرے نصف کے دوران احتجاجوں، ریلیوں، دھرنوں، سوشل میڈیا مہمات، سول نافرمانی اور آخر میں ملک بھر میں کاروبار کی بندش کی صورت میں متحرک سیاسی شرکت کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ سیاسی وابستگی سے قطع نظر، تجزیہ کاروں نے سیاسی سرگرمیوں میں خواتین اور نوجوانوں کی شرکت کی بے حد

تعریف وتوصیف کی۔ یہ وہ طبقہ ہے جو پہلے سیاست کو ''گندے'' کاروبار کا نام دیتے ہوئے ہچکچاتا نہیں تھا لیکن اب وہ سیاست کا حصہ بن گیا تھا۔لیکن یہ طبقہ اپنی شرائط پر سیاست کا حصہ بنا۔اس طبقے کے بہت سے مطالبات ایسے تھے جن کو جمہوریت کے لیے بہتر نہیں سمجھا جاتا تھا۔مثال کے طور پر انتخابی اصلاحات انتخابی دھاندلیوں کی آزادانہ اور فوری تحقیقات اور ریاست کے کارندوں کی کارستانیوں کے سبب ہونے والی انسانی اموات کی جوابدہی ایسے مطالبات تھے جنہیں بہتر تصور نہیں کیا جاتا۔لرزاں وخیزاں اور صحت مند جمہوریت میں اس قسم کی سیاسی شرکت حکومت کو محض انتخاب والے دن نہیں بلکہ پورے عرصۂ حکومت کے دوران حکمرانوں کی جوابدہی کرتی رہتی ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود سال بھر کے دوران رونما ہونے والے واقعات ذمہ دارانہ سیاسی شرکت کی ضرورت کا احساس بھی دلاتے ہیں جس کے بغیر سیاسی رفاقت اور احتجاج کا حق۔ جو بڑی جدوجہد کے بعد حاصل ہوا، کم از کم پنجاب میں تو استحقاق یا جواز کھوسکتا ہے۔ قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں سے ان کی زیادتیوں کا حساب لیا جانا چاہیے اور انہیں جان لیوا طاقت کے استعمال کے بغیر پُرامن اجتماعات پر قابو پانے کی تربیت دی جانی چاہیے۔تاہم یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ لاٹھیوں اور دوسرے اسلحہ سے مسلح مظاہرین کو کس حد تک پُرامن کیا جاسکتا ہے؟ جب ہزاروں مظاہرین حکومت کو گرانے کے ارادے سے ملک کی پارلیمنٹ پر چڑھائی کر دیں تو پھر پُرامن مظاہروں اور دہشت گردی کے اقدامات کے درمیان حدِ فاصل کیسے کھینچی جاسکتی ہے؟ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ریاست کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ پُرامن احتجاج، ایسوسی ایشن اور سیاسی شرکت کو یقینی بنائے تو پھر پرامن رہنے کے لئے مظاہرین اور ان کے رہنماؤں پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟ ان کا فرض ہے کہ وہ مظاہرین کو نفرت اور تشدد پھیلانے سے باز رکھیں اور آئین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے مطالبات پیش کریں۔ پاکستانی ریاست سیاسی شرکت کے حق اور امن وامان کو یقینی بنانے کے فرض کے درمیان توازن کیسے قائم رکھ سکتی ہے، اس کے ملک کی رائج الوقت سیاست پر دوررس نتائج مرتب ہوں گے۔

پسماندہ گروہ اور سیاسی شرکت

اب جبکہ پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک نے 2014ء کے دوران پنجاب کے سیاسی میدان میں سیاسی شرکت کے حق کو وسعت دی ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سال کے دوران پسماندہ طبقات کی سیاست میں شرکت میں مزید کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ سال بھر کے دوران چونکہ میڈیا اور عوام کی توجہ پی ٹی آئی پر رہی، اس لیے پسماندہ طبقات کی سیاست میں شرکت میں آنے والی کمی کے عمل کو عمومی طور پر نظر انداز کیا گیا۔

اکتوبر 2014ء میں گلگت بلتستان میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے کوآرڈی نیٹر اسرار الدین اسرار اور دس دوسرے افراد کے خلاف انسداد دہشت گردی ایکٹ (اینٹی ٹیررازم ایکٹ) مجریہ 1997ء کو ''کالا قانون'' قرار دینے اور سیاسی حقوق کی مہم چلانے والے بابا جان کو دی جانے والی سزا کے خلاف احتجاج کرنے کے الزام میں بغاوت کا مقدمہ درج کیا گیا۔ گلگت بلتستان میں 2010ء کے دوران پہاڑی تودہ گرنے سے سینکڑوں دیہات تباہ اور ایک ہزار سے زائد افراد بے گھر ہو گئے تھے۔ بابا جان نے مقامی لوگوں کو نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرنے کے لیے یکجا کیا تھا۔ اگست 2011ء کے یہ مظاہرے پولیس کے ساتھ تصادم کے نتیجے میں پرتشدد ہو گئے جن میں دو مظاہرین جاں بحق ہوئے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچا۔ گلگت بلتستان کے بابا جان اور دوسرے گیارہ افراد کو گرفتار کر لیا اور اینٹی ٹیررازم ایکٹ مجریہ 1997ء کے تحت ان کے خلاف مقدمے درج کر کیے گئے۔ ستمبر 2014ء میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے ان سب کو عمر قید کی سزائیں سنا دیں۔

18 مارچ کو بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن۔ آزاد (بی ایس او، آزاد) کے چیئر پرسن زاہد بلوچ کو بندوق کی نوک پر کوئٹہ سے اغوا کر لیا گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق زاہد بلوچ کو فرنٹیئر کور کے ارکان نے اغوا کیا۔ ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں، کس ادارے کے قبضے میں ہیں۔ دوسرے درجنوں متحرک کارکنوں کی طرح جنہیں ریاست کے ایجنٹوں نے طاقت کے زور پر اغوا کیا تھا، زاہد بلوچ بھی پسماندہ بلوچ کمیونٹی کے لیے انصاف اور مساوی سلوک کا مطالبہ کر کے سیاسی شرکت کے حق کو استعمال کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح، زیر نظر سال کے دوران ''مارو اور کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دو'' کی پالیسی پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ پہلے یہ پالیسی سیاسی طور پر متحرک بلوچوں کے خلاف استعمال کی جاتی تھی مگر اب سندھی قوم پرستوں کے لیے بھی یہی پالیسی اختیار کر لی گئی ہے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ایسے متعدد واقعات پر مشتمل دستاویز تیار کی ہے۔ اس دستاویز کے مطابق قوم پرست گروپوں کے ساتھ منسلک افراد کو اغوا کیا گیا اور الزام لگایا جاتا ہے کہ سکیورٹی ایجنسیوں سے متعلق افراد اغوا کی ان وارداتوں میں ملوث ہیں۔ بعد میں مغویوں کی لاشیں سندھ اور بلوچستان کے مختلف حصوں سے ملیں۔ اسی طرح غیر قانونی نظر بندیوں اور متعدد متحرک کارکنوں پر تشدد کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔ یہ لوگ بلوچ قوم پرست ہیں یا وہ لوگ ہیں جو بلوچ علیحدگی پسندوں سے قربت رکھتے تھے۔ ایسے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ متعدد بلوچ نوجوانوں کی لاشیں کراچی کے کوڑہ دانوں سے ملی ہیں۔ ایسے واقعات کے سبب جائز سیاسی عمل میں بلوچ اور سندھی قوم

پرستوں کی شرکت میں بہت کمی آئی۔جس کے باعث ریاست کے خلاف ردعمل میں شدت آئی۔

پاکستان کے دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں، جہاں پنجاب کے مقابلے میں میڈیا کی توجہ بہت کم جاتی ہے، میں ان گروپوں کی طرف سے کیے جانے والے احتجاج کو غداری اور پاکستان دشمن قرار دے دیا گیا۔اس حوالے سے ریاستی اداروں کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ جس طرح چاہیں، احتجاج کرنے والوں کے ساتھ نمٹیں۔اس کے مقابلے میں پی ٹی آئی کے دھرنوں کو دیکھیں۔ پی ٹی آئی منتخب وزیراعظم کو غیر قانونی طریقے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کرتی رہی جبکہ پی ٹی اے تو نظام کو ہی ختم کرنے کا مضحکہ خیز مطالبہ کرتی رہی اور ان دونوں جماعتوں کے ان مطالبات کو ہمارا میڈیا سراہتا رہا اور اسے سورمائی کوششیں قرار دے کر لوگوں کو ان مبہم مطالبات کی حمایت کرنے پر تیار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوسکتا ہے کہ میڈیا کی ان کوششوں کو اسٹیبلشمنٹ کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ بہر حال ملک میں سیاسی شرکت کے تبدیل ہوتے ہوئے مظاہر کا جائزہ لیتے وقت ان دوہرے معیارات کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔

خواتین

خواتین کی سیاسی شرکت کے حوالے سے سال 2014ء بہت دلچسپ رہا۔ ایک طرف جہاں پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کے احتجاجوں، ریلیوں اور دھرنوں میں خواتین کی بھاری شرکت کو بہت زیادہ پذیرائی ملی، وہیں کچھ رجعت پسند اور انحطاط پذیر لوگوں نے خواتین کی شرکت کو غیر اخلاقی قرار دے دیا اور وہ ان خواتین پر پھبتیاں کستے رہے۔ دوسری طرف یہ الزامات بھی سامنے آئے کہ خواتین کو حفاظتی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور یہ الزام بھی سامنے آیا کہ خواتین کو فیصلے سازی میں رائے دینے سے روکنے کے لیے انہیں احتجاجوں اور دھرنوں میں بیٹھنے تک محدود کر دیا گیا۔

پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کی ریلیوں میں شرکت کے لیے اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں خواتین تو بہرصورت سڑکوں پر نکلیں۔ اپنے مردوں کی طرح وہ بھی ریلیوں میں تقریریں سنتیں، ان پر تحسین کے نعرے بلند کرتیں اور موسیقی کی تال پر مارچ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈانس بھی کرتیں۔ عوامی اجتماعات میں عورتوں کی ایسی شرکت نے بہت سے مردوں کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیا اور پاکستانی معاشرے میں موجود زن بیزاری کے مستحکم احساس کو آشکار کر دیا۔ میڈیا نوجوان خواتین کی تصاویر کو کافی دیر تک دکھاتا رہتا۔ مذہبی اور رجعت پسند جماعتیں ان ریلیوں میں خواتین کی موجودگی پر سخت سیخ پا ہوتے اور اسے غیر اخلاقی قرار دیتے اور پاکستان عوامی تحریک اور پاکستان تحریک انصاف کے مخالفین ان ریلیوں کو سماجی اجتماع قرار دیتے جہاں مرد عورتوں سے آنکھیں لڑانے کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح کے فقروں سے وہ ان خواتین کو محض نمائشی

اشیا قرار دے کر ان کی کردار کُشی کرنے میں لذت حاصل کرتے۔ یہ تمام تر ردّعمل ان مشکلات کو ظاہر کرتے ہیں جو سیاسی عمل میں خواتین کی شرکت کی راہ میں مانع ہیں۔

پاکستان تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کی قیادت نے ریلیوں میں شرکت کرنے والی خواتین کی بڑی تعداد کو انقلابی تبدیلی کے علاوہ سیاسی عمل میں مردوں اور عورتوں کی مساوی شرکت کی طرف قدم بھی قرار دیا۔ تاہم پاکستان عوامی تحریک اور پاکستان تحریک انصاف کے اجتماعات کے دوران سٹیج کے اوپر اور سٹیج کے سامنے نیچے مجمع میں خواتین کی تعداد کا فرق ان جماعتوں کے دعوے کی تصدیق نہیں کرتا۔ بہرحال سیاسی ریلیوں میں خواتین کی شرکت ایک مثبت پہلو ہے، تاہم پاکستانی سیاست میں بڑی تبدیلی لانے کے لیے احتجاجوں میں خواتین کی شرکت کو بڑھانا ازحد ضروری ہے۔ طویل المدت اثر کے لیے سیاسی عمل میں خواتین کی شرکت کو یقینی بنانا، سورماؤں کی پوجا کروانے اور ان سے نعرے لگوا کر ان کی آواز کو دفن کرنے کی بجائے خواتین کی آواز پر کان دھرنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے 2014ء کے دوران سیاسی عمل میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے ایسی کسی تبدیلی کی شہادت نہیں ملتی۔

مئی 2014ء میں سرچ فار کامن گراؤنڈ پاکستان نے ایک رپورٹ جاری کی جس کا عنوان تھا ''پاکستان میں موثر جمہوری طرزِ حکمرانی کے لیے سیاسی عمل میں خواتین کی شرکت اور ان کی قیادت کو تقویت پہنچانا''۔ یہ ایک تحقیقی کام تھا اور اس میں جمہوری سیاست اور پاکستان کی طرز حکمرانی میں خواتین ارکانِ پارلیمنٹ کے ساتھ جڑی ہوئی خصوصیات اور ان کو درپیش چیلنجوں کی شناخت کروائی گئی ہے۔

اس تحقیقی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین ارکان پارلیمنٹ لائق اور اہل ہیں اور قانون سازی کرنے کے قابل ہیں لیکن وہ شدید صنفی عدم مساوات اور صنفی تعصب کے باعث مردوں کے مقابلے میں نہ صرف سیاسی رہنماؤں بلکہ عام ووٹروں کی نظروں میں بھی بہت کم اہمیت رکھتی ہیں۔ رپورٹ بتاتی ہے کہ جن بہت سی خواتین کو انتخاب لڑنے کی اجازت دی گئی ان کا تعلق سیاسی خاندانوں سے تھا۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی کہ سیاسی جماعتوں میں خواتین رہنماؤں کو قیادت دی جانی چاہیے۔ عام نشستوں پر زیادہ خواتین کو انتخاب لڑایا جائے اور ایسی انتخابی اور قانونی اصلاحات کی جائیں جن کے ذریعے خواتین کو سیاسی میدان میں یکساں مواقع فراہم ہوسکیں تاکہ خواتین بھرپور طور پر سیاسی عمل میں شرکت کرسکیں۔

''سیاسی عمل میں شرکت کے لیے خواتین کی بڑھتی ہوئی فنی صلاحیت'' کے موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس میں، جس کا اہتمام حکمرانی سے متعلق ایک بین الاقوامی تنظیم ''فورم آف فیڈریشن'' نے کیا تھا، شرکاء نے سیاست میں خواتین کی شرکت کی راہ میں موجود بہت سی رکاوٹوں کا ذکر کیا۔ ان میں عمومی ذہنی روّیے

کی بنیاد پر، کہ سیاست، خواتین کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے، نظریاتی بندشتیں، سماجی اور ثقافتی رکاوٹیں جن میں خواتین پر کام اور گھریلو امور کا بوجھ شامل ہے، اقتصادی رکاوٹیں جن میں غربت شامل ہے جو انہیں سیاست میں آنے سے روکتی ہے، اور سیاسی رکاوٹیں جن میں سیاسی عمل کے لیے معاشی اور سماجی معیار، سیاسی عمل کے لیے دستیابی کی سطح اور یہ دھبہ کہ سیاست ''گندہ کام'' ہے، شامل ہیں۔ اجلاس میں خواتین کی بہتر سیاسی شرکت کے لیے ان کی اہلیت اور قابلیت کو بڑھانے اور انہیں مساوی مواقع مہیا کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔

''فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک'' کی طرف سے خواتین کے عالمی دن پر جاری کی جانے والی رپورٹ کے مطابق پہلے پارلیمانی سال میں ہونے والے پارلیمنٹ کے نو سیشنوں کے دوران خواتین اراکین اسمبلی کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ خواتین اراکین اسمبلی نے قانون سازی میں بہت متحرک کردار ادا کیا۔ انہوں نے بارہ پرائیویٹ ممبر بل جن میں چھ انفرادی اور مشترکہ طور پر چھ اراکین اسمبلی کی طرف سے تھے جمع کروائے گئے۔ ان بلوں کا تعلق طرزِ حکمرانی، انسانی حقوق، جمہوریت اور سیاسی ترقی کے موضوعات سے تھا۔ خواتین اراکین اسمبلی نے انفرادی طور پر 20 قراردادیں، 14 توجہ دلاؤ نوٹس، 1383 سوالات، قاعدہ نمبر 259 کے تحت 22 تحاریک التواء اور 64 پوائنٹس آف آرڈر پیش کیے۔

گلوبل جینڈر گیپ کی سالانہ رپورٹ ورلڈ اکنامک فورم نے اکتوبر 2014ء میں شائع کی۔ اس رپورٹ میں صنفی مساوات کے حوالے سے جو سروے شائع کیا گیا اس میں جن 142 ممالک میں سروے کیا گیا ان میں پاکستان 141 ویں نمبر پر تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صحت، تعلیم، اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں خواتین اور مردوں کے درمیان موجود فرق میں توازن پیدا کیا جائے۔ اس تحقیق کے نتائج کے مطابق سیاسی اختیارات کے حوالے سے چار شعبوں میں پاکستان کو بہترین قرار دیا گیا ہے۔ خواتین کی اقتصادی شراکت اور مواقع کے حوالے سے پاکستان 141 ویں نمبر پر ہے۔ ''تعلیم کے حصول میں 132 ویں، صحت اور زندہ بچ جانے کے حوالے سے 119 ویں اور سیاسی اختیارات کے حصول کے حوالے سے 85 ویں نمبر پر ہے۔

نوجوان

پاکستان دنیا کا وہ ملک ہے جہاں نوجوانوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ 18 کروڑ کی آبادی کا 59 فیصد حصہ ان نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی عمریں 24 سال اور 67 فیصد حصہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کی عمریں 30 سال سے کم ہیں۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران جو مختلف سروے کیے گئے ان کے مطابق نوجوان لوگوں کو سیاسی طور پر متحرک ہونے میں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی نظام جبلی اور فطری طور پر بگاڑ، تعفن اور بدعنوانی پر مبنی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں اقتدار کا ڈھانچہ ان لوگوں کو

وزیراعلیٰ بلوچستان لطیف جوہر کو بھوک ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں

سیاسی عمل میں حصہ لینے سے روکتا ہے جو اقربا پرورانہ اور مخصوص و محدود نظام کے باہر سے متعلق ہوتے ہیں۔

ووٹ دینے کی عمر کو پہنچنے والے نوجوان لوگوں کی اکثریت پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں یا اس کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فوجی حکمران جنرل ضیاالحق نے طلبہ کی سیاست پر پابندی لگا رکھی تھی اور سرکاری سطح پر سرکاری اداروں کو بدعنوان اور نااہل ثابت کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے نوجوان طلبہ سیاست کے تجربے سے محروم رہے اور وہ طلبہ اور قومی سیاست کے درمیان تعلق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ سیاسی جماعتیں بھی سیاسی عمل میں طلبہ کی شرکت کی حوصلہ افزائی کرنے میں ناکام رہیں۔ حکمرانوں کی پالیسیاں پنجاب حکومت کی لیپ ٹاپ سکیم جیسی ہی رہیں جو کھوکھلی اور بے معنی تھیں۔ ان پالیسیوں کے باعث ہمارا نوجوان سیاسی طور پر بااختیار ہونے کی بجائے نامزدگیوں کی دوڑ میں شریک ہو کر رہ گیا۔

پاکستان تحریک انصاف وہ سیاسی جماعت ہے جس نے نوجوان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نعرے بازی سے کام نہیں لیا بلکہ عملی طور پر پارٹی میں ان کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے۔ اس مقصد کے لیے پارٹی کے نوجوانوں کی مالی معاونت کی۔ انصاف سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی گئی جو پی ٹی آئی کی طرف سے طلبہ کی نمائندہ تنظیم تھی۔ اس میں تمام صوبوں کے نوجوانوں کو نمائندگی دی گئی۔ سوشل نیٹ ورک پر فورم بنائے گئے جس کا مقصد نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا تاکہ وہ سوشل میڈیا کو استعمال کریں اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس سے نوجوانوں، خصوصاً شہری علاقوں اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے

نوجوانوں کو پی ٹی آئی کی طرزِ سیاست میں وسیع پیمانے پر حصہ لینے کا موقع میسر آیا۔

مستقبل میں پاکستان میں جمہوریت کے عمل کو مضبوط کرنے کے لیے جہاں جمہوری عمل میں نوجوانوں کی شرکت کو یقینی بنانا ضروری ہے، وہیں سیاست میں نوجوانوں کی شرکت کو مکمل طور پر بہتری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ 2014ء کے دوران جہاں طلبہ اور نوجوان لوگوں کی ایک بڑی تعداد عمران خان اور پی ٹی آئی کی حمایت میں سڑکوں پر نکلی، وہیں یہ لوگ سیاسی طبقہ اور سیاسی طرزِ عمل کو انتہائی تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

تبدیلی کے لیے ان کی خواہش کا اظہار ان لوگوں کے لیے تحقیر سے ہوتا ہے جو ان نوجوانوں کی پارٹی کے سیاسی طرزِ عمل سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ ایسے نیوز چینلز، صحافیوں اور میڈیا ہاؤسز جو ان کے مقصد سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے، کو ہراساں کرتے رہے، انہیں گالیاں دیتے اور ان پر حملے کیے جاتے رہے اور اس کا مظاہرہ سوشل میڈیا کے علاوہ سڑکوں پر بھی ہوتا رہا۔ ایسے لگتا تھا جیسے نوجوانوں کی یہ نئی سیاسی کھیپ طویل المدت سیاسی اور جمہوری بڑھوتری کے لیے بہت زیادہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

یہ نوجوان ایک اور مختلف نوعیت کی سیاسی تحریک کے ہراول دستے کے طور پر سامنے آئے۔ دی وائس آف بلوچ مسنگ پرسنز (گمشدہ بلوچوں کی آواز) جس نے بلوچستان میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور اپنے گمشدہ عزیزوں کی بازیابی سے متعلق آگاہی پیدا کرنے کے لیے کوئٹہ سے اکتوبر 2013ء میں جو پیدل مارچ شروع کیا تھا، وہ مارچ 2014ء میں اپنی منزل یعنی اسلام آباد پہنچ گیا۔ ایک 22 سالہ بلوچ طالب علم لطیف جوہر نے بی ایس او آزاد کے چیئرپرسن زاہد بلوچ کے اغوا کے خلاف کراچی پریس کلب کے سامنے بھوک ہڑتال کی جو 46 روز تک جاری رہی۔ 2014ء کے سال کا اختتام ایک اور نوعیت کی سیاسی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ 16 دسمبر 2014ء کو آرمی پبلک سکول پشاور پر ہونے والے ہولناک حملے کے خلاف لوگوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا کہ وہ مدرسوں اور مسجدوں سے پھوٹنے والی انتہا پسندی اور فرقہ واریت کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے اور ان لوگوں کو سخت سزائیں دی جائیں جو تشدد اور نفرت کو ہوا دیتے ہیں۔ اسلام آباد کی لال مسجد کے امام مولانا عبدالعزیز نے ایک ٹیلی ویژن شو میں پشاور کے سکول پر ہونے والے حملے کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔

اس انکار کے نتیجے میں لال مسجد کے باہر مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان احتجاجی مظاہروں نے ''اپنی مسجد واپس لینے'' کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ مظاہروں میں مولانا عبدالعزیز سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے روّیہ پر عوام سے معافی مانگیں۔ پولیس نے مظاہرین کے خلاف ''امن تباہ'' کرنے کے الزامات پر رپورٹ درج کر لی اور اگلے ہی روز مظاہرین میں سے پانچ افراد کو گرفتار کر لیا گیا لیکن مظاہرے ان گرفتاریوں

کے باوجود جاری رہے اور چند روز بعد اس مہم کے منتظم اعلیٰ کو ٹیلی فون پر طالبان سے الگ ہونے والے گروپ جماعت الاحرار کے ترجمان احسان اللہ احسان کی طرف سے دھمکیاں ملیں اور انہیں کہا گیا کہ وہ مظاہرے بند کر دیں ورنہ انہیں اور ان کے خاندان کو اس کے نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ مولانا عبدالعزیز نے بھی اپنے جمعہ کے خطبہ میں دھمکی دی کہ اگر انہیں کوئی نقصان پہنچا تو خودکش حملے کیے جائیں گے۔ 26 دسمبر کو مولانا عبدالعزیز کے خلاف پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 506 (2) کے تحت ایف آئی آر درج کی گئی۔ مظاہرے اس صورت حال کے باوجود جاری رہے اور یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا کہ عبادت گاہوں کے طور پر مساجد کو حکومت واپس اپنی تحویل میں لے اور انہیں انتہا پسندوں کی خانقاہیں بننے سے روکا جائے۔ اس کے علاوہ یہ واضح کرے کہ مسلح افواج اور مذہبی رہنماؤں سمیت ریاستی اداکار مذہبی انتہا پسندی کے فروغ کے ذمہ دار ہیں، انہیں کہا گیا کہ وہ اس قسم کے عمل سے دور رہیں۔ نوجوانوں کی مختلف قسم کی تحریکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان مذہبی، نسلی، طبقاتی اور صنفی حوالے سے حصوں بخروں میں تقسیم ہے۔ ایسی تقسیم نوجوانوں میں بھی موجود ہے اس لیے کہ ہمارے نوجوان ایک جیسے نہیں ہیں جس کا اظہار ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کرتے رہتے ہیں۔

مذہبی اقلیتیں:

مذہبی اقلیتوں پر 2014ء کے دوران بھی پرتشدد حملے جاری رہے جس سے ان کی زندگیاں بُری طرح متاثر ہوئیں اور ان کی سیاسی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ مذہبی اقلیتیں اس سال عدم تحفظ کا شکار رہیں، انہیں موت کی دھمکیاں دی جاتی رہیں۔ موت کے خوف نے انہیں سیاسی عمل، سہولیات، تعلیم اور ملازمت جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم رکھا۔ (مذہبی اقلیتوں سے متعلق باب دیکھیے)

سیاست میں مذہبی اقلیتوں کی شمولیت کے خلاف اداراتی امتیاز میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مثال کے طور پر آئین پاکستان کی شق 41 (2) اور شق 91 (3) کے تحت کوئی غیر مسلم ریاست کا سربراہ، صدر اور حکومت کا سربراہ اور وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ آئین پاکستان میں موجود یہ پابندیاں، یہ رکاوٹیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ غیر مسلموں کو سیاسی عمل میں بھرپور شریک ہونے کی ضمانت نہیں دی گئی۔

احمدیوں کے حوالے سے یہ استثناء بہت واضح ہے جن کے ناموں پر مشتمل علیحدہ انتخابی فہرستیں آج بھی ویسی ہی ہیں حالانکہ باقی تمام مذہبی اقلیتوں کو ووٹروں کی عام فہرستوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اپنے ووٹ رجسٹر کروانے کے لیے احمدیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا پتہ اور خود کو اسلام سے بے تعلق ہونے کی تحریر مہیا کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ احمدیوں کو طویل عرصہ سے ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔

مذہبی اقلیتوں پر پُر تشدد حملوں کا سلسلہ جاری رہا جن کے باعث سیاسی عمل میں شمولیت کے حق سمیت اُن کے تمام حقوق متاثر ہوئے

مینارٹی رائٹس گروپ انٹرنیشنل نے دسمبر 2014ء میں ''تحفظ کی تلاش: پاکستان میں مذہبی گروہوں کی محرومی میں بڑھوتری'' کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع کر کے تقسیم کی ہے جس میں سیاسی عمل سے مذہبی اقلیتوں کو دور رکھنے کی کوششوں میں اضافے پر سخت تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سیاسی جماعتیں اقلیتوں کو شاذو نادر ہی انتخابات میں نشستوں پر انتخاب لڑنے کا موقع دیتی ہیں اور اگر کبھی کبھار انہیں پارٹی ٹکٹ دے بھی دیا جائے یا اقلیتی نمائندہ بطور آزاد امیدوار انتخابات میں حصہ لے تو ایسے امیدواروں کو دوسری قسم کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر مئی 2013ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک ضلع میں ہندو امیدواروں کو پارٹی ٹکٹ دیئے تو ایک مقامی مدرسہ نے پمفلٹ تقسیم کیے جن میں مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ غیر مسلم امیدواروں کو ووٹ نہ دیں اس لیے کہ ہندو کافر ہوتے ہیں۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ جب مسلمان امیدوار مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے ووٹروں سے ملاقاتیں کرتے تو ان ملاقاتوں میں بھی بہت سے اقلیتی افراد کو نظر انداز کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ غیر مسلم آبادیوں والے علاقوں میں بھی جاری رہتا۔ مثال کے طور پر میر پور خاص ضلع میں امیدواروں نے حمایت حاصل کرنے کے لیے 40 فیصد ہندو آبادی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس کمیونٹی کا تعلق ہندوؤں کی نچلی ذاتوں سے تھا اور وہ جاگیرداروں کے لیے کام کرتے تھے اس لیے امیدواران جاگیرداروں سے ملے تاکہ انہیں اقلیتوں کی حمایت حاصل ہو سکے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ امیدواران اقلیتی گروہوں سے براہ

راست رابطہ کرتے لیکن انہوں نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ یہ لوگ نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔

اختیارات کی منتقلی اور مقامی حکومتیں

نچلی اور بنیادی سطح کے قریب تر ہونے کے باعث مقامی حکومت کو شراکتی جمہوریت کا انتہائی اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں مقامی حکومتوں کی مختلف شکلوں نے تاریخی طور پر صرف ایک ہی ذمہ داری نبھائی اور وہ تھی آمرانہ حکومتوں خصوصاً فوجی حکمرانوں کے کنٹرول کو قانونی شکل دینا اور انہیں مضبوط بنانا۔ آمرانہ حکومتوں کے بعد میں آنے والی سول حکومتیں یا تو منتخب مقامی حکومتوں کو نئے سرے سے رائج کرنے میں ناکام ہیں یا وہ اپنا مقصد پورا نہیں کر سکیں۔

دسمبر 2013ء میں بلوچستان میں بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ 2014ء کے دوران صوبے نے دوسرا اور تیسرا انتخابی مرحلہ مکمل کیا اور توقع تھی کہ جنوری 2015ء میں مقامی حکومتیں قائم کردی جائیں گی۔ اس طرح بلوچستان واحد صوبہ ہے جہاں مقامی حکومتوں کے انتخابات کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر عمل درآمد کیا گیا۔ انتخابات کا پہلا مرحلہ 7 دسمبر 2013ء کو مکمل ہوا۔ صوبے میں انتخابی عمل میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ بلدیاتی انتخابات سے متعلق قانون میں ترامیم ہونا تھیں۔ یاد رہے کہ بلدیاتی حکومتوں کی میعاد 2009ء میں ختم ہوگئی تھی۔ دوسری صوبائی حکومتوں نے انتخابات کروانے سے متعلق قانونی اور انتظامی شرائط پوری کرنے میں تساہل سے کام لیا۔

بلوچستان کے سوا تمام صوبوں نے مقامی حکومت کے انتخابات منعقد کروانے سے پہلوتہی کی

مارچ 2014ء میں عدالت عظمٰی نے فیصلہ دیا کہ مقامی حکومتوں سے متعلق صوبائی قوانین کی وہ شقیں جو صوبائی حکام کو مقامی حکومتوں کی حلقہ بندی کرنے کا مجاز بناتی ہیں، غیر آئینی اور نا قابل نفاذ ہیں۔ عدالت نے وفاقی اور صوبائی قانون سازاداروں کو حکم دیا کہ وہ قوانین میں ترامیم کریں جن کے ذریعے الیکشن کمیشن کو یہ اختیار مل جائے کہ وہ 30 اکتوبر 2014ء تک حلقہ بندیوں کا کام مکمل کر لے۔

20 اکتوبر کو سندھ اسمبلی نے سندھ لوکل گورنمنٹ (امینڈمنٹ) بل مجریہ 2014ء کی منظوری دی جس کے ذریعے الیکشن کمیشن آف پاکستان کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ حلقہ بندیوں کا کام شروع کر دے۔ 27 اکتوبر 2014ء کو پنجاب اسمبلی نے پنجاب لوکل گورنمنٹ (سیکنڈ امینڈمنٹ) آرڈیننس منظور کیا جس کے ذریعے الیکشن کمیشن آف پاکستان کو حلقہ بندیاں کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ خیبر پختونخوا میں پی ٹی آئی کی مخلوط حکومت عرصے سے مطالبہ کر رہی تھی کہ مقامی حکومت کے انتخابات بائیومیٹرک الیکٹرانک تھمب ویری فیکیشن مشینوں (انگوٹھوں کی تصدیق کرنے والی مشین) کے ذریعے کروائے جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ شفافیت کو یقینی بنایا جا سکے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے اس کا جواب دیا کہ بائیومیٹرک نظام کے انتخابات نومبر 2015ء میں کروائے جا سکیں گے۔ نومبر 2014ء میں پی ٹی آئی اس بات پر رضامند ہو گئی کہ اپریل 2015ء میں بائیومیٹرک تھمب ویری فیکیشن کے نظام کے بغیر ہی انتخابات کروا دے گی۔

گلگت۔ بلتستان:

2009ء میں صدر آصف علی زرداری نے گلگت۔بلتستان، اختیارات اور خود مختاری آرڈر مجریہ 2009ء (گلگت۔بلتستان ایمپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر، 2009) کی منظوری دی جس کے ذریعے پہلی بار مقامی لوگوں کو اپنے کچھ معاملات کے حوالے سے اختیارات منتقل کیے گئے۔ اس صدارتی آرڈر کے بعد یہاں پہلے انتخابات ہوئے جن میں پاکستان پیپلز پارٹی نے نشستوں کی اکثریت پر کامیابی حاصل کی اور قانون ساز اسمبلی میں واحد اکثریتی جماعت کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی۔ بہرحال گلگت۔ بلتستان کی یہ خود مختاری مقامی آبادی کو اختیارات دینے کے حوالے سے ناکام رہی اور متحرک سیاسی کارکنوں اور تجزیہ کاروں کے مطابق اس محدود خود مختاری اور علاقے میں بنیادی حقوق کی محرومی کے حوالے سے گلگت۔ بلتستان کو ایک نو آبادی ہی سمجھا جاتا رہا۔

2014ء کے دوران علاقے کے لوگ بیگانگی کے بڑھتے ہوئے احساس کا شکار رہے۔ ہزاروں افراد سڑکوں پر آئے جنہوں نے گلگت اور سکردو میں دھرنے دیئے۔ ان احتجاجوں کا محرک حکومت کی طرف

گلگت بلتستان کے لوگوں کا خیال تھا کہ اُن کے سیاسی عمل میں شمولیت کے حق پر شدید پابندیاں عائد کی گئی تھیں

سے گندم پر دی جانے والی سبسڈی کو واپس لینا تھا لیکن صورت حال سیاسی غلبہ اور بنیادی حقوق سے انکار کے خلاف تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ انسانی حقوق کے کمیشن کی ایک رپورٹ ''اے نیو گریٹ گیم'' (ایک نیا بڑا کھیل) تیار کی جو حقائق جاننے والے مشن کے مشاہدات پر مشتمل تھی۔ یہ مشن اکتوبر 2013ء میں گلگت بلتستان آیا تھا۔ اس رپورٹ میں نشاندہی کی گئی تھی کہ گلگت بلتستان کے عوام نے اپنی بے قاعدہ آئینی اور قانونی حیثیت کے ساتھ ساتھ گلگت بلتستان کونسل کی نااہلی، جس کا اجلاس گزشتہ چار برسوں کے دوران صرف ایک مرتبہ ہوا تھا، کے سبب بہت نقصان اٹھایا تھا۔ حقائق جاننے والے مشن نے انکشاف کیا کہ کسی بھی فریق نے ایمپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر 2009ء پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔ مزید برآں علاقے کے لوگوں کا کہنا تھا کہ سیاسی شرکت سے متعلق ان کے حق کو استعمال کرنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں اور انہوں نے مقامی سطح پر جن مسائل کی نشاندہی کی تھی، قومی سطح پر ان پر توجہ نہیں دی گئی۔

10 دسمبر کو قانون ساز اسمبلی کی میعاد ختم ہو گئی۔ اسمبلی کے نئے انتخابات مارچ 2015ء میں متوقع ہیں۔ وزیراعظم نواز شریف نے ایک ریٹائرڈ جج جسٹس طاہر علی شاہ کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا لیکن پاکستان تحریک انصاف نے جسٹس شاہ کی تقرری کو اس دعوے کے ساتھ سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا کہ جسٹس شاہ کے پاکستان مسلم لیگ ن کے ساتھ قریبی تعلقات کے باعث وہ اس عہدے کے لیے ناموزوں ہیں۔

سفارشات

1- طبقہ، نسل، صنف، نظریے، مذہب یا کسی اور بنیاد پر امتیاز نہ برتتے ہوئے ہر کسی کو سیاسی شرکت کا حق دینے کو یقینی بنایا جائے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سکیورٹی ایجنسیوں کو طاقت کے غیر قانونی استعمال سے روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں اور اس جرم کے مرتکب افراد کا سختی کے ساتھ احتساب کیا جائے۔

2- سیاسی جماعتوں کو اہداف مقرر کرنے چاہئیں یا جماعتی سطح پر تعداد مقرر کر لینی چاہیے کہ کتنی خواتین اور مذہبی اقلیتی گروپوں کے کتنے ارکان انتخابات میں ان جماعتوں کے امیدواروں ہوں گے۔ انتخابات میں حصہ لینے والی خواتین اور اقلیتی امیدواروں کی سیاسی حمایت کے ساتھ ساتھ انہیں وسائل بھی مہیا کیے جائیں اس کے علاوہ پارٹی قیادت اور پالیسی ساز کمیٹیوں میں ان کی نمائندگی کو یقینی بنایا جائے۔

3- الیکشن کمیشن کو ایک آزاد اور مؤثر ادارہ بنانے کے لیے حسبِ ضرورت اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کروا سکے۔ الیکشن کمیشن کو مضبوط بنانے سمیت، انتخابی نظام میں اصلاحات کی جائیں لیکن اس عمل کو مشاورتی ہونا چاہیے اور اس میں پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کی تمام سیاسی جماعتوں کے علاوہ سول سوسائٹی کے گروپوں کو بھی شریک کیا جائے۔

4- طلبہ تنظیموں کی سرگرمیوں کو روکنے اور سیاست میں طلبہ اور نوجوانوں کی شرکت کو محدود کرنے والی پالیسیوں اور تمام قوانین میں یا تو ترمیم کی جائے یا انہیں منسوخ کر دیا جائے۔

5- تمام مذہبی اقلیتوں کو مکمل سیاسی شرکت کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ ان مواقع میں تمام شہریوں کے لیے یہ یقینی بنانا شامل ہے کہ انہیں ووٹنگ کے مساوی حقوق حاصل ہیں اور احمدیوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ ان کے ناموں کی علیحدہ انتخابی فہرستیں تیار ہوں۔ تمام غیر مسلموں کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ تمام سطح کے حکومتی عہدوں پر تعینات ہو سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے آئین کے آرٹیکل (2) 41 اور آرٹیکل 91 (3) جیسے امتیازی قوانین میں ترمیم کی جائے جن کے باعث کوئی غیر مسلم فرد صدر اور وزیر اعظم کے عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں تمام مذہبی گروپوں کے خلاف تشدد کو روکنے کے اقدامات کیے جائیں اور انہیں مؤثر تحفظ مہیا کیا جائے خصوصاً ایسے علاقوں پر زیادہ توجہ دی جائے جہاں یہ لوگ عمومی طور پر عسکریت پسندوں کے حملوں کی زد میں

رہتے ہیں۔

6- گلگت۔ بلتستان کی بے قاعدہ آئینی حیثیت کی فوری طور پر اصلاح کی جائے اور یہ کام علاقے کے تمام متعلقہ فریقین کی مشاورت سے کیا جائے۔گلگت بلتستان کو عارضی یا مستقل طور پر صوبائی حیثیت دینے پرغور کیا جائے اورگلگت بلتستان کے ان لوگوں کو بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے جوملک کے دوسرے صوبوں میں رہائش پذیر ہیں۔

5

محروم طبقوں کے حقوق

خواتین

تمام شہری قانون کے روبرو، مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں، محض جنس کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

کسی بھی شہری کو، جو پاکستان کی سروسز میں تقرری کی اہلیت رکھتا ہے، محض جنس کی بنا پر اسے تقرری کے سلسلے میں امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

قومی زندگی کے تمام شعبوں میں، خواتین کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ ریاست، شادی، خاندان اور ماں کو تحفظ فراہم کرے گی۔

ریاست اس بات کو یقینی بنائے گی کہ خواتین کو ان شعبوں میں ملازم نہ رکھا جائے جو ان کی جنس سے مطابقت نہیں رکھتے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل نمبر 25-27-35-37]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار اور حقوق کے سلسلے میں مساویانہ حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

اس اعلان میں جن آزادیوں اور حقوق کا ذکر ہے، ہر انسان ان پر بغیر کسی قسم کی تفریق کے حق رکھتا ہے۔

تمام انسان قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور بغیر کسی تفریق کے، مساویانہ قانونی تحفظ کے مستحق ہیں۔

ہر بالغ مرد اور عورت، شادی کے دوران اور شادی کے خاتمہ کے سلسلے میں مساویانہ حقوق رکھتا ہے۔

شادی مرد و زن کی آزادانہ اور مکمل رضامندی کے مطابق طے پانی چاہیے۔

ہر فرد کو اپنے ملک کی پبلک سروس تک مساویانہ رسائی کا حق حاصل ہے۔

ماں اور بچہ خصوصی سلوک اور مدد کے مستحق ہیں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 1-2-7-16`21(2)-25(2)]

ریاست کی طرف سے خواتین کے تحفظ کو مستحکم کرنے کی کئی کوششوں کے باوجود 2014ء کے دوران خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں میں کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ سیلابوں اور قبائلی علاقوں میں دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کے باعث انہیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا جس کے باعث ان کی تکالیف اور مسائل میں اضافہ ہوا۔ سال کے دوران بہت سے ایسے

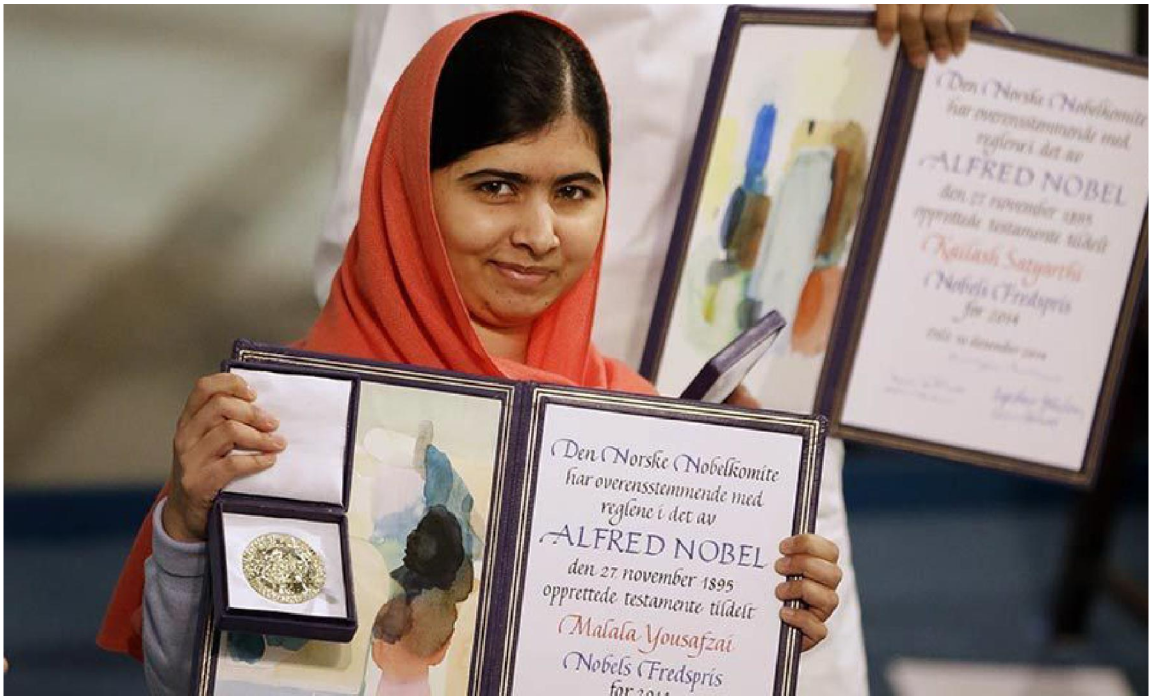

پاکستان سے تعلق رکھنے والی نوبیل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی

واقعات دیکھنے میں آئے جن میں خواتین کو لوگوں کی طرف سے انتہائی بے رحمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مثال کے طور پر ایک حاملہ عورت کو لاہور ہائی کورٹ کے باہر اس کے خاندان والوں نے اینٹیں مار مار کر صرف اس لئے ہلاک کر دیا کہ اس نے گھر والوں کی اجازت کے بغیر شادی کی تھی۔ لگتا ہے کہ جیسے خواتین کے لئے بازاروں اور سڑکوں پر کوئی جگہ نہیں رہ گئی جہاں انہیں تحفظ کا احساس ہو اور بلوچستان میں ہونے والے دو واقعات نے اس احساس میں شدت پیدا کر دی ہے۔

پہلا واقعہ میں کوئٹہ میں جیولری کی ایک دکان میں نقاب پوش مسلح افراد گھس آئے اور انہوں نے سرنجوں کے ذریعے چار خواتین پر تیزاب چھڑک دیا جس سے وہ شدید زخمی ہوگئیں۔ دوسرا واقعہ مستونگ کے بازار میں پیش آیا جہاں دو نوعمر لڑکیاں خریداری کر رہی تھیں۔ ان پر بھی سرنجوں کے ذریعے تیزاب چھڑکا گیا۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران بلوچستان کے شہروں دالبندین، قلات اور کوئٹہ میں اس نوعیت کے کئی واقعات پیش آ چکے ہیں۔ ایسے حملوں کا مقصد ایسی خواتین کو خوفزدہ کرنا ہے جو اپنے مردوں کے بغیر اکیلے ہی بازاروں میں جا کر خریداری کرتی ہیں۔ انہیں پیغام دیا گیا تھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان پر حملے کئے جائیں گے۔

ہر سال خواتین کے تحفظ اور ان کی ترقی کے وعدے کئے جاتے ہیں جو کبھی پورے نہیں کئے جاتے۔ 2014ء کا سال پچھلے برسوں سے کسی صورت مختلف نہیں تھا۔ صوبائی حکومتوں نے خواتین کے لئے متعدد خصوصی اقدامات کا اعلان تو کیا لیکن ان میں سے اکثر وعدے محض بیانات تک ہی محدود رہے اس لئے کہ ان وعدوں پر عمل درآمد کے لئے عملی اقدامات کے بارے میں سوچا تک نہیں گیا۔ بہرحال ان تمام تر مشکلات کے باوجود پاکستان کی خواتین نے مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی کے باعث اعزازات حاصل کئے۔ ملالہ یوسفزئی نے پہلی پاکستانی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ دینا کی کم عمر ترین خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کیا جسے امن کا نوبیل انعام (نوبل پیس پرائز) کا حقدار قرار دیا گیا اور انہوں نے یہ انعام وصول بھی کیا۔ اس کے علاوہ سال کے دوران متعدد دوسرے انعامات بھی حاصل کئے۔ دسمبر میں وزیراعظم محمد نواز شریف نے صحافی سے سفارتکار بننے والی خاتون ڈاکٹر ملیحہ لودھی کو اقوام متحدہ میں مستقل مندوب کے طور پر تعینات کیا۔ ان کا دفتر نیویارک میں ہے۔ اس سے قبل ملیحہ لودھی دو مرتبہ امریکہ میں 1993ء سے 1996ء اور 1999ء سے 2002ء تک پاکستان کی سفیر اور 2003ء سے 2008ء تک برطانیہ میں پاکستان کی ہائی کمشنر کے طور پر تعینات رہیں۔ ڈاکٹر ملیحہ لودھی تخفیف اسلحہ کے امور سے متعلق اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے مشاورتی بورڈ کی 2001ء سے 2005ء تک رکن رہیں۔ عاصمہ شیرازی وہ پہلی پاکستانی خاتون ہیں جنہوں نے جنگی امور کی نامہ نگار کے طور پر 2014ء میں پیٹر سیکلر ایوارڈ حاصل کیا۔ انہیں یہ ایوارڈ ان کی انسانوں کے باہمی روابط کے حوالے سے جرأت مندانہ رپورٹنگ کرنے پر دیا گیا۔ خواتین کی کرکٹ ٹیم نے ایشیائی کھیلوں میں پاکستان کے لئے پہلا اور واحد گولڈ میڈل جیتا۔

معاشی اور سماجی حقوق (مواقع اور چیلنج)

خواندگی کے پست معیار اور تعلیمی سطح کی متبادل صورت حال اور زندگی کو خوشگوار بنانے کے عمل یا تعلیم تک کمزور رسائی نے پاکستان کو ان دس ملکوں کی نچلی ترین سطح تک پہنچا دیا ہے جن میں غریب بچیوں کی بہت ہی کم تعداد کو سکولوں میں جانے کا موقع ملا ہے۔ یونیسکو کی ایجوکیشن فار آل گلوبل مانیٹرنگ رپورٹ (ای ایف اے جی ایم آر) جو اس بات کا جائزہ لیتی ہے کہ عالمی تعلیمی مقاصد کی طرف کوئی اقدام اٹھایا گیا ہے یا نہیں، کے تخمینہ کے مطابق صرف چھ ممالک جو سب کے سب افریقہ میں ہیں، ایسے ہیں جن کی صورت حال پاکستان سے بھی بُری ہے۔ اس رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ پاکستان میں سات سے پندرہ سال کی عمروں کے درمیان کی 62 فیصد بچیاں ایسی ہیں جنہوں نے کبھی کلاس روم میں وقت نہیں گزارا۔ اس کے

پاکستان میں سات سے 15 برس کی 62 فیصد لڑکیاں کبھی بھی سکول نہیں گئیں

مقابلے میں بھارت میں ایسی بچیوں کی تعداد 30 فیصد اور بنگلہ دیش میں 9 فیصد ہے۔ یاد رہے کہ یہ تقابل ایشیائی ممالک کے حوالے سے ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ پاکستان کا شمار ان دس ملکوں میں ہوتا ہے جہاں کی بہت کم خواتین نے اپنی زندگیوں کا کچھ وقت سکول میں گزارا۔ رپورٹ کے مطابق 17 سال سے 22 سال تک کے درمیان کی عمر کی خواتین نے زیادہ سے زیادہ ایک برس کا عرصہ سکولوں میں گزارا جب کہ ہندوستان میں اس عمر کی خواتین نے 2.9 برس اور بنگلہ دیش کی خواتین نے 4.4 برس سکولوں میں گزارے۔

اگرچہ پاکستان کے تازہ ترین سروے 14-2013ء میں پرائمری تعلیم، ثانوی تعلیم اور یوتھ لٹریسی میں صنفی تعدیل کے حوالے سے تو معمولی بہتری کا اشارہ ملتا ہے لیکن صنفی مساوات پر ایم. ڈی. جی۔ 3 کے مقرر کردہ اہداف حاصل کرنے میں ملک ناکام رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملازمتوں کے مواقع کے حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اس میں خواتین کے لئے غیر زرعی شعبوں میں ملازمت کا حصہ صرف 10.1 فیصد تھا۔ جبکہ گذشتہ دو دہائیوں کے دوران میں یہ حصہ تسلسل کے ساتھ بڑھا ہے۔ بہر حال سال 2015ء میں داخل ہوتے وقت غیر زرعی شعبوں میں خواتین کے لئے ملازمتوں کے مواقع ایم. ڈی. جی۔ 3 کے ہدف کے مطابق نہیں

تھے۔2014ء کے لئے یہ ہدف 14 فیصد مقرر کیا گیا تھا۔ 2014ء کی ہیومن ڈویلپمنٹ "ہیومن اسسٹینگ پراگریس: رڈیوسنگ ویمنز ایبلیٹیز اینڈ بلڈنگ ریزیلیئنس کے تیار کردہ صنفی عدم مساوات کے اشاریہ کے مطابق 2013ء میں پاکستان اس فہرست میں 123ویں نمبر پر تھا جبکہ 2014ء میں وہ مزید تنزلی کا شکار ہو کر 127ویں نمبر پر آ گیا یعنی وہ چار درجے مزید تنزلی کا شکار ہوا۔ جنیوا میں قائم بین الاقوامی اقتصادی فورم کی رپورٹ گلوبل جینڈر گیپ رپورٹ (جی. جی. جی. آر 2014ء) کے مطابق صحت، تعلیم اور کام تک رسائی کے حوالے سے عالمی سطح پر صنفی مساوات کی فہرست میں پاکستان کا نمبر آخری سے ایک درجہ پہلے ہے۔ پاکستان 141ویں درجے پر ہے جبکہ جی. جی. آر میں شامل ممالک کی کل تعداد 142 ہے۔ بین الاقوامی مزدور تنظیم کی گلوبل ویلیج رپورٹ 15-2014ء دسمبر 2014ء میں شائع کی گئی جس کے مطابق پاکستانی خواتین کے لئے تنخواہ والی ملازمتیں حاصل کرنے کے امکانات کم ہیں اور ان ملازمتوں پر جو خواتین تعینات ہیں وہ ایسی ہی ملازمتوں پر تعینات مردوں کی نسبت 38.5 فیصد کم اجرت حاصل کرتی ہیں۔

پاکستان ڈیموگرافک ہیلتھ سروے (پی ڈی ایچ ایس) 13-2012ء جو ایسی تازہ ترین تحقیقی رپورٹ ہے جس میں اہم ترین اعداد و شمار اور صحت سے متعلقہ اشاریوں پر مبنی تخمینہ جات دئے گئے ہیں۔ اس سروے میں پہلی بار ملک میں خواتین کے اختیارات کی سطح کو جانچا گیا ہے۔ حالیہ ترین سروے میں کہا گیا ہے کہ 15 سے 49 برس تک کی عمر والی خواتین کو انٹرویو کیا گیا جن میں سے 29 فیصد خواتین ایسی ملازمتوں پر کام کرتی تھیں جن پر انہی عمروں یعنی 15 سے 49 برس تک کے مرد کام کرتے تھے اور ان کی تعداد 98 فیصد تھی۔ شوہروں کی آمدنی پر کنٹرول کے حوالے سے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ؛ بلوچستان میں 71 فیصد، خیبر پختونخوا میں 68 فیصد، سندھ میں 35 فیصد اور پنجاب میں 25 فیصد مرد اپنی پوری کمائی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ سندھ میں 16 فیصد مردوں کا یہ کہنا تھا کہ کہاں، کتنا اور کیسے خرچ کرنا ہے، یہ فیصلہ عموی طور پر بیویاں کرتی ہیں۔

پاکستان نے مئی 2014ء میں امریکی حکومت کے ساتھ ایک یاداشت پر دستخط کئے تھے جس کا مقصد خواتین کو معاشی اعتبار سے خود مختار بنانے اور خواتین کی کاروباری صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لئے مشترکہ کوششیں کرنا تھا۔ اس یاداشت کا مقصد یہ تھا کہ دونوں حکومتیں ایسے مشترکہ منصوبے شروع کریں گی جن کے ذریعے پاکستانی خواتین کے کاروباری اداروں کو مثبت شکل دے کر ان کے معاشی اختیارات کو فروغ دیا جائے۔ اس کے علاوہ خواتین کے لئے کاروباری میدان کو وسعت دی جائے۔

صوبہ جات:

خواتین کے عالمی دن کی یاد میں منعقدہ ایک تقریب میں پنجاب حکومت نے خواتین کے معاشی حقوق کو آگے بڑھانے کے لئے متعدد اقدامات کا اعلان کیا۔ ان میں 47,000 لیڈی ہیلتھ ورکرز کو ملازمتوں پر ریگولر کرنا، پنجاب ڈے کیئر فنڈ میں موجود رقم سے کام کرنے والی خواتین کے لئے 65 ڈے کیئر مراکز قائم کرنا اور پنجاب سکلڈ ڈویلپمنٹ فنڈ کے لئے دیہی علاقوں کی چار ہزار خواتین کے لئے تربیتی پروگرام متعارف کرانا شامل تھا۔ پنجاب اسمبلی نے 8 مارچ کو فیئر ریپریزنٹیشن ایکٹ 2014ء منظور کیا جس کا مقصد فیصلہ سازی میں خواتین کی شرکت کو یقینی بنانا تھا۔ اس کے علاوہ اس قانون کا مقصد چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 1929ء میں ترامیم کرنا، مسلم شادیوں کے ایکٹ مجریہ 1939ء کا خاتمہ، ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ 1964ء اور ڈووری (جہیز) اینڈ برائیڈل گفٹس (رسٹرکشن) ایکٹ 1976ء کا خاتمہ تھا۔ خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والی خواتین نے جہاں اس قانون سازی کا خیر مقدم کیا، وہیں انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ 2012ء میں حکومت نے اسی قسم کے پیکیج کا اعلان کیا تھا جس میں گھریلو تشدد کے خلاف جن حفاظتی اقدامات کا اعلان کیا تھا ان پر مکمل طور پر کبھی عمل درآمد کیا ہی نہیں گیا۔

معاشی طور پر خواتین کو مضبوط کرنے کے لئے اعلان کیا گیا کہ مائیکروفنانس روزگار بینک جو قرضے دے گا ان کا 30 فیصد حصہ خواتین کو جاری کیا جائے گا جبکہ 50 فیصد حصہ کاربزنس لون سکیم کے تحت خواتین کے لئے مخصوص ہوگا۔ اس سکیم کا افتتاح وزیراعظم نے کیا۔ ستمبر میں پنجاب کے محتسب نے غیر شادی شدہ بیٹیوں کو فیملی پنشن وصول کرنے کا حقدار ٹھہرادیا اور اس حوالے سے محکمہ تعلیم اور فنانس ڈیپارٹمنٹ کے اعتراضات کو مسترد کر دیا۔

سندھ ویمن ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے چند منصوبوں کا اعلان کیا۔ محکمہ کو 15-2014ء کے مالی سال کے لئے نئی سکیموں کے لئے 8 کروڑ 70 لاکھ روپے کی رقم دی گئی۔ لیکن 10 نومبر کو ایک سوال کے تحریری جواب میں سندھ اسمبلی کو بتایا گیا کہ مالی سال کے پہلے چار ماہ کے دوران ایک روپیہ بھی جاری نہیں کیا گیا۔ اجلاس کو بتایا گیا کہ ڈائریکٹوریٹ آف ویمن ڈویلپمنٹ کے دفاتر کے لئے بجٹ میں 5 کروڑ پچاس لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی تاہم رقم جاری ہی نہیں کی گئی۔ سندھ کی دیہی خواتین کی ترقی اور ان کو معاشی طور پر بااختیار کرنے کے لئے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی اور دو کروڑ روپے کی رقم دیہی یا انتہائی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لئے مائیکروفنانسنگ پروگرام اور فنی

نامعلوم مسلح افراد کے ہاتھوں نشانہ بننے والی خاتون پولیو ورکر کے رشتہ دار جناح پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل سنٹر کراچی کے مردہ خانے کے سامنے ماتم کُناں ہیں

پیشہ ورانہ تربیت کے لئے رکھی گئی تھی اور یہ رقم فرسٹ ویمن بینک کے ذریعے تقسیم ہونی تھی۔ لیکن ان سکیموں کے لئے کوئی رقم جاری نہ کی گئی۔ 2013-14ء کے دوران خواتین کی ترقی کے محکمہ کی سکیموں کے لئے 34 کروڑ اسی لاکھ روپے کی جو رقم جاری منصوبوں کے لئے مختص کی گئی تھی اس میں سے صرف دو کروڑ 48 لاکھ روپے (صرف سات فیصد) کی رقم جاری کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ترجیحات میں خواتین کو کہاں جگہ دیتی ہے۔

اس تمام تر صورت حال کے باوجود سندھ ویمن ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے جنوری 2014ء میں بی اے کی ڈگری رکھنے والے تیسری جنس کے تین افراد کو ملازم رکھا۔ اس کا مقصد تیسری جنس کے حقوق کو ایک طریقے سے فروغ دینا تھا۔ اکتوبر میں وزارت محنت اور ویمن ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے جو پیکیج تجویز کیا تھا اس کو سندھ حکومت نے منظور کرلیا۔ اس پیکیج کے مطابق سرکاری اداروں کی ملازمتوں میں 33 فیصد نمائندگی خواتین کو دی جانی ہے۔ مزید برآں سندھ کے محکمہ صحت نے بھی ایسی خواتین کے لئے ملازمتوں کا الگ سے کوٹہ مقرر کرنے کا وعدہ کیا جنہیں تیزاب پھینک کر یا مٹی کا تیل چھڑک کر جلانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بچ گئیں۔ اپاہج افراد کے لئے ملازمتوں کا کوٹہ پہلے سے موجود ہے۔

پولیس ٹریننگ سنٹر نوشہرہ پختونخوا میں خواتین پولیس کمانڈوز تربیتی مشقوں کے دوران

خیبر پختونخوا میں 36 خواتین پر مشتمل خواتین کا پہلا اینٹی ٹیررا سکواڈ قائم کیا گیا۔ ان کمانڈو لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ ہی تربیت دی گئی تھی۔ خواتین شکایت کنندگان کی مدد کے لئے پولیس سٹیشنوں میں خواتین کے لئے سہولتی ڈیسک قائم کئے گئے۔ بہر حال بہت کم خواتین شکایت کنندگان تھانوں میں شکایات درج کرانے کے لئے آئیں۔ سماجی رسم و رواج کے باعث یہاں کی خواتین تھانوں میں جا کر شکائتیں درج کرانے کی بجائے گھروں میں خاموش بیٹھ جانے کو ترجیح دیتی ہیں اور وہ روائتی ماؤں بیویوں کے کردار سے آگے نہیں بڑھتیں۔ مردوں کے برابر ملازمتیں حاصل کرنے اور معاشی تبدیلی میں حصہ ڈالنے کے خواب دیکھنے والی لڑکیوں کو بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر صوبہ پختونخوا کی آبادی دو کروڑ بیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ صوبے کے محکمہ صحت میں 40 ہزار خواتین ملازم ہیں جبکہ مرد لیبر فورس کی تعداد سات لاکھ ہے۔ سرکاری شعبہ میں قائم میڈیکل کالجوں میں سینکڑوں لڑکیاں داخل ہیں لیکن پورے صوبے میں صرف چھ سو خواتین ڈاکٹر ہیں جبکہ مرد ڈاکٹروں کی تعداد چھ ہزار ہے۔ صوبے میں ایک لاکھ انیس ہزار دو سو چوہتر اساتذہ ہیں جن میں خواتین کی تعداد صرف 41,102 ہے۔ مینوفیکچرنگ کے شعبہ میں بھی حالات کوئی زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ خیبر پختونخوا میں تقریباً دو سو صنعتی یونٹ کام کر رہے ہیں جن میں کام کرنے والوں میں صرف تین فیصد

خواتین ہیں۔

جہاں تک صوبہ بلوچستان کا تعلق ہے تو یہاں قطرے پلانے والی خاتون ورکروں کو بدتر حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں پولیو ٹیموں پر حملے کئے جاتے ہیں۔ 26 نومبر کو کوئٹہ میں اسلحہ برداروں نے چار پولیو ورکرز کو قتل کر دیا جن میں تین خواتین تھیں۔ پشاور میں چارسدہ روڈ پر اسلحہ برداروں نے ایک خاتون ہیلتھ ورکر کو ہلاک کر دیا۔ کالعدم تحریک طالبان پاکستان، جماعت الاحرار، نے اس حملہ کی ذمہ داری قبول کی۔ خوف اور دھمکیاں ان کی زندگیوں کا حصہ بن گئی ہیں۔ پولیو ورکرز کو قتل کے واقعات نے ان کارکنوں اور خصوصاً خواتین رضا کاروں اور لیڈی ہیلتھ ورکرز میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے۔ پولیو کے خلاف مہم میں حصہ لینے والی زیادہ تر خواتین کا تعلق انتہائی غریب گھرانوں سے ہے۔ انہیں دیہاڑی کی بنیاد پر معمولی سی رقم دی جاتی ہے لیکن زیادہ تر خواتین رضا کاروں اور لیڈی ہیلتھ ورکرز شکائت کرتی ہیں کہ محکمہ صحت ان کی معمولی سی اجرت کی ادائیگی میں بھی بہت زیادہ تاخیر کرتا ہے۔ اکتوبر میں سپریم کورٹ کے حکم پر دارالحکومت اسلام آباد میں کام کرنے والے 366 لیڈی ہیلتھ ورکروں کی ملازمتوں کو باقائدہ کر دیا ہے۔ بلوچستان کی حکومت نے اپریل 2014ء میں سات ہزار لیڈی ہیلتھ ورکروں کی ملازمتوں کو باقاعدہ کر دیا۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کا ایک مشن گلگت بلتستان گیا جہاں سے واپسی پر اس نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں گلگت بلتستان ایمپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر 2009ء کے تحت علاقے میں اس نظام پر عمل درآمد کی صورت حال اور متعارف کروائے گئے نظام کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ اس دستاویز میں انسانی حقوق سے متعلق اہم معاملات کا جائزہ لیا گیا اور آبادی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کے تاثرات ریکارڈ کئے گئے اور ان کی تشویش کو قلمبند کیا گیا۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ گروپ نے طالبات اور ملازمت کرنے والی خواتین سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے پوچھا کہ کیا اس آرڈر کے نفاذ سے کوئی بہتری آئی اور کیا نئے نظام کے تحت ان کی آواز پر کان دھرے جاتے ہیں؟

انہوں نے بتایا کہ "ایمپاورمنٹ آرڈر" کا ہم نے خیر مقدم کیا اس لئے کہ اس سے کچھ تبدیلی آئی۔ سکردو میں خواتین کو اس حقیقت سے آشنائی ہوئی کہ انہیں اپنی زندگیوں پر اختیار حاصل ہے اور چیزوں میں بہتری آئی ہے۔ اس احساس میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ سکردو میں قائم قراقرم یونیورسٹی کے کیمپس میں لڑکوں کی نسبت طالبات کی تعداد زیادہ تھی۔ بلتستان میں لڑکیوں کی تعلیم کو مذہبی رہنماؤں کی حمائت حاصل ہے۔ مذہبی رہنماؤں اور مذہبی دانشوروں کے ترقی پسندانہ کردار کے باعث بلتستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لڑکیوں سے ان کی شادی کے حوالے سے باقاعدہ مشورہ کیا جاتا ہے۔ تاہم گفتگو میں

شریک چند افراد نے بتایا کہ عام طور پر بیٹیاں اپنے والدین کے تجویز کئے گئے رشتوں کو مسترد کرنے سے احتراز کرتی ہیں۔علاقے میں کاروکاری جیسی رسمیں قطعاً ناپید ہیں۔

لڑکیوں کے موبائل فون استعمال کرنے کے خلاف بلتستان میں ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس پر عدم اتفاق پیدا ہوا۔ جمعہ کے خطبات میں لڑکیوں کی طرف سے سیل فون پر خلاف آداب گفتگو کا حوالہ آیا۔اس کے سوا اور کوئی بات نہ ہوئی۔

گلگت میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے متحرک افراد کے ساتھ ایک ملاقات میں حقائق جاننے والی ٹیم کے ارکان کو ان مشکلات کا علم ہوا جن کا سامنا علاقے کی خواتین کو کرنا پڑتا ہے۔ان خواتین نے بتایا کہ ہُنزہ اور اس جیسے علاقوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہاں خواتین کے لئے تعلیم اور ان کی صحت اور خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا اور ان مقاصد کے حصول کے لئے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) پر کسی قسم کی قدغن نہیں ہے۔مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ان خواتین نے کہا کہ ضلع دیامر میں کوئی گائنا کالوجسٹ اس وجہ سے تعینات نہیں ہے کہ ایسی تعیناتی سے مذہبی رہنماؤں کو پریشانی ہوتی ہے۔

نگر کی خواتین کو اس وجہ سے پچھڑا ہوا رکھا جاتا ہے کہ وہاں کے مرد خواتین کو تعلیم دینے کی سخت مزاحمت کرتے ہیں۔لیکن خواتین کی تنظیمیں صورت حال کو بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور وہ والدین کو قائل کرتی ہیں کہ وہ اپنی بچیوں کی تعلیم کو بھی یقینی بنائیں۔ جہاں تک گلگت بلتستان میں خواتین کی آگہی کا تعلق ہے تو اس کا مقابلہ "جنوبی علاقوں" کی آگہی کے ساتھ تو نہیں کیا جاسکتا لیکن گذشتہ چند دہائیوں کے دوران مختلف شعبوں میں خواتین کی شرکت کے سبب اس علاقے میں بہت بہتری آئی ہے۔اگر چہ سماجی طور پر خواتین کی حیثیت کافی کمزور ہے لیکن اس کے باوجود تعلیم کے سبب ان کو اپنے حقوق کی زیادہ آگاہی ہوئی۔

حالیہ چند برسوں کے دوران گلگت بلتستان میں خواتین کی فعالیت میں اضافہ ہوا ہے۔آغا خان رورل سپورٹ پروگرام (اے کے آر ایس پی) کے شروع ہونے سے سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ خاص طور پر خواتین کی تعلیم اور خواتین کی ترقیاتی تنظیموں کے قیام پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔خواتین پر قبائلی دباؤ میں کچھ کمی آئی ہے۔خواتین کے خلاف تشدد، نام نہاد عزت کے لئے قتل اور بچوں کے ساتھ زیادتی وہ مسائل ہیں جن پر خواتین کے حقوق کی تنظیموں کو سخت تشویش لاحق ہے۔

عزت کے نام پر ہونے والے قتل کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو فرقہ وارانہ عصبیت سے

جڑے ہوئے ہیں۔علاقے میں بہت سے فرقوں کی موجودگی کے باعث فرقہ وارانہ بنیادوں پر کم عمر بچیوں کی شادیاں عام تھیں۔گلگت بلتستان میں یہ سول سوسائٹی کی کمزوریاں تھیں کہ وہ بہت سی خواتین کی اموات کی صحیح طور پر تفتیش نہیں کر پائی۔یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان خواتین کی اموات عزت کے نام پر قتل تھیں، وہ حادثاتی طور پر ڈوب گئی تھیں یا انہوں نے خودکشیاں کی تھیں۔دیامر میں عزت کے نام پر قتل کی رپورٹیں سامنے آئی تھیں۔اس کے علاوہ عورتوں کا علاج معالجہ اس لئے نہیں کرایا گیا کیونکہ ان کے مردوں کو خوف تھا کہ اس طرح خواتین کی بے پردگی ہوگی۔

صحت

پاکستان ڈیموگرافک ہیلتھ سروے (پی ڈی ایچ ایس) برائے سال 2012-2013 کا اجراء 2014 میں ہوا۔پی ڈی ایچ ایس نے پندرہ سے پینتالیس برس کی 14 فیصد خواتین کو لاغر جبکہ چالیس فیصد کو فربہ قرار دیا۔شہری علاقوں کی خواتین کے ہاں بچوں کی پیدائش کی شرح 3.2 بچے فی عورت جبکہ دیہات میں یہ شرح 4.2 بچے فی عورت تک ہے۔

عالمی تنظیم سیو دی چلڈرن (Save the children) کی ماؤں کی حالت زار سے متعلق عالمی رپورٹ 2014 میں پاکستان ماں بننے کے لیے دنیا کا ''خطرناک ترین'' ملک قرار دیا گیا ہے۔پاکستان کو 178 ممالک میں ماؤں کی حالت زار کے اعتبار سے 147واں درجہ دیا گیا ہے جو جنوبی ایشیا کے تمام دیگر ممالک سے بھی بدتر ہے۔اگرچہ پاکستان میں زچگی کے دوران اموات کی شرح، قدرتی آفات اور تنازعات کے باعث پاکستان ایم ڈی جی 5 کے مقرر کردہ اہداف کی شرح کے مطابق کام کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔رپورٹ کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں زچگی کے دوران 59 فیصد اموات کا قدرتی آفات اور تنازعات سے متاثرہ 45 ریاستوں میں واقع ہوتی ہیں جن میں پاکستان بیسویں نمبر پر ہے۔پی ڈی ایچ ایس 2012-2013 کے مطابق پاکستان میں ہر ایک لاکھ زچگیوں کے دوران 278 ہلاکتیں ہوتی ہیں۔پاکستان میں صرف 41 فی صد زچگیاں تربیت یافتہ عملے کے ہاتھوں انجام پاتی ہیں۔کونٹیک انٹرنیشنل نامی نگہداشت، مشاورت اور انتظامی امور کی تنظیم کی ریسرچ اینڈ ایڈووکیسی فنڈ (RAF) کی معاونت سے کی گئی ایک اور تحقیق کے مطابق پاکستان زچگی کے دوران پیچیدگیوں/ مسائل کی وجہ سے ہونے والی 16000 اموات کے باعث دنیا بھر میں چوتھے نمبر پر ہے۔یونیسیف کے ڈیموگرافک ہیلتھ سروے 2014 کے مطابق پاکستان کی ہر سات میں سے ایک ماں کو دوران حمل تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

Maternal Mortality in Pakistan

276/100,000 live births

Source: Pakistan Demographic Health Survey (PDHS) 2012/13

ذریعہ معلومات: پاکستان آبادیاتی ہیلتھ سروے (پی ڈی ایچ ایس)

عسکری تحریکوں، فوجی کارروائیوں اور سیلابی طغیانیوں کے باعث ملک میں عورتوں کی مجموعی صحت کی صورت حال متاثر ہوئی ہے۔ جولائی 2014 تک فاٹا ڈیزاسٹر مینجمنٹ کے پاس فوجی کارروائی کے دوران بے گھر ہونے والے 261734 خواتین کا اندراج ہو چکا تھا۔ صفائی ستھرائی کے نامناسب انتظامات کے باعث ان میں سے بیشتر خواتین میں سانس، پیٹ، جلد اور آلودہ پانی کے استعمال سے لگنے والی دیگر بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 17 جولائی 2014 تک عالمی ادارہ صحت کے رپورٹ کے مطابق شمالی وزیرستان میں جنگ کے باعث 950,000 افراد بے گھر ہو چکے تھے جن میں سے 73 فیصد بچے اور عورتیں تھے۔

چالیس کے قریب قبائلی عمائدین نے بے گھر افراد کی خواتین کو امداد حاصل کرنے سے روک دیا، ان کا کہنا تھا کہ، "خوراک کی تقسیم کی جگہ پر آنے والی خواتین کو سزا دی جائے گی۔" خوراک، پانی اور ادویات حاصل کرنے کے لیے قطار بند بے گھر خواتین سرتاپا برقعے میں ملبوس ہونے کے باوجود قبائلی عمائدین کے غضب کا نشانہ بنیں۔ بنوں سٹیڈیم میں صحافیوں اور سیکیورٹی اہلکاروں نے ایک قبائلی سردار کے ہاتھوں خوراک کے حصول کے لیے قطار میں کھڑی کئی خواتین کے پٹنے کا منظر دیکھا۔ اس دوران کسی نے اس سردار کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور مار کھانے والی کئی خواتین سمیت درجنوں خوراک حاصل کیے بنا ہی جانے پر مجبور ہو گئیں۔

قبائی عمائدین کی جانب سے بانٹے گئے ایک پرچے میں خواتین کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا گیا" ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب سے کوئی عورت خوراک کی تقسیم کے مقامات پر نہیں جائے گی۔ وزیرستان کے

لوگ اپنی عورتوں کو گھروں میں رکھیں۔" اس پرچے میں یہ بھی کہا گیا، "خلاف ورزی کی صورت میں قبائلی سردار گھروں میں جا کر ذمہ داران مردوں کو مناسب سزا دیں گے۔" امدادی سامان کے حصول کے لیے قطار بند خواتین پر تشدد کے متعدد واقعات کے بعد (بظاہر) فوج نے امدادی سامان کی تقسیم کیلیے سپورٹس کمپلیکس میں قائم مرکز پر خواتین کی آمد پر پابندی عائد کر دی۔ بیوہ اور محرم مردوں سے محروم خواتین کے لیے کسی قسم کی ہدایات نہیں دی گئی تھیں۔ بچے اور بیشتر خواتین شناختی کارڈ سے محروم ہونے کے باعث امدادی سامان کے حصول کے اہل نہیں تھے۔ سم کارڈ کے ذریعے وصول ہونے والی امداد بھی خواتین کی دسترس میں نہیں تھی۔ ثقافتی پابندیوں کا شکار خواتین خیبر پختونخواہ حکومت کی جانب سے دیے گئے 7000 ماہانہ، پنجاب حکومت کے دیے گئے 8000 ماہانہ اور وفاقی حکومت کے دیے 30000 ہزار کا رمضان پیکج حاصل کرنے میں بھی ناکام رہیں۔ سپورٹس کمپلیکس میں داخلے پر پابندی کے باعث خواتین خیراتی امدادی پیکج سے مبرا دیگر مراکز کا رخ کرنے پر مجبور تھیں۔ جنگ زدہ علاقوں سے نقل مکانی کے بعد کئی حاملہ خواتین کے ہاں بچے کی پیدائش کے دوران صحت کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بے گھر افراد کے لیے صحت کی ناکافی سہولیات سب سے بڑا مسئلہ رہی ہیں۔ تولیدی ادویہ کی عدم موجودگی اور محض چار گائناکالوجسٹ ڈاکٹروں کی موجودگی کے باعث بہت سی خواتین کی تولیدی صحت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ جولائی میں عالمی ادارہ صحت نے خیبر پختونخواہ حکومت کے ساتھ مل کر بنوں میں قائم بچوں کے ہسپتال میں چالیس ہزار سے زائد بے گھر حاملہ خواتین کی نگہداشت اور بے گھر افراد کو سہولیات فراہم کرنے والے بیس مراکز صحت پر سہولیات کی فراہمی کا منصوبہ شروع کیا۔

قحط، غربت اور صحت کی ناکافی سہولیات کے باعث پاکستان کے 22000 مربع کلومیٹر اور پندرہ لاکھ آبادی پر مشتمل غربت تھر میں بچوں کی ایک تشویش ناک حد تک بڑی تعداد نمونیے اور ہیضے کی شکار ہوئی ہے۔ خشک سالی سے ہونے والے قحط کے باعث مویشیوں کی اموات اور علالت کی وجہ سے بچے اور عورتیں اپنی واحد غذا یعنی دودھ اور اس سے بنی اشیاء سے محروم ہو گئے۔ ایک شدید موسم سرما نے دودھ پلانے والی لاغر ماؤں اور نوزائیدہ بچوں کے لیے صورت حال مزید خراب کر دی۔ غذائیت کی کمی سے قوت مدافعت کم ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سردی اور بھوک کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ صحراوں میں خشک سالی فطری امر ہے لیکن اموات نہیں۔ صحت کی ناکافی سہولیات اور قحط سے عورتوں کی صحت متاثر ہونے کی وجہ سے غزائیت کی کمی کا شکار بچے پیدا ہوئے۔ ڈاکٹروں کی نصف نشستیں خالی ہیں اور مٹھی کے علاوہ کہیں بھی خاتون ڈاکٹر موجود نہیں۔ تھر میں ہونے والی اموات پر سندھ کی حکمران جماعت پیپلز پارٹی کو تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

گلگت بلتستان کے حکام کو تحریک طالبان پاکستان کے مقامی نمائندے کی جانب سے چلاس کے

مرکزی ضلعی ہسپتال کے الٹراساونڈ مرکز پر حملے کی دھمکی موصول ہوئی کیوں کہ ان کے مطابق یہ خلافِ شرع تھا، تاہم یہ مرکز بند نہیں کیا گیا۔ پاکستان سمیت پندرہ ایشیائی ممالک میں خواتین کے جنسی اور تولیدی حق کو سرکاری سطح پر تسلیم کرانے کے لیے مئی میں ایک مہم کا آغاز کیا گیا تھا۔

2014 میں خواتین کی منصفانہ نمائندگی کا قانون منظور کیا جانا فیصلہ سازی میں عورتوں کی شمولیت کے حوالے سے ایک اہم قدم ہے۔ اس قانون کے تحت تمام آئینی اداروں، سرکاری محکموں، خصوصی ٹاسک فورسز اور صوبائی کمیٹیوں میں خواتین کے لیے تینتیس فی صد نشستیں مخصوص ہیں۔

گلگت بلتستان میں مقامی حکومتوں کے قانون 2014 کے مطابق خواتین کے لیے کوٹہ مختص کیا گیا اور تمام مقامی کونسلوں کے فعال قرار پانے کے لیے ان نشستوں کا پر کیا جانا لازم قرار دیا گیا ہے۔

مرکز برائے سماجی تحقیق اور اقوام متحدہ کے اشتراک سے 2012-2013 میں "سیاست میں شامل خواتین پر تشدد" کے نام سے ہونے والی ایک تحقیق کے دوران یہ ظاہر ہوا کہ خواتین امیدواروں اور رائے دہندگان کی تعداد میں اضافے کے باوجود قومی اداروں میں خواتین کی نمائندگی میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔ اس تحقیق کے دوران ہر تین میں سے ایک فرد کے خیال میں سیاست کو مردانہ شعبہ تصور کرنا سیاسی عمل میں خواتین کے خلاف تشدد کی اہم وجہ ہے۔ خیبر پختونخواہ سے تحقیق میں شریک تمام افراد کے خیال میں خواتین کی سیاسی عمل میں شمولیت کی راہ میں پردہ سب سے بڑی روکاوٹ ہے۔ 48 فی صد کے خیال میں سیاست میں شمولیت کے لیے خواتین کو اپنے گھر سے اجازت طلب کرنی چاہیے جبکہ 78 فی صد کے خیال میں منتخب ہونے والی خواتین کو اپنے گھریلو امور پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ تحقیق میں شامل دو تہائی افراد کے مطابق پولیس عورت کے پر امن سیاسی جدو جہد میں شریک ہونے کے حق کو تسلیم نہیں کرتی، 70 فیصد کے خیال میں سیاسی عمل میں شامل خواتین پر تشدد کے واقعات سامنے نہ آنے کے باعث اس تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔

سرچ فار کامن گراونڈ (SCG) کے تحت "پاکستان میں موثر جمہوری حکومت کے لیے سیاست میں خواتین کی شمولیت اور قیادت" کے موضوع پر کی گئی تحقیق مئی میں جاری کی گئی۔ اس تحقیق کے نتائج بھی اقوام متحدہ کی خواتین کی تحقیق جیسے ہی تھے۔ تحقیق سے ثابت ہوا؛ با اثر خاندانی پس منظر خواتین کی سیاسی شمولیت میں اضافہ کا باعث ہے؛ راسخ پدرسری روایات کے باعث مرد عورتوں کی قیادت تسلیم نہیں کرتے؛ سماجی دباؤ کے باعث خاتون سیاستدان ذرائع ابلاغ پر آنے سے گریزاں ہیں؛ سیاسی جماعتوں میں خاتون سیاستدانوں کے روابط استوار نہ ہونے کے باعث ان کی سیاسی قوت کم ہوتی ہے۔ اس پورٹ میں سیاست میں خواتین کی بہتر شمولیت کے لیے انتخابات لڑنے کے مساوی مواقع پیدا کرنے اور خواتین کی انتخابی اہلیت پر

توجہ دینے، مرد سیاستدانوں اور سیاسی قیادت کی حمایت، حکومتی اہلکاروں سے بہتر تعلقات کار اور ذرائع ابلاغ میں خاتون سیاستدانوں کی نمائندگی کی تجاویز دی گئی ہیں۔

خیبر پختونخواہ کی خاتون ارکان اسمبلی نے خواتین کی سیاسی و معاشی خوداختیاری کے لیے 2014-2015 کے سالانہ ترقیاتی منصوبے کے لیے پروگرام وضع کیا ہے۔

صوبے میں خواتین کے حقوق کے فروغ اور قانون سازی کے لیے پنجاب کی خاتون اراکین اسمبلی پر مشتمل تنظیم مارچ میں قائم کی گئی تھی۔ سندھی خواتین کی حالت زار میں بہتری لانے کے لیے سندھ اسمبلی کی خاتون اراکین کی تنظیم اکتوبر میں تشکیل پائی جس کا مقصد آزادی نسواں، خواتین کو بااختیار بنانے اور ترقی کے مواقع فراہم کرنے کے لیے اتفاق رائے قائم کرنا تھا۔ بلوچستان اسمبلی میں خاتون اراکین کی تنظیم قرارداد منظور ہونے کے باوجود تشکیل نہیں دی جاسکی۔

اکتوبر میں خیبر پختونخوا کی خاتون اراکین اسمبلی نے مرد اراکین کے مقابلے میں ترقیاتی فنڈ سے محروم کیے جانے پر حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ تمام 22 خاتون اراکین نے احتجاجاً اسمبلی سیشن سے واک آوٹ بھی کیا۔ تمام اراکین اسمبلی کو ہر سال ترقیاتی فنڈ کی مد میں 2 کروڑ روپے جاری کیے جاتے ہیں۔

سال بھر کی مشاورت کے بعد ایچ آر سی پی نے الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کی تجاویز پیش کیں جن میں کم سے کم ایک خاتون الیکشن کمشنر کی تجویز بھی شامل ہے۔

انصاف تک رسائی اور قانون سازی میں تبدیلیاں

عالمی گرل چائلڈ ڈے کے موقع پر قانون، انصاف اور انسانی حقوق کی وزارت نے مشکل کا شکار خواتین کے لیے 24 گھنٹے کی ہیلپ لائن قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ سال کے اواخر تک یہ ہیلپ لائن (1414) چند شہروں میں متعارف کرادی گئی ہے جہاں خاتون پولیس اہلکار مشکل کا شکار خواتین کی شکایات سننے پر مامور ہیں۔

ستمبر 2014 میں سندھ حکومت نے ٹھٹھ، عمرکوٹ، سانگھڑ، نواب شاہ اور خیر پور کے اضلاع میں زنانہ تھانے قائم کرنے کا اعلان کیا۔ عورتوں کو بہتر سہولیات کی فراہمی کے لیے کراچی کے نئے تھانوں میں محکمہ بہبود خواتین کے کاونٹر قائم کرنے کی ہدایات بھی جاری کی گئی ہیں اور پولیس میں 2000 خاتون اہلکار بھرتی کرنے کا ابھی اعلان کیا گیا ہے۔ سندھ میں پہلی مرتبہ خاتون ایس ایچ اوز کو تین تھانوں کا اختیار دیا گیا، ان میں سے دو کو اپریل میں جبکہ ایک کو اگست 2014 میں یہ اختیارات تفویض کیے گئے۔ اوائل فروری میں عالمی انسداد منشیات اور نفاذ قانون کے عالمی بیورو نے کراچی کی خاتون پولیس اہلکاران کے لیے بسیں تحفے میں دیں۔

اپریل 2014 میں خیبر پختونخوا حکومت نے صوبے بھر کے 500 تھانوں میں خواتین ڈیسک قائم کرنے کا اعلان کیا۔حکومت نے محکمہ پولیس میں خواتین کی تعداد بڑھانے کے لیے منصوبہ سازی کا بھی اعلان کیا۔

جیلوں میں قید خواتین کے لیے حالات پہلے کی طرح کشیدہ رہے۔اقوام متحدہ کے دفتر برائے منشیات وجرائم کے 2014 کے سروے میں مختلف جیلوں میں قید 800 خواتین کی حالت زار کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سروے کے مطابق ان خواتین کو جیلوں میں غلاظت بھرے ماحول، ہراسیمگی، صحت اور تربیت کی سہولیات کے فقدان کا سامنا ہے۔جیلوں میں نفسیاتی معالجین کی عدم موجودگی کے باعث قیدی خواتین کی نفسیاتی صحت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ پاکستان کی مختلف جیلوں پر ایچ آر سی پی کے 2013-2014 میں کیے گئے سروے کے مطابق ان میں سے کسی میں کل وقتی خاتون ڈاکٹر موجود نہیں۔ ایسی جیلوں میں خاتون قیدیوں کو لاحق سنگین بیماریوں کے علاج کے لیے مقامی ہسپتالوں میں بھیجا جاتا ہے۔ یو این او ڈی سی کے مطابق پاکستان کی جیلوں میں قید خواتین خودکشی پر مائل ہونے، نیند کی کمی اور منشیات پر انحصار سمیت کئی نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں۔

صوبوں میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے کئی قوانین متعارف کرائے گئے ہیں۔خواتین کی سماجی ومعاشی بہبود کے لیے اور صنفی امتیاز کی تمام صورتوں کے خاتمے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا۔اس مقصد کے لیے پنجاب کمیشن آن سٹیٹس آف ویمن ایکٹ 12 فروری 2014 کو منظور کیا گیا۔ وزیراعلی پنجاب کی طرف سے حقوق نسواں کو یقینی بنانے کے لیے چائلڈ میرج ایکٹ 1929، جہیز، شادی، تولیت، نکاح نامے اور جائیداد کی تقسیم کے قوانین میں تبدیلیوں کے اعلان کے باوجود سال کے اختتام تک کوئی عملی پیش رفت نہیں کی جاسکی۔

سندھ میں شادی کی کم سے کم حد 18 برس مقرر کرنے کے لیے بچپن کی شادی کی روک تھام کے 1929 کے قانون میں ترمیم کی گئی۔ بلوچستان میں گھریلو تشدد کے امتناع کا قانون جون 2014 میں منظور کیا گیا تھا، اس قانون کے نفاذ کے لیے درکار میکنزم کی تیاری کے لیے محکمہ بہبود خواتین سال کے آخر تک کام کا آغاز کر چکا تھا۔محکمہ بہبود خواتین کی جانب سے خواتین کے مرتبہ کے حوالے سے ایک قانون کا مسودہ اسمبلی میں پیش کیے جانے سے قبل صوبائی محکمہ قانون کو تبصرے کے لیے بھجوایا گیا ہے۔

2014 میں موجودہ قوانین میں ترمیم اور نئے سامنے آنے والے مسائل پر قانون سازی کے لیے نجی اراکین کی جانب سے پیش کیے جانے والے متعدد بل اسمبلی میں پیش کیے گئے۔ ہندو برادری میں شادی اور طلاق کے معاملے پر ہندو میرج بل 2014 پیش کیا گیا۔آئی سی ٹی کے لیے تیزاب چھڑکنے کے مقدمات کی سماعت اور تیزاب کی خرید وفروخت کی نگرانی سے متعلق ایک قانون (نجی رکن کا پیش کیا گیا بل)

مارچ 2014 میں پیش کیا گیا۔ وفاقی دارالحکومت کی حدود میں شادی کی کم سے کم عمر اٹھارہ سال کرنے کے لیے کم عمری کی شادی کی روک تھام کا ترمیمی قانون بھی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ مئی 2014 میں انسداد جنسی ہراسانی (ترمیمی) بل 2014 جمعیت علمائے اسلام (ف) کی اقلیتی رکن آسیہ ناصر نے پیش کیا۔ اس بل میں اندراج شدہ اور غیر اندراج شدہ شعبوں میں جنسی ہراسگی، ملازم اور آجر کی تعریف میں وسعت اور اس بل کے تحت ووکیشنل ٹریننگ اور تعلیم کے شعبے میں ہر قسم کی تعلیم پانے والوں اور تربیت پانے والوں کو تحفظ دینے کی تجویز دی گئی تھی۔ سال کے آخر تک ان قوانین اور ترامیم کے حوالے سے کسی قسم کی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

خواتین کے خلاف تشدد

پاکستان میں خواتین پر تشدد نفسیاتی اور جسمانی سمیت کئی شکلوں میں موجود ہے اور بعض صورتوں میں متاثرہ فرد یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے اپنے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک تشدد کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک غیر سرکاری تنظیم عورت فاونڈیشن کے مطابق 2014 میں روزانہ چھ عورتیں اغواء، چار ریپ اور چھ قتل کی گئیں اور تین خواتین نے خودکشی کی۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی جانب سے خواتین کے خلاف جرائم کے اخباری جائزے کے مطابق 2014 میں 597 خواتین کو جنسی زیادتی اور 823 کو اجتماعی جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ ایچ آر سی پی کے مطابق 36 خواتین کو برہنہ گھمایا گیا۔

محکمہ داخلہ کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں 18,700 افراد جن میں اکثریت خواتین کی تھی اغواء کی گئیں۔ محکمہ داخلہ کے اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر میں اجتماعی جنسی زیادتی کے 326 واقعات رپورٹ کیے گئے جن میں سے 263 پنجاب، 35 سندھ، 11 خیبر پختونخواہ اور 17 اسلام آباد میں پیش آئے۔ 3243 کے لگ بھگ جنسی زیادتی کے واقعات بھی رپورٹ کیے گئے جن میں سے 2734 پنجاب، 191 سندھ، 135 کے پی، 19 بلوچستان، 162 اسلام آباد اور چار گلگت بلتستان میں رونما ہوئے۔

جنسی زیادتی کے واقعات کو ذرائع ابلاغ اپنی دکان چمکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ صحافی جنسی زیادتی کے متاثرین کا ہسپتال کے بستر تک پیچھا کرتے ہیں اور متاثرہ فرد کے اغواء اور جنسی زیادتی کی تفصیلات بار بار دہراتے ہیں جو لاکھوں لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ متاثرہ فرد کے خاندان کی طرف سے ذرائع ابلاغ کے ذریعے انصاف کے حصول کی توقع (بدقسمتی سے) انہی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ غیر ضروری میڈیا کوریج کے باعث متاثرہ فرد لوگوں کے لیے موضوع بحث بن جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں متاثرہ فرد کی شناخت ظاہر کرنا غیر اخلاقی اور غیر قانونی اقدام ہے۔ خلوت کا حق بنیادی انسانی حق ہے۔ ریاست کے

چوتھے ستون کے طور پر ذرائع ابلاغ کو اس حق کا احترام کرنا چاہیے۔

ذرائع ابلاغ سنگین واقعات کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ مظفر گڑھ سے تعلق رکھنے والی جنسی زیادتی کا شکار ہونے والی لڑکی نے مبینہ طور پر ایک رپورٹر کے کہنے پر مزید توجہ حاصل کرنے کے لیے پٹرول چھڑک کر خودسوزی کی (جس سے بعدازاں 14 مارچ 2014 کو اس کی موت واقع ہوگئی)۔ رپورٹر نے اسے بچانے کی یقین دہانی کرائی تھی اور کہا تھا، "پریشان مت ہو ہم تمہیں بچا لیں گے" لیکن لڑکی کے پہنے ریشمی کپڑوں کے باعث آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا۔

بچیوں کے خلاف تشدد

یونیسف کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 12 کروڑ لڑکیاں (ہر دس میں سے تقریباً ایک لڑکی) 20 برس کی عمر تک جنسی تشدد یا جنسی تشدد کی کوشش کا نشانہ بن چکی ہوئی ہیں۔ ان متاثرہ لڑکیوں کی بڑی تعداد کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہوتا ہے جہاں بچوں کے تحفظ کے ادارے غیر موجود ہوتے ہیں یا غیر مؤثر ہوتے ہیں۔ پاکستان بھی اُن ممالک میں شامل ہے۔

2014 میں مددگار نیشنل ہیلپ لائن نے پاکستان میں بچوں پر تشدد کے حوالے سے اعداد و شمار جاری کیے جن کے مطابق جنوری 2,000 سے لے کر دسمبر 2013 تک 4,572 کمسن بچیوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ایچ آر سی پی کے اعداد و شمار کے مطابق 2014 کے دوران 139 کمسن بچیوں کو اجتماعی جنسی تشدد جبکہ 290 کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

بعض واقعات جو 2014 کے دوران قومی اخبارات میں اجاگر کیے گئے تھے: 14 اگست 2014 کو مانسہرہ، خیبر پختونخوا کے گاؤں اندراسی کی رہائشی 14 سالہ معصومہ بی بی کو اُسی کے گاؤں کے ایک شخص نے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اُس نے شنکیاری پولیس اسٹیشن میں شکایت درج کروائی تھی جہاں ایک مقامی پولیس افسر نے اُس کی شکایت درج کی تھی اور اُسے تسلی دی تھی اور وعدہ بھی کیا تھا کہ ملزم کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ بچی کو طبی معائنے کے لیے ہسپتال لے جانے کا کہہ کر اُسے اپنے گھر لے گیا اور وہاں اس سے زیادتی کر ڈالی۔ لڑکی نے ضلعی پولیس افسر (ڈی پی او) کو اپنے کرب سے آگاہ کیا جس نے مجرم کی گرفتاری اور معصومہ بی بی کا طبی معائنہ کروانے کا حکم صادر کیا۔ پولیس افسر کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اُس وقت سے لے کر اب تک لڑکی پر راضی نامہ کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔

اکتوبر 2014 میں احمد پور ایسٹ کے علاقہ اسلام پورہ سے ایک پانچ سالہ لڑکی کو اغوا کیا گیا۔ ملزم نے اُسے ایک ویران جگہ پر لے جا کر جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ پولیس نے ملزم کے خلاف ریپ کا مقدمہ درج کر

لیا ہے۔ اُسی ماہ، بہاولپور کے دیہاتی علاقے تلیانوالہ میں ایک پانچ سالہ لڑکی کے ساتھ ریپ کیا گیا۔ اکتوبر میں ہی چک 12 بی سی میں ایک 13 سالہ لڑکی کو اُس کے کزن نے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ پولیس نے ملزم کو گرفتار کر لیا تھا۔

سال کے دوران 597 خواتین اور لڑکیوں کو اجتماعی تشدد کا نشانہ بنایا گیا، 828 کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور 36 کے سرعام کپڑے پھاڑے گئے

نومبر میں، ایک چھ سالہ ہزارہ لڑکی کو کوڑے کے ڈھیر سے پایا گیا جسے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ بچی کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ملزموں کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔

ایچ آر سی پی کے مطابق 894 خواتین نے خودکشی کی تھی اور 357 نے اقدام خودکشی کیا تھا۔ زیادہ تر نے گھریلو جھگڑوں کے باعث یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔

پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستان ہیلتھ و آبادیاتی سروے 2012-13 نے ملک میں گھریلو تشدد کے واقعات کا جائزہ لیا۔ سروے کے مطابق ہر پانچ میں سے ایک عورت سروے کے سال کے دوران جسمانی تشدد سے دوچار ہوئی تھی اور شادی شدہ عورتوں کا ایک تہائی حصہ 15 برس کی عمر سے جسمانی تشدد کا نشانہ بن رہی تھیں۔ تقریباً 40 فیصد عورتوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے کسی مقام پر ازدواجی تشدد کا ضرور نشانہ بنی تھیں اور تقریباً 32 فیصد کہنا تھا کہ اُنہیں سب سے زیادہ جذباتی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ سب سے زیادہ تشویشناک حقیقت یہ سامنے آئی کہ تشدد کا سامنا کرنے والی خواتین میں سے نصف سے زائد نے کبھی بھی مدد طلب نہیں کی تھی۔ اسی طرح کی حقیقت یونیسف نے ستمبر میں شائع کردہ اپنی رپورٹ ''نظروں کے سامنے پوشیدہ: بچوں کے خلاف تشدد کا شماریاتی تجزیہ'' میں کی تھی۔ رپورٹ کے مطابق جنسی یا جسمانی تشدد کا نشانہ بننے والی 20 سے 42 برس کی عمر کی 52 فیصد عورتوں نے کبھی بھی اس کے متعلق نہیں کی تھی۔ بیوی کو پیٹنے کے متعلق رائج رویے کے بارے میں پی ڈی ایچ ایس کا کہنا ہے کہ تقریباً 43 فیصد عورتوں اور ایک تہائی مردوں کا خیال تھا کہ اگر بیوی اپنے خاوند کے ساتھ تلخ کلامی کرتی ہے تو خاوند کو اُسے پیٹنے کا حق حاصل ہے۔ 35 فیصد کا

کہنا تھا کہ بیوی اگر بچوں کا خیال نہ رکھے، 31 فیصد کا کہنا تھا کہ اگر وہ خاوند کے ساتھ جنسی مشاورت سے انکار کرے، 31 فیصد کے خیال میں اگر وہ خاوند کو بتائے بغیر کہیں جائے جبکہ 30 فیصد کا خیال تھا کہ اگر وہ سسرالیوں کا خیال نہ رکھے اور خراب کھانا بنائے تو خاوند اسے مارنے پیٹنے کا مجاز ہے۔

خواتین کو کام کے مقامات پر ہراسیمگی سے تحفظ فراہم کرنے کے ایکٹ 2010 کی منظوری کے باوجود خواتین اپنے آجروں کے ہاتھوں ہراسیمگی کا نشانہ بن رہی ہیں۔ جولائی 2014 میں ایک 19 سالہ خاتون کرکٹر نے خودکشی کی۔ خواتین کی قومی کرکٹ ٹیم کی تیز باؤلر اور ملتان کی رہائشی حلیمہ رفیق نے بیت الخلا کی صفائی کے لیے استعمال ہونے والا تیزاب پی لیا تھا۔ اس سمیت دیگر پانچ خواتین کرکٹرز نے ملتان کرکٹ کلب کے عہدیداروں کے خلاف جنسی ہراسیمگی کا مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ ان الزامات کے ردعمل میں کلب کے ایک عہدیدار نے مذکورہ کرکٹرز کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اطلاعات کے مطابق، حلیمہ نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا۔

اُس سے قبل مارچ میں عدالت عظمیٰ نے سیکرٹری قانون سے ہراسیمگی کے قانون پر عملدرآمد اور کیپٹن رفعت حئ کے مقدمے میں پیش رفت نہ ہونے کی وجہ کے بارے میں رپورٹ طلب کی تھی۔ رفعت حئ 2010 سے مختلف اداروں میں شکایات درج کروا رہی تھیں۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ پی آئی اے کے سینئر اہلکار اُنہیں اُن کی ملازمت کے ابتدائی عرصہ سے جنسی ہراساں کر رہے ہیں۔ تاہم تاحال اُن کی شکایات کا ازالہ نہیں کیا گیا تھا۔ سیکرٹری قانون نے سال کے اختتام تک عدالت عظمیٰ کی طلب شدہ رپورٹ پیش نہیں کی تھی۔

جون میں سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے قانون و انصاف نے بھی سفارش کی تھی کہ تعلیمی اداروں میں طلباء کے تحفظ کے لیے ہراسیمگی کے قانون میں ترمیم کی جائے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران یونیورسٹیوں میں ہراسیمگی کے واقعات پیش آ رہے تھے اور قانون سازی میں موجود نقائص کی وجہ سے ملزم کے خلاف کارروائی نہیں ہو پاتی تھی جس کے ردعمل میں قائمہ کمیٹی کی مذکورہ تجویز سامنے آئی۔

2012 میں پیش آنے والے کوہستان ویڈیو واقعہ میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی۔ واقعے کی تفصیلات کے مطابق انٹرنیٹ پر شادی کی ایک تقریب میں کچھ لڑکیوں اور لڑکوں کے ناچنے اور گنگنانے کی ایک ویڈیو نشر ہوئی تھی جس کے حکم پر دو لڑکوں اور تین بہنوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

جنوری 2014 میں عدالت نے قتل میں ملوث ایک فرد کو سزائے موت جبکہ 5 کو عمر قید کی سزا سنائی۔ تاہم ویڈیو میں نظر آنے والی چار لڑکیوں اور دو لڑکوں کے قتل کا حکم دینے والے جرگہ کے سربراہ اور دیگر کئی افراد کو بری الذمہ قرار دے دیا گیا جن پر تہرے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

سنٹر برائے سوشل ریسرچ اور یو این ویمن کے مشترکہ تحقیقی جائزے میں بتایا گیا کہ پاکستان اور دیگر دو جنوبی ایشیائی ممالک ہندوستان اور نیپال کی سیاست میں خواتین کے خلاف تشدد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تحقیقی جائزے کے مطابق اِن ممالک میں 90 فیصد خواتین نے تشدد کے خوف سے سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور پاکستان میں جسمانی یا زبانی تشدد کی نسبت کردار کشی زیادہ بڑا خطرہ تھا۔

خواتین کی اسمگلنگ پاکستان میں ایک سنگین مسئلہ ہے۔ پاکستان میں اقدام متحدہ کے دفتر برائے منشیات و جرم (یو این او ڈی سی) نے جنوری 2014 میں ''پاکستان میں اور پاکستان سے انسانی اسمگلنگ کے حالیہ رجحانات'' کے عنوان سے ایک تحقیقی رپورٹ جاری کی جس کے مطابق پاکستان سے عورتوں اور بچوں کو جنسی استحصال کے لیے خلیج فارس اسمگل کرنے کے واقعات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رپورٹ میں اگرچہ اعداد وشمار نہیں دیے گئے تھے تاہم رپورٹ کے مطابق واقعاتی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان سے خواتین کو ڈانسرز کی ملازمت کا جھانسہ دے کر یو اے ای منتقل کیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ جنسی استحصال کا نشانہ بنتی ہیں۔ امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے 20 جون 2014 کو جاری ہونے والی اپنی رپورٹ ''2014 میں انسانی اسمگلنگ کی رپورٹ: پاکستان'' میں بتایا کہ پاکستانی خواتین کو جنسی استحصال کے لیے خلیجی ریاستوں میں اسمگل کیا جا رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان مردوں، عورتوں اور بچوں سے جبری مشقت لینے اور اُنہیں جنسی استحصال کا نشانہ بنانے کے اسمگلنگ کا ماخذ گزرگاہ اور راہدار ٹھکانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ لڑکیوں کو جنسی استحصال کے لیے بھرتی کرنے اور بلیک میل کرنے کے لیے سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کیفیز کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

خواتین کے خلاف تشدد میں اضافے کے باوجود، ریاست نے متاثرین کے عملی تحفظ کے لیے سنجیدہ اقدامات نہیں کیے۔ صوبائی سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کے تعاون سے روزن، شرکت گاہ اور انڈس ریسورس سنٹر کا متعارف کردہ ''سندھ دارالامان ریفارمز پراجیکٹ'' درست سمت میں واحد اقدام ہے جس کا مقصد صوبے کے چار ریاستی دارالامانوں میں اصلاحات لانا ہے۔ اس طرح کی مشترکہ کوششوں کی پنجاب میں بھی ضرورت ہے جہاں ہر ضلع میں ایک ڈی یو اے ہے۔ اس وقت بلوچستان میں صرف ایک ڈی یو اے ہے اور کوئی دارالامان نہیں۔ بلوچستان میں مزید دارالامانوں کی ضرورت ہے، جس کی نشاندہی سول سوسائٹی کی تنظیموں (سی ایس اوز) اور بلوچستان کی خواتین اراکین پارلیمان نے بھی کی تھی۔

غیرت کے نام پر جرائم اور تیزاب گردی کے واقعات

عورت فاؤنڈیشن کے اندازوں کے مطابق پاکستان میں 2008 سے لے کر اب تک 3,000 سے زائد عورتیں ''غیرت'' کے نام پر ماری جا چکی ہیں۔ ایچ آر سی پی کے اعداد وشمار کے مطابق 2014 میں

923 عورتیں اور 82 کمسن لڑکیاں ''غیرت'' کے نام پر قتل ہوئی تھیں۔ ان اعداد وشمار میں گلگت بلتستان میں پیش آنے والی 21 ہلاکتیں بھی شامل تھیں۔ ان جرائم کا نشانہ بننے والے متاثرین کی کل تعداد عموماً زیادہ ہوتی ہے کیونکہ مرد اور عورتوں، دونوں کو ان واقعات میں نشانہ بنایا جاتا ہے۔

2014 کے دوران ایسی ہلاکتوں کی بنیادی وجہ عورت اور مرد کے مابین مبینہ ناجائز تعلقات کو قرار دیا گیا۔ مبینہ ناجائز تعلقات کے الزام میں کئی مردوں اور عورتوں کو قتل کیا گیا۔ قتل کے ان واقعات میں زیادہ تر آتشی اسلحہ استعمال ہوا تھا۔

لاہور میں 2014 کے دوران غیرت کے نام پر قتل کا ایک انتہائی بھیانک واقعہ پیش آیا۔ ایک 25 سالہ حاملہ لڑکی کو لاہور ہائی کورٹ کے باہر اُس کے خاندان والوں نے سنگسار کر کے مار ڈالا۔ حملہ آوروں میں اُس کا والد، دو بھائی اور سابق منگیتر شامل تھا۔ فرزانہ کی منگنی اُس کے کزن کے ساتھ کی گئی تھی مگر اُس نے شادی کسی اور شخص سے کر لی تھی۔ فرزانہ کے خاندان نے اُس کے خاوند کے خلاف فرزانہ کے اغواء کا مقدمہ درج کروایا جس پر فرزانہ عدالت میں بیان دینے آئی کہ اس نے اپنی رضامندی سے شادی کی تھی اور یہ کہ اُسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔ اس وقوعہ کے ردِّعمل میں سنی اتحاد کونسل (ایس آئی سی) نے بیان جاری کیا کہ غیرت کے نام پر قتل ''حرام'' ہے اور یہ کہ اسلام میں ایسے ''ظالمانہ جرم'' کی کوئی گنجائش نہیں۔ نومبر 2014 میں لاہور ہائی کورٹ نے فرزانہ کے قتل میں ملوث چار افراد کو سزائے موت سنائی۔

پاکستان میں تیزاب گردی کے واقعات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ 2010 میں اس اقدام کو انتہائی سنگین جرم قرار دیا گیا تھا۔ ایچ آر سی پی کے اعداد وشمار کے مطابق 2014 میں 92 عورتوں اور 13 کمسن بچیوں پر تیزاب پھینکا گیا۔ سات عورتیں اس حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گئیں۔ 60 عورتیں سلنڈر کے پھٹنے، چولہا پھٹنے اور آگ لگنے جیسے واقعات کی بھینٹ چڑھیں۔ تیزاب گردی کے متاثرین کی امداد کرنے والی ایک این جی او ''ایسڈ سروائیورز فاؤنڈیشن'' کے اعداد وشمار کے مطابق 2007 سے لے کر 2014 تک تیزاب گردی کے 1,090 واقعات پیش آئے۔ 43 واقعات 2009 میں، 55 واقعات، 2010 میں 2011 میں 150، 2012 میں 93، 2013 میں 143 جبکہ جنوری سے اکتوبر میں 161 واقعات پیش آئے تھے۔ گزشتہ برس سے واقعات کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے جس کے باعث اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ متاثرین کے تحفظ کے لیے ہر صوبے میں جامع قانون مرتب کیا جائے۔ پنجاب کے لیے یہ خاص طور پر ضروری ہے کیونکہ اے ایس ایف کے مطابق 2013 کے دوران پیش آنے والے واقعات کا 56 فیصد پنجاب میں پیش آئے تھے۔

2014 کے دوران 923 خواتین اور 82 کمسن بچیاں بھی فرزانہ کی طرح ''غیرت'' کے نام پر قتل ہوئیں

جولائی 2014 میں بلوچستان میں 24 گھنٹوں کے دوران تیزاب گردی کے دو تشویشناک واقعات پیش آئے جن میں متاثرین پر تیزاب بھرے پچکاریاں چھڑکی گئی تھیں۔ پہلے واقعہ میں دو موٹر سائیکل سواروں نے سریاب روڈ کوئٹہ کے علاقہ کلی کمالو میں ایک زیورات والی دکان کے باہر چار خواتین پر تیزاب پھینکا۔اس کے فوری بعد کوئٹہ سے 45 کلومیٹر دور ضلع مستونگ میں دو بہنوں، عمر 12 سال اور 14 سال پر تیزاب پھینکا گیا۔دونوں واقعات میں مجرم جائے واردات سے فرار ہو گئے اور پولیس اُن کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔اے ایس ایف کے اعداد وشمار کے مطابق تیزاب گردی اور جلائے جانے کے 65 فیصد واقعات کا نشانہ عورتیں اور لڑکیاں تھیں جبکہ 15 فیصد واقعات کے متاثرین بچے تھے اور صرف 35 فیصد واقعات میں مجرموں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا۔رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ زیادہ تر واقعات ملتان، مظفر گڑھ، رحیم یار خان اور بہاولپور سمیت جنوبی پنجاب میں پیش آئے تھے۔ستمبر 2014 میں ضلع جھنگ میں دو افراد نے 16 سالہ لڑکی شبنم بی بی پر تیزاب پھینکا۔حملہ آوروں میں سے ایک مرد نے لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز پیش کی تھی جسے لڑکی کے والدین نے ٹھکرایا تھا جس کا حملہ آوروں کو رنج تھا۔لڑکی حملے میں شدید متاثر ہوئی تھی اور اُس کے چہرے کا 90 فیصد حصہ جل گیا تھا اور آنکھوں پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔حملے میں لڑکی کی والدہ

بھی زخمی ہوگئی تھی۔ پولیس نے ایک حملہ آور کو گرفتار کر لیا تھا جبکہ دوسرا مفرور تھا۔

مذہب کی جبری تبدیلی اور جبری شادی

ایک معروف غیر سرکاری فلاحی ادارے پاکستان میں یک جہتی کی تحریک نے اپریل 2014 میں ایک رپورٹ شائع کی جس کے مطابق پاکستان میں ہر برس تقریباً 1,000 اقلیتی عورتوں کا زبردستی مذہب تبدیل کر کے مسلمانوں کے ساتھ اُن کی شادی کی جاتی ہے۔ 10 کیس سٹڈیز سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تقریباً تمام واقعات میں لڑکی کے والدین نے مقدمات کی پیروی کی اور لڑکیوں نے بیان دیا کہ اُنہوں نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا تھا اور لڑکیوں کے اہل خانہ کو انصاف دیے بغیر محض لڑکی کے بیان پر مقدمات کو خارج کر دیا گیا۔ اُس کے بعد زیادہ تر خواتین کو جنسی تشدد، ریپ، جبری عصمت فروشی، انسانی سمگلنگ یا فروخت یا گھریلو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ سندھ اسمبلی نے 18 نومبر 2014 کو مذہب کی جبری تبدیلی اور جبری شادی کے واقعات کے خلاف قرارداد منظور کی۔ قرارداد میں غیر مسلم اقلیتوں خاص طور پر ہندو لڑکیوں کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا جنہیں اغواء، ریپ اور مذہب کی جبری تبدیلی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ قرارداد میں جبری تبدیلی

خواتین پر تیزاب گردی کے واقعات خوف و ہراس پھیلانے کا سبب بنے

مذہب/جبری شادی کی روک تھام کے لیے قانون سازی کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔قرارداد میں ڈھرکی میں پیش آنے والے حالیہ واقعے کا حوالہ دیا گیا تھا جس میں ایک 12 سالہ لڑکی کا زبردستی مذہب تبدیل کرکے اُس کی جبری شادی کی گئی تھی۔لڑکی کو بازیاب کروا کر دارالامان کراچی منتقل کیا تاہم اُسے اپنے والدین سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔قرارداد میں اُس میں تحفظ اور اُسے اُس کے والدین کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

سفارشات

1- بلوچستان، کے پی اور سندھ کی حکومت کو چاہیے کہ وہ بھی صوبوں میں خواتین کی مؤثر نمائندگی کا ایکٹ نافذ کریں تاکہ عوامی فیصلہ سازی کے عمل میں خواتین کو شریک کیا جاسکے۔

2- پاکستان میں دوران زچگی خواتین خاص طور پر سیلاب اور جنگ سے متاثرہ ماؤں کی صحت پر خاص توجہ دی جائے۔

3- خواتین کے تحفظ کے لیے ہر صوبے میں قانونی ڈھانچہ مستحکم کیا جائے۔کمسنی کی شادی، مذہب کی جبری تبدیلی اور جبری شادی، گھریلو تشدد، تیزاب گردی عورتوں کو جلانے جیسے جرائم کی روک تھام کے لیے قوانین منظور کیے جائیں اور ان پر عملدرآمد کیا جائے تاکہ عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات میں کمی آسکے۔

4- خواتین پر تشدد کے خاتمے کے لیے دارالامانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔سرکاری دارالامانوں میں اصلاحات لائی جائیں اور وہاں کے عملے کی اچھی تربیت دی جائے تاکہ خواتین کے مؤثر تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔عورتوں کے تحفظ پر مامور عناصر کو چاہیے کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ قریبی رابطہ قائم کریں تاکہ تشدد کے متاثرین کی مؤثر خدمت کو یقینی بنایا جاسکے۔

5- ریاست کو چاہیے کہ وہ خواتین کی معاشی خودمختاری پر خاص توجہ دے۔اس مقصد کے لیے اُن کے لیے تربیتی پروگرامز شروع کیے جائیں اور اُن کے لیے ملازمتوں کے مواقع پیدا کیے جائیں۔پاکستان کی افرادی قوت میں خواتین کی شمولیت میں اضافے سے ملک کو درپیش حالیہ معاشی، بحران پر قابو پانے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

بچے

چودہ برس سے کم عمر بچے کو کسی فیکٹری یا دکان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل 11-(3)]

ریاست، شادی، خاندان، ماں اور بچے کو تحفظ فراہم کرے گی — آئین پاکستان [آرٹیکل - 35]

ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔۔۔ کہ بچوں کو ان پیشوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا جو ان کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔۔۔ — آئین پاکستان [آرٹیکل 37-(e)]

۔۔۔ بچپن خاص توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔ — [بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کے کنونشن کا دیباچہ]

بچوں کے متعلق عمل میں لائی گئی تمام کارروائیوں میں، چاہے وہ سرکاری یا نجی سوشل ویلفیئر اداروں کی طرف سے عدالتوں، انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے حکام یا قانون ساز اداروں کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہوں، بچوں کے بہترین مفادات کو اولین فوقیت دی جائے گی۔ بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کا کنونشن [آرٹیکل نمبر 3 (1)]

ریاست اس برس بھی بچوں کے حقوق کو ترجیح دینے میں ناکام رہی۔ سماجی و قانونی تحفظ کے ڈھانچے میں سنگین نقائص کے نتیجے میں بچے تشدد، آبروریزی اور استحصال کا نشانہ بنے۔ شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے باعث اپنے گھروں سے بے دخل ہونے والے تقریباً دس لاکھ افراد میں 400,000 بچے بھی شامل تھے۔ طالبان نے دسمبر میں آرمی پبلک سکول پشاور پر دھاوا بولا۔ یہ پاکستان کی حالیہ تاریخ میں دہشت گردی کا بدترین حملہ تھا اور اس میں خاص طور پر بچوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس بہیمانہ غارت گری میں 132 طالب علموں سمیت 141 افراد مارے گئے۔

کشمیر، پنجاب اور سندھ میں سیلاب سے متاثر ہونے والے 45 لاکھ افراد میں ایک بڑی تعداد بچوں کی تھی۔ سندھ میں خشک سالی نے 29 لاکھ افراد کو متاثر کیا اور 2014 کے اختتام تک 650 بچے موت کا شکار ہوئے۔ بچوں کو تعلیم وصحت کی سہولیات سے محرومی، غذا کی محدود دستیابی اور ناقص رہائش کی بدولت سخت موسمی حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث اُنہیں شدید مشکلات درپیش آئیں۔ 306 پولیو کیسز کے ساتھ

2014ء کے دوران سندھ میں خشک سالی نے 29 لاکھ افراد کو متاثر کیا اور 650 بچے ہلاک ہوئے

پاکستان نے پولیو سے متاثرہ بچوں کی تعداد کے حوالے سے اپنا 15 سالہ ریکارڈ بھی توڑ دیا۔

پاکستان نے ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کے حصول اور اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق کے کنونشن (یو این، سی آر سی) پر عملدرآمد میں انتہائی ناقص پیش رفت کی۔ پاکستان نے دو سے زائد عشرے قبل سی آر سی کی توثیق کی تھی۔ پاکستان نے مئی 2014 میں ایک سال کی تاخیر کے بعد بچوں کے حقوق کی اقوام متحدہ کی کمیٹی کو سی آر سی پر عملدرآمد کی سلسلہ وار رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ نے پاکستان میں بچوں کے تحفظ کے نظام میں پائے جانے والے نقائص کی نشاندہی کی ہے۔اس میں تاخیر سے رپورٹنگ کرنے اور ناقص عملدرآمد کے جاری وساری رجحان کی عکاسی بھی ہوئی ہے۔

اگرچہ 2014 کا سال سی آرسی کی پچیسویں برسی کے طور پر منایا گیا مگر یونیسف نے اسے بچوں کے حقوق کے حوالے سے سب سے 'تباہ کن'' سال قرار دیا۔ یونیسف کا کہنا تھا کہ ڈیڑھ کروڑ سے زائد بچے دنیا بھر میں جاری مسلح تصادم کا نشانہ بنے اور پاکستان کا شمار بھی اُن ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر ''طویل تصادم'' سے بچوں کی زندگیاں اور مستقبل تباہ ہو رہے ہیں۔ گزشتہ 25 برسوں میں بچوں کے حقوق میں بہتری کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے یونیسف کا کہنا تھا کہ اس کنونشن کی بدولت دنیا بچوں کے لیے بہتر سے بہتر مقام ہے مگر ابھی بھی کروڑوں بچے اس کنونشن میں دیے گئے فوائد سے محروم ہیں، خاص طور پر وہ جو غریب ہیں، جو لسانی/مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھتے تھے، جو دیہی علاقوں میں رہائش پذیر تھے یا جو معذور تھے۔ پاکستان کے

بچے کمزور سیاسی عزم اور خراب سماجی معاشی حالات کے باعث اس مثالی دستاویز سے مستفید نہیں ہو سکے۔

صدر پاکستان اور وزیر اعظم پاکستان دونوں نے بچوں کے حقوق کے عالمی دن پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پرعزم ہے اور ملک کو سی آر سی کی پچیسویں برسی پر بین الاقوامی برادری کے ساتھ شریک ہونے پر فخر ہے۔ مگر ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کنونشن کی توثیق کے بعد اس کی پچیسویں برسی منانے کے لیے پاکستان کے پاس خوشی کا سامان بہت کم ہے۔

پاکستانی اسکول طالبہ اور تعلیم کے فروغ کی سرگرم کارکن ملالہ یوسف جسے 2012 میں طالبان نے سر پر گولی ماری تھی، نے سب سے کم عمر نوبل انعام یافتہ ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اُس کے نام سے قائم کیے گئے فنڈ سے دنیا بھر میں بچوں کی تعلیم میں مدد مل رہی ہے۔

صحت

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاپولیشن سٹڈیز نے فروری میں ''مردم شماری وصحت سروے رپورٹ۔ 2012-13'' شائع کی تھی۔ اگرچہ 1990 میں کیے گئے سروے کے بعد سے ہونے والی چند مثبت تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا گیا تاہم سروے میں بچوں کی صحت کی انتہائی مایوس کن تصویر کشی کی گئی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ ملک میں ہر 14 میں سے ایک بچہ ایک برس کی عمر سے قبل فوت ہو جاتا ہے اور ہر 11 میں سے ایک بچہ پانچ برس کی عمر سے قبل فوت ہو جاتا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نوزائیدہ بچوں کی اموات کی شرح بڑھی ہے۔ 1990 میں ہر 1,000 نوزائیدہ بچوں میں سے 51 مر جاتے تھے جبکہ 2012 میں ہر 1,000 میں سے 55 بچوں کی موت واقع ہوئی ہے جبکہ شیر خوار بچوں کی موت کی شرح کم ہوئی ہے۔ 1990 میں ہر 1,000 شیر خوار بچوں میں سے 91 مرتے تھے جبکہ 2012 میں ہر 1,000 میں سے 74 بچے موت کا شکار ہوئے۔ رپورٹ میں بتایا کہ بچوں کو دی گئی ویکسی نیشن کی شرح شہری علاقوں میں 66 فیصد جبکہ دیہاتی علاقوں میں 48 فیصد تھی جبکہ 12 سے 23 ماہ کے 54 فیصد بچوں نے تمام ضروری ویکسینیشن سے استفادہ کیا۔

یونیسف نے اپنی رپورٹ ''دنیا کے بچوں کی حالت: 2014'' شائع کی جس پاکستان اُن ممالک کی فہرست میں چھبیسویں نمبر پر آتا ہے جہاں شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح بہت زیادہ ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا کہ پاکستان میں ہر نوزائیدہ بچے کے لیے زندگی کی اوسط توقع 66 فیصد تھی جبکہ پانچ برس تک کی عمر کے ایک تہائی بچے کم وزن تھے۔ قدرتی آفات، معاشی تباہی یا تصادم جیسے حالات سے گزرنے والے تغیر پذیر معاشروں میں کام کرنے والے ایک عالمی امدادی ادارے 'میرسی کور' نے 2014

میں پاکستان بھر میں ایک سروے کیا جس کا مقصد ملک میں بچوں پر اثر انداز ہونے والی مہلک بیماریوں کے متعلق شعبہ صحت کے سینئر اہلکاروں کا علم معلوم کرنا تھا۔ سروے کے حقائق کے مطابق، نوزائیدہ بچوں کی اموات کی شرح اور بچوں کی اموات کی روک تھام کے لیے ضروری رہنما اصول اور اقدامات کے بارے میں ہیلتھ ڈائریکٹرز جنرل سمیت تمام صوبوں کے سینئر ہیلتھ افسران کا علم لیڈی ہیلتھ ورکرز، دائیوں، پیدائش کے وقت بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے روایتی خدمت کاروں اور زچہ و بچہ کے متعلق کچھ معلومات رکھنے والی کمیونٹی خواتین جتنا ہی تھا۔ رپورٹ کے مطابق اُن میں سے زیادہ تر کو نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت کے متعلق ضروری ہدایات کا علم بھی نہیں تھا۔ وہ عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کی ہدایات سے بھی لاعلم تھے۔

پاکستان ایم ڈی جی کے ہدف کو بھی حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے جس کے مطابق پاکستان کو پانچ برس سے کم عمر بچوں کی شرح اموات کو 52 فی 1,000 بچہ تک کم کرنا تھا۔ پاکستان اس میدان میں انتہائی معمولی پیش رفت کر سکا۔

پاکستان میں 2014 کے دوران پولیو کی شرح میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا۔ 2012 میں پولیو کے 58 کیسز جبکہ 2013 میں 98 کیسز تھے جبکہ 2014 میں 300 فیصد اضافے کے ساتھ 306 کیسز ریکارڈ ہوئے۔ پاکستان نے اس حوالے سے اپنا 15 سالہ ریکارڈ توڑا ہے۔ دنیا بھر میں پولیو کیسز کا 4/5 پاکستان میں پائے جاتے ہیں اور عالمی ادارہ صحت کے مطابق دنیا بھر میں پائے جانے والے پولیو وائرس کا مرکز پاکستان ہے اور پولیو سے پاک دنیا کے قیام کی راہ میں واحد بنیادی رکاوٹ ہے۔ ڈبلیو ایچ او کا کہنا تھا کہ دنیا میں پولیو وائرس کے 80 فیصد کیسز اس برس پاکستان سے ریکارڈ ہوئے ہیں۔ دنیا بھر سے کل 359 پولیو کیسز رپورٹ ہوئے تھے جن میں سے 306 صرف پاکستان سے رپورٹ ہوئے تھے۔ ڈبلیو ایچ او نے پولیو کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیش نظر پاکستان اور دو ممالک پر سخت سفری پابندیوں کی سفارش کی تھی۔ شمالی وزیرستان میں تصادم، امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال، والدین کا اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے سے انکار اور حکام میں عزم کی کمی نے پاکستان میں بچوں کی مؤثر ویکسی نیشن کو شدید متاثر کیا۔ پولیو ویکسینیٹرز اور اُن کے محافظین طالبان کے حملوں کا نشانہ بنتے رہے۔

اس برس شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن اور سیلاب نے بچوں کی ایک بڑی تعداد کو اُن کے گھروں سے بے دخل کیا اور اُنہیں زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم رکھا۔ انسانیت دوست امور کی رابطہ کاری کے اقوام متحدہ کے دفتر (اوچا) کے مطابق شمالی وزیرستان سے اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد کی تعداد دس لاکھ سے زائد تھی جن میں سے 45 فیصد بچے تھے جو صحت کے سنگین مسائل سے دوچار تھے۔

ڈبلیو ایچ او کے مطابق وہ سانس کی بیماریوں، پیچش، نامعلوم قسم کے بخار، جلدی بیماریوں اور ملیریا کا شکار تھے۔ حفظانِ صحت کے ناقص انتظامات اور شدید گرم موسم نے آئی ڈی پیز کو پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں اور معدے کی بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ ڈبلیو ایچ او نے آئی ڈی پیز کے لیے صحت کی سہولیات کے فقدان پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور آئی ڈی پیز کے میزبان اضلاع میں قائم ہسپتالوں میں بہتری لانے کی سفارش کی تھی۔ آئی ڈی پیز کے بڑھتے ہوئے طبی مسائل کے حل کے لیے حکومتی وسائل اور سہولیات سال کے اختتام تک ناکافی رہیں۔

تھرپارکر، سندھ میں خشک سالی، قحط اور غذائیت بخش خوراک کی پیداوار کی عدم اہلیت کی صورت حال 2014 میں شدت اختیار کر گئی جس کے باعث 650 بچے موت کا شکار ہوئے۔ زیادہ تر بچے خشک سالی، غربت اور صحت کے ناقص انفراسٹرکچر کے باعث غذائی کمی، نمونیا، پیچش کا شکار ہوئے۔ ایمبولینس سروس کی قلت کے باعث والدین کو طویل سفر طے کر کے اپنے بچوں کو ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ نومبر میں وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ تھرپارکر میں بچوں کے لیے قوت بخش غذا کا ایک پروگرام شروع کیا جا رہا ہے اور ورلڈ بینک کے تعاون سے تھر میں دودھ کی مارکیٹنگ کے منصوبے پر بھی کام شروع کیا جائے گا۔ تاہم سال کے اختتام تک بچوں کی اموات کا سلسلہ جاری رہا۔

ورلڈ بینک نے دو سال سے کم عمر بچوں کو قوت بخش غذا کی فراہمی اور بچوں کو دودھ پلانے کے عمل میں خواتین کی معاونت کی مد میں 29 اکتوبر کو پاکستان کے لیے 47.95 ملین امریکی ڈالر کی منظوری دی۔ ورلڈ بینک نے کہا کہ پاکستان کے تمام صوبے غذائی قلت کا شکار ہیں۔ بلوچستان میں 51 فیصد بچے، سندھ میں 50 فیصد، خیبر پختونخوا میں 48 فیصد اور پنجاب میں 39 فیصد بچے ناقص نمو کا شکار تھے۔ سندھ اور بلوچستان میں قوت بخش غذائی صورت حال دیگر صوبوں سے خراب تھی چنانچہ منصوبے کا آغاز سندھ اور بلوچستان سے کیا جائے گا۔

تعلیم

پاکستان میں بڑھتی ہوئی شرح خواندگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کے لیے انتہائی کم وسائل مختص کیے جاتے ہیں۔ 15-2014 کے مالی سال میں وفاقی وصوبائی حکومتوں کے تعلیمی بجٹوں میں نمایاں اضافہ دیکھنے کو ملا تاہم گزشتہ ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم پر اِن فنڈز کے مکمل اصراف کے امکانات کم ہی ہیں۔ پنجاب نے سال 15-2014 کے لیے اپنے تعلیمی بجٹ میں 10 فیصد اضافہ کیا تھا۔ تعلیم کے لیے 47.62 ارب روپے مختص کیے گئے جن میں سے 20 ارب اسکول کی تعلیم، 24 ارب اعلیٰ

تعلیم، 15 کروڑ دس لاکھ روپے خصوصی تعلیم کے لیے اور ساڑھے تین کروڑ بنیادی غیر رسمی تعلیم کے لیے مختص کیے گئے تھے۔ کے پی نے اپنے بجٹ میں 14 فیصد اضافہ کیا تھا۔ سندھ نے 45.02 ارب (21.3 فیصد اضافہ) مختص کیے۔ گزشتہ سال کے 135.55 ارب روپے کے بجٹ سے تقریباً 10 ارب روپے زائد۔ بلوچستان نے اپنے تعلیمی بجٹ میں 23.09 فیصد اضافہ کیا تھا۔ وفاقی حکومت نے 15-2014 کے مالی سال میں 64 ارب روپے مختص کیے تھے۔ وفاقی حکومت نے تعلیمی بجٹ میں گزشتہ برس کی نسبت آٹھ فیصد اضافہ کیا۔ اگرچہ تعلیم اب صوبائی شعبہ ہے مگر وفاقی حکومت نے بھی اپنے بجٹ کے حصے کے طور پر پانچ منصوبوں کا اعلان کیا اور اُن کے لیے 40 کروڑ، 60 لاکھ روپے مختص کئے۔ ان منصوبوں کا مقصد دارالحکومت اسلام آباد، پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں اساتذہ کے تربیتی اداروں کی استعداد سازی اور ایلیمینٹری اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت کرنا تھا۔ آئین میں دفعہ 25 (الف) کی شمولیت بہت بڑا اقدام تھا مگر اسکولوں میں داخلے کی شرح میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔ اگرچہ کے پی کے علاوہ تمام صوبوں نے دفعہ 25 (الف) کی مطابقت میں مفت و لازمی تعلیم کی فراہمی کے لیے قانون سازی کی تھی۔ پنجاب نے سب سے آخر میں 13 مئی کو یہ قانون منظور کیا۔

'پاکستان ایجوکیشن اٹلس 2013'، مارچ 2014 میں شائع ہوئی جو کہ پاکستان کے تعلیمی نظام پر ایک سروے رپورٹ ہے۔ رپورٹ کے مطابق، تعلیم میں بہتری کی رفتار انتہائی سست تھی اور پرائمری تعلیم مکمل کرنے والے بچوں کی شرح مختلف صوبوں میں مختلف تھی۔ سب سے بہتر شرح اسلام آباد میں تھی (96 فیصد اور فاٹا میں 48 فیصد تھی۔ پرائمری تعلیم مکمل کرنے والے بچوں کی سب سے کم شرح سندھ اور بلوچستان میں تھی۔ دونوں صوبوں میں یہ شرح 43 فیصد تھی۔ ملک کے مختلف صوبوں میں مڈل اسکول کی تعلیم مکمل کرنے والے بچوں کی تعداد میں انتہائی معمولی اضافہ ہوا۔ اسلام آباد میں 100 فیصد بچوں، گلگت بلتستان میں 89 فیصد، پنجاب میں 87 فیصد، خیبر پختونخوا میں 72 فیصد، آزاد جموں وکشمیر میں 69 فیصد اور بلوچستان میں 67 فیصد بچوں نے مڈل اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ فاٹا میں اس برس 61 فیصد بچوں نے مڈل اسکول کی تعلیم تک رسائی حاصل کی جبکہ 2010 میں یہ تعداد 44 فیصد تھی۔ سندھ 59 فیصد کے ساتھ اس فہرست میں سب سے پیچھے تھا۔

رپورٹ میں اسکول میں بچوں کے لیے بنیادی سہولیات کی دستیابی کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ رپورٹ کے مطابق ملک بھر کے صرف 64 فیصد پرائمری اسکولوں میں بچوں کو پینے کا پانی میسر تھا اور آزاد جموں وکشمیر میں صرف 27 فیصد پرائمری اسکولوں میں بچوں کو پینے کا پانی میسر تھا۔ اسلام آباد کے

اڑھائی کروڑ بچے، کُل پاکستانی بچوں کا 47 فیصد ابھی بھی اسکول نہیں جاتے

191 پرائمری سکولوں میں سے 185 سکولوں میں بچوں کو پینے کا پانی دستیاب تھا۔ صرف 49 فیصد سرکاری پرائمری سکولوں میں بجلی تھی اور 58 فیصد میں بیت الخلا تھے۔ بلوچستان میں 10,000 سکولوں میں سے صرف 1665 میں بجلی تھی اور 2000 سکولوں میں بچوں کو بیت الخلا کی سہولت میسر تھی۔ رپورٹ کے حقائق پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیرمملکت برائے تعلیم وتربیت بلیغ الرحمان نے کہا کہ نیشنل ایکشن پلان کے تحت 2013ء میں 788 ارب روپے مختص کئے گئے تھے جو کہ تین برسوں کے دوران سکول نہ جانے والے بچوں اور ملک بھر میں بنیادی تعلیمی سہولیات کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے خرچ کئے جائیں گے۔

این پی اے جسے 'ایم ڈی جی پر عملدرآمد میں تیزی لانے کا پروگرام' بھی کہا گیا تھا، 2013ء میں متعارف کیا گیا تھا اور اسے صوبوں کی مشاورت سے تشکیل دیا گیا تھا۔ البتہ 15-2014ء کے بجٹ میں اس کی تفصیلات کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا تھا جس کے باعث پہلے برس کے دوران اس کی پیش رفت کا اندازہ لگانا مشکل کام تھا۔

الف اعلان کی دوسری سالانہ رپورٹ، ''پاکستانی اضلاع کی تعلیمی درجہ بندی؛ 2014ء'' مئی

2014ء میں شائع ہوئی جس میں تعلیم کی صورتحال پر مستند اور تازہ ترین معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ رپورٹ، استحکام پذیر ترقی پالیسی انسٹی ٹیوٹ، (ایس ڈی پی آئی) کے تعاون سے تیار کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں معیاری تعلیم، سکولوں کے گوشواروں اور توجہ طلب اور اصلاح طلب شعبہ جات کی نشاندہی کے ذریعے ملک بھر میں پرائمری مڈل تعلیم کے مختلف معیارات کا جائزہ لیا گیا۔ ہر سکول کو سکولوں میں داخلے کی شرح، تعلیمی مرحلے کی تکمیل میں بچوں کی کامیابی کی شرح، خواندگی، علمیت کے نتائج، انفراسٹرکچر، صنفی مساوات اور سہولیات کی دستیابی کی بنیاد پر 0 سے 100 تک سکورز دیئے گئے۔ اسلام آباد تعلیمی معیار کے لحاظ سے سب سے بہتر علاقہ قرار دیا گیا۔ پنجاب دوسرے نمبر پر تھا جس کے بعد آزاد جموں وکشمیر اور گلگت بلتستان تھے۔ جبکہ فاٹا اس درجہ بندی میں سب سے نچلے درجے پر تھا۔ رپورٹ کے مطابق اڑھائی کروڑ بچے، کُل پاکستانی بچوں کا 47 فیصد، سکول سے باہر تھے۔ سکول نہ جانے والے بچوں میں سے 68 فیصد کبھی بھی سکول نہیں گئے تھے جبکہ 32 فیصد کسی وقت پر سکول جاتے رہے تھے۔ عالمی اکنامک فورم نے ستمبر 2015ء میں عالمی مقابلہ جاتی رپورٹ 15-2014 رپورٹ شائع کی جس کے مطابق سکولوں میں انتہائی کم شرح داخلہ والے 144 ممالک میں پاکستان 132ویں نمبر پر تھا۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ایک چوتھائی بچے سکول نہیں گئے۔

2014ء میں مدارس کے تعلیمی نظام میں بہتری لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اگرچہ ملک بھر میں رجسٹرڈ مدارس کی تعداد میں خاطرخواہ اضافہ ہوا۔ نومبر میں، پولیس نے کراچی میں ایک گھر سے 36 لڑکیوں کو بازیاب کرالیا جنہیں ایک مدرسہ کی انتظامیہ نے گھر کے مالکان کو دیئے گئے قرض کی ضمانت کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ مدرسہ نے لڑکیوں کی نگہداشت کی ذمہ داری گھر کے مالکان پر عائد کرنا چاہی تھی اور مالکان کی جانب سے قرضے کی واپسی کی ناکامی کی صورت میں لڑکیوں کو ضمانت کے طور پر استعمال کیا۔ لڑکیوں کا تعلق قبائلی علاقے باجوڑ سے تھا اور وہ اردو پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ انہیں شانتی نگر، کراچی میں بچوں کے تحفظ کے ادارے دارلبنات منتقل کیا گیا جہاں ان کے والدین اور ورثاء انہیں لینے آئے۔

ملک کے تعلیمی نظام کو درپیش ایک اور بڑا مسئلہ اساتذہ کی کمی کا تھا۔ یونسیکو نے 2014ء میں اپنا پالیسی پیپر جاری کیا جس کے مطابق پاکستان کو 2015ء تک یونیورسل پرائمری تعلیم کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے 150,000 سے زائد مزید تربیت یافتہ پرائمری سکول اساتذہ کی ضرورت ہے اور 2020 تک ملک کو 290,000 مزید اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ پاکستان میں پرائمری سکولوں کے 84 فیصد اساتذہ تربیت یافتہ تھے اور اسے 40 طالب علم فی تربیت یافتہ ٹیچر کا ہدف حاصل کرنا

2014 میں مدارس میں اصلاحات لانے کی کوشش نہ کی گئی

تھا۔ کے پی کے ضلعی تعلیمی مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم (ای ایم آئی ایس) 14-2013ء کے مطابق، پرائمری سطح پر اساتذہ کی مقرر کردہ 78,000 سیٹوں میں سے 6,800 سے زائد سیٹیں، انٹرمیڈیٹ سطح پر 21,494 سیٹوں میں سے 7,409، جبکہ ثانوی سطح پر 30,844 سیٹوں میں سے 6,315 اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر کردہ 1,000 سیٹوں میں سے 2,193 سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ ای ایم آئی ایس کے مطابق 5 سے 16 برس کی عمر کے لڑکوں کی کل تعداد 37 لاکھ تھی اور ان میں سے 73,600 لڑکے صوبے کے 25 اضلاع کے سکولوں سے باہر تھے۔ لڑکیوں کے لیے صورتحال انتہائی تشویشناک تھی کیونکہ صوبے کی 34 لاکھ لڑکیوں میں سے تقریباً نصف تعلیم حاصل نہیں کر رہی تھیں۔ یو ایس ایڈ نے شعبہ ٹیلی کام کی مدد سے 2014ء میں کشیدگی معاونت پروگرام، شروع کیا تھا جس کا مقصد مسلح کشیدگی سے متاثرہ بچوں کی معاونت کرنا تھا۔ اس پروگرام کے تحت ایسے 4000 بچوں کو تعلیمی وظائف فراہم کئے جائیں گے جو مسلح کشیدگی سے متاثر ہوئے تھے اور جو اپنے والدین سے محروم ہوئے تھے۔ سال کے اختتام تک، اس پروگرام کے تحت کے پی کے 2686 بچوں کو تعلیمی وظائف فراہم کئے جا چکے تھے۔

حقوق کی خلاف ورزیاں اور بچوں کا تحفظ

یونیسیف نے ''بچوں کی زندگیوں میں بہتری، بہتر مستقبل کی تلاش، جنوبی ایشیا میں بچوں کے حقوق کے 25 برس'' کے عنوان سے رپورٹ شائع کی جس کے مطابق جنوبی ایشیا میں بچوں کے حقوق کی صورتحال میں سست روبہتری کی بنیادی وجہ مستقل جنسی استحصال اور صحت، تعلیم اور سماجی تحفظ پر کم حکومتی وسائل کا اصراف ہے۔ اس برس پاکستان میں بچوں کے تحفظ کے نظام میں کسی قسم کی نمایاں بہتری نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا

ہے کہ حکومت اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ اس حوالے سے واحد قابل ذکر اقدام نیشنل کمشنر برائے وفاقی محتسب سیکرٹریٹ کی طرف سے بچوں کے قومی کمیشن کے قیام کا اعلان تھا۔ کمیشن بچوں کے حقوق کی نگرانی کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی ہے جو کہ بچوں کے مفادات اور انسانی حقوق کے ساتھ گہری وابستگی رکھنے والے معروف افراد پر مشتمل ہوگی اور چاروں صوبائی محتسب اور چائلڈ کمشنرز بھی اپنے عہدوں کی بدولت اس کے اراکین ہوں گے۔

بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے سول سوسائٹی کے اتحاد 'چائلڈ رائٹس موومنٹ' نے حکومت پر زور دیا کہ بچوں کے تحفظ کی پالیسی متعارف کروائی جائے اور بچوں کے تحفظ سے متعلقہ قانونی مسودات پر قانون سازی کے لیے عوامی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے عوامی پٹیشن کا اجراء بھی کیا جائے۔ پنجاب سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ یونیسیف کے تعاون سے 2011 سے بچوں کے تحفظ کی پالیسی مرتب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ 8 جولائی 2014ء کو سی آر ایم کی منعقد کردہ ایک ورکشاپ میں پنجاب اسمبلی کے دس اراکین اور دیگر سرکاری اہلکاروں نے بغیر کسی تاخیر کے بچوں کے تحفظ کی پالیسی منظور کرنے پر اتفاق رائے کا اظہار کیا تھا تاہم سال کے اختتام تک پالیسی التواء کا شکار تھی۔ جو بل قانون سازی کے منتظر ہیں ان میں بچوں کے حقوق کے قومی کمیشن کا بل، جسمانی سزا کے امتناع کا بل 2013ء، بچوں کے تحفظ کا (فوجداری قانون) ترمیمی بل 2013ء، بچوں کے حقوق کا منشور بل 2013ء، بچوں کی شادی کی روک تھام کا (ترمیمی) بل شامل تھے۔ یہ تمام وفاقی سطح کے بل ہیں۔ صوبائی سطح پر، بلوچستان چائلڈ پروٹیکشن وویلفئر بل، بچوں کے حقوق کے لیے پنجاب کمیشن کا بل، بلوچستان اور کے پی میں مفت و لازمی تعلیم کے حق کے بل اور بچوں سے ملازمت لینے کے لیے امتناع کے بل صوبوں میں زیر التواء ہیں۔ سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ 2011ء اپنی منظوری کے تین برس بعد بھی نفاذ کا منتظر ہے۔ اس قانون سازی کا سندھ میں بہت زیادہ بگل بجایا گیا تھا۔ حکومت نے 2014ء کے اختتام تک اس اتھارٹی اور اس کے قواعد وضوابط کا نوٹیفکیشن کے اجراء کے لیے کسی قسم کی پیش رفت نہیں کی تھی تاہم قانون کی رو سے قانون سازی کے ساٹھ دنوں کے اندر اندر اتھارٹی کا قیام وجود میں آجانا چاہئے تھا۔

سی آر ایم نے نومبر 2014ء میں ''پاکستان میں ٹیکس کا نظام اور بچوں کی زندگیوں پر اس کے اثرات'' کے عنوان سے ایک رپورٹ بھی شائع کی تھی۔ رپورٹ کے مطابق بچوں کی کمزور صحت اور ناقص تعلیم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر کم سطح کی سرمایہ کاری کی جاری ہے۔ رپورٹ میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اہداف کا تعین کر کے ان کے حصول کے لیے درکار وسائل مختص کئے جائیں تا کہ بچوں پر سرمایہ کاری کو یقینی بنایا جاسکے اور

اس کے ذریعے گروہی تفاوت کو دور کیا جائے، سماجی خدمات کی فراہمی میں پائے جانے والے نقائص کی نشاندہی ہوسکے اور بچوں کی حالت زار میں بہتری کے لیے درکار بنیادی سماجی عوامل میں اصلاحات لائی جاسکیں۔

بچوں پر تشدد

یونیسیف نے ستمبر میں ''ظاہر منظر میں پوشیدہ: بچوں پر تشدد کا شماریاتی تجزیہ'' شائع کیا۔ یہ رپورٹ 190 ممالک کے سروے پر مبنی تھی۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان ان دس ممالک میں شامل تھا جہاں بچوں کی ہلاکتوں کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ سروے میں شریک 15 سے 19 برس کی تیس فیصد لڑکیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ پندرہ برس کی عمر سے جسمانی تشدد کا سامنا کررہی ہیں جبکہ 24 فیصد کا کہنا تھا کہ انہوں نے گزشتہ بارہ ماہ کے عرصہ میں جسمانی تشدد کا سامنا کیا تھا۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ سروے میں حصہ لینے والی پندرہ سے انیس برس کی 53 لڑکیوں اور 34 فیصد لڑکوں کا خیال تھا کہ خاوند/شریک حیات کی مار پیٹ بعض حالات میں باجواز تھی۔

بچوں کے جنسی تشدد کے خلاف کام کرنے والی ایک غیر منافع بخش اور غیر سرکاری تنظیم ساحل نے مارچ میں 'ظالمانہ اعداد 2013ء' کے نام سے ایک رپورٹ شائع کی۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ بچوں کے ساتھ ناروا سلوک کے واقعات میں گزشتہ چند برسوں کے دوران نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ 2013ء میں کل 3002 واقعات پیش آئے جو کہ گزشتہ برس کی نسبت آٹھ فیصد زیادہ تھے۔ کل واقعات میں سے 57.46 فیصد دیہی علاقوں میں جبکہ 42.54 فیصد شہری علاقوں میں پیش آئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق اغوا کاری کے واقعات میں چھ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ 2013ء میں کل 1706 بچے اغواء ہوئے تھے جس سے مراد یہ ہے کہ 2013ء کے دوران فی دن اوسطاً پانچ بچے اغواء ہوئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق جنسی تشدد غیر فطری جنسی اختلاط بشمول اجتماعی جنسی تشدد اور اجتماعی غیر فطری جنسی اختلاط کے 1220 واقعات پیش آئے اور جنسی تشدد کی کوشش/ اجتماعی غیر فطری اختلاط کی کوشش کے 202 واقعات پیش آئے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ناروا سلوک کا نشانہ بننے والے زیادہ تر بچوں کی عمر گیارہ سے پندرہ برس کے درمیان تھی۔ 2003 واقعات پنجاب سے، 583 سندھ سے، 139 خیبر پختونخوا سے، 134 اسلام آباد کے علاقے سے، 106 بلوچستان سے، 35 آزاد وجموں کشمیر سے جبکہ گلگت بلتستان سے صرف دو واقعات رپورٹ ہوئے۔ تنظیم کا کہنا تھا کہ تقریباً 311 واقعات جنوری سے 30 ستمبر 2014 کے دوران رپورٹ آئے تھے جن میں 214 لڑکیوں اور 97 لڑکوں کو صرف راولپنڈی اور اسلام آباد میں نشانہ بنایا گیا تھا۔

گزشتہ سال جنسی تشدد کے واقعات میں غیر معمولی اضافے کے باوجود حکام نے اس مسئلے سے نبٹنے کے لیے کسی قسم کے سنجیدہ اقدامات نہیں کیے

بچوں کے حقوق کے تحفظ کی سوسائٹی (سپارک) نے مئی 2014ء میں اپنی رپورٹ ''پاکستان میں بچوں کی حالت: 2014'' شائع کی جس میں بچوں پر تشدد، کے اعداد وشمار دیئے گئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق 2013ء کے دوران اغواء کے 1115 واقعات، قتل کے 295 واقعات، لڑکوں پر جنسی حملے کے 102 واقعات جبکہ بچوں کی فروخت کے 97 واقعات پیش آئے۔ گزشتہ برس جنسی تشدد کے واقعات میں نمایاں اضافے کے باوجود حکام نے اس مسئلے سے نبٹنے کے لیے کسی قسم کے سنجیدہ اقدامات نہ کئے۔

پاکستان کے شمالی علاقوں میں بچوں کو غیر جنسی اختلاط کا نشانہ بنائے جانے کے رجحان کی نشاندہی کی گئی۔ 2014ء ''پاکستان کی پوشیدہ ندامت'' کے نام سے ایک ڈاکومنٹری نشر ہوئی جس کے پروڈیوسر جیمی ڈورن اور ہدایت کار محمد نقوی تھے۔ ڈاکومنٹری میں خاص طور پر صوبہ پختونخوا کے بس اڈوں پر بچوں کے ساتھ غیر فطری جنسی اختلاط کے بڑھتے ہوئے واقعات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ڈاکومنٹری میں بتایا گیا کہ پشاور کے ہر دس بے گھر بچوں میں سے نو بچے غیر فطری جنسی اختلاط کا شکار ہیں اور کے پی کے ٹرک/بس ڈرائیوروں میں غیر فطری جنسی اختلاط کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ بچوں کو اس سرگرمی میں دھکیلنے کی سب سے بڑی وجہ غربت ہے۔ ڈاکومنٹری میں انٹرویو دینے والے ایک بارہ سالہ لڑکے نے کہا کہ پہلی مرتبہ اس وقت وہ یہ کام کرنے پر

آمادہ ہوا تھا جب وہ بھوکا تھا اور اس نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔

جسمانی سزا

سکولوں میں جسمانی سزا کا سلسلہ جاری رہا۔ ایچ آر سی پی کے اعداد وشمار کے مطابق سال کے دروان 27 طالبات سمیت 120 بچوں کو جسمانی سزا کا نشانہ بنایا گیا۔

اس روش کو ختم کرنے کی غرض سے نومبر 2014ء میں بچوں کے عالمی دن پر جسمانی سزا کے خاتمے کے لیے سہ ماہی مہم کی بنیاد رکھی گئی۔ ''بڑے پیار سے سمجھائیں'' کے عنوان سے شروع ہونے والی یہ مہم وزارت قانون اور یونیسیف کی مشترکہ کوشش تھی۔ اس مہم کے تحت مختلف ذرائع سے کروڑوں لوگوں کو جسمانی سزا کے برے اثرات سے آگاہ کیا گیا۔ مہم کے آغاز کے وقت مہم سے پہلے پانچ الفاظ میں کیے گئے بنیادی جائزے کے مشاہدات سے بھی لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔ اس تحقیق میں بتایا گیا کہ ہر دس والدین اور سرپرستوں میں سے 9 نے اپنے بچوں کو مارا پیٹا تھا اور نصف سے زائد کو معلوم نہیں تھا کہ اس مار پیٹ کے بچے پر کتنے دورس اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ وزارت قانون، انصاف وانسانی حقوق نے ''بچوں کے خلاف تشدد کے خاتمے کے لیے جنوبی ایشیائی اقدام'' (ایس اے ای وی اے سی) اور ''بچوں پر تشدد کے خلاف کارروائی کے لیے قائم جنوبی ایشیاء گروپ'' (ایس اے سی جی) کے تعاون سے مارچ 2014ء میں بچوں کی ''جسمانی سزا کے خلاف مہم'' (سی او پی) کے عنوان سے ایک مہم شروع کی جو کہ اوپر مذکور مہم سے ملتی جلتی تھی۔ پاکستان سارک ممالک میں سے یہ مہم چلانے والا دوسرا ملک تھا جس کا مقصد جسمانی سزا کے امتناع کے لیے قانون سازی اور، حکام، سول سوسائٹی، بچوں اور دیگر فریقین کی تربیت کرنا تھا کہ بچوں کی سرپرستی، تدریس اور نگہداشت کے فریضے کو مثبت انداز میں سرانجام دیا جائے۔ مطلوبہ قانونی اصلاحات کا موثر نفاذ اور کمیونٹی، علاقائی اور قومی سطح پر لوگوں کو بچوں کی نشوونما پر جسمانی سزا کے نقصان دہ اثرات سے آگاہ کرنا بھی اس مہم کا مقصد تھا۔

کسی بھی صوبے نے جسمانی سزا کے امتناع کا قانون منظور نہ کیا۔ اپریل 2014ء میں ڈائریکٹوریٹ ایلیمنٹری وثانوی تعلیم، کے پی نے نوٹیفکیشن جاری کیا کہ کسی بھی ضلع میں اگر کسی استاد کے خلاف بچے کو جسمانی سزا دینے کی شکایت موصول ہوئی تو استاد کے خلاف ملازمت سے برخواستگی کے خصوصی اختیارات کے آرڈیننس 01-2000 کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ نوٹیفکیشن میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا کہ سکولوں میں جسمانی سزا کا عام رجحان صوبے کی شرح خواندگی میں شدید کمی کا سبب تھا اور تعلیمی ایم ڈی جی کے حصول میں رکاوٹ بھی تھا۔

میڈیا نے ملک کے مختلف علاقوں میں جسمانی سزا کے متعدد واقعات کی نشاندہی کی۔ ان میں سے چند واقعات میں بچے شدید زخمی ہوئے؛ مثال کے طور پر اگست 2014ء میں ایبٹ آباد میں ایک معلم نے ایک سات سالہ بچے کو پہلے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور پھر اسے ہوا میں اچھال دیا جس کے نتیجے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ستمبر میں اسلام آباد میں پیش آنے والے ایک اور واقعے میں ایک ٹیچر نے نویں جماعت کے طالب علم کو تشدد کا نشانہ بنایا جس سے اس کی دو انگلیاں ٹوٹ گئیں۔

الف اعلان اور سوسائٹی برائے ترقی تعلیم (ساہی) کی جانب سے 20 نومبر 2014ء کو''اساتذہ کی آواز: پاکستان بھر کے اساتذہ کی زیرِ تعلیم'' کے عنوان سے شائع ہونے والی رپورٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ جسمانی سزا اور اساتذہ کی غیر تدریسی فرائض کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا پاکستان کے اساتذہ غیر تدریسی فرائض کے بوجھ تلے دبے ہیں جو انہیں کمرہ جماعت سے دور لے جاتی ہیں۔ یہ فرائض جسمانی سزا کا باعث بنتے ہیں اور اگر ان اساتذہ کو چناؤ کا اختیار دیا جائے تو وہ تدریس کے مقابلے میں بہتر تنخواہ والے انتظامی عہدوں کو ترجیح دیں گے۔

چائلڈ لیبر

2014ء کے غلامی کے عالمی گوشوارے میں چھٹے نمبر پر تھا، جہاں چائلڈ لیبر عام تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق تقریباً 20 لاکھ پاکستانی یعنی ملک کی کل آبادی کا تقریباً 1.130 فیصد مزدوری کرنے والے بچوں اور گروی مزدورزں پر مشتمل تھا۔ جی ایس آئی نے بھی انکشاف کیا کہ پاکستان میں کام کرنے والے بچوں کی تعداد ایک کروڑ کے قریب تھی جن میں سے 38 لاکھ بچوں کی عمر 5 سے 14 سال تھی۔ آئی ایل او کے 2012ء کے اندازے کے مطابق یہ تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ تھی جبکہ یونیسیف کا کہنا تھا کہ ملک میں کم عمر ملازمین کی تعداد تقریباً ایک کروڑ تھی۔ پاکستان کی چائلڈ رائٹس موومنٹ کے اندازے کے مطابق پاکستان میں اسی سال 13 سے 19 سال کی عمر کے محنت کش بچوں اور نوعمر افراد کی تعداد تقریباً اٹھانوے لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ ان میں سے پچیس لاکھ اسی ہزار بچوں کی عمر 10 سے 14 سال تھی، جبکہ اس کے علاوہ ہزاروں بچے ایسے تھے جن کی عمر دس سال سے بھی کم تھی۔ اگرچہ ملک بھر میں بچے خطرناک حالات میں کام کر رہے ہیں تاہم چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے 2014ء میں قومی یا صوبائی سطح پر کوئی بل متعارف نہیں کروایا گیا۔

آئی ایل او چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے اس سال بھی پاکستان کی مدد جاری رکھے ہوئے ہے۔ اگست 2014ء میں پنجاب کے گورنر اور عالمی ادارہ برائے محنت نے ''چائلڈ لیبر اور گروی مشقت کے خاتمے کا

پاکستان میں چائلڈ لیبر عام تھی

مربوط پراجیکٹ'' کےعنوان سے ایک پراجیکٹ کا آغاز کیا۔ اس پراجیکٹ کا 2020 میں ختم ہونے کا امکان ہے اوراس کا ہدف پنجاب کے 36 اضلاع میں چائلڈ لیبر اور گروی مشقت پر قابو پانا ہے۔ آئی ایل او کی معاونت سے چلنے والے دیگر پراجیکٹ، جن کا نفاذ وزارت برائے سمندر پار پاکستانی اور ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے اشتراک سے کیا گیا، ان میں ساہیوال اور سکھر کے آٹھ ہزار بچوں کو بحال کیا گیا، جیسا کہ آئی ایل او کی پریس ریلیز میں کہا گیا۔ پنجاب حکومت اپنے وسائل سے دیگر اضلاع میں بھی ایسے پراجیکٹ شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

2014ء میں ''سیو دی چلڈرن'' نے آئیکی فاؤنڈیشن، ڈیوکون اور حکومت سندھ کے اشتراک سے پاکستان کے کپاس کاشت کرنے والے ضلع شہید بےنظیر آباد میں چائلڈ لیبر کے اسباب پر قابو پانے کے لیے اپنی مشترکہ کاوشوں کا دائرہ وسیع کر دیا۔ اس پراجیکٹ کا مقصد بچوں کے لیے تعلیم کے امکانات کو بہتر بناتے ہوئے اور خواتین اور لڑکیوں کو خود مختار بناتے ہوئے اگلے چار سالوں میں کپاس کی کاشت سے وابستہ پندرہ لاکھ بچوں کے حالات زندگی کو بہتر بنانا تھا۔

بچوں کا نظام انصاف

سال 2014ء کے دوران فوجداری مقدمات میں ملوث بچوں کے لیے نہ تو الگ عدالت قائم کی

گئی اور نہ ہی کم سن مجرموں کی اصلاح کے ادارے قائم کئے گئے جن کا بچوں کے نظام انصاف سے متعلق آرڈیننس میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اے جی ایچ ایس کا چائلڈ رائٹس یونٹ جو بچوں کے حقوق کے فروغ اور تحفظ سے متعلق پراجیکٹ ہے، پنجاب کی جیلوں میں بچوں کے سیکشن کی باقاعدگی کے ساتھ نگرانی کرتا ہے۔ 2014ء کی مانیٹرنگ رپورٹس کے مطابق اے جی ایچ ایس کے چائلڈ رائٹس یونٹ کی ٹیم نے پنجاب کی تقریباً تمام جیلوں میں بے باقاعدگیوں کی تصدیق کی۔ بالغوں کی بچوں سے علیحدگی پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا تھا۔ بچوں کو تھانوں اور بعض اوقات جیلوں میں بھی ایذا رسانی کا سامنا رہا۔

پاکستان میں 2013ء میں بچوں کی صورتحال سے متعلق سپارک کی 2014ء میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق 2013ء میں پاکستان کی تمام جیلوں میں 1383 کم سن بچے موجود تھے، جن میں سے 137 مجرم تھے اور 1246 کے مقدمات زیرسماعت تھے۔ پنجاب کی جیلوں میں چند کم سن بچوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو 783 تھی، جبکہ سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں ان بچوں کی تعداد بالترتیب 217,276 اور 106 تھی۔ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ 2013ء میں ملک میں 288 بچوں کو پروبیشن پر رہا کیا گیا۔ پنجاب میں 156، خیبر پختونخوا اور فاٹا میں 71، سندھ میں 151 اور بلوچستان میں دس بچون کو پروبیشن پر رہا کیا گیا۔

ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق صوبہ پنجاب کی مختلف جیلوں میں 746 کم سن قیدی موجود تھے جن میں سے صرف 61 کو سزا سنائی گئی۔ صوبے میں ایک بھی کم عمر بچی قید نہیں تھی۔

سندھ کی جیلوں کے دورے کرنے والی فاؤنڈیشن برائے تحقیق و انسانی ترقی (ایف آر ایچ ڈی) کی اطلاعات کے مطابق کراچی کی جیلوں میں 198 کم عمر بچے قید تھے جن میں سے 196 بچوں کے مقدمات زیرسماعت تھے اور دو کو سزا سنائی گئی۔ حیدرآباد کی جیلوں میں 63 کم عمر بچے قید تھے جن میں سے 85 (ان میں سے نصف پر قتل کا الزام تھا) کے مقدمات زیرسماعت تھے اور پانچ کو سزا سنائی گئی تھی۔ سکھر کی جیلوں میں اٹھارہ کم عمر بچے قید تھے، جن میں 16 (جن میں سے 10 پر قتل کا الزام تھا) کے مقدمات زیرسماعت تھے اور 2 سزا یافتہ تھے اور لاڑکانہ کی جیلوں میں بارہ کم عمر بچے قید تھے جن میں سے 11 (ان میں سے 8 پر قتل کا مقدمہ درج تھا) کے مقدمات زیرسماعت تھے، ایک کے خلاف فیصلہ سنایا جاچکا تھا جبکہ ان میں سے ایک بھی سزا یافتہ نہیں تھا۔

شفقت حسین جس کی عمر اب چوبیس سال ہے، کراچی کی سنٹرل جیل میں قید تھا۔ وہ گزشتہ دس سال سے زائد عرصے سے سزائے موت کا منتظر تھا۔ انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے قتل کے جرم میں اسے

پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ جب اسے 2001ء میں اغواء کی کوشش اور قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور سزا سنائی گئی، اس وقت اس کی عمر چودہ برس تھی۔ اس مقدمے کا دارومدار صرف ایک ثبوت پر تھا، جو شفقت کا اقبال جرم تھا۔ شفقت اور اس کے وکیلوں کا کہنا تھا کہ اس سے تشدد کے ذریعے اقبال جرم کروایا گیا تھا۔ عدالت کے ریکارڈ کے مطابق، شفقت نے جج کو بتایا تھا کہ اس نے دباؤ اور تشدد کی وجہ سے جرم کا اقرار کیا تھا۔ نہ ہی مقدمے کی سماعت کرنے والے جج نے اور نہ ہی شفقت کے ریاست کی جانب سے مقرر کردہ وکیل نے ان دعوؤں کی چھان بین کی۔ پولیس کی رپورٹس کے مطابق شفقت پر ایک بالغ کے طور پر مقدمہ چلایا گیا اور اس وقت اس کی عمر تئیس سال تھی۔ (وزیر داخلہ چودھری نثار علی خان نے 2 جنوری 2015ء میں شفقت کی پھانسی پر عملدرآمد روکنے کا حکم دیا۔ جس کے بعد شفقت کے مقدمے کا ازسرنو جائزہ لیا گیا، تاہم وہ اب بھی سزائے موت کا منتظر تھا)۔

علاقہ	کم عمر قیدیوں کی تعداد
پنجاب	764
سندھ (02-09-2014 تک)	131
بلوچستان	46
خیبر پختونخوا	ڈیٹا دستیاب نہیں
گلگت بلتستان	3
کل	**1,126**

پیدائش کا اندراج

یونیسیف کے مطابق پاکستان دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں پیدائش کے اندراج کی شرح سب سے کم ہے۔ گزشتہ ریکارڈ کے مطابق یہ شرح ستائیس فیصد تھی۔ یونیسیف نے ملک میں پیدائش کے اندراج کی شرح میں بہتری لانے کے لیے ایک موبائل کمپنی ٹیلی نار کے اشتراک سے ستائیس مارچ کو ایک پائلٹ پراجیکٹ کا آغاز کیا۔ اس پراجیکٹ کا مقصد موبائل کی درخواستوں کے ذریعے پیدائشوں کا اندراج کرنا ہے۔ یہ جدید اختراعی طریقہ کار سستا اور تیز رفتار تصور کیا جاتا ہے اور اس کی مدد سے اندراج کی شرح میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پائلٹ پراجیکٹ پنجاب اور سندھ کے منتخب یونین کونسلوں میں شروع کیا گیا۔ پنجاب میں پیدائش کے اندراج کی شرح میں اضافہ کرنے کے لیے پنجاب کے خواتین کی خودمختاری سے متعلق اقدام 2014ء، کے تحت صوبے بھر میں یونین کونسل کی سطح پر اندراج کی فیس ختم کر دی گئی۔

بے گھر بچے اور معذور بچے

2014ء میں بے گھر بچوں کی تعداد سے متعلق کسی قسم کے کوائف اکٹھے نہیں کئے گئے۔ سول سوسائٹی کے اندازوں کے مطابق بے گھر بچوں کی تعداد 15 لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ ایک غیر سرکاری تنظیم انیشی ایٹر ہیومن ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن (آئی ایچ ڈی ایف) کے حالیہ سروے میں اندازہ لگایا ہے کہ بے گھر بچوں میں سے 66 فیصد گھر سے بھاگے ہوئے تھے جنہوں نے خود پر گھر، سکول یا کام کی جگہ پر ہونے والے تشدد سے تنگ آ کر اپنے گھر کو خیر باد کہا تھا۔ آئی ایچ ڈی ایف کے مطابق منظّم مافیا بے گھر بچوں سے گداگری اور چوریاں کروا کر ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ چائلڈ رائٹس موومنٹ (سی آر ایم) نے اس امر پر مایوسی کا اظہار کیا کہ حکومت نے پاکستان کے بے گھر بچوں سے متعلق بچوں کے حقوق کی کمیٹی کی سفارشات پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی بے گھر بچوں کی صورتحال میں بہتری کے لیے کوئی منظّم طریقہ کار اپنایا، بے گھر بچوں کو پناہ دینے اور انہیں تحفظ دینے کے لیے کسی قسم کے مراکز موجود نہیں تھے۔ خاص طور پر سندھ میں بے گھر بچوں کی معاونت کے لیے پنجاب چائلڈ پروٹیکشن بیورو یا خیبر پختونخوا کے چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر کمیشن جیسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔

ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ پاکستان نے پہلی مرتبہ برازیل کے شہر ریوڈی جینیرو میں ہونے والے سٹریٹ چائلڈ ورلڈ کپ (سی ایس ڈبلیوسی) 2014ء میں حصہ لیا۔ پاکستان کے 9 کم عمر بے گھر بچوں نے

پاکستان میں معذورین کی تعداد ایک کروڑ 80 لاکھ ہے جن کی بیشتر تعداد بچوں پر مشتمل ہے

اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور کانسی کا ایک تحفہ جیت کر فخر کے ساتھ پاکستان واپس آئے۔ اس مقابلے میں شرکت سے ملک کے بے گھر بچوں کو ایک بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اپنی مہارتوں کا مظاہرہ کرنے اور اپنی پہچان کرانے کا موقع ملا۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں معذور بچوں کی تعداد ایک کروڑ اسی لاکھ ہے جن میں ایک بڑی تعداد بچوں کی ہے۔ 2014ء میں معذور بچوں کی فلاح اور سہولت کے حوالے سے کوئی نمایاں پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی، تاہم پنجاب نے خصوصی بچوں کی بہبود کے لیے بجٹ میں اسی کروڑ روپے مختص کیے۔ سول سوسائٹی نے کئی بار جامع تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ خصوصی بچوں کے مسائل کو اجاگر کرنے میں میڈیا کا کردار حوصلہ افزا نہیں تھا۔ 2014ء میں معذور بچوں کو تعلیم فراہم کرنے کے لیے وفاقی یا صوبائی حکومتوں نے کسی قسم کے سنجیدہ اقدامات نہیں کیے۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے جسمانی طور پر معذور بچوں کو تعلیم کے بہتر مواقع کی فراہمی کے لیے اقدامات کیے۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ نومبر میں پاکستان سائن لینگویج (پی ایس ایل) ریسورسز کا آغاز کیا گیا، جس کا تعلق دستخطوں کی زبان کو سمجھنے والے آلات سے تھا۔

کم عمری کی شادی/کم عمر مائیں

اندازوں کے مطابق پاکستان کی سترہ کروڑ نوے لاکھ دس ہزار آبادی کی عمر اٹھارہ سال یا اس سے کم ہے۔ ساحلکی سالانہ رپورٹ ''تکلیف دہ اعداد و شمار 2013ء کے مطابق ملک میں کم عمری کی شادیوں کے 96 واقعات پیش آئے، یہ تعداد 2012ء کے مقابلے میں اکیس فیصد زیادہ ہے۔ ان میں سے 71 واقعات دیہی علاقوں اور 20 فیصد واقعات شہری علاقوں میں پیش آئے۔ کم عمری کی شادی کے 41.76 فیصد متاثرین کی عمر گیارہ سے پندرہ سال اور 34.7 فیصد متاثرین کی عمر چھ سے دس سال تھی۔ صوبہ وار درجہ بندی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم عمری کی شادی کے 42.86 فیصد واقعات سندھ، 30.76 فیصد خیبر پختونخوا اور 25,27 فیصد واقعات پنجاب میں پیش آئے۔ بلوچستان میں کم عمری کی شادی کا ایک بھی واقعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ پولیس نے 57.14 فیصد واقعات کے مقدمات درج کیے۔ یونیسیف کی ایک رپورٹ ''بچوں کی زندگیوں میں بہتری، مستقبل میں تبدیلی۔ جنوبی ایشیا میں بچوں کے حقوق کے 25 سال'' میں یہ بات سامنے آئی کہ جنوبی ایشیا کی نصف کے قریب لڑکیوں کی شادی اٹھارہ سال سے پہلے کر دی گئی۔

مددگار قومی ہیلپ لائن کے مطابق سال کے پہلے چار ماہ کے دوران پاکستان میں کم عمری کی شادی کے 42 واقعات پیش آئے۔ ان میں سے 17 واقعات جنوری، 10 واقعات فروری، 8 واقعات مارچ اور 7 واقعات اپریل میں پیش آئے۔

سندھ حکومت نے اپریل 2014 میں بچوں کی شادی کی ممانعت کا بل 2013 منظور کیا جس کے تحت 18 برس سے کم عمر بچوں کی شادی ممنوع ہے

کم عمری کی شادی کا براہ راست نتیجہ کم عمر میں ماں بننے کی صورت میں نکلتا ہے، جس کے کم عمر ماں کی صحت پر شدید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پی ڈی ایچ ایس 13-2012ء کے مطابق پاکستان میں 8 فیصد نوعمر خواتین (15 سے 19 سال کی عمر کی) یا تو ماں بن چکی ہیں یا پھر اپنے پہلے بچے کو جنم دینے والی ہیں۔ سروے میں یہ بھی پتہ چلا کہ کم آمدنی والے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً 12 فیصد نوعمر لڑکیوں کا کم عمر میں ماں بننے کا زیادہ امکان تھا جبکہ اس کے مقابلے میں زیادہ آمدنی والے گھرانوں میں یہ شرح تین فیصد تھی۔ خیبر پختونخوا میں کم عمر میں ماں بننے کی شرح سب سے زیادہ 10 فیصد تھی۔

اپریل 2014ء میں سندھ حکومت نے کم عمری کی شادی کی ممانعت کا بل 2013ء کی منظوری دی جس کے تحت اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کی شادی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ بل قومی اسمبلی میں شرمیلا فاروقی اور روبینہ قائم خانی نے 2013ء میں پیش کیا تھا جس کی تمام اراکین نے متفقہ طور پر منظوری دی تھی۔ تاہم اس بل کو اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس نے اس بل کو اس بناء پر اسلامی احکامات کے منافی قرار دیا کہ شریعت میں شادی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ سندھ کے کم عمری کی شادی کی ممانعت کے بل 2013ء کے مطابق اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو تین سال قید اور جرمانے کی سزا بھی سنائی جا سکتی ہے۔ سال کے آخر تک کسی اور صوبے نے ایسا قانون منظور نہیں کیا تھا۔

سفارشات

1۔ صوبائی اور وفاقی حکومتوں کو پولیو سے پاک پاکستان اور پولیو سے پاک دنیا کے لیے تمام ممکن اقدامات کرنے چاہئیں۔ 2014ء میں پولیو کے کیسز میں نمایاں اضافہ اس بات کا متقاضی ہے کہ صورتحال پر قابو پانے اور ملک سے اس وبائی مرض کے خاتمے کے لیے ٹھوس اور فوری اقدامات کئے جائیں۔

2۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ تعلیم پر کام کرنے والی سوسائٹی کی تنظیموں کو نگران کا کردار ادا کرنا چاہئے اور حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہئے کہ وہ تعلیم کے لیے اپنے بجٹ کے اہداف کو پورا کریں۔ جسمانی سزا کو جرم قرار دینے کے لیے بھی اقدامات کئے جائیں جو بچوں کے تعلیم کو ترک کرنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔

3۔ تمام صوبوں کو بچوں کی ایک مخصوص کیٹیگری پر توجہ دینے کی بجائے ایسی پالیسی اپنانی چاہئے جو بچوں کی فلاح کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو۔ بچوں سے متعلق تمام زیرالتواء قوانین کی فوری طور پر منظوری دی جائے اور قوانین سے ہم آہنگ اصول جن کی پہلے ہی منظوری دی جا چکی ہے ان کی تشہیر کی جائے تاکہ موجودہ قوانین کے نفاذ کو یقینی بنایا جا سکے۔

4۔ چائلڈ لیبر کا خاتمہ حکومت کی ترجیحات کا حصہ ہونا چاہئے۔ چائلڈ لیبر میں مصروف بچوں کی تعداد سے متعلق ایک تازہ سروے کا انعقاد کیا جائے تاکہ اس حوالے سے ایک مناسب پالیسی تشکیل دی جا سکے۔

5۔ قابل اطلاق قوانین سے متعلق آگہی اور انصاف اور شفاف تحقیقات تک بہتر رسائی کے ذریعے بچوں کے خلاف ہر قسم کے تشدد کا خاتمہ کیا جائے۔ بچوں کو جنسی زیادتی سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے والدین اور بچوں کے لیے آگہی اجلاس منعقد کئے جائیں۔

6۔ پیدائش کے اندراج کو بچوں کے بنیادی حق کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے اور حکومت کو خاص طور پر دیہی علاقوں میں اندراج کے عمل میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا چاہئے۔

7۔ لڑکیوں کی شادی کے لیے موزوں عمر کو اٹھارہ سال تک بڑھانے کے لیے تمام صوبوں کے کم عمری کی شادی سے متعلق قوانین کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ میڈیا کے ذریعے اور گھر گھر جا کر آگہی فراہم کر کے کم عمری کی شادی کے نقصانات (ذہنی اور جسمانی) کی نشاندہی کی جائے۔

لیبر

ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور اس بنیادی اصول کہ ''ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام'' اور ''ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ'' پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لیے مناسب اقدامات بروئے کار لائے گی۔

آئین پاکستان - [آرٹیکل- 3]

غلامی نہ تو موجود ہے اور نہ اس کی اجازت ہے کوئی بھی قانون کسی بھی شکل میں، پاکستان میں اس کی اجازت فراہم نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے پاکستان میں متعارف کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہر قسم کی جبری مشقت اور انسانوں کی تجارت پر پابندی عائد ہے۔ چودہ سال سے کم عمر کے کسی بھی بچے کو کسی فیکٹری یا کان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل 11-(3-1)]

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا۔ سوائے اس کے کہ، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ اور سالمیت کے مفاد میں، یا امن عامہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون کے تحت معقول پابندیاں عائد کی جائیں۔

آئین پاکستان [آرٹیکل 17-(i)]

ریاست منصفانہ اور مشفقانہ شرائط کار متعارف کرانے کی پابند ہوگی۔

آئین پاکستان [آرٹیکل - 37-(c)]

جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر، ریاست، عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور دولت کے ارتکاز اور تقسیم اور پیداوار کے ذرائع کو، چند ہاتھوں میں سمٹنے سے روک کر، عوام کا معیار زندگی بہتر بنائے گی۔ ریاست، آجر اور ملازم، جاگیردار اور مزارع کے حقوق کے درمیان منصفانہ توازن قائم کرنے کی کوشش کرے گی اور ملک کے وسائل کے مطابق تمام شہریوں کو کام اور روزگار اور آرام کے مناسب مواقع سے روشناس کرائے گی اور ان کی تفریح کے لیے مواقع کی فراہمی کو بھی یقینی بنائے گی۔ ریاست، حکومت پاکستان کی ملازمت یا دوسرے اداروں میں خدمات سرانجام دینے والے تمام افراد کو لازمی بیمہ یا دیگر ذرائع سے سماجی تحفظ فراہم کرے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر، ان تمام افراد کو ضروریات زندگی مثلاً خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔۔۔ اور افراد کی آمدنیوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔

آئین پاکستان [آرٹیکل - 38اے تا ای]

کسی شخص کو غلامی یا محکومی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- 4]

ہر شخص کو، معاشرے کا رکن ہونے کے ناطے، سماجی تحفظ کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 22]

ہر شخص کو کام کرنے، پیشے کا انتخاب کرنے، منصفانہ اور مناسب شرائط کار طے کرنے اور بیروزگاری کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو کسی امتیاز کے بغیر، مساویانہ کام کے بدلے مساویانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو کام کرتا ہے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کام کے عوض منصفانہ اور مناسب معاوضہ وصول کرے تاکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے وجود کو انسانی وقار کا اہل ثابت کر سکے اور اگر ضرورت پڑے تو اسے دیگر سماجی تحفظ کے ذرائع سے مستحکم بھی کر سکے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہر شخص کو یونین بنانے اور اس میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔
انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 23 (1 تا 4)]

ہر شخص کو آرام اور تفریح کا حق حاصل ہے۔ بشمول کام کرنے کی مدت کی مناسب حد اور تنخواہ کے ساتھ بوقت ضرورت چھٹی۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 24]

ہر شخص کو ایک ایسا معیار زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے کافی ہو۔ بشمول خوراک، لباس، رہائش، طبی سہولیات، ضروری سماجی خدمات اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوہ یا بوڑھا ہونے کی صورت میں، ایسے حالات میں جو اس کی دسترس سے باہر ہیں، عدم روزگار کی صورت میں تحفظ کا حق۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 25-(1)]

ریاست معاشی استحصال یا کسی ایسے کام، جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے یا بچے کی تعلیم، صحت یا جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی یا سماجی نشو ونما میں رکاوٹ بن سکتا ہے، کے خلاف بچے کے تحفظ کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔
بچوں کے حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کا کنونشن [آرٹیکل 32-(1)]

بہتر معیار زندگی اور بہتر حالات کار، اجرت میں اضافہ، محفوظ اور مناسب اوقات کار، بیماری معذوری اور بڑھاپے میں آمدنی کا تحفظ اور انجمن سازی کی آزادی 2014 کے دوران بھی محنت کشوں کی اکثریت کے لئے خواب ہی رہے۔ دوران سال لیبر قوانین کی خلاف ورزیاں بلا روک ٹوک جاری رہیں۔

یکم جنوری 2014ء سے پاکستان کو جی ایس پی پلس حیثیت ملنے کے باعث رعائتی محصول پر یورپی منڈی تک ترجیحی رسائی کا درجہ حاصل ہونے پر محنت کشوں کو امید کی کرن دکھائی دی۔ جی ایس پی پلس عالمی ادارہ محنت کے 27 میں سے آٹھ کلیدی ضوابط یعنی محنت، انسانی اور خواتین کے حقوق، ماحولیات، منشیات اور رشوت ستانی پر عمل درآمد سے مشروط ہے۔ توقع تھی کہ اب حکومت لیبر قوانین کی خلاف ورزیوں کا سختی سے نوٹس لے گی۔ تاہم وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں نے لیبر قوانین پر عمل درآمد کے لئے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔

دوران سال سرکاری اور غیر رسمی شعبے میں محنت کشوں کے کئی گروپوں نے تنخواہوں کی ادائیگی، تنخواہوں میں اضافے اور کم از کم اجرت کے قانون کے نفاذ کے لئے جلوس نکالے۔ سرکاری شعبے کی مزدور انجمنوں نے نجکاری کی مزاحمت کی اور لیبر قوانین میں اصلاحات پر زور دیا۔

جنوری میں نجکاری کمیشن نے پاکستان اسٹیل ملز، آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کمپنی لمیٹڈ، پی آئی اے،

حیدرآباد: سندھ کے 16اضلاع سے تعلق رکھنے والے واپڈا ورکرز حیدر چوک پر اکٹھا ہوئے۔اُن کا اجتماع کا مقصد واپڈا کی 16 توانائی فراہمی کی کمپنیوں سمیت قومی اداروں کی مجوزہ نجکاری کے خلاف احتجاج کرنا تھا

ہیوی الیکٹریکل کمپلکس ،نیشنل پاور کنسٹرکشن کمپنی ،لیسکو ،فیسکو ، ناردرن پاور جنریشن کمپنی ،حبیب بینک اورالائیڈ بینک کی نجکاری کا اعلان کیا گیا۔آل پاکستان واپڈا ہائیڈروالیکٹرک ورکرز یونین اور ناردرن پاور جنریشن کمپنی کے ورکروں نے کئی اجلاس منعقد کئے اور ممکنہ نجکاری کے خلاف مظاہرے کئے۔

انٹرنیشنل ٹریڈ یونین کنفیڈریشن (IUTC) کی 2014ء میں 1 سے 5پلس تک کی درجہ بندی کے مطابق پاکستان دنیامیں محنت کشوں کیلئے بدترین مما لک کی فہرست میں چوتھے نمبر پر تھا۔درجہ بندی میں چوتھے نمبر پر شمار ہونے والے مما لک میں نظام کی باضابطہ اور منظّم خلاف ورزیاں رپورٹ ہوئیں ۔وہاں کے سرکاری ادارے شدت سے محنت کشوں کی اجتماعی آواز دبانے میں مصروف رہے جس کے باعث بنیادی اجتماعی حقوق تسلسل کے ساتھ خطرے میں رہے۔

لیبر مارکیٹ

شماریات کے وفاقی ادارے نے 2014ء کے دوران محنت کشوں سے متعلق سہ ماہی سروے رپورٹیں جاری نہیں کیں۔2013-14ء کا لیبر فورس کا سالانہ سروے بھی سال کے آخر تک شائع نہیں ہو

سکا۔ محنت کشوں کے 13-2012ء کے تا حال لیبر فورس کے سروے کے مطابق لیبر فورس پانچ کروڑ ستانوے لاکھ چالیس ہزار مزدوروں پر مشتمل تھی۔ جن میں سے 5 کروڑ 60 لاکھ 10 ہزار ورکر برسرِ روزگار تھے۔ اس طرح 7 3 لاکھ تیس ہزار ملازمتوں کی کمی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ بیروزگاری کی شرح 6.2 فیصد تھی۔ 29-15 سال کی عمر کے بیروزگار مزدوروں کی 9.2 فیصد شرح کے حساب سے کافی زیادہ تھی۔ لیبر فورس کی شرکت کی شرح 32.9 فیصد رہی اور اس میں مردوں کی شرح 43.9 فیصد اور خواتین ورکرز کی شرح 15.6 فیصد ہے۔ برسرِ روزگار ورکروں کا 69.48 فیصد حصہ ہفتے میں چالیس سے چھپن گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ کام کرتا ہے جس کا مطلب ہے فی گھنٹہ پیداوار میں کمی اور اس کے ساتھ ساتھ اجرت میں کمی افرادی قوت کا بڑا حصہ یعنی 59.9 فیصد حصہ بشمول خودکفیل اور خاندان کی کفالت کرنے والے غیر مستقل یا عارضی قسم کی ملازمت کر رہے ہیں۔

قوانین، پالیسیاں اور مقدمہ بازی

مزدور انجمنوں کیمستقل کوششوں اور عالمی ادارہ محنت (ILO) کے لگاتار چار سالوں کے دباؤ کے باعث مئی 2014ء کو انجمن سازی کے لئے کم از کم پچاس ورکروں کی لازمی شرط کو ایک ترمیم کے ذریعے پنجاب انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ 2010ء سے ختم کر دیا گیا۔

ماہ اگست میں سندھ ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ صادر کیا جس کے انجمن سازی اور صنعتی تنازعات کا تصفیہ کرنے پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ متعدد مزدور انجمنوں، سرکاری اور تجارتی اداروں کی طرف سے دائر کی جانے والی انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ 2010ء سے متعلق 52 مختلف درخواستوں کو نپٹاتے ہوئے ہائی کورٹ کے فل بنچ نے قرار دیا کہ بین الصوبائی سطح پر کام کرنے والی کمپنیوں کے معاملات کے حوالے سے قانون سازی کی مجاز وفاقی حکومتھے۔ یہ فیصلہ بین الصوبائی کمپنیوں کے تمام مقدمات کو لیبر کورٹ سے نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کورٹ (NIRC) کے مجاز بنچوں کو منتقل کرنے کا محرک بنا جو کارکنوں کے لئے مشکلات کا سبب بنا کیونکہ ہر صوبے میں NIRC کا صرف ایک ایک بینچ کام کر رہا ہے۔ اس فیصلے نے ان پوشیدہ خدشات کی نشان دہی کر دی جن کی طرف ماہرین 18 ویں ترمیم کے بعد اشارہ کرتے رہے تھے۔

اپریل 2014ء میں حکومت پنجاب نے ٹریڈ یونین کے نمائندوں کی مدد سے لیبر پالیسی کا مسوّدہ تیار کیا جس کے کئی نکات پر شدید تنقید کی گئی۔ پالیسی تیار کرتے وقت سہ فریقی نظام کی عدم موجودگی کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی گئی۔ دسمبر تک لیبر پالیسی کو حتمی شکل نہ دی جا سکی۔ جنوری میں ڈومیسٹک ورکرز (گھریلو ملازمین) ایکٹ 2013ء (حقوق ملازمت) کا مسودہ سینیٹ میں پیش کیا گیا جسے قانون و انصاف کی قائمہ

کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ قانون صرف وفاقی دارالحکومت کے لئے تھا۔

اجرتیں اور پنشن

جون میں پنجاب اور سندھ کی حکومتوں نے سال 15-2014ء کے لئے غیر ہنر مند ورکروں کی کم از کم اجرت دس ہزار روپے سے بڑھا کر بارہ ہزر روپے ماہوار کردی۔ پنجاب حکومت نے 51 صنعتوں میں کم از کم اجرتوں پر نظر ثانی کی اور نئی کم سے کم اجرتوں کا نفاذ کرنے کے علاوہ ورک مین کمپنسیشن ایکٹ مجریہ 1923ء میں ترمیم کے ذریعے فوتیدگی کی گرانٹ دو لاکھ روپے سے بڑھا کر چار لاکھ روپے کردی اور انڈسٹریل اینڈ کمرشل اسٹیبلشمنٹ ایکٹ مجریہ 1968ء میں ترمیم کرکے ورکروں کی گروپ انشورنس کی رقم دو لاکھ روپے سے بڑھا کر چار لاکھ روپے کردی۔

حکومت بلوچستان نے کم از کم اجرت نو ہزار روپے سے بڑھا کر دس ہزار روپے ماہوار کردی۔ خیبر پختونخوا حکومت نے بھی اجرت بڑھا کر بارہ ہزار روپے کردی۔ بعد میں اپوزیشن کے مطالبے پر کم از کم اجرت بڑھا کر پندرہ ہزار روپے کردی۔ تاہم خیبر پختونخوا حکومت نے سال کے اختتام تک اس اضافے کا نوٹیفیکیشن جاری نہیں کیا۔

لیبر لاز پر عمل درآمد کے لئے موثر نظام نہ ہونے کے سبب محنت کشوں کی کثیر تعداد 2014ء میں کم از کم اجرت بارہ ہزار روپے ماہوار حاصل نہ کرسکی۔ پاکستان لیبر فورس سروے 2013ء کے سرکاری اعداد و

ای او بی آئی اور وزارتِ خزانہ کے درمیان عدم اتفاق کا مطلب ہے کہ بزرگ شہریوں کو کمیٹی کے فیصلے کا منتظر رہنا پڑے گا جسے مسئلے کے حل کے لیے قائم کیا گیا تھا

شمار کے مطابق %20 ملازمین پانچ ہزار روپے ماہانہ اجرت لیتے تھے جبکہ %41.73 ورکر پانچ ہزار سے دس ہزار روپے ماہوار کے درمیان وصول کرتے رہے۔

2014ء کے دوران کم آمدنی اور زیادہ آمدنی کے درمیان فرق میں مزید اضافہ ہوا۔ سرکاری اعداد و شمار (PLFS) سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی تنخواہ (6952 روپے) اور منیجر سطح کی تنخواہ (36,946 روپے) میں تفاوت چھ گنا ہو چکا ہے۔ دیہی و شہری اور مرد و خواتین کی اجرتوں میں فرق بھی بہت زیادہ ہے۔

ملک میں اجرتیں مقرر کرنے کا قانونی مروجہ نظام موجود تو ہے لیکن وہ نظام کام نہیں کرتا۔ کم از کم اجرتوں کا تعیّن رسمی طور پر نہیں بلکہ آمرانہ طریقے سے یکطرفہ طور پر کیا جاتا ہے۔ مزدور انجمنوں کی تعداد، ان کی قوت اور اختیارات میں کمی کے باعث اجرت کا تعین اجتماعی سوداکاری ایجنٹ کی موجودگی میں شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔

2014ء کے دوران موجودہ کم از کم 3600 روپے ماہوار پنشن میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ عمومی شعبہ کے ریٹائرڈ ملازمین کا طبقہ 329,336 پنشنروں پر مشتمل ہے جو ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹس انسٹیٹیوشن (EOBI) سے 3600 سے 6240 روپے ماہوار تک پنشن پاتا ہے۔ جون میں وفاقی حکومت نے سرکاری ملازمین کی پنشن میں 6000 روپے تک کا اضافہ کیا۔ ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹس ایسوسی ایشن بورڈ نے اضافے کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جب تک شراکتی رقم میں اضافہ نہیں ہوتا، 3600 روپے کی کم از کم ماہوار پنشن 2027ء تک برقرار رہے گی۔

پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت

2014ء میں ورکروں کی ملازمت کا تحفظ اور ان کی صحت کے حوالے سے صورت حال میں بہتری کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ بدترین صنعتی تباہی کے اسباب میں (ستمبر 2012ء میں بلدیہ فیکٹری میں ہونے والی آتشزدگی) کی جو 14-2013ء کے دوران ابتدائی کارروائی میں سامنے آئے، ان میں لیبر قوانین اور عمارتی تحفظ کے قوانین کی سنگین خلاف ورزی، بلدیہ فیکٹری کے مالکان اور سرکاری محکموں کے حکام کی مجرمانہ غفلت شامل ہیں۔

2014ء کے دوران بلدیہ ٹاؤن کی گارمنٹ فیکٹری علی انٹرپرائز کے خلاف فوجداری کارروائی میں ثابت ہوا کہ یہ فیکٹریز ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ بھی نہیں تھی۔ محکمہ محنت، شعبہ بجلی اور سائیٹ اتھارٹی کے کسی انسپکٹر نے کبھی اس کا معائنہ بھی نہیں کیا جو کہ مختلف قوانین کے تحت ضروری ہے۔ فیکٹری مالکان نے کئی عمارتی قوانین کی خلاف ورزیاں کیں اور جعلی بین الاقوامی سرٹیفکیٹ SA-8000 حاصل کر رکھا تھا۔ مالکان بری نہ

بلدیہ فیکٹری آتشزدگی: فوجداری مقدمہ اور معاوضہ کی ادائیگی

بلدیہ سائٹ کراچی کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں لگنے والی پاکستان کی صنعتی تاریخ کی ہولناک ترین آتشزدگی میں 255 مزدور جاں بحق ہوئے۔ اس واقعہ کی 12 ستمبر 2012ء کو فوجداری مقدمہ کے تحت درج کرائی جانے والی رپورٹ کے بعد دو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی مالکان سمیت تمام ملزمان ضمانت پر ہیں۔ ملزمان پر ابھی تک فرد جرم عائد نہیں کی گئی اور فوجداری مقدمہ ابھی شروع نہیں ہوسکا۔ آتشزدگی کے حفاظتی قوانین کی خلاف ورزی، سوشل سکیورٹی اور تعمیراتی قوانین کی خلاف ورزیوں کے مقدمات بھی درج نہیں ہوئے۔

فوجداری مقدمہ کی 26 ستمبر کو ہونے والی سماعت کے دوران سندھ ہائی کورٹ نے نیشنل فورنسک سائنس اتھارٹی کے سربراہ اور اس کی ڈی این اے لیبارٹری کے انچارج کو بلدیہ فیکٹری کی آتشزدگی میں مرنے والوں کی شناخت بارے تفصیلی رپورٹ پیش کرنے میں ناکامی پر توہین عدالت کے نوٹس بھجوائے۔ جسٹس مقبول باقر کی سربراہی میں ڈویژن بینچ نے بھی ای او بی آئی کے سربراہ کو 255 جاں بحق ہونے والے ورکروں کے لواحقین کو مقررہ قانونی پنشن کی ادائیگی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے میں ناکامی پر توہین عدالت کا نوٹس بھیجا۔

پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (PILER)، نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن (NTUF) اور دوسری تنظیموں کی جانب سے دائر کی گئی پٹیشن پر سندھ ہائی کورٹ کے عدالتی تحرک سے متاثرہ خاندانوں کو مالی معاوضے ادا کرنے میں معاونت کی گئی۔ اگست 2014ء تک 255 جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو تیرہ لاکھ روپے فی خاندان کے حساب سے معاوضہ دیا گیا۔ زخمی ہونے والے 55 افراد نے زخموں کی نوعیت کے لحاظ سے سوا لاکھ روپے سے چھ لاکھ دس ہزار روپے تک معاوضہ وصول پایا۔ متاثرہ خاندانوں کو بالآخر پنشن کی ادائیگی بھی شروع ہوگئی ہے۔ ان مالی معاوضوں میں حکومتی امداد کے علاوہ قانونی واجبات اور بلدیہ گارمنٹ فیکٹری کی اہم ترین جرمن خریدار کمپنی کک ٹیکسٹیلین (KIK Textilian) کی طرف سے فراہم کردہ ایک ملین ڈالر کی ادائیگی بھی شامل ہے۔

ہونے کے باوجود سال بھر سے ضمانت پر آزاد گھوم رہے ہیں۔ اس طرح نہ صرف آجر بلکہ صنعتکاروں، سرکاری اہلکاروں اور سیاسی اشرافیہ کا مضبوط گٹھ جوڑ کام کی جگہوں پر حفاظت اور صحت کے قوانین کے نفاذ میں مزاحم ہوتا ہے۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق چھوٹے سے لے کر درمیانے درجے کے کارخانوں میں جہاں 73.6% مزدور کام کرتے ہیں کے مالکان رجسٹریشن سے اجتناب کر کے لیبر قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ درمیانے درجے کے کارخانوں کی حالت بھی اچھی نہیں کیونکہ مالکان متعلقہ قوانین کے اطلاق سے گریز کرتے ہیں اور مزدور انجمنوں کو ناکام بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ملک کے بڑے پیداواری یونٹوں میں بھی پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت کے مناسب انتظامات ناپید ہوتے ہیں۔ 2014ء میں پاکستان ریڈی

میڈ گارمنٹس مینوفیکچررز اینڈ ایمپلائرز ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ کے مطابق ایسوسی ایشن کے 551 رجسٹرڈ ارکان ہیں اور بلدیہ میں قائم فیکٹری یعنی علی انٹر پرائزز بھی اس کی رکن تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف صنعتی شعبوں میں صحت اور سلامتی کے قوانین کی کس قدر خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔

مختلف قوانین کے تحت محنت کے صوبائی محکمے صنعتی اداروں میں ہونے والے حادثات کا ریکارڈ رکھنے کے پابند ہوتے ہیں۔ تاہم نا اہل انتظامیہ اور خراب کارکردگی کے باعث باقاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور یہ معلومات شاذ و نادر ہی عوام الناس کے علم میں لائی جاتی ہیں۔ عوام تک صنعتی حادثات کی اطلاع کا واحد ذریعہ میڈیا ہی رہ گیا ہے۔

عالمی ادارہ محنت کی پاکستان سے متعلق حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں لیبر انسپیکشن کا مستعد نظام موجود نہیں۔ محکمہ کلی طور پر فنڈز اور سٹاف کی کمی کا شکار ہے۔ لیبر انسپکٹر موثر نگرانی کے لئے مطلوبہ تربیت اور صلاحیت سے محروم ہیں۔ 2012ء میں ملک میں 337 لیبر انسپکٹر تھے یعنی ہر 25000 مزدوروں کے لئے ایک انسپکٹر تھا۔

ستمبر میں سندھ لیبر ڈیپارٹمنٹ نے پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت کی پالیسی کا مسّودہ ایک سہ فریقی مشاورتی اجلاس میں پیش کیا جو عالمی ادارہ محنت کے مشترکہ ایکشن پلان کے لئے منعقدہ اجلاس میں ہونے والے بحث مباحثہ کا نتیجہ تھا۔ یہ اجلاس جنوری کے آغاز میں ہوا تھا۔ محکمہ نے نومبر میں پالیسی مسودے کو حتمی شکل دی اور دسمبر میں صوبائی کابینہ کی منظوری کے لئے بھیج دیا۔

پنجاب حکومت کے محکمہ محنت نے کمپیوٹرائزڈ لیبر انسپکشن سسٹم کے قیام کے بارے میں مطلع کیا۔ ستمبر تک 4917 فیکٹریوں کا اندراج کیا گیا اور 1111 فیکٹریوں کی معائنہ رپورٹیں آن لائن موصول ہوئیں۔ تاہم یہ اعداد و شمار محکمے کی ویب سائٹ پر تا حال دستیاب نہیں۔ محکمہ نے گزشتہ نو ماہ کے دوران ہونے والی مشاورت کے حوالے سے بتایا کہ صوبے بھر میں 7510 فیکٹریوں کا معائنہ کیا گیا۔

2014ء میں پیش آنے والے صنعتی حادثات

نمبر شمار	حادثے کی نوعیت	تاریخ	حادثے کا مقام	جاں بحق ہونے والوں کی تعداد	زخمی ہونے والوں کی تعداد
1	کنوئیں کی مرمت	7-1-2014	سموزئی، پیر بندہ۔ مردان	3	0
2	تعمیراتی کام	16-1-2014	لواری سرنگ۔ چترال	1	0
3	کنوئیں کی مرمت	20-1-2014	پاکپتن	3	0
4	کوئلے کی کان	3-1-2014	اورکزئی ایجنسی	2	5

5	ماربل پتھر کی کان	31-1-2014	مہمند ایجنسی	3	4
6	تعمیراتی جگہ (چھت کا گرنا)	3-2-2014	رنگ روڈ۔پشاور	1	24
7	بوائلر دھماکہ	4-2-2014	باغبانپورہ۔لاہور	1	-
8	کان کی چھت کا بیٹھنا	7-2-2014	قلعہ سیف اللہ، چمن۔بلوچستان	5	متعدد
9	بوائلر دھماکہ	مارچ 2014ء	کوٹ لکھپت۔لاہور	4	-
10	بجلی کا جھٹکا	20-3-2014	ویٹا ٹیکسٹائل ملز، سہراب گوٹھ، کراچی	1	-
11	بوائلر دھماکہ	2-4-2014	سادھوکے۔گوجرانوالہ	-	8
12	کنوئیں کی صفائی	20-4-2014	میلسی۔وہاڑی	7	3
13	بوائلر دھماکہ	22-4-2014	سمندری روڈ۔فیصل آباد	1	2
14	گٹر کی صفائی	7-5-2014	کوٹ سلامت پورہ۔قصور	1	1
15	بجلی کا جھٹکا	15-5-2014	نارنگ منڈی۔مریدکے	1	-
16	بجلی کا جھٹکا	16-5-2014	شالامار۔لاہور	1	-
17	آتش بازی کے سامان میں دھماکہ	22-5-2014	میمن گوٹھ۔کراچی	6	-
18	کوئلے کی کان کا بیٹھنا	30-6-2014	جھم پیر۔بلوچستان	2	4
19	پاورلوم سے بجلی کا جھٹکا	7-7-2014	سدھر۔فیصل آباد	1	-
20	زہریلی گیس کا اخراج	7-7-2014	باغبانپورہ۔لاہور	2	-
21	بوائلر دھماکہ	26-9-2014	سائٹ۔کراچی	1	-
22	دیوار کی کھدائی	17-7-2014	مٹھی۔تھرپارکر	3	-
23	گیس سلنڈر دھماکہ	13-7-2014	گجومتہ۔لاہور	3	-
24	زیرتعمیر چھت کا گرنا	10-7-2014	کندھ کوٹ۔سندھ	2	5
25	بجلی کا جھٹکا	اگست 2014ء	جیا موسیٰ۔شاہدرہ	2	-
26	بجلی کا جھٹکا	اگست 2014ء	مریدکے	2	-
27	دھماکہ	19-8-2014	پاکستان آرڈننس فیکٹری۔واہ	2	-
28	کنوئیں کی کھدائی	24-8-2014	لانڈھی۔کراچی	2	-
29	بوائلر کا دھماکہ	25-8-2014	سکھر	1	24
30	زہریلی گیس کا اخراج	25-8-2014	کورنگی۔کراچی	2	-
31	آئل فیکٹری میں زہریلی گیس کا اخراج	8-9-2014	حیدرآباد	2	-
32	دوران تعمیر بجلی کا جھٹکا	9-9-2014	فیصل آباد	2	-
33	کوئلے کی کان میں دھماکہ	10-9-2014	اورکزئی ایجنسی (فاٹا)	3	متعدد
34	دوران تعمیر بجلی کا جھٹکا	11-9-2014	ٹوپی۔ضلع صوابی	2	3
35	سڑک کی کھدائی کے دوران بجلی کا جھٹکا	13-9-2014	کاہنہ۔لاہور	2	-

36	تعمیراتی ملبہ کا گرنا	14-9-2014	کھارا۔قصور	1	۔
37	کنوئیں کی کھدائی	20-9-2014	رینالہ خورد	3	۔
38	کنوئیں کی کھدائی	29-9-2014	منگن۔اوکاڑہ	1	1

2014ء میں پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران پیش آنے والے حادثات کی خاصی تعداد میڈیا میں شائع ہوئی جیسا کہ اوپر دیئے گئے جدول (تمام میڈیا رپورٹیں شامل نہیں) سے ظاہر ہے۔حادثات کی وجوہات میں بوائلر دھماکے، زیرِتعمیر چھتوں کا گرنا، کنوؤں کی کھدائی، بجلی کے جھٹکے اور کوئلے کی کانوں کا گرنا شامل ہیں۔ بوائلر دھماکے بار بار ہوتے ہیں جن کی وجوہات میں آجروں کا مطلوبہ قابلیت کے سند یافتہ افراد کو ملازم نہ رکھنا، بوائلر کی نگہداشت اور معائنے سے پہلوتہی جیسے عوامل شامل ہیں۔تعمیراتی شعبے میں ورکروں کی سلامتی کے لئے ناکافی حفاظتی اقدامات اور اداروں کی طرف سےتعمیراتی معیار کی خلاف ورزی کی وجہ سے حادثات ہوتے ہیں۔الیکٹریکل ورکروں اور لائن ڈالنے والوں کی زیادہ تر اموات بجلی کا جھٹکا لگنے سے ہوتی ہیں کیونکہ بجلی کی کمپنیوں کی انتظامیہ کی طرف سے بجلی کے بین الاقوامی معیار، قواعد وضوابط کی خلاف ورزیاں کی جاتی ہیں۔

غیر محفوظ پیشے

کان کنی اور پتھر کی کرشنگ

جنوری میں اورکزئی ایجنسی میں کوئلے کی کان بیٹھ جانے سے دو مزدور جاں بحق اور پانچ زخمی ہو گئے۔چمن میں کرومائیٹ کی کان کی چھت گرنے سے فروری میں پانچ کان کن جاں بحق ہو گئے۔30 جون کو سندھ میں جھمپیر کے قریب یعقوب بروہی گاؤں کے مائننگ زون میں اس نوعیت کے ایک حادثے میں کوئلہ کی کان کے دو کان کن ہلاک اور دو شدید زخمی ہو گئے۔ مائننگ زون میں علاج کی سہولت نہیں تھی اور اکلوتا دیہی مرکزِ صحت بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

دنیا بھر میں کان کنی سب سے زیادہ غیر محفوظ پیشوں میں شمار ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی کوئلے کی کھدائی ورکروں کے لئے انتہائی پرخطر ہے۔کوئلہ اور دیگر معدنیات حفاظتی اقدامات کے بغیر سادہ سے اوزاروں کے ذریعے نکالی جاتی ہیں۔ سانس کے ذریعے کوئلے کا غبار جسم کے اندر جانے، میتھین گیس کے دھماکے، آگ لگنے کے واقعات، کان کی چھت کے بیٹھنے، زہریلی گیسوں کے اخراج اور بار برداری کے حادثات کوئلے کی کان کنی میں عام ہیں۔

پنجاب کی کانوں اور معدنیات کے انسپکٹریٹ کی طرف سے میڈیا کو دیئے گئے اعداد وشمار کے

چواءسیدن شاہ پنجاب میں کوئلے کی کان میں کان کن کام سے وقفے کے دوران

مطابق ہر سال کان کنی کے دوران صوبے میں اوسطاً 62 کان کن ہلاک اور 14 زخمی ہو جاتے ہیں۔ٹریڈ یونین کے ایک فعال عہدیدار کے مطابق کانوں میں ہر روز حادثے رونما ہوتے ہیں مگر میڈیا میں ان کی خبر شائع نہیں ہوتی۔اس پیشے سے منسلک کارکن اموات، زخموں اور سانس کی خطرناک اور دائمی امراض کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

کان کنی کے شعبے میں پیشہ ورانہ حفاظتی اقدامات میں بہتری اور صحت کی صورت حال میں پیش رفت اس وقت ہوئی جب جولائی میں پھیپھڑوں کی خطرناک بیماری سیلیکوسز سے 18 مزدوروں کی ہلاکت پر سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے ازخود نوٹس جاری کیا۔

پاکستان نے بین الاقوامی ادارہ محنت (ILO) کے مائنز کنونشن 1995ء (176) برائے سلامتی وصحت کی توثیق نہیں کی نہ یہ سلامتی اور صحت کے عالمی ادارہ محنت کے 2006 Code کی تعمیل کرتا ہے جس میں کان کنی کے تمام پہلوؤں کے لئے قواعد وضوابط اور خصوصی ہدایات وضع کی گئی ہیں۔ان میں کان کنی کے عمل کو ضابطہ تحریر میں لانے اور اس کا ریکارڈ رکھنا بھی شامل ہے۔مزدور انجمنوں اور سول سوسائٹی کے اداروں کی طرف سے بھی بین الاقوامی پیشہ ورانہ حفاظت اور صحت کے معیارات کی توثیق کے لئے کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔

پھیپھڑوں کے امراض سے اموات

سابقہ چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے جولائی میں گوجرانوالہ میں ہونے والی 18 اموات پر ازخود نوٹس لیا۔ نوٹس لینے کی وجہ وہ درخواست تھی جو سول سوسائٹی تنظیم کے پبلک لائرز فرنٹ نے آئین کے آرٹیکل (3)184 کے تحت دائر کی۔ درخواست میں موقف اختیار کیا گیا کہ مئی 2014ء تک ہلاک ہونے والے مزدوروں کی اموات کی وجہ وہ سٹون کرشنگ کی چار فیکٹریاں ہیں جو ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ مرنے والے مزدوروں کے اپنے آجروں سے مسلسل مطالبے کے باوجود مالکان نے خطرناک سیلیکا پاؤڈر کی سرایت پذیری روکنے کے لئے نہ حفاظتی ماسک فراہم کئے نہ دھول کی روک تھام کے لئے آلات لگائے۔

عدالت کو بتایا گیا کہ گذشتہ چند سالوں میں ڈیرہ غازی خان اور پنجاب کے دوسرے اضلاع میں واقع پتھر توڑنے کی فیکٹریوں میں پھیپھڑوں کے امراض کی وجہ سے 100 سے زائد مزدور ہلاک ہو چکے ہیں۔

چیف جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں قائم ہونے والے تین رکنی بینچ نے ستمبر اور اکتوبر میں ہونے والی سماعتوں میں فیکٹری مالکان کو مرنے والے 18 مزدوروں کے ورثاء کو زر تلافی ادا کرنے کا حکم دیا۔ عدالت کو بتایا گیا کہ وزیر محنت سمیت وزارت محنت، محکمہ تحفظ ماحول اور محکمہ انڈسٹریز کے سیکرٹریوں پر مشتمل نو رکنی کمیٹی لیبر سیفٹی سٹینڈرڈز کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرے گی۔ صوبائی حکومت نے مزدوروں کے ورثاء کو معاوضہ کی ادائیگی کے لئے 54 لاکھ روپے کی رقم کی منظوری دی۔ عدالت کو مزید مطلع کیا گیا کہ ڈیرہ غازی خان میں مرنے والے 34 مزدوروں کے لواحقین کو پانچ لاکھ روپے فی خاندان کے حساب سے معاوضہ دے دیا گیا ہے۔

پاکستان میں پھیپھڑوں کے امراض کے اسباب کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی گئی جبکہ انڈیا میں اس جان لیوا مرض کے حوالے سے پندرہ قوانین ہیں۔ مزدوروں کو چہرے کے حفاظتی ہلمٹ سمیت حفاظتی ساز وسامان کی فراہمی اور دھول بٹھانے والے آلات نصب کرنے سے خطرات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مشینی خودکاری، رگڑائی، چھڑکاؤ اور ماحولیات کو بہتر بنا کر خطرات کو کم کیا جا سکتا ہے۔

گوجرانوالہ سے 30 کلومیٹر جنوب کی طرف واقع گاؤں نت کلر کے 9 سپوت پھیپھڑوں کی بیماری کا نشانہ بن چکے ہیں۔ تمام 6 برس سے لے کر کئی برسوں تک پتھر پیسنے کی صنعت میں کام کرتے رہے

توانائی کے معاملات:

20 اگست کو لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی (LESCO) کے مزدوروں کی ریلی میں فرائض کی ادائیگی کے دوران بجلی کے جھٹکے لگنے سے ورکروں کی بڑھتی ہوئی اموات کو اجاگر کیا گیا۔ دو مہینوں میں ناموافق حالات میں کام کرتے ہوئے کرنٹ لگنے سے 25 سے زائد لائن مین جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نومبر کے تین دنوں میں لیسکو لائن سٹاف کے تین ورکر بجلی کا کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہو گئے۔ ٹریڈ یونین کے مطابق پاکستان میں 22,000 لائن مین ہیں۔ ان میں سے سالانہ 100 لائن مین جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور بہت سے زندگی بھر کے لئے معذور ہو جاتے ہیں۔ ملک بھر میں بجلیکی پیداوار، ترسیل اور تقسیم کے عمل میں مصروف لائن ڈالنے اور لائن کی مرمت کرنے والوں کو سنگین خطرات کا سامنا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے دنیا کے دس خطرناک ترین پیشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ورکروں کو نہ حفاظتی ساز وسامان فراہم کیا جاتا ہے اور نہ ہی مناسب تربیت دی جاتی ہے۔

شپ بریکنگ

یکم نومبر کو گڈانی ساحل پر یارڈ نمبر 107 میں دو حادثات ہوئے۔ گڈانی شپ بریکنگ مزدور یونین کے صدر بشیر محمودانی کے مطابق ایک ناقص لفٹ کے زمین بوس ہونے سے 15 مزدور زخمی ہو گئے۔ مزدور لیڈر نے نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن کے ساتھ ایک مشترکہ بیان میں پاکستان میں سب سے زیادہ خطرناک شعبہ میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت زار کو اجاگر کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ زخمی مزدوروں کو معاوضہ دیا جائے، ٹھیکیداری نظام کو ختم کیا جائے اور سوشل سکیورٹی اور ایمپلائیز اولڈ ایج بینیفٹس انسٹیٹیوشن (EOBI) میں مزدوروں کو رجسٹر کیا جائے۔

شپ بریکنگ انتہائی خطرناک شعبہ ہونے کی وجہ سے شمال نے اس کو جنوب کے ممالک کو منتقل کر دیا ہے۔ گڈانی یارڈ میں پر خطر کام کرنے والے ورکروں کو جان لیوا زہریلے مادوں، دھماکہ خیز گیسوں، گرتے ہوئے آہنی تختوں اور دوسرے خطرات کا سامنا کرنے کے عوض حقیر سا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق شپ یارڈ میں اندازاً بارہ سے پندرہ ہزار مزدور مصروف کار ہیں۔ ان میں زیادہ تر 12 سے 50 سال تک کی عمر کے لوگ ہیں۔ ان مزدوروں کو نہ تو حفاظتی ساز وسامان فراہم کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی طبّی امداد یا ایمرجنسی تک رسائی ہے۔ وہ یارڈ کے احاطے میں رہتے ہیں جہاں نہ پینے کا صاف پانی میسّر ہے، نہ بجلی نہ آرام گاہ۔ گڈانی ساحل شہر سے دور ہونے کی وجہ سے مزدوروں کا استحصال میڈیا کی توجہ حاصل نہیں کر پاتا۔

غلامانہ اور استحصالی قواعد وضوابط کے خلاف مزدوروں کی جدوجہد:

بین الاقوامی غلامی انڈیکس (Global Slavery Index) 2014ء کے مطابق پاکستان ان 167 ملکوں میں سے چھٹے نمبر پر ہے جہاں غلامی کی جدید ترین شکلیں موجود ہیں اوران میں قرضہ کے عوض غلامی بھی شامل ہے۔ انڈیکس کے مطابق پاکستان میں بیس لاکھ اٹھاون ہزار دوسو لوگ غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس حوالے سے اینٹوں کے بھٹے اور زرعی شعبہ سرفہرست ہیں جنمیں زیادہ تر لوگ قرض کے عوض غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

بھٹہ مزدور:

بھٹہ مزدوروں کا طبقہ ناتوان ترین طبقہ شمار کیا جاتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس شعبہ میں غلامی اور کام کی استحصالی شرائط اور ضابطوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی ہوئی ہے۔ پنجاب کے متعدد اضلاع میں بھٹہ مزدوروں نے ڈی سی او کے مقامی دفاتر میں بھٹہ مالکان کے خلاف درخواستیں جمع کرائیں۔ بھٹہ مزدوروں کو پاورلوم ورکروں کی تنظیم لیبر قومی موومنٹ کی بے مثال حمائت حاصل تھی۔

2014ء میں صوبہ پنجاب میں مزدوروں اور بھٹہ مالکان کے درمیان تنازعات میں اضافہ ہوا جو اجتماعی احتجاجوں کی بڑھتی ہوئی لہر کا باعث بنا۔ ورکروں اور مالکان کے درمیان جنگ حکومتی مداخلتکے باعث شدت اختیار کرگئی جس نے اجتماعی انصاف کے حصول میں مزدوروں کی مدد کی جس کے باعث مالکان کو جوابی کاروائی کرنا پڑی۔ 2013ء کے اواخر میں پنجاب حکومت نے ضلعی نگران کمیٹیوں کو متحرک کیا۔ پنجاب لیبر ڈیپارٹمنٹ کے مطابق اکتوبر 2013ء سے مارچ 2014ء کے درمیان 199 کمیٹیوں کو متحرک کیا گیا اور مزدوروں کو غلام بنانے کے مرتکب مالکان کے خلاف 399 ایف آئی آر درج کی گئیں۔

جنوری اور فروری میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بھٹہ مزدوروں نے ضلعی لیبر آفیسر کے دفتر کے سامنے ریلیاں نکالیں اور 2013ء میں حکومت کی منظور کردہ اجرتیں نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ مارچ کے آخر میں کم از کم اجرت 740 روپے فی ہزار اینٹ کے نفاذ کے لئے ڈی سی او آفس فیصل آباد کے سامنے دھرنا دیا گیا۔ دھرنے کے 34 گھنٹے بعد حکومت اور مالکان نہ مانے تو ورکروں نے لاہور میں چیف منسٹر ہاؤس کی طرف لانگ مارچ شروع کردیا۔ مالکان اور پولیس کی دھمکیوں کے باوجود مرد، خواتین اور بچوں سمیت ایک ہزار سے زیادہ افراد نے 80 کلومیٹر تک مارچ کیا۔ ننکانہ اور شیخوپورہ اضلاع کے ورکر بھی مارچ میں آملے۔ بالآخر لیبر قومی موومنٹ، بھٹہ مالکان کی ایسوسی ایشن، فیصل آباد اور ننکانہ صاحب کی ضلعی انتظامیہ کے

2014 کے دوران جنوبی پنجاب میں بھٹہ مزدوروں اور بھٹہ مالکان کے درمیان چپقلش کے کئی واقعات پیش آئے

درمیان اجرت 740 روپے فی ہزار اینٹ مقرر کرنے اور مزدوروں کو ان کی مرضی کے خلاف کام پر جبری طور پر نہ روکے رکھنے کا معاہدہ طے پا گیا۔

اپریل کے دوران پنجاب میں قصور کے بھٹہ مالکان کی طرف سے مزدوروں پر جسمانی تشدد، ایذا رسانی اور غیر قانونی حراست کے تین علیحدہ علیحدہ واقعات کی اطلاع ملی۔ ورکروں نے پنجاب حکومت کی 2013ء میں منظور شدہ اجرت دینے اور سوشل سکیورٹی رجسٹریشن کارڈ جاری کرنے کا مطالبہ کیا تھا جس پر یہ واقعات رونما ہوئے۔ اپریل میں ایک اور واقعہ میں چار بھٹہ مالکان کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب انہوں نے غیر قانونی حراست میں رکھے گئے مزدوروں کی رہائی کے لئے آنے والی چھاپہ مار پولیس پارٹی اور عدالتی ہرکارے پر فائرنگ کر دی۔ 22 اپریل کو ساہیوال میں بھٹہ مالکان کی ایسوسی

ایشن نے بھٹوں پر فیکٹریز ایکٹ کا اطلاق ختم کرنے کا مطالبہ کیا جس سے ان کی غیر منطقی سوچ، جاگیردارانہ ذہنیت اور قانون کی توہین کا اندازہ ہوتا ہے۔مئی میں عدالتی حکم پر قصور میں ایک بھٹہ سے 19 مزدوروں کو آزاد کرایا گیا۔

جون میں وہاڑی کے بھٹہ مزدوروں نے مالکان کے خلاف لاہور ہائی کورٹ کے ملتان بنچ میں درخواست دائر کی۔ضلع سیالکوٹ میں ایک بھٹہ مالک اور اس کے کارندوں نے ایک مزدور خاندان کو اغوا کر کے اس کے سربراہ کو قتل کیا اور باقی افراد کو محبوس کر لیا۔جولائی میں لاہور ہائی کورٹ نے قصور میں 20 مزدوروں کی غیر قانونی حراست سے رہائی کو یقینی بنایا۔ستمبر میں سرگودھا میں ایک بھٹہ مالک کے ہاتھوں ایک مزدور کے اغواء کی خبر آئی۔

دسمبر میں ضلع مظفر گڑھ میں بھٹہ مزدوروں نے منظور شدہ اجرت سے کم مزدوری دینے پر دھرنا دیا۔ اس ضلع کے 160 بھٹوں پر 26000 مزدور کام کرتے ہیں۔منظور شدہ مزدوری 888 روپے فی ہزار تھی مگر بھٹہ مالکان صرف 560 روپے فی ہزار اجرت دے رہے تھے۔نرخوں کے نفاذ کے لئے ڈی سی او نے ایک کمیٹی قائم کر دی۔

2014 کے دوران سندھ کی مختلف غیر قانونی جیلوں سے رہائی پانے والے جبری مزدور

ضلع	رہائی پانے والے
حیدرآباد	19
میرپورخاص	786
بدین	445
عمرکوٹ	1871
سانگھڑ	794
ٹنڈو محمد خان	57
خیرپور	9
ٹنڈوالہ یار	242
تھرپارکر/مٹھی	21
جامشورو	0
مٹیاری	30
ٹھٹہ	28
کل	**3,972**

زرعی مزدور:

دوران سال صوبہ سندھ کے مختلف اضلاع میں مزارعین اور دیہاڑی دار مزدوروں کے واجبات کی عدم ادائیگی ، بے دخلی اور انہیں ہراساں کرنے کے بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ایک مزدور تنظیم جو کسانوں کو سندھ مزارعت ایکٹ (Sindh Tenancy Act) مجریہ 1950ء کے تحت مزارعت ٹریبونلز (Tenancy Tribunals) میں مقدمات دائر کرانے میں مدد دیتی تھی، کے مطابق جنوری سے اگست تک کے عرصے میں ضلع سانگھڑ میں مختلف

خاتون مزدور کپاس کے کھیت میں کپاس کی چنائی کر رہی ہیں۔ 2014 کے دوران حصہ داروں اور دیہاڑی دار مزدوروں کو معاوضے کی عدم ادائیگی، جنسی ایذا رسانی اور بے دخلی کے واقعات پیش آئے

زمینداروں کے خلاف بارہ مقدمات دائر کئے گئے۔ عمر کوٹ میں واجبات کی ادائیگی اور بے دخلی کے خلاف پانچ مقدمات رجسٹر ہوئے۔ شہریوں کی ایک اور انجمن نے ضلع عمر کوٹ میں پہلے چھ ماہ کے دوران 93 مقدمات درج کرائے اور دیگر اضلاع میں بھی بھٹوں اور فارموں پر قید مزدوروں کی بازیابی کے لئے 200 سے زائد مقدمات دائر کئے گئے۔

فروری میں لاہور ہائی کورٹ کے حکم پر پنجاب کے ضلع حافظ آباد میں ایک زمیندار کی نجی جیل سے 13 کسانوں کو بازیاب کرایا گیا۔ یہ کسان پچھلے دس سال سے قید تھے۔ جولائی میں بچوں اور عورتوں سمیت 100 افراد کو حافظ آباد کے نواح میں ایک بھٹے سے رہائی دلائی گئی جنہیں تین زمینداروں نے بدترین حالت میں رکھا ہوا تھا اور کھیتوں یا بھٹوں پر کی جانے والی ان کی محنت کی اجرت ہڑپ کر جاتے تھے۔ مزدوروں نے بتایا کہ فرار ہونے کی کوشش کرنے والے چھ مزدوروں کو مالکان نے مار دیا تھا۔

آٹھ خاندانوں کے 72 افراد کو سندھ ہائی کورٹ کے سکھر بنچ کے حکم پر عمر کوٹ میں ایک زمیندار سے آزاد کرایا گیا۔ جون میں ان لوگوں نے حیدر آباد پریس کلب کے سامنے دھرنا دیا اور زمیندار کے ہاتھوں چھینے گئے اپنے مویشیوں اور مال اسباب کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ان مزدوروں کو زمیندار نے چھ سال پہلے روزانہ اجرت کی بنیاد پر ملازم رکھا پھر ان کی اجرت دینے سے انکار کر دیا، ان کو ہراساں کیا اور ایذا پہنچائی۔ شہری تنظیم کے ورکروں نے مویشیوں کی بازیابی کے لئے خاندانوں کی مدد کی۔

چائلڈ لیبر:

اگرچہ عالمی ادارہ محنت (ILO) کی چائلڈ لیبر پر مرتب کردہ رپورٹ برائے سال 2013ء کے مطابق دنیا بھر میں چائلڈ لیبر میں کمی ہو رہی ہے۔ تاہم پاکستان کی لیبر فورس میں تھوڑی کمی کے باوجود دس سے چودہ سال کی عمر تک کے مزدور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان لیبر فورس سروے (PLFS) برائے سال 13-2012ء کے مطابق پیداواری سرگرمیوں میں حصہ لینے والے بچوں کی شرح 11.4 فیصد یعنی 68,10,000 تھی جبکہ سال 12-2011 میں کل لیبر فورس میں 14-10 سال کی عمر کے بچوں کی تعداد 11.8% شرح کے تناسب سے 67,50,000 تھی۔ مزدور بچوں کی تعداد میں یہ اضافہ ملک کی مجموعی آبادی میں اضافے اور بڑی تعداد میں بچوں کی سکول سے محرومی کی وجہ سے ہے۔ حالیہ یونیسکو تحقیق کے مطابق پاکستان میں پچپن لاکھ بچے سکول نہیں جاتے۔

چائلڈ لیبر سے متعلق بین الاقوامی ادارہ محنت کے رسمی معاہدوں کی روشنی میں ترتیب دئے ہوئے سال 2014ء کے چائلڈ لیبر انڈیکس کے مطابق پاکستان 196 ممالک میں پست ترین سطح پر نویں نمبر پر ہے۔ یہ انڈیکس برطانیہ کی میپل کرافٹ گلوبل رسک اینا لیٹکس (Maplecraft Global Analytics) تیار کرتی ہے جو بین الاقوامی کمپنیوں کے فنانشل رسک کے تجزیئے کرتی ہے۔ انڈیکس میں پاکستان کو انتہائی پرخطر ملک قرار دیا گیا جہاں مزدور بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یونیسکو کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 14-10 سال عمر کے 13% بچے مشقت کرتے ہیں۔ ان میں سے 76 % بچے زراعت (کھیتی باڑی اور ماہی پروری) سے منسلک ہیں۔ 14.6% بچے خدمات کے شعبے (کیٹرنگ، گاڑی مرمت، ٹرانسپورٹ، گھریلو ملازمت اور تعمیرات) میں کام کرتے ہیں۔ 9.3% بچے صنعتی شعبے (بھٹے، آلات جراحی، فٹبال سلائی، قالین بافی اور کان کنی) سے منسلک ہیں۔ ملک میں بچوں کی مشقت پر تا حال آخری تجزیہ 1996ء میں کیا گیا۔ تب سے اب تک ملک میں بچوں کی مشقت کے حجم اور وسعت کا تعین کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ 2013ء میں بین الاقوامی ادارہ محنت اور صوبائی لیبر یونٹوں کے تحت چاروں صوبوں کے منتخب اضلاع میں بچوں کی مشقت کی بدترین اقسام پر سروے کرایا گیا۔ سندھ کے چھ اضلاع ٹھٹھہ، بدین، ٹنڈو اللہ یار، سانگھڑ، قمبر۔ شہداد کوٹ اور دادو کے سروے سے معلوم ہوا کہ بچوں کی مشقت ان خاندانوں میں زیادہ ہے جن کے بالغ ارکان کی آمدنی کم سے کم اجرت سے بھی کم ہے۔ یہاں گورنمنٹ سکول نہیں ہیں جس کی وجہ سے تعلیم کا حصول ان کی دسترس سے باہر ہے۔ زرعی شعبہ میں بچوں کی مشقت عروج پر ہے۔ سندھ میں ٹرانسپورٹ بشمول چنگ چی چلانے کا نیا شعبہ

دنیا بھر میں چائلڈ لیبر کم ہو رہی ہے مگر پاکستان میں بڑھ رہی ہے

بچوں کی مشقت کے لئے سازگار پایا جاتا ہے۔لکڑی کا کام اور کچرا چننے کے دوخطرناک شعبے ان تین اضلاع میں ایسے ہیں جن میں بچوں کی مشقت عام ہے۔

صوبوں کو محکمہ محنت کی منتقلی کے بعد صوبہ پنجاب نے ایمپلائمنٹ آف چلڈرن (ترمیمی) ایکٹ 2011ء کے وفاقی قانون کو بدلا اور بچوں کی ملازمت کا امتناعی بل 2012ء کا مسودہ تیار کیا۔سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی حکومتوں نے سال کے اختتام تک ان مسوّدوں کو حتمی شکل نہیں دی۔

محنت کش بچوں کی اپنی نہ تو کوئی تنظیم ہوتی ہے، نہ نمائندگی، نہ آواز اور نہ مطالبہ۔ نہ ہی وہ اپنے استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔محنت کش بچوں کے مسائل پر کام کرنے والے انسانی حقوق کے گروپ اور سوسائٹی کی انجمنیں ان کے مسائل اجاگر کیئے رکھتے ہیں۔دوران سال زرعی اور گھریلو خدمات کے شعبے میں بچوں کو تشدد کے ذریعے ہلاک کرنے اور جنسی تشدد کی خبریں آتی رہیں۔

سفارشات

☆ وفاقی سطح پر لیبر قوانین کا قانونی نظام تشکیل دے کر اس پر عمل درآمد کیا جائے تاکہ صوبوں میں قوانین صوبائی تقاضوں کے مطابق ہوں۔صوبوں کی طرف سے لیبر قوانین کو ضرورت کے مطابق ڈھالنے یا ان کی تشکیل نو کرنے کی ضرورت ہے۔لیبر قوانین کے دائرہ کار کو زرعی مزدوروں تک

وسعت دی جائے۔

☆ صوبائی سطح پر لیبر انسپیکشن نظام کو مضبوط کرنے، پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت کو یقینی بنانے کے لئے ایک مربوط ادارہ قائم کیا جائے۔

☆ کم از کم اجرت، زیادہ سے زیادہ اوقات کار، کم از کم وقفہ، باتنخواہ رخصت اور بڑھاپے میں مالی امداد کی نگرانی اور مقامی سطح پر موثر نفاذ کے لئے ایک لیبر ویلفیئر اتھارٹی قائم کی جائے۔

☆ کم از کم اجرت کے تناظر میں حادثاتی چوٹ، بیماری، اور ملازمت سے برخواستگی کو سوشل سکیورٹی کے تحت تحفظ دیا جائے۔

☆ کاروباری اداروں اور موجودہ ملازمت سے بالا بالا مقامی حکومتیں ان ورکروں کی رجسٹریشن کریں گی۔

6

سماجی اور معاشی حقوق

تعلیم

ریاست، جہالت کا خاتمہ کرے گی اور کم ازکم مدت میں مفت اور لازمی ثانوی تعلیم کا بندوبست کرے گی۔فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم تک عام شہری کی رسائی کو آسان بنایا جائے گا اور میرٹ کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم، سب کی دسترس میں لانے کی کوشش کی جائے گی۔

آئین پاکستان[آرٹیکل - 37(بی)اور(سی)]

تعلیم پر ہرانسان کا حق ہے۔کم ازکم، ابتدائی اور بنیادی سطحوں پر تعلیم مفت اور لازمی ہوگی۔فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم بھی، عام طور پر سب ہی لوگوں کو دستیاب ہوگی۔میرٹ کی بنیاد پر، اعلیٰ تعلیم پر بھی ہر شخص کا حق ہوگا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل 26]

تعلیم دیگر تمام انسانی حقوق سے مستفید ہونے کے لیے بنیادی شرط ہے۔ بین الاقوامی میثاق برائے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق (آئی سی ای ایس سی آر) کے نفاذ کا جائزہ لینے والی اقوام متحدہ کی کمیٹی کے مطابق تعلیم جہاں ایک انسانی حقوق ہے وہیں دیگر حقوق کے حصول کا ناگزیر ذریعہ بھی ہے۔ پاکستان نے مذکورہ میثاق کی 2008ء میں توثیق کی تھی۔تعلیم کمزور اور استحصال کا آسانی سے نشانہ بن جانے والے افراد اور گروہوں کو خودمختار بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔مزید برآں، یہ معیار اور انسانی وقار کے ساتھ منسلک ہے۔

اٹھارہویں ترمیم کے بعد، آئین میں مفت پرائمری تعلیم کو بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے اور اس حق کے حصول کے لیے وفاقی اور صوبائی قوانین نافذ کئے گئے ہیں۔اس کے باوجود 90 لاکھ بچے پرائمری یا ثانوی تعلیم حاصل نہیں کر رہے اور ناخواندگی کی شرح بھی بدستور قائم ہے۔ پاکستان 2015ء کے سال میں قدم رکھ چکا ہے مگر اس سال کے اختتام تک لازمی پرائمری تعلیم کی فراہمی کا ہزار سالہ ترقیاتی ہدف پورا کرنے میں ناکام نظر آرہا ہے۔

2010-11ء کے مقابلے میں 2012-13ء میں پرائمری سکولوں میں داخلے کی شرح میں محض

ایک فیصد اضافہ ہوا۔ دیہی اور شہری علاقوں میں صنفی عدم مساوات نمایاں تھی۔ وفاقی اور صوبائی مشترکہ تعلیمی بجٹ مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) کا محض 2 فیصد تھا جو کہ جنوبی ایشیا میں سب سے کم تھا۔

ملک کے سرکاری اور نجی سکولوں میں دی جانے والی تعلیم کے معیار کا معاملہ بھی اتنا ہی پریشان کن تھا۔ آئی سی ای ایس سی آر کے مطابق تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت اور وقار کی نشوونما ہونا چاہیئے اور اس کے نتیجے میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو تقویت ملنی چاہیئے۔ تعلیم کا مقصد تمام انسانوں کو ایک آزاد معاشرے کا ایسا فرد بنانا ہوتا ہے جو معاشرتی زندگی میں بھرپور حصہ لے، ذہنی ہم آہنگی کو فروغ دے، تمام اقوام اور تمام تعلیمی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے درمیان برداشت، دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کو بڑھاوا دے۔

لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود رہتا ہے کہ جو تعلیم دی جا رہی ہے کیا اس سے لوگوں میں رواداری کا احساس پیدا ہو رہا ہے یا نہیں اور کیا ہمارے معاشرے کے لوگوں کو ذہنی ترقی میسر نہیں ہو رہی ہے یا اس تعلیم کے نتیجے میں معاشرے میں پہلے سے موجود تعصّبات، کٹرپن اور نفرتیں راسخ ہو رہی ہیں جن سے ملک کا سماجی ڈھانچہ بتدریج انحطاط کا شکار ہو رہا ہے۔

2014ء کا سال پاکستان میں تعلیم کے حوالے سے انفرادیت کا حامل تھا۔ تعلیمی ادارے بالخصوص بلوچستان اور ملک کے شمال مغربی حصے میں وسیع پیمانے پر شدت آمیز حملوں کا نشانہ بنے۔ سال کا اختتام ایک تعلیمی ادارے پر حالیہ تاریخ کے بدترین اور بیہمانہ حملے سے ہوا جب تحریک طالبان پاکستان نے آرمی پبلک سکول پشاور پر حملہ کر کے 150 افراد کو قتل کیا جن میں اکثریت بچوں کی تھی۔ دوسری جانب، بچوں اور نوجوانوں پر جبر کی مخالفت کرنے اور بچوں کے حقِ تعلیم کے لیے جدوجہد کرنے پر ملالہ یوسف زئی کو (ہندوستان کے کیلاش ستھیارتی کے ساتھ مشترکہ) نوبیل امن انعام سے نوازا گیا۔ ایوارڈ نے اس امید کو جنم دیا کہ پاکستان میں صنف سے قطع نظر کسی بچے کو تعلیم سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ سال کی ابتداء ''مغربی ایجنڈے'' کو فروغ دینے اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے تشخص کو خراب کرنے کے الزام میں ملالہ یوسف زئی کی لعن طعن اور ملامت سے ہوئی تاہم اس کا اختتام نسبتاً اس عالمی اتفاق رائے سے ہوا کہ تشدد پاکستان میں تعلیم کی راہ میں بنیادی رکاوٹ ہے۔

بین الاقوامی درجہ بندیاں اور شرح خواندگی

گزشتہ برسوں کی طرح، انسانی ترقی کا بنیادی عالمی درجہ بندیوں میں پاکستان کی کارکردگی حوصلہ شکن رہی ہے، حتیٰ کہ جی ڈی پی والے ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں بھی خراب رہی۔ اس افسوسناک کارکردگی کی ایک بنیادی وجہ تعلیم کے انتہائی پست اعشاریے ہیں۔

فروری 2014ء میں جاری ہونے والے یونیسکو کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ پاکستان کا شمار ایسے ممالک کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے جہاں بچوں کی بہت بڑی تعداد سکول نہیں جاتی۔ نائیجریا اس دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ پاکستان میں 55 لاکھ بچے سکول نہیں جاتے۔ پاکستان میں ہندوستان اور چین کے بعد دنیا بھر میں ناخواندہ بالغوں کی شرح بھی سب سے زیادہ ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان ان 21 ممالک میں شامل ہے جو تعلیمی اداروں میں طلبہ کے اندراج اور اخراج، تعلیمی کارکردگی اور خواندگی جیسے امور کے حوالے سے علمی بحران کا شکار ہیں۔

اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (یو این ڈی پی) نے 2014ء میں انسانی ترقی سے متعلق رپورٹ، ''انسانی ترقی کا استحکام، عدم تحفظ میں کمی اور قوت برداشت میں اضافہ'' شائع کی جس کے مطابق پاکستان بدستور ان ملکوں میں شامل، جہاں انسانی ترقی کی شرح کم رہی اور جہاں بہتری کی بہت ہی کم علامتیں نظر آئیں۔

انسانی ترقی کے گوشوارے (ایچ ڈی آئی) کی فہرست میں گزشتہ برسوں کے 0.535 پوائنٹس میں 0.002 پوائنٹس کی بہتری کے ساتھ 187 ممالک کی فہرست میں پاکستان 146 ویں درجے پر ہے۔ 2014ء میں پوائنٹس 0.537 رہے۔ کم پوائنٹس حاصل کرنے کی ایک بڑی وجہ شعبہ تعلیم میں پاکستان کی ناقص کارکردگی تھی۔ پاکستان میں طالب علموں کے سکول میں تعلیم حاصل کرنے کی مدت کی افسوسناک اوسط شرح 4.4 برس تھی جبکہ متوقع شرح 7.7 برس تھی۔ اس کے برعکس ہمسایہ ممالک میں یہ شرح بہت زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر، ہندوستان میں یہ شرح 11.7، نیپال میں 12.4 جبکہ بھوٹان میں 12.4 برس تھی۔

ورلڈ اکنامک فورم (ڈبلیو ای ایف) کی عالمی مسابقتی رپورٹ (جی سی آر) میں 14 معیشتوں میں پاکستان کا درجہ 129 واں تھا۔ رپورٹ ستمبر 2014ء میں جاری ہوئی تھی۔ مسابقتی درج بندی میں پاکستان کے پست درجے پر ہونے کی بنیادی وجہ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم میں کم اندراج کو قرار دیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق 129 ویں نمبر کے ساتھ سارک ممالک میں پاکستان کا سب سے کم تر درجہ ہے۔ ہندوستان 71، سری لنکا 73، نیپال 102، بھوٹان 103 جبکہ بنگلہ دیش 109 ویں نمبر پر ہے۔

حکومتی پالیسیاں، ترجیحات اور عملی اقدامات

اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد تعلیم صوبائی معاملہ بن چکا ہے اور 5 سے 16 برس کی عمر کے تمام بچوں کو مفت تعلیم کی فراہمی ایک آئینی فریضہ ہے۔ وفاقی حکومت کی طرح صوبائی حکومتوں نے بھی تعلیم کو ترجیحی معاملہ قرار دیا ہے اور تمام صوبوں می میں تعلیم کی مایوس کن صورتحال میں بہتری لانے کے لیے بسا اوقات دعوے کرتے ہیں۔ مگران وعدوں کو تاحال عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔

وفاقی حکومت

وفاقی حکومت نے سال 15-2014ء کے لیے تعلیمی بجٹ کی مد میں 63ارب روپے کی رقم رکھی جو کہ وفاقی حکومت کے بجٹ کا تقریباً 2 فیصد بنتی ہے۔ وفاقی بجٹ کا 73 فیصد اعلیٰ تعلیمی کمیشن (ایچ ای سی)، 9.38 فیصد کیپٹل انتظامیہ اور ڈویلپمنٹ ڈویژن (سی اے ڈی ڈی) 5.1 فیصد وزارت تعلیم وتربیت جبکہ 4.62 فیصد کنٹونمنٹ علاقوں کے تعلیمی اداروں کے لیے مختص کیا گیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ وفاقی تعلیمی بجٹ تقریباً ایک ارب روپے کم ہوا تھا؛ اگر افراطِ زر کا جائزہ لیا جائے تو 14-2013ء کے وفاقی بجٹ کی نسبت اس برس تعلیمی بجٹ 11 فیصد کم ہوا ہے۔ 2013-2014ء میں وفاقی حکومت نے ہزار سالہ ترقیاتی اہداف (ایم ڈی جی ایس) پر موثر عمل درآمد کے لیے قومی ایکشن پلان مرتب کیا تھا جس میں وفاقی حکومت نے اس عہد کا اظہار کیا کہ 2018ء تک تعلیمی بجٹ 2 فیصد سے بڑھا کر جی ڈی پی کا چار فیصد کیا جائے گا (جو کہ 2015ء تک جی ڈی پی کے 7 فیصد ہدف سے بہت ہی کم ہے جو قومی تعلیمی پالیسی 2009ء میں تجویز کیا گیا تھا)۔ موجودہ رجحانات سے لگتا ہے کہ حکومت آنے والے برسوں میں تعلیمی بجٹ میں اضافہ کے

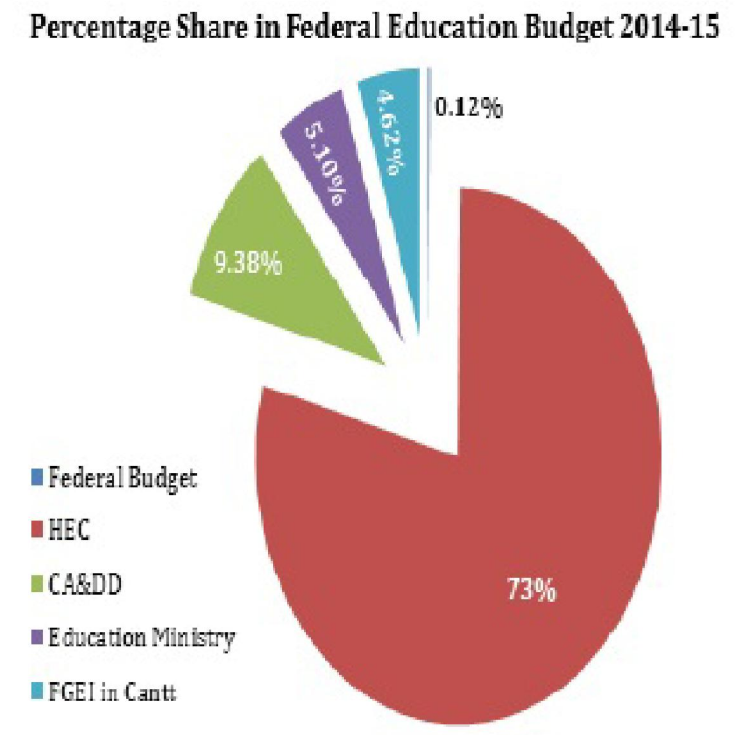

حوالے سے اپنے ہی متعین کردہ اہداف حاصل نہیں کر پائے گی۔

پنجاب

پنجاب حکومت نے 15-2014ء میں تعلیم کے لیے 273 ارب روپے کی رقم مخصوص کی تھی جو کہ پنجاب کے مجموعی بجٹ 1.044 کھرب روپے کا 26.1 فیصد تھے۔ خیبر پختونخوا کے بعد یہ دوسرا بڑا صوبائی تعلیمی بجٹ ہے۔

273 ارب روپے میں سے، پنجاب نے 48 ارب روپے ترقیاتی مد میں رکھے جس میں 28.1 ارب روپے سکول کی تعلیم، 114 ارب روپے اعلیٰ تعلیم، 2.4 ارب روپے خواندگی کے لیے اور 12.9 ارب روپے کھیلوں اور امورِ نوجوانان کے لیے مختص کئے گئے۔ لیکن بجٹ کا بڑا حصہ یعنی 224.69 ارب روپے کی رقم رواں اخراجات کے لیے مختص کی گئی۔ اس میں تنخواہوں وغیرہ کی ادائیگی شامل ہے۔

سندھ

سندھ نے 15-2014ء میں تعلیم کے لیے 145 ارب روپے مختص کئے جو کہ 686 ارب روپے کے مجموعی بجٹ کا 21 فیصد ہے۔ 14-2013ء میں تعلیمی بجٹ 134 ارب روپے تھا۔ جو نسبتاً کم رقم ہے۔ تاہم سندھ میں تعلیمی ترقیاتی بجٹ گھٹا کر دس ارب روپے کر دیا گیا جو کہ کل تعلیمی بجٹ کا 7 فیصد ہے جبکہ گزشتہ برس یہ رقم سولہ ارب روپے تھے۔ بقیہ بجٹ میں پندرہ ارب روپے کی رقم بنیادی، پرائمری اور ثانوی تعلیم جبکہ 5 ارب روپے کی رقم یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے۔

خیبر پختونخوا

خیبر پختونخوا نے تعلیم کے لیے 111 ارب روپے کی رقم مختص کی تھی۔ یہ رقم صوبے کے مجموعی بجٹ 404.8 ارب روپے کا 27.4 فیصد ہے۔ تعلیم کے شعبہ کے لیے یہ سب سے بڑا صوبائی بجٹ تھا۔ کے پی حکومت کے مطابق 1.14 ارب روپے ترقیاتی مد میں رکھے گئے، گزشتہ برس بھی اتنی ہی رقم مختص کی گئی تھی 197 ارب روپے کی رقم جاری اخراجات کے لیے مختص کی گئی ہے۔ کے پی نے اپنے نئے بجٹ میں درج ذیل سکیموں کی نشاندہی کی: کوہستان اور تورغر میں لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے 240 ارب روپے کی رقوم کو اضافی کمروں، ٹوائلٹوں، عمارتوں کی مرمت وتزئین وآرائش اور کمیونٹی کے تعاون سے پانی وتوانائی کے منصوبوں کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مستحق یونیورسٹی طلباء کے لیے قائم وزیر اعلیٰ عطیہ فنڈ کے لیے 50 کروڑ رکھے گئے جبکہ اڑھائی ارب روپے ثانوی سطح تک تعلیمی کتب کی مفت فراہمی کے لیے اور

1.75ارب روپے 100 مدارس کو پرائمری سکول کا درجہ دینے کے لیے مختص کیے گئے۔

بلوچستان

بلوچستان حکومت نے 15-2014ء میں 28ارب روپے کا تعلیمی بجٹ منظور کیا جو 14-2013ء کے تعلیمی بجٹ سے تین ارب روپے زیادہ تھا۔ تعلیمی بجٹ مجموعی بجٹ 215ارب روپے کا 13 فیصد تھا۔ تعلیمی بجٹ کا 39 فیصد (گیارہ ارب روپے) تعلیمی سکیموں کے لیے مختص کیا گیا ان سکیموں میں دو یونیورسٹیوں اور چودہ نئے کالجوں کا قیام اور 200 پرائمری سکولوں کو مڈل سکول کا درجہ دینا شامل تھا۔

ابتدائی وثانوی تعلیم

سکولوں میں جسمانی سزا کے خاتمے کو یقینی بنانے کی کوششوں کے باوجود ملک بھر میں سزا دینے کا رجحان جاری رہا۔ مارچ 2014ء میں وزارتِ قانون، انصاف وانسانی حقوق نے بچوں پر تشدد کے لیے قائم جنوبی ایشیائی تحریک اور بچوں پر تشدد کے خلاف اقدام کے لیے قائم ساؤتھ ایشیا کوآرڈینیٹنگ گروپ، کے تعاون سے جسمانی سزا کے خلاف قومی تحریک چلانے کا اعلان کیا اور اس رجحان کے مکمل خاتمے کے عزم کا اعادہ کیا۔ مارچ 2014 میں قومی اسمبلی میں جسمانی سزا کے خاتمے کا بل 2014ء پیش کیا گیا جس میں گھروں کے سوا تمام مقامات پر جسمانی سزا کے خاتمے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

سکولوں میں طلبہ کے اندراج کی شرح اور دیگر احوال بدستور مایوس کن ہے۔ اکیڈمی برائے ایجوکیشنل پلاننگ ومنیجمنٹ (وزارتِ تعلیم) اور ورلڈ فوڈ پروگرام کے مشترکہ مرتب کردہ پاکستان ایجوکیشنل گوشوارہ 2013ء جسے مارچ 2014ء میں جاری کیا گیا تھا، کے مطابق پانچ سے نو برس کی عمر کے 32 فیصد بچے سکول جانے سے محروم ہیں۔ گوشوارے میں یہ بھی بتایا گیا کہ ملک کے سترہ فیصد پرائمری سکول ایک کمرے پر مشتمل ہیں اور اساتذہ کی اوسط شرح تین ٹیچر فی سکول سے بھی کم تھی۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ آٹھ فیصد سکولوں کی عمارت تک نہیں تھی، 35 فیصد ایسے سکولوں میں بچے جاتے تھے جن کی عمارتوں کی چاردیواری نہیں تھیں۔ 37 فیصد سکولوں میں بیت الخلاء اور صفائی کی سہولیات موجود نہیں تھیں؛ 45 فیصد سکولوں میں بجلی نہیں تھی اور صرف 64 فیصد پرائمری سکولوں میں طالب علموں کو پینے کے پانی کی سہولت دستیاب تھی۔

انٹرنیشنل کرائسز گروپ (آئی سی جی) نے جون 2011ء میں ''پاکستان میں تعلیمی اصلاحات'' کے عنوان سے ایک رپورٹ جاری کی جس میں سرکاری سکولوں میں اساتذہ کی غیر حاضری اور بدعنوانی کے رجحانات پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ رپورٹ میں بھرتیوں، تعیناتیوں اور تبادلوں جیسے امور میں سیاسی مداخلت کی

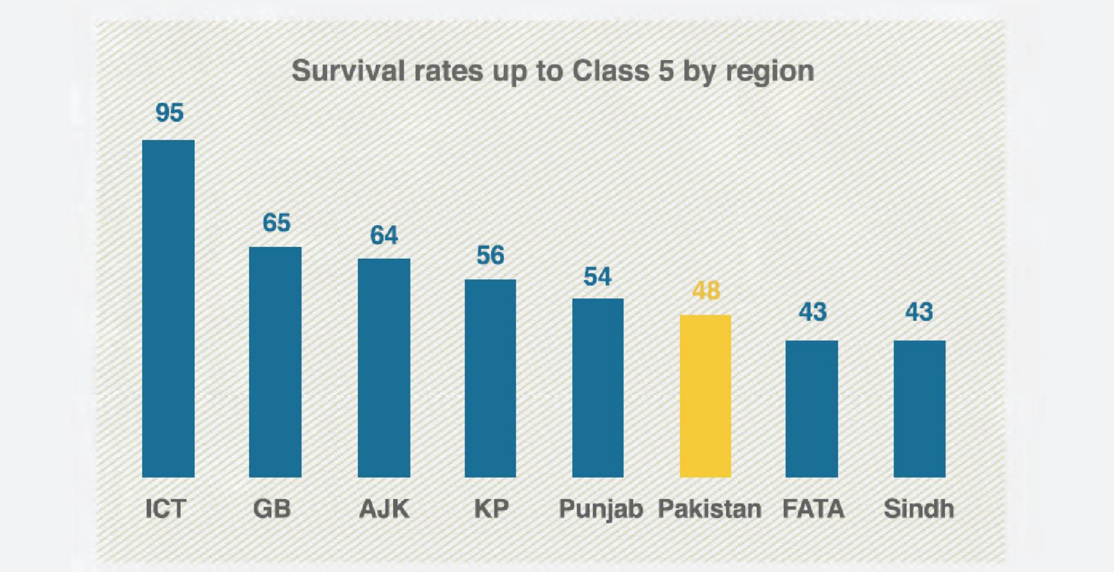

جماعت پنجم تک کامیابی سے پہنچنے کی شرح

نشاندہی بھی کی گئی تھی جس سے معیارِ تعلیم شدید متاثر ہوا۔

پرائمری اور ثانوی تعلیم کی صورتحال صوبوں میں نمایاں حد تک مختلف تھی پنجاب کی کارکردگی دیگر صوبوں سے کافی بہتر رہی جہاں 80 فیصد سے زائد بچے سکول میں داخل تھے اور یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق پنجاب کے بچوں سے ریاضی سے متعلق مہارتوں میں سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے بچوں کی نسبت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ بلوچستان اور کے پی کے سکولوں کی صورتحال زیادہ پریشان کن رہی۔

بلوچستان

انسانی ترقی کے دیگر شعبوں میں ناقص کارکردگی کی طرح بلوچستان بچوں کی تعلیم کے شعبہ میں بھی دیگر صوبوں سے پیچھے رہا۔ الف اعلان کے مطابق، پاکستان کے سکولوں میں بچوں کے اخراج کی شرح تشویشناک حد تک زیادہ ہے۔ تقریباً 8,65,337 بچے پرائمری سکولوں میں داخل ہوتے ہیں اور مڈل سکول میں پہنچنے تک یہ تعداد 191,300 رہ جاتی ہے۔ چنانچہ 57 فیصد بچے پرائمری تعلیم مکمل کئے بغیر ہی سکول چھوڑ دیتے ہیں۔

بلوچستان کے سرکاری سکولوں کی حالت انتہائی پریشان کن ہے۔ بلوچستان کے کل 12,347 سرکاری سکولوں میں سے ہائی سکولوں کی تعداد صرف چھ فیصد ہے۔ سکول جانے والے بچوں کی کم از کم 76 فیصد تعداد سرکاری سکولوں میں جاتی ہے جبکہ 19 فیصد نجی سکولوں میں اور پانچ فیصد مذہبی مدارس میں تعلیم حاصل

گوٹھ جان محمد بروہی میں ایک استاد اور اس کے طلبا کھجور کے درخت کے نیچے پڑھائی کر رہے ہیں جہاں اکلوتے سکول کے ڈھانچے کو خطرناک ہونے کی وجہ سے تعلیم کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا

کرتے ہیں۔

ان میں سے 216 سکول فعال نہیں ہیں جبکہ تعلیم کا معیار عموماً دیگر صوبوں کی نسبت بہت ناقص ہے۔ بلوچستان کے کسی بھی ضلع نے پاکستان کے شعبہ تعلیم میں نمایاں پوزیشن حاصل نہیں کی۔ 14 فیصد اساتذہ پڑھاتے ہی نہیں ہیں، مگر تنخواہیں وصول کرتے ہیں جبکہ 37 فیصد سکول صرف ایک کمرے پر مشتمل ہیں۔ بلوچستان کے 10,000 سکولوں میں سے صرف 662 (17 فیصد سے بھی کم) میں بجلی کی سہولت نہیں ہے جبکہ صرف 2000 سکولوں میں بیت الخلاء کی سہولت میسر ہے۔ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک نے کہا کہ حکومت کے پاس شعبہ تعلیم کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے مناسب وسائل نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سکولوں میں اندراج بڑھانے کے لیے ان کی حکومت کو 63 ارب روپے کی ضرورت ہے۔ ملی عوامی پارٹی کے سینیٹر عبدالروف کے مطابق وفاقی حکومت کو اٹھارویں ترمیم کے بعد مکمل ذمہ داری صوبوں کو منتقل کرنے کی بجائے 65 برسوں تک شعبہ تعلیم کو نظرانداز کرنے کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے تھی جس کی وجہ سے صوبے میں تعلیم کی صورتحال مایوس کن رہی ہے۔

خیبر پختونخوا

صوبہ کے پی میں 25 لاکھ (2.5 ملین) بچے اب بھی سکول سے باہر ہیں۔

ضلعی ایجوکیشن منیجمنٹ انفارمیشن سسٹم، کے پی (ای ایم آئی ایس) کی رپورٹ 14-2013ء

کے مطابق 5 سے 16 برس کی عمر کے بچوں کی کل تعداد 37 لاکھ (3.7 ملین) ہے۔ تاہم ان میں تقریباً 736000 بچے صوبہ کے 25 اضلاع کے سکول سے باہر ہیں۔ صوبہ کی تقریباً 34 لاکھ (3.4 ملین) لڑکیوں کے لیے صورتحال انتہائی ابتر ہے کیونکہ ان کی نصف تعداد یعنی 17 لاکھ (1.7 ملین) سے زائد بچیاں تعلیم حاصل نہیں کر رہیں۔

صوبے کو سکولوں میں محض اندراج کی کم شرح کا مسئلہ ہی درپیش نہیں۔ جبکہ پرائمری سطح پر اساتذہ کی منظور شدہ 78 ہزار آسامیوں میں سے تقریباً 10 فیصد آسامیاں خالی پڑی ہیں۔ انٹرمیڈیٹ سطح پر 21,494 آسامیوں میں سے 7,409 (تقریباً 33 فیصد) آسامیاں خالی ہیں۔ ثانوی سطح پر اساتذہ کے لیے حکومت کی مقررہ کردہ 30,844 آسامیوں میں سے 6,315 آسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔ الف اعلان نے پاکستان ڈسٹرکٹ ایجوکیشن درجہ بندی رپورٹ 2014ء جاری کی جس کے مطابق صوبے میں مجموعی طور پر روزانہ 14 فیصد اساتذہ غیر حاضر رہتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم

2014ء میں اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے دو اہم نکات سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے ملکی یونیورسٹیوں میں نظریہ پاکستان، مقاصد پاکستان اور/ یا حکومت پاکستان کے نقطہ نظر کو چیلنج کرنے والی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے وہاں بحث و مباحثہ اور گفت و شنید کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ اور وہ دوسری یہ کہ پاکستان میڈیکل و ڈینٹل کونسل (پی ایم ڈی سی) نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے پچاس فیصد کا کوٹہ مختص کر کے قابلیت کی بنیاد پر داخلہ پالیسی کو ختم کرنے کی کوششیں کی۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد میں اقوام متحدہ کی ایک تقریب میں اسرائیلی ثقافت کی جھوٹ موٹ کی نمائش لگائی گئی جس کے خلاف جماعت اسلامی کے طلبہ ونگ اسلامی جمعیت طلبہ نے پرتشدد احتجاج کیا، تقریب کو تہ و بالا کیا اور شرکاء کو کیمپس سے بھاگنے پر مجبور کیا۔ نمائش کا اہتمام ثقافتی سرگرمیوں کے جزو کے طور پر کیا گیا تھا جس کا مقصد کانفرنس میں شریک ریاستوں کی نمائندگی تھا جیسے اقوام متحدہ کے اجلاسوں کی طرز پر منعقد کیا گیا تھا۔ تقریب میں طلبہ نے اقوام متحدہ کے، لسانی، مذہبی گروہوں کے مابین ہم آہنگی، برداشت اور دوستی کے عمل کو فروغ دینے کے حوالے سے اظہار خیال کیا تھا۔ جس پر انسانی حقوق کا عالمی منشور بھی زور دیتا ہے۔

تاہم، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ایسی سرگرمیوں سے تنبیہ کی جو نظریہء پاکستان، پاکستان کے اقدار، اور/ یا حکومت کے نکتہء نظر کے منافی ہو۔ نوٹیفکیشن میں طلباء کو

حکومتی پالیسیوں پر تنقید کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے اور اس کے نفاذ سے پاکستان میں حقِ تعلیم پر شدید منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ ماہرین تعلیم اور کارکنوں نے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے نوٹیفیکیشن کے خلاف آواز بلند کی اور اس اقدام کو کیمپس میں اظہار رائے کی آزادی میں غیر قانونی مداخلت کے مترادف قرار دیا۔

ایچ آر سی پی کے نوٹیفیکیشن کے دو دن بعد، 30 اکتوبر کو وزیراعظم کے دفتر نے ایچ ای سی کو سکول، کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں اصلاحات کرنے کی ہدایت کی تا کہ آئینی جمہوریت کی اہمیت کے تصور کو فروغ دیا جا سکے۔ اور آئینی جمہوریت کے عمل اور تکثیریت کا ادراک مستحکم ہو۔

ستمبر میں، پاکستان میڈیکل ڈینٹل کونسل نے قابلیت کی بنیاد پر داخلہ کی شرط ختم کر دی اور ملک کے میڈیکل و ڈینٹل کالجوں میں داخلہ کے خواہشمند لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے بالترتیب 50,50 سیٹوں کا کوٹہ مختص کر دیا۔ پی ایم ڈی سی کے صدر ڈاکٹر مسعود حمید نے دلیل پیش کی کہ پاکستان میں ہر برس گریجوایشن کرنے والے 14,000 میڈیکل طلباء میں سے 70 فیصد خواتین ہوتی ہیں مگر ان میں سے صرف 50 فیصد لڑکیاں طب کی پریکٹس کرتی ہیں۔ چونکہ حکومت قابلیت کی بنیاد پر داخلہ لینے والے ہر طالب علم پر 24 لاکھ (2.4 ملین) روپے خرچ کرتی ہے اور جنرل میرٹ پر داخلہ لینے والی لڑکیوں کی نصف تعداد پریکٹس نہیں کرتی جس سے ملکی خزانے کو بھاری نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

پی ایم ڈی سی کے مطابق گریجوایشن کرنے کے بعد مرد ڈاکٹروں کی نسبت خواتین ڈاکٹروں کی کم تعداد ہی شعبہ طب میں پریکٹس کرتی ہیں۔ تاہم، پدری نظام اور جنسی امتیاز جیسے معاملات، جن کے باعث خواتین کی ذاتی و پیشہ وارانہ زندگی طاعون زدہ ہے، سے نبٹنے کی بجائے نوجوان لڑکیوں کو طبی تعلیم سے محروم کرنے کے عمل کو خطرناک راہ فرار ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

لاہور ہائی کورٹ نے کوٹہ پالیسی کو صنفی سطح پر امتیازی ہونے کے باعث اسے غیر آئینی قرار دے کر کالعدم کر دیا۔ تاہم پی ایم ڈی سی کی جانب سے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کے ارادے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں خواتین کے لیے مساوی تعلیمی مواقع کی فراہمی کا خواب مستقبل قریب میں پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ ملک میں لڑکیوں اور عورتوں کے لیے غیر مساوی مواقع کی نشاندہی ورلڈ اکنامک فورم کی جنسی مساوات سے متعلق 2014ء کی رپورٹ میں بھی کی گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق خواتین کی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے حوالے سے 142 ممالک کی فہرست میں پاکستان کا درجہ 103 واں ہے۔

ورلڈ اکنامک فورم کی عالمی مسابقتی رپورٹ کے مطابق اعلیٰ اور اعلیٰ ثانوی تعلیم میں طلبہ کے اندراج میں بھی پاکستان کی کارکردگی میں کمی واقع ہوئی ہے اس حوالے سے پاکستان 144 ممالک کی فہرست

میں 129 ویں نمبر پر ہے جبکہ اس کے برعکس 2013ء میں 148 ممالک کی فہرست میں پاکستان 121 ویں درجے پر تھا۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن متعدد تنازعات کا شکار بھی رہا۔ اسلام آباد ہائی کورٹ نے حکومت کو ایچ ای سی کا مستقل چیئر پرسن تعینات کرنے کا حکم صادر کیا جس کی تعمیل میں وزیر اعظم نواز شریف نے ڈاکٹر مختار احمد کو تعینات کر دیا۔ تاہم اس تعیناتی کو اسلام آباد ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا۔ درخواست گزار کا موقف تھا کہ تعیناتی، انٹرویو لئے بغیر ہی کی گئی تھی۔ چنانچہ انتخاب میں مناسبت اور موزونیت کے حوالے سے مقابلے کے پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

ایک اور بڑا مسئلہ جو اعلیٰ تعلیم کو درپیش ہے وہ ہے لڑکیوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنا۔ طالبات کی جنسی ہراسیمگی کے متعدد واقعات منظر عام پر آئے، حتیٰ کہ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) جیسی معروف نجی یونیورسٹیوں سے بھی ایسے واقعات کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ تاہم جنسی ہراسیمگی کے واقعات کو رپورٹ کرنا اور مجرموں کی جوابدہی کو یقینی بنانے کا کام آسان نہیں تھا۔

جون 2014ء میں قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کی ایک طالبہ نے شکایت کی کہ یونیورسٹی کے ایک استاد نے اسے جنسی طور پر ہراساں کیا تھا۔ ملزم استاد یونیورسٹی کے شعبہ سکول آف مینجمنٹ سائنسز کا سربراہ تھا اور طالبہ نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ جب تک وہ اس عہدے پر فائز ہے تب تک کوئی استاد اور طالب علم اس کے خلاف گواہی دینے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ تاہم یونیورسٹی نے ملزم کی عہدے پر تعیناتی کے دوران ہی تحقیقات کرائی اور الزامات کو غیر حقیقی قرار دیا۔

یونیورسٹی نے شکایت پر کارروائی کے لیے ''کام کے مقام پر خواتین کو جنسی ایذادہی سے تحفظ کے ایکٹ 2010'' کو استعمال کیا۔ یونیورسٹی کا کہنا تھا کہ مذکورہ ایکٹ طلباء۔ اساتذہ تعلقات پر لاگو نہیں ہوتا۔

پارلیمنٹ کے بعض اراکین خصوصاً فرحت اللہ بابر نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو قانون کے دائرہ کار میں لانے کے لیے اس میں ترمیم کرنے کی کوشش کی۔ البتہ ابھی تک ترمیم کو عملی شکل نہیں دی جا سکی۔

نجی سکول

عالمی بینک نے مئی 2014ء میں، ''پاکستان میں نجی سکولوں کی شراکت'' کے عنوان سے اپنی پالیسی دستاویز جاری کی جس کے مطابق پاکستان میں سکولوں میں جانے والے بچوں کا پانچواں حصہ نجی سکولوں میں جاتا ہے۔ اس حوالے سے اگر سکول نہ جانے والے بچوں کی بہت بڑی تعداد کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندازاً ایک تہائی بچے نجی سکولوں میں جاتے ہیں۔ توقع کے مطابق پالیسی دستاویز میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نجی سکولوں کے طلباء سرکاری سکولوں کے طلباء کی نسبت شہری، متمول اور زیادہ تعلیم یافتہ گھرانوں سے تعلق

رکھتے ہیں۔ مزید برآں، نجی سکولنگ شہروں میں زیادہ عام ہے۔اس لئے نجی سکولوں کے 50 فیصد طلباء ملک کے کل 113 اضلاع میں سے صرف 10 اضلاع میں موجود ہیں۔ یہ 10 اضلاع جن میں سے زیادہ تر شمال پنجاب میں ہیں،شہری آباد پر مشتمل ہیں اور نسبتاً متمول علاقے سمجھے جاتے ہیں۔

نجی اسکولوں نے فیسیں بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا

وسائل اور استطاعت رکھنے والے لوگوں کی تعلیم پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے اور حکومتی کنٹرول سے آزاد ہونے کی وجہ نجی اسکولوں نے ملک بھر میں اپنی مرضی سے فیسیں بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔نجی سکولوں کو پاکستانی بچوں کے حق تعلیم کا احساس کرنے کی بجائے اپنی منافع خوری کی زیادہ فکر رہی جس کا ثبوت انہوں نے 'پنجاب مفت ولازمی تعلیم آرڈیننس 2014ء' کی اس دفعہ کی منظم طریقے سے مزاحمت کی صورت میں پیش کیا جس کی رُو سے نجی سکولوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ جماعت اول سے لے کر دہم تک 10 فیصد سیٹیں غریب طلبہ کے لیے مختص کریں گے اور انہیں مفت تعلیم فراہم کریں گے۔

نجی سکولوں کے نمائندوں نے پنجاب اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے تعلیم ایک اجلاس میں یہ دلیل اپناتے ہوئے اس دفعہ کی مخالفت کی کہ اس پالیسی کے ذریعے داخل ہونے والے طلبہ کے لیے نفسیاتی مسائل پیدا ہونگے۔

اسی طرح، خیبر پختونخوا کی حکومت کو بھی نجی اداروں میں زیر تعلیم طلبہ کے لیے فیس میں رعایت کے معاملے پر قانونی جنگ اس وقت ہارنی پڑی جب عدالت عظمیٰ نے تعلیمی ضابطہ این ڈبلیوایف پی، 1935 کے آرٹیکل 106 (ii) کی قانونی حیثیت پر عدالت عالیہ پشاور کے یکم فروری 2011ء کے فیصلے کو یہ کہتے ہوئے کالعدم قرار دے دیا کہ اگر ایک گھرانے کے دو یا دو سے زیادہ بچے ایک سکول یا مختلف سکولوں میں زیر تعلیم ہیں تو جو بھائی یا بہن سب سے بڑی جماعت میں ہوگا اسے مکمل فیس ادا کرنا ہوگی جبکہ دوسرے بھائی یا بہن کو نصف فیس ادا کرنا پڑے گی۔

پشاور کے آرمی پبلک سکول میں مسلح طالبان کا نشانہ بننے والوں کی یاد میں طلباء مٹی کے دیئے روشن کر رہے ہیں

عدالت عالیہ پشاور نے اپنے 2011ء کے فیصلے میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا تھا کہ تعلیم ایک صنعت اور نجی کاروبار بن چکی ہے۔ عدالت نے کہا کہ انسانیت دوست اور ہمدردانہ احساسات کو نجی سکولوں کے دائرہ کار سے الگ کر دیا گیا تو تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ تاہم، نجی سکولوں نے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جس نے اس بنیاد پر ان کی اپیل منظور کر لی کہ ضابطے (Code) کو قانونی حیثیت حاصل نہیں تھی اور بعض طلباء کی نصف فیس سے دستبرداری کا اطلاق نجی سکولوں پر زیادتی ہو گی جس کے باعث وہ بعض طلباء کے لیے اپنی نصف فیس سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوئے ہیں۔

نجی سکولوں کے بارے میں سرکاری سکولوں کی نسبت ترقی پسند اور روادار ہونے کے عمومی تاثر کی حقیقت بھی اس وقت مشکوک ہو گئی جب ملک کے 150,000 سکولوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی ''آل پاکستان نجی سکولز فیڈریشن'' نے ''میں ملالہ نہیں ہوں'' یوم منایا اور نوبیل امن پرائز جیتنے والی لڑکی کو اپنے ملک اور مذہب کے منافی نظریے کا پرچار کرنے پر برا بھلا کہا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ملالہ نے اپنی آپ بیتی ''میں ملالہ ہوں''، میں سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رشدی کی حمایت کی جو کہ ایک جارحانہ اور نظریہ پاکستان کے منافی اقدام ہے۔ متنازعہ پیراگراف میں ملالہ نے اپنے والد کے ان الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ''کتاب اسلام کے حوالے سے جارحانہ ہے'' مگر مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ وہ خود کو کتاب پڑھنے کے قابل بنائیں اور اس کے ردعمل میں اپنا نقطہ نظر پیش کریں۔

نجی سکول بھی سرکاری سکولوں کی طرح بدعنوانیوں کا ارتکاب کرتے رہے ہیں مگر ان کی بدعنوانیاں مختلف نوعیت کی تھیں۔ مثال کے طور پر، ایکسائز و ٹیکسیشن آفس راولپنڈی کے مطابق ضلع بھر میں 700 سے زائد نجی سکولوں نے متعدد بار یاددہانی کے باوجود گزشتہ دس برسوں سے ٹیکس ادا نہیں کیا۔ لینڈ ریونیو کے ایک اہلکار نے بتایا کہ ضلع کے ایک ہزار نجی سکولوں میں سے صرف 300 سکولوں نے ٹیکس ادا کیا تھا۔

نجی سکولوں میں جسمانی سزا دیئے جانے کی اطلاعات بھی موصول ہوتی رہیں۔ فیصل آباد میں ایک ٹیچر نے چھ سالہ بچے کو ''جماعت میں خلل ڈالنے'' پر تشدد کر کے اس کا بازو توڑ دیا۔ تشدد کے دیگر کئی واقعات میں بھی صوبہ بھر سے رپورٹ ہوئے۔

پاکستان کے دیگر علاقوں، بالخصوص بلوچستان میں نجی سکول انتہا پسندی کا بنیادی ہدف بنے رہے۔ مئی 2014ء میں اسلامی انتہا پسندوں کے گروپ نے تربت اور پنجگور میں نجی سکولوں کو پمفلٹ بھیجے جن میں ان سے مخلوط تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کا سلسلہ بند کرنے کو کہا گیا۔ دھمکیوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تشدد نے دونوں اضلاع کے نجی سکولوں کو کئی ماہ تک پڑھائی کا سلسلہ بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ سکولوں کی بندش اور تشدد کا خوف صوبے میں پہلے ہی بگڑی ہوئی تعلیمی صورتحال کے لیے بڑا دھچکا ثابت ہوا۔

مدارس کی تعلیم

آرمی پبلک سکول پشاور پر حملے میں 150 افراد کی ہلاکتوں نے مدارس میں اصلاحات اور چھان بین کے معاملے کو ایک دفعہ پھر اجاگر کر دیا۔ حملے کے بعد انسداد دہشت گردی پر مشتمل وزیر اعظم کے 20 نکاتی ایجنڈے میں مدارس کو فوری طور پر باضابطہ بنانے کی سفارش بھی شامل تھی۔ تبصرہ نگاروں اور اراکین مقنّنہ، سب نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ کسی بھی قسم کی شدت پسندانہ تربیت میں ملوث مدارس کی بیرونی امداد پر پابندی عائد کی جائے۔ جناح انسٹی ٹیوٹ کے مطابق، ملک بھر میں 25 ہزار سے زاہد مدارس رجسٹرڈ ہیں جن میں تقریباً دو لاکھ کل وقتی طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ اگر ان مدارس میں زیر تعلیم جز وقتی طالبعلموں کی تعداد بھی شمار کی جائے تو یہ تعداد تقریباً 15 لاکھ (1.5 ملین) تک پہنچ جاتی ہے۔

وفاقی حکومت کی اندرون ملک قومی سلامتی کی پالیسی فروری 2014ء میں شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ مدارس ''انتہا پسندی پھیلانے'' کی صلاحیت رکھنے کے باعث ملکی سلامتی کے لیے ممکنہ خطرہ ہیں۔ پالیسی دستاویز میں مدارس کے نامعلوم مالیاتی وسائل اور ذرائع اور نفرت انگیز مواد کی اشاعت اور تقسیم جیسے تکلیف دہ پہلوؤں کا حوالہ دیا گیا جو قومی اندرونی سلامتی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ پالیسی میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ تمام مدارس مسئلہ نہیں ہیں مگر بعض نے عدم رواداری اور پر تشدد مذہبی رویوں اور بنیاد پرست مواد کے

فروغ اور دیگر عقائد کی مکمل نفی کی تبلیغ کا خطرناک کردار ادا کیا ہے اور فرقہ وارانہ ذہن سازی کا کام کر رہے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''متعدد دہشت گرد مدارس میں زیرِ تعلیم ہیں یا زیرِ تعلیم رہے ہیں جہاں سے انہیں ریاست کے خلاف اسلحہ اٹھانے کے لیے قائل کیا گیا۔ رپورٹ میں مدارس کے تعلیمی نظام کی اصلاحِ نو کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور ان کے انتظامی امور میں معاونت، مالیاتی امور کی پڑتال اور نصاب کی منظوری کے ذریعے قومی تعلیمی نظام کے ساتھ مربوط کرنے کی سفارش کی گئی۔

قومی اسمبلی نے بھی مذہبی درسگاہوں میں تعلیمی سرگرمیوں میں بہتری لانے اور انہیں باضابطہ بنانے کی قرارداد منظور کر کے مدارس میں اصلاح کے حکومتی منصوبوں کی حمایت کی۔ قرارداد پی پی پی کی رکن پارلیمان نفیسہ شاہ نے پیش کی جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ مدارس کی تعلیم میں بہتری لائی جائے اور اسے باضابطہ بنایا جائے۔ ملک کی مذہبی جماعتوں نے مدارس کے نظام میں بہتری لانے کی حکومتی کوششوں کی شدید مخالفت کی۔ جماعت اسلامی نے اندرون ملک قومی سلامتی پالیسی کو ''سیکولر قوتوں'' کی سازش قرار دیا۔ مسلم لیگ (ن) کے اتحادی جماعت جمعیت علمائے اسلام (فضل گروپ) نے مدرسوں کے انتظامی، مالیاتی اور نصابی امور میں مداخلت سے خبردار کیا اور وفاق المدارس العربیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا حنیف جالندھری نے مدارس کی خودمختاری کے تحفظ کے لیے ملک بھر میں ریلیاں نکالنے کا اعلان کیا۔

جامعہ حفصہ مدرسہ اسلام آباد نے اسامہ بن لادن کو ''اسلام کا ہیرو'' اور ''شہید'' قرار دیتے ہوئے اسے خراجِ تحسین پیش کیا اور اپنی لائبریری کا نام اسامہ بن لادن رکھا۔ مدرسے کا سربراہ مولانا عبدالعفور ہے جسے 2013ء میں ان تمام الزامات سے بری قرار دے دیا گیا جو اس پر 2007ء میں لال مسجد کے محاصرے کے حوالے سے عائد کئے گئے۔ کئی مدارس کے حالات افسوسناک رہے اور وہاں جسمانی سزا کا اطلاق معمول کا عمل تھا۔ پنجاب میں ڈسکہ، کاہنہ، وہاڑی، گوجرانوالہ، فیصل آباد اور لاہور سمیت دیگر مقامات سے اساتذہ کی جانب سے طالب علموں پر تشدد اور بعض واقعات میں انہیں شدید زخمی کئے جانے کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔ مارچ میں، پولیس نے امرسدھو، لاہور کے ایک مدرسے سے فرار ہونے والے ایک پندرہ سالہ لڑکے کو حفاظتی تحویل میں لیا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ اسے مدرسے میں چھ دن تک زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ جولائی میں ہری پور کے ایک مدرسے سے بچوں سمیت 115 افراد کو بازیاب کرایا گیا جو زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ بعض اطلاعات کے مطابق شدت پسندوں نے والدین کو اپنے بچے مدارس میں بھیجنے پر مجبور کیا۔ ایسی زیادہ تر اطلاعات فاٹا سے موصول ہوئیں۔ بعض شدت پسندوں نے انکاری والدین سے بھاری رقوم کا مطالبہ کیا جبکہ دیگر نے مغربی نظامِ تعلیم کو گناہ قرار دیا۔

پولیس نے پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں سرچ آپریشن کے دوران رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ مدرسوں سے 48 غیر ملکی طالب علموں کی گرفتاری کا دعویٰ کیا۔ چند مدارس میں ''مشکوک سرگرمیوں'' کی اطلاع پر آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے بعد پولیس نے لاہور، فیصل آباد، چکوال اور ڈیرہ غازی خان میں 10 سے زائد مدارس پر چھاپہ مارا۔

نصابی اصلاحات

تمام اقوام اور تمام نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے مابین ہم آہنگی، برداشت اور دوستی کا فروغ حقِ تعلیم کا لازمی حصہ ہے۔ تاہم، 2014ء میں ایک بار پھر نہ صرف لاکھوں بچے سکول جانے سے محروم رہے بلکہ نام نہاد ''تعلیم یافتہ'' کہیں زیادہ متعصب اور ہٹ دھرم بن کر سامنے آیا۔ ماہرین تعلیم کے خیال میں اس رویے کی بنیادی وجہ نظریے پر مبنی تعلیم ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں قومی نصاب میں قدامت پسندی کو بہت زیادہ فروغ دیا گیا۔ تاریخی حقائق کو مسخ کیا گیا اور سماجی علوم کی تدریس کے ذریعے مذہبی عدم رواداری اور تعصب کو ہوا دی گئی۔ پر تشدد جہاد اور مذہب کے نام پر زندگی قربان کرنے کو عبادت کا درجہ دیا گیا۔ کشمیر میں ہندوستان کی مزاحمت کو مذہبی فریضے کے طور پر پیش کیا گیا اور بچوں کو پڑھایا گیا کہ تمام ہندو پاکستان اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

1990ء سے لے کر اب تک یکے بعد دیگرے بننے والی حکومتیں نصاب میں اصلاح کے لیے نصاب پر جامع نظر ثانی کرنے کے اپنے وعدوں سے منحرف ہوتی رہیں۔ یہ رجحان مشرف کے دورِ حکومت کے اختتام پر کسی حد تک تبدیل ہوا جب قومی نصاب 2006ء اور پھر قومی تعلیمی پالیسی 2009ء کے ذریعے دو کمیٹیوں نے نصابی اصلاحات کے لیے کاوشیں کیں۔ قبل از اسلام دور، مزید برآں نوآبادیاتی نظام کے خلاف اور آزادی کے حق میں ہندوستان کی دو مرکزی سیاسی جماعتوں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی کاوشوں کو تاریخ کے مضمون کا حصہ بنایا گیا۔ تاہم، ان پیش رفتوں کے باوجود، نظر ثانی شدہ نصاب میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے طالبعلموں کے لیے لازمی مضامین میں اسلامی نظریے اور اسلامی رسوم کی تبلیغ شامل ہے، پاکستانی شہریت کی تعریف مسلم شناخت کے ساتھ جوڑی گئی؛ اور تاریخ جیسے مضامین غلطیوں اور تعصب سے بھرے پڑے ہیں۔

نصابی اصلاحات کی کچھ کوششوں کو سیاسی پیش رفتوں کی مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کی مثال 2013ء کے انتخابات کے بعد کے پی کی حکومت میں پی ٹی آئی کے ساتھ جماعت اسلامی کا اتحاد ہے۔ جماعت اسلامی نے صوبے میں پرائمری اور ثانوی سطح کے اسلامیات کے نصاب پر نظر ثانی کے عمل کی

پنجگور کے رہائشی، والدین اور طلباء سکول کو ملنے والی دھمکیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

مخالفت کی۔ نصابی اصلاحات پر عمل اٹھارہویں ترمیم کے بعد اے این پی کی حکومت نے شروع کیا تھا۔ خاص طور پر نویں اور دسویں جماعت کی اسلامیات کی کتاب میں جہاد کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا۔ ماہرین تعلیم کے خیال میں جہاد سے متعلق آیات انٹرمیڈیٹ کے طالبعلموں کو پڑھائی جانی چاہئیں کیونکہ نویں اور دسویں جماعت کے طالبعلم اپنی کم عمری کے باعث اس کے حقیقی مفہوم سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ اس تبدیلی کے خلاف جماعت اسلامی کی مخالفت کی وجہ سے یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ صوبے میں نصابی اصلاحات پر عملدرآمد ہو سکے گا کہ نہیں۔

مزید برآں، اپنی اتحادی جماعت کو خوش کرنے کے لیے کے پی میں پی ٹی آئی کی حکومت پرائمری سکولوں کی درسی کتابوں سے مبینہ ''قابل اعتراض'' مواد نکالنے پر بھی آمادہ ہوگئی۔ مبینہ ''قابل اعتراض'' مواد میں دوپٹہ کے بغیر کمسن بچیوں کی تصویریں، کرسمس کا کیک، ایک ایمبولینس پر ہلال کی بجائے صلیب کا نشان اور بعض مقامات پر اسلام وعلیکم کی بجائے گڈ مارننگ شامل تھا۔ ماہرین تعلیم کے مطابق ان تبدیلیوں کے نفاذ سے کے پی میں امن، باہمی رہن سہن اور برداشت کو بہت بڑا دھچکا لگے گا۔

پنجاب میں صوبائی حکومت نے ستمبر میں نصابی و ٹیکسٹ بک آرڈیننس 2014 منظور کیا جس کا مقصد پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ اور پنجاب نصاب اتھارٹی کے اختیارات میں پائے جانے والے ابہام کو دور کرنا

تھا۔ آرڈیننس کے ذریعے ان کے فرائض کو ضم کر دیا گیا اور نیا پنجاب نصاب و ٹیکسٹ بورڈ تشکیل دے دیا گیا۔

رواداری اور مذہبی اقلیتوں کی تعظیم کے فروغ کے لیے نصابی اصلاحات کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے آزاد جموں و کشمیر، گلگت بلتستان، وفاق کے زیر انتظام علاقہ جات اور ملک دیگر حصوں سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں طالبعلموں نے 10 ستمبر کو لاہور میں ایک قرارداد منظور کی جس میں وفاقی و صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اقلیتوں کی خدمات کا اعتراف کیا جائے اور قومی ہیروز کے طور پر انہیں خراج تحسین پیش کیا جائے۔ نوجوانوں کی ترقی پر مامور ایک غیر سرکاری تنظیم برگد نے پنجاب حکومت، اقوام متحدہ کے پاپولیشن فنڈ (یو این پی اے) امید جوان اور دیگر غیر سرکاری تنظیموں کے تعاون سے تقریب کا اہتمام کیا تھا۔

ایک اور پیش رفت کے مطابق لاہور ہائی کورٹ نے 29 اگست کو وفاقی حکومت اور پنجاب حکومت کو نوٹس جاری کر کے ہدایت کی کہ 1973ء کے آئین کا اردو ترجمہ طالبعلموں کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ پٹیشنر کا موقف تھا جس سے عدالت نے اتفاق کیا کہ پاکستان کے تمام شہریوں کو کم عمری سے ہی بنیادی حقوق، پالیسی سازوں کے رہنما اصول اور جمہوریت کا علم ہونا چاہیئے۔

جنوری 2014ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئر پرسن بلاول بھٹو زرداری نے ملک میں مسخ شدہ تاریخ، مطالعہ پاکستان اور متنازعہ اسلامی نظریہ پڑھانے پر تنقید کی اور عہد کیا کہ سندھ حکومت سے کہیں کہ نصاب میں مزید سیکولر اور متوازن درسی کتب شامل کی جائیں۔ اس کے بعد جولائی میں سینئر وزیر برائے تعلیم و خواندگی کے ترجمان نے کہا کہ نصاب و ٹیکسٹ بک اصلاحات پر قائم مشاورتی کمیٹی نصاب کا جائزہ لے گی تاکہ خامیوں کے خاتمے اور بہتری کے لیے مواقع کی نشاندہی ہو سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ کمیٹی نصاب سے ایسے مواد کو نکال دے گی جس سے صنفی، لسانی یا مذہبی امتیاز کو فروغ ملتا ہے۔

وفاقی سطح پر اس وقت ایک تنازعہ پیدا ہو گیا جب 30 اکتوبر کو وزیر اعظم نواز شریف نے اعلیٰ تعلیمی کمیشن کو ہدایت کی کہ صوبائی حکومتوں کی مشاورت اور ان کی منظوری کے بعد پرائمری، مڈل اور ثانوی سکولوں، نیز کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج مطالعہ پاکستان، انگریزی اور اردو کے نصاب پر نظر ثانی کی جائے۔ کہا گیا ہے کہ نظر ثانی شدہ نصاب میں ایسے اسباق شامل کئے جائیں جو پاکستان کی ترقی اور پہچان کے لیے آئینی جمہوریت کی ضرورت پر زور دیتے ہوں، قومی اور بین الاقوامی تناظر میں آئینی، جمہوری عمل اور تکثیریت کے فوائد سے روشناس کراتے ہوں؛ آئینی جمہوریت کے بارے میں پائے جانے والی عام غلط فہمیوں کے خاتمے کے لیے طالب علموں کے علم میں اضافہ کرنے کا باعث بنیں اور آئینی ڈھانچے کے اندر عدالتی نگرانی، ذرائع ابلاغ، اظہار رائے کی آزادی، حقِ معلومات اور انتخابات جیسے جوابدہی کے ذرائع کے متعلق تنقیدی فکر کو جلا

بخشتے ہوں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے وزیر اعظم نے اعلیٰ تعلیمی کمیشن کو ماہرین تعلیم، یونیورسٹیوں اور درسی کتب کے ناشرین کے ساتھ رابطہ کرنے کی ہدایت کی تا کہ دو ماہ کے اندر اندر ہر درجے (جماعت) کی مطابقت سے حکایات، کہانیوں، مضامین، تقاریر، تدریسی گائیڈز، تدریس کے تربیتی مواد، نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں، امتحانات اور دیگر متعلقہ اقدامات پر مشتمل مواد تیار کیا جا سکے جسے اگلے تعلیمی سال سے سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں پرائمری سکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک نافذ کیا جا سکے۔ اگرچہ تجزیہ کاروں، ماہرین تعلیم اور سیاسی جماعتوں نے تکثیریت، برداشت، اور قانون کی حکمرانی کے لیے نصابی اصلاحات پر زور دینے کے عمل کو سراہا مگر اس امر پر تحفظات کا اظہار بھی کیا کہ وزیر اعظم ایک وفاقی ادارے ایچ ای سی کو پرائمری اور ثانوی سکولوں کا نصاب تشکیل دینے کی ہدایت کیسے کر سکتے ہیں جبکہ اٹھارویں ترمیم کے بعد تعلیم صوبائی معاملہ ہے۔

نوٹیفکیشن ایسے وقت میں آیا جب صوبائی حکومتیں اٹھارویں ترمیم کے بعد تعلیمی نظام میں یکسانیت لانے کے لیے نصاب سے متعلق قومی کونسل کے قیام کے معاملے پر مرکز سے مذاکرات کر رہی تھیں۔ وفاقی حکومت نے کونسل کو زیادہ اختیارات دینے پر اصرار کیا جبکہ کے پی اور سندھ کی حکومتوں کا مطالبہ تھا کہ کونسل کی حیثیت مشاورتی ادارے کی ہونی چاہئے جو صوبوں کو صرف سفارشات پیش کرے جن کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہو۔ اکتوبر میں وزرائے تعلیم کی بین الصوبائی کانفرنس (آئی پی ای ایم سی) کے موقع پر سندھ کے سوا تمام صوبوں نے وفاقی علاقے، صوبوں، گلگت بلتستان، آزاد جموں و کشمیر اور وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات سے کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین اراکین پر مشتمل قومی نصابی کونسل کے قیام پر اتفاق کا اظہار کیا۔ تاہم کونسل کی ساخت اور کام کے طریقہ کار کو جنوری 2015ء میں ہونے والی آئی پی ای ایم سی میں طے کرنے کا فیصلہ ہوا۔

تشدد، غیر محفوظ حالات اور تعلیم کی جستجو

ملک میں جاری عدم تحفظ، تشدد اور مختلف مسلح گروہوں کے حملے پاکستان میں تعلیم کی راہ میں بنیادی رکاوٹ بنے رہے۔ تعلیم کو حملوں سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے عالمی اتحاد نامی امریکی ادارے نے 2009 سے 2013ء تک 70 ممالک میں تصادموں سے متعلق ایک سروے رپورٹ جاری کی جس میں بتایا گیا تھا کہ تعلیمی اداروں پر پُرتشدد حملوں میں گزشتہ برسوں کی نسبت اضافہ ہوا ہے، اور حملوں کے نتیجے میں کُل 9,600 سکول تباہ ہوئے یا انہیں نقصان پہنچا۔ سروے کے مطابق، پاکستان سب سے زیادہ متاثر ہوا جہاں

صرف 2009ء سے 2012ء کے درمیانی عرصے میں 800 سکولوں کو دیدہ ودانستہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور متعدد کو بم دھماکوں سے تباہ کیا گیا تھا۔

ملک میں سال کا آغاز پُرتشدد وقوعے سے ہوا۔ 6 جنوری 2014ء کو ضلع ہنگو کے شیعہ اکثریتی علاقہ ابراہیم زئی میں واقع ایک سرکاری سکول کے باہر ایک 14 سالہ لڑکے نے خودکش بمبار کو دیکھا اور اسے سکول میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تو خودکش بمبار نے خود کو سکول کے باہر اڑا دیا۔ موقع پر ہلاک ہونے والے طالب علم اعتزاز کو ''ہنگو کے ہیرو'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے اور اس کی شہادت کے بعد اسے ستارہ شجاعت سمیت متعدد انعامات سے نوازا گیا۔ شدت پسند تنظیم لشکر جھنگوی نے حملے کی ذمہ داری قبول کی۔

15 جنوری کو 23 طلبہ معلومات عامہ کے مقابلے میں شرکت کے بعد گھر واپس آتے ہوئے سکول ویگن کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ واقعے سے طالب علموں کے لیے سفر کے غیر محفوظ حالات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کراچی سے 170 میل شمال مشرق کی جانب واقع شہر نوابشاہ کے نزدیک ویگن اور ٹرک کے تصادم میں تین اساتذہ اور ویگن کا ڈرائیور جاں بحق ہوگئے تھے۔ طالب علم دولت پور کے برائٹ فیوچر پبلک سکول میں منعقدہ تقریب میں شریک ہوئے تھے۔

سال کا اختتام ایک ایسے حملے سے ہوا جو نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کی حالیہ تاریخ کا سب سے بھیانک اور بہیمانہ واقعہ تھا۔ 16 دسمبر کو تحریک طالبان پاکستان نے آرمی پبلک سکول پشاور پر حملہ کر کے 136 طلبہ سمیت 150 افراد کو شہید کر دیا۔ ٹی ٹی پی کے مطابق حملہ شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن ضرب عضب کے ردعمل میں کیا گیا تھا۔ شمال مغربی پاکستان میں سکولوں اور اساتذہ کو سال بھر حملوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ فروری میں نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے ضلع ہنگو میں ایک بار پھر تین اساتذہ کو اس وقت گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جب وہ سکول میں ڈیوٹی کر کے واپس گھر جا رہے تھے۔ اگست میں، باجوڑ ایجنسی میں تین خواتین اساتذہ اور سکول کے دو بچوں سمیت 6 افراد کو بم دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اور اکتوبر میں نامعلوم حملہ آوروں نے پشاور کے علاقہ شبقدر میں عسکری پبلک سکول پر دستی بم پھینک کر ایک سکول ٹیچر کو ہلاک جبکہ سکول کے دو بچوں کو زخمی کر دیا۔ اس سے قبل سکول کو دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ اگر طالبعلموں نے ''مغربی لباس'' کی بجائے شلوار قمیض پہننا نہ شروع کی تو سکول کو حملے کا نشانہ بنایا جائے گا۔ بلوچستان میں بھی تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تعلیمی اداروں پر پُرتشدد حملے تھے۔

مئی 2014ء میں نقاب پوش افراد پنجگور میں انگریزی زبان کی تعلیم دینے والے مرکز میں داخل ہوئے اور طالبعلموں و اساتذہ کو تلقین کی کہ وہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے سے باز رہیں۔ کیونکہ ان

تعلیم تک یکساں رسائی میں بدترین کارکردگی والے ممالک کی صف میں پاکستان گیارہویں نمبر پر ہے

کے بقول شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک شدت پسند تنظیم الاسلامی الفرقان نے دھمکیوں کی ذمہ داری قبول کی۔ دھمکیوں اور خوف وہراس کی فضا کے باعث پنجگور میں تمام نجی تعلیمی ادارے اور انگریزی زبان سکھانے والے مراکز تین سے زائد ماہ تک بند رہے۔ جب اگست میں ادارے دوبارہ کھلے تو اساتذہ کے مطابق طالب علموں کی حاضری 40 فیصد سے بھی کم تھی۔

حالات کو مزید ابتر کرنے کے لیے ستمبر 2014ء میں مسلح افراد نے بلوچستان کے مغرب میں واقع تربت کے علاقہ دشت میں ایک نجی سکول کو آگ لگادی۔ الجہاد نامی گروہ نے حملے کی ذمہ داری قبول کی۔ گروہ نے دھمکی آمیز پمفلٹ بھی تقسیم کیے جن میں لکھا گیا تھا کہ نجی سکولوں کو "مغربی تعلیم دینا بند کرو خاص طور پر انگریزی زبان میں" اور کہا کہ حملہ مغربی طرز کی تعلیم کے خلاف مقدس جنگ کا حصہ تھا۔ پنجگور اور تربت کے سکولوں اور کالجوں پر حملوں میں شدت کے بعد وہاں کے متعدد طالب علم کوئٹہ یا کراچی نقل مکانی کر گئے۔

کراچی سے بھی تشدد کے اکا دکا واقعات رپورٹ ہوتے رہے۔ اپریل 2014ء میں نامعلوم شدت پسندوں نے گلشن اقبال کراچی میں ایک مدرسہ کے تین طالبعلموں کو قتل کردیا۔ چند دن بعد، نارتھ ناظم آباد، کراچی میں مدرسہ میں زیرتعلیم کم ازکم تین طالبعلموں کو فائرنگ کرکے مار دیا گیا۔ تشدد کا دوسرا پہلو یونیورسٹیوں میں شدت پسند طلباء گروہوں کی موجودگی اور ان کی کارروائیاں تھیں۔ بالعموم دیگر گروہوں جبکہ

بالخصوص اسلامی جمعیت طلباء سے وابستہ طلباء کی طرف سے اساتذہ اور طالب علموں کو ہراساں کرنے اور انہیں ڈرانے دھمکانے کی متعدد اطلاعات موصول ہوئیں۔ مثال کے طور پر ویلنٹائن ڈے کے موقع پر پشاور یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلباء اور پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ اطلاعات کے مطابق، آئی جے ٹی کے اراکین نے طلباء کو ویلنٹائن ڈے منانے سے روکا تھا اور اصرار کیا تھا کہ وہ اس کی بجائے ''حیاڈے'' منائیں، جس کے بعد آئی جے ٹی اور پی ایس ایف کے کارکنوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ شروع کردی اور نتیجتاً کم از کم پانچ طالب علم زخمی ہوگئے۔

ستمبر 2014ء میں بھی کئی طلباء اس وقت زخمی ہوئے جب آئی جے ٹی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی انتظامیہ کے ساتھ جھگڑا کیا۔ انتظامیہ نے یونیورسٹی کے ایک آڈیٹوریم کے سامنے سے آئی جے ٹی کے سٹال ہٹانے کی کوشش کی تو لڑائی شروع ہوگئی۔ انتظامیہ کی جانب سے آئی جے ٹی کو داخلہ سٹال لگانے کی اجازت نہ دینے کے ردعمل میں چندروز بعد پنجاب یونیورسٹی ہال کونسل کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر محمد اختر کے گھر کو آئی جے ٹی کے مبینہ حملے کا سامنا کرنا پڑا۔

صنفی امتیاز

میں اپنے والد کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے پنکھ نہیں کاٹے...... مجھے اڑنے کی اجازت دی تاکہ میں اپنے مقاصد حاصل کرسکوں...... میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دنیا پر ظاہر کردیا کہ لڑکی قیدی نہیں ہے۔ لڑکی میں اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ اور وہ صرف ایک ماں نہیں، ایک بہن نہیں، ایک بیوی نہیں بلکہ اس کی اپنی شناخت ہونی چاہئے۔ اس کو تسلیم کیا جانا چاہئے اور اس کو لڑکے کے برابر حقوق دیئے جانے چاہئیں۔

یہ الفاظ ملالہ یوسف زئی نے 17 برس کی عمر میں نوبیل امن پرائز لیتے وقت ادا کئے تھے۔ اس کی تقریر ملک میں لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی عکاسی کرتی ہے اور اس امر کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ ملک میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مساوی مواقع کی جدوجہد سست رفتار اور طویل بھی ہوگی۔

بین الاقوامی رپورٹیں اور گوشوارے ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا عمل بدنظمی کا شکار ہے مگر لڑکوں کی نسبت لڑکیاں اس پریشان کن صورتحال کا زیادہ نشانہ بن رہی ہیں۔ ورلڈ اکنامک فورم کی جاری کردہ ''گلوبل صنفی تفاوت رپورٹ 2014ء اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ 142 ممالک میں مردوں اور عورتوں میں وسائل اور مواقع کی تقسیم کس قدر منصفانہ ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستان

142ویں نمبر پر تھا جبکہ یمن اس سے ایک درجہ بہتر تھا۔

گوشوارے کے مطابق، معاشی شراکت کے شعبہ میں بدترین کارکردگی والے ممالک کی فہرست میں پاکستان دوسرے نمبر پر جبکہ تعلیم کے مساوی مواقع کے حوالے سے گیارہویں نمبر پر تھا۔ ایک تحقیقاتی اور استعداد سازی والے ادارے پاکستان پاپولیشن کونسل کے مطابق، لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ غربت ہے۔ جب بڑے خاندان اپنے چند بچوں کی تعلیم کا خرچہ ہی برداشت کر سکتے ہیں تو اس میں عموماً بیٹوں کی تعلیم کو بیٹیوں کی تعلیم پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں حائل دیگر رکاوٹوں میں سکول تک عدم رسائی اور طویل فاصلے، (جنسی تشدد کے خطرات کی موجودگی میں)، ثقافتی رکاوٹیں؛ کم عمری کی شادی اور/یا حمل؛ اور سکولوں میں پانی کی عدم دستیابی اور صفائی کا فقدان شامل ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم ملک میں سرگرم عمل شدت پسندوں کا نشانہ بھی رہی ہے۔ مثال کے طور پر سوات میں طالبان کے حملوں سے تباہ شدہ سکولوں میں سے نصف سے زائد لڑکیوں کے سکول تھے۔

سفارشات

1۔ آئین میں شامل حقِ تعلیم کو اس حد تک وسعت دی جائے کہ جس سے انسانی حقوق کے متعلق پاکستان کی طرف سے تسلیم کردہ اصولوں کی عکاسی ہو۔ مزید برآں تعلیم کا مقصد تمام اقوام اور تمام نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے مابین ہم آہنگی، برداشت اور دوستی کا فروغ ہونا چاہئے۔ نصابی اصلاحات پر ایک صحت مند اور مفید بحث مباحثے کا آغاز کیا جائے اور نصاب سے تمام تاریخی مغالطے اور دیگر خامیاں اور تعصّبات حذف کئے جائیں۔ پرائمری سکول کی سطح سے ہی نصاب میں انسانی حقوق کو شامل کیا جائے۔ جس کا اعادہ پاکستان نے اپنے یونیورسل سلسلہ وار ریویو 2012ء میں بھی کیا تھا۔

2۔ تعلیم کے لیے بجٹ جی ڈی پی کے کم سے کم چار فیصد کے برابر ہونا چاہئے تا کہ حکومت کے اس دعوے کی عکاسی ہو سکے کہ ترقی، امن اور ہم آہنگی کے لیے تعلیم ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ سکولوں کے انتہائی پست حالات میں فوری طور پر بہتری لائی جائے اور تمام سکولوں میں آسائش اور حفاظت کے کم سے کم معیارات کو فوری طور پر لاگو کیا جائے۔

3۔ ملک بھر کے سکولوں اور مدارس میں جسمانی سزا پر بندش کا بندوبست کیا جائے اور اس حوالے سے قانون کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔

4۔ روزگار کے مقامات پر خواتین کو ایذا دہی سے تحفظ کے ایکٹ 2010 میں ترمیم کی جائے تاکہ تعلیمی اداروں میں طالبعلموں کی ایذا دہی کے واقعات پر بھی اس کا اطلاق ہو سکے۔ لڑکیوں کو تعلیم کا محفوظ اور آرام دہ ماحول فراہم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ صنفی حساسیت پیدا کرنے کے لیے اساتذہ کی تربیت کی جائے اور نصاب کو منفی لحاظ سے حساس بنانے کے لیے اس پر نظر ثانی کی جائے۔ حکومت اس امر کو یقینی بنائے کہ سرکاری سکولوں خاص طور پر لڑکیوں کے سکول بالخصوص پسماندہ دیہی علاقوں میں آبادیوں کے نزدیک قائم ہوں تاکہ لڑکیاں سکول جانے میں خوف و خطرہ محسوس نہ کریں۔

5۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ تعلیمی اداروں پر ہونے والے حملوں اور دھمکیوں پر قابو پائے۔ خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم کے بنیادی حق پر اثر انداز ہونے والے حملوں اور دھمکیوں کے خاتمے کو بھی یقینی بنایا جائے۔ تشدد کے ایسے واقعات میں ملوث مجرموں کے خلاف تحقیقات کے ذریعے انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے عمل کو یقینی بنایا جائے۔ تشدد کا نشانہ بننے والے تعلیمی اداروں کی فوری طور مرمت اور تعمیر نو کی جائے۔ تشدد کا نشانہ بننے والے طالبعلموں کی جلد از جلد دیگر سکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخل کر لیا جائے۔ تعلیمی اداروں کے اندر تشدد کو کسی صورت بھی برداشت نہ کیا جائے اور مجرموں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ تاہم منتخب طلباء یونینوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور جائز طلباء سیاست کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دور کی جائیں۔

صحت

جنس، ذات، رنگ اور نسل کے امتیاز سے بالاتر، ریاست عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ایسے تمام افراد کو بنیادی ضروریات زندگی۔۔۔مثلاً طبی سہولیات۔۔۔فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقلاً یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-38 (اے) اور (ڈی)]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی پر حق رکھتا ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔ جس میں خوراک، لباس، رہائش، صحت برقرار رکھنے کی سہولیات، ضروری سماجی خدمات [بجلی، پانی، گیس وغیرہ] اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے یا ایسے حالات کے تحت جو اس کے بس سے باہر ہوں اور عدم روزگار کی کسی بھی صورت کے خلاف ضمانتیں بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 25(1)]

ہر پاکستانی شہری کا یہ حق ہے کہ اس کو معیاری طبی سہولتیں حاصل ہوں۔ بدقسمتی سے سابقہ حکومتیں اس کی فراہمی میں ناکام رہی ہیں۔ اگرچہ ملک بھر میں سرکاری ہسپتال، بنیادی مراکز صحت اور سرکاری ڈسپنسریاں قائم ہیں تاہم وہاں مطلوبہ عملہ کی کمی، آلات اور سہولیات کی کمی کا سامنا رہتا ہے۔ حکومت چونکہ احتیاطی اقدامات کی طرف توجہ نہیں دیتی اس لئے اس کے علاج معالجہ پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ بہت سے لوگ جب ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں تو اس وقت تک ان کا مرض لا دوا ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنے امراض سے لاعلم رہتے ہیں کیونکہ ان کی کسی سرکاری تشخیصی سہولت تک رسائی نہیں ہوتی۔ ویسے بھی اکثر سرکاری شفاخانوں میں تشخیصی سہولیات ناپید ہوتی ہیں۔

سرکاری سطح پر اس فرض کی ادائیگی میں ناکامی پر عوام کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ نجی شعبہ میں مہنگے داموں علاج کرانے پر مجبور ہوتے ہیں جو عمومی طور پر ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔

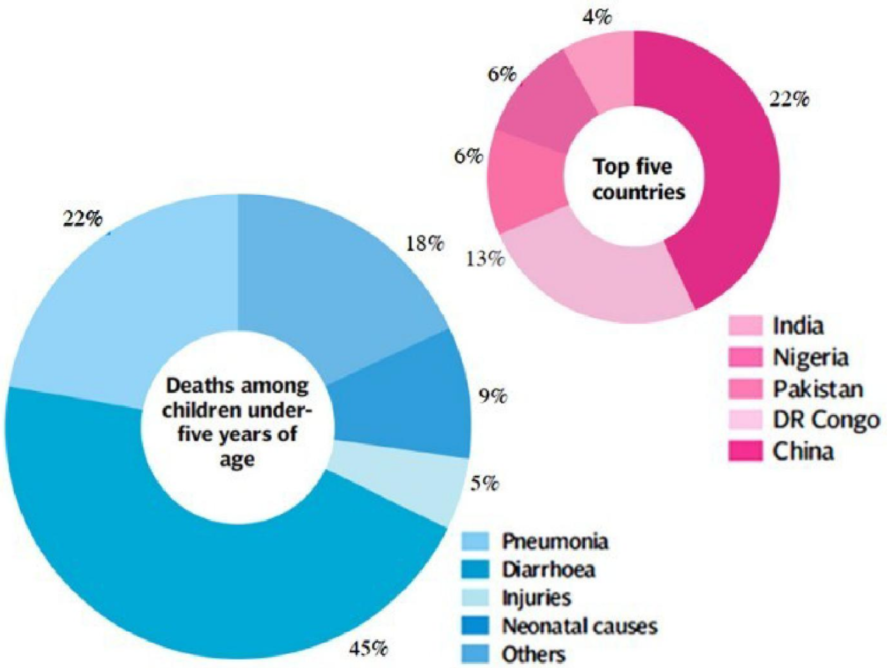

پاکستان بچوں کے زندہ رہنے کے لیے ایک مشکل مقام ہے

پاکستان میں علاج معالجے کی زیادہ تر سہولتیں نجی شعبہ مہیا کرتا ہے۔ 70 سے 80 فیصد افراد بیرونی مریضوں کے طور پر نجی شعبوں میں قائم ہسپتالوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ریاست کے شہریوں کی صحت کی صورتحال انتہائی غیر تسلی بخش ہے۔ 19 فیصد آبادی اور پانچ سال سے کم عمر کے تین بچے ناقص خوراک پاتے ہیں۔

14-2013ء کے معاشی سروے کے مطابق پاکستان میں اعداد و شمار، وبائی امراض کی روک تھام سے متعلق علم اور سماجی و اقتصادی عوامل کی بنیاد پر کچھ مخصوص رجحانات تا حال موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے آبادی کا اکثر حصہ صحت کی سہولیات سے محروم ہو گیا ہے۔ حفظان صحت کی سہولیات ملک کے بعض حصوں میں ناکافی ہیں اور وہاں متعلقہ سامان اور آلات بھی موجود نہیں ہیں صوبوں کی سطح پر یہ صورتحال مختلف ہے۔ سروے کے مطابق صحت کے تربیت یافتہ ورکروں کی قلت اور آبادی میں اضافے سے صحت کے سرکاری اداروں پر بڑھتے ہوئے دباؤ سے نجی شعبے کو طلب اور رسد میں موجود خلا کو پُر کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

صحت کے شعبے میں پسماندگی نیچے کی طرف جاتے ہوئے اشاروں سے واضح ہو جاتی ہے۔ پیدائش کے وقت تصور یہ کیا جاتا ہے کہ پیدا ہونے والے افراد کی عمر 59 سال ہوگی جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان جیسے ممالک میں 61 سال کی عمر متوقع ہوتی ہے۔ شیر خوار بچوں کی شرح اموات 95 بچے فی ہزار ہے جبکہ دوسرے ملکوں میں یہ شرح 60 فی ہزار ہوتی ہے۔ صحت پر جو سالانہ رقم خرچ کی جاتی ہے، وہ بہت ہی کم ہے۔

عالمی ادارہ صحت نے صحت کے شعبے میں سرکاری کارگزاری کا احاطہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ صحت کے شعبے کا وسیع ڈھانچہ موجود ہونے کے باوجود صحت کی بہترین خدمات کی انجام دہی کا کام نہیں لیا جاسکا۔اس کی وجہ کام کا ماحول اور شعبہ طب کی ملازمت کے کمزور ڈھانچے کی وجہ سے ملازمین میں خدمت کا جذبہ ناپید ا ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ شہری اور دیہی تناسب سے طبی وسائل کی تقسیم میں بدعنوانی اور قومی صحت پالیسی میں افرادی قوت کی کمیابی بھی شعبہ صحت کی خراب صورتحال کا موجب ہیں۔عالمی ادارہ صحت کا کہنا ہے کہ پاکستان جی ڈی پی کا 0.5 فیصد صحت پر خرچ کرتا ہے جو کہ بہت کم ہے۔ یہ مطلوبہ ادویات، لیبارٹری سہولیات کے ساتھ حفظان صحت کی فراہمی میں حکومتی نااہلی کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے میں صحت کے 80 فیصد اخراجات لوگوں کی جیب سے نکالے جاتے ہیں۔صحت کا معلوماتی نظام بھی منصوبہ سازی کے لئے مطلوبہ اعداد وشمار فراہم نہیں کرتا۔

صحت کا بجٹ (تمام صوبوں کا)

2014ء کے لیے صحت کے وفاقی بجٹ میں ہیپاٹائٹس، ملیریا اور ٹی بی کے خاتمہ کے لیے قومی ہیلتھ پروگرام چلانے کے لیے 26 ارب 80 کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔

صحت صوبائی معاملہ ہے۔ پنجاب نے اپنے بجٹ کا 5.4 فیصد یعنی 73.2 ارب روپے کی رقم صحت کے لیے مختص کی۔ خیبر پختونخوا نے 29 ارب روپے یعنی 7.9 فیصد رقم صحت کے لیے وقف کی۔ سندھ نے صحت کے لیے 43 ارب خرچ کرنے تھے جو پچھلے سال کی نسبت 20 فیصد زیادہ تھے اور اس کے کل بجٹ کا 7.3 فیصد تھے۔ بلوچستان نے صحت کے لئے 14.14 ارب روپے مختص کیے جو کل بجٹ کا 9.9 فیصد ہے اور گزشتہ سال کی نسبت 26 فیصد زیادہ ہے۔اس طرح بلوچستان صحت پر اخراجات کے حوالے سے تمام صوبوں پر سبقت لے گیا۔

ماؤں کی صحت اور شیر خوار بچوں کی شرح اموات

حکومتوں کی طرف سے صحت کے شعبہ میں متعدد اقدامات کرنے کے باوجود ماؤں کی صحت اور شیر خوار بچوں کی بلند شرح اموات ملک کے لیے بدستور ایک بڑا اور اہم مسئلہ رہیں۔اقوام متحدہ کے پاپولیشن فنڈ کی جاری کردہ حالیہ رپورٹ کے مطابق اندازاً 14000 خواتین، پاکستان میں ہر سال زچگی کی پیچیدگیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق زچہ و بچہ کی شرح اموات جنوبی ایشیا میں بلند ترین ہے۔ یونیسیف کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بچوں کی اموات کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔اس رپورٹ کے

مطابق بچوں کی اموات کے حوالے سے پاکستان دنیا بھر کے ملکوں کی فہرست میں 26ویں نمبر پر ہے۔

2014ء میں "Save The Children" برطانیہ کی جانب سے جاری ہونے والی تحقیقی رپورٹ سے کچھ واضح حقائق سامنے آئے ہیں جن پر فوری طور پر حکومتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔"نومولود بچوں کی اموات کا خاتمہ" نامی سروے میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں سالانہ اسقاط حمل کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے زچہ یا بچہ کے لیے یہ سب سے خطرناک ملک ہے۔انسانی بحرانوں میں ماؤں اور بچوں کے تحفظ سے متعلق درجہ بندی میں پاکستان 178 ممالک میں سے 147ویں نمبر پر ہے۔

پاکستان پاپولیشن کونسل کے حوالے سے غذائی قلت، ناتجربہ کار دائیوں کے ہاتھوں پیدائش اور معیاری طبی سہولتوں تک رسائی نہ ہونے، ملک میں بچپن کی شادیوں اور غیر محفوظ اسقاط کی وجہ سے 13فیصد خواتین زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں ہیں جبکہ 34 فیصد حاملہ خواتین ناقص غذا کے علاوہ وٹامن اے اور آیوڈین کی کمی کا شکار ہوتی ہیں۔

ماؤں کی بلند شرح اموات کی وجہ لڑکیوں کی نوعمری میں شادیاں ہوتی ہیں۔اس عمر میں لڑکیاں نہ تو حمل اور نہ ہی بچے کی پیدائش کو سنبھال سکتی ہیں۔سندھ اسمبلی نے بچوں کی کم عمری کی شادیوں پر پابندی کا ایکٹ مجریہ 2013ء منظور کر کے دولہا اور دلہن کی کم از کم عمر اٹھارہ سال مقرر کی ہے۔پنجاب اسمبلی نے کم عمری کی شادیاں روکنے کے لیے ایک قرارداد منظور کی۔تاہم سال کے آخر تک متعلقہ قوانین میں حالات کے مطابق مناسب تبدیلیاں نہیں کی جا سکیں۔

پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں ہونے والی اموات کی شرح 89 فی ہزار ہے۔ان میں دو تہائی (55 فی ہزار) اموات نومولودگی میں ہی ہو جاتی ہیں جبکہ پیدائش کے پہلے ہفتے میں ہونے والی اموات کی تعداد کل اموات کا 74 فیصد ہے۔ پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے (پی ڈی ایچ ایس) 2014ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں بازاری دودھ پینے والے بچوں کی تعداد جنوبی ایشیاء میں سب سے زیادہ ہے جبکہ ماں کا دودھ پینے والے بچوں کی تعداد جنوبی ایشیاء میں سب سے کم ہے۔

ناقص غذا

پاکستان مسلسل شدید ناقص غذائیت اور غذائی عدم تحفظ کا شکار چلا آ رہا ہے۔خاص طور پر سندھ کے خشک سالی کے شکار علاقے تھرپارکر میں سال کے دوران نوزائیدہ اور شیر خوار بچوں سمیت ایک ہزار کے قریب لوگ ان وجوہات کی بناء پر مر گئے۔Save the children کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال مرنے والے 800,000 بچوں میں سے 35 فیصد یعنی 280,000 بچے ناقص غذا کی وجہ سے

تقریباً 19 فیصد آبادی اور پانچ سال سے کم عمر کے 30 فیصد بچے غذائی قلت کا شکار ہیں

مرجاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے ادارے خوراک وزراعت کا کہنا ہے کہ مناسب غذا نہ ملنے کی وجہ سے پاکستان کے چالیس فیصد بچے ناقص غذائیت اور وزن میں کمی کا شکار ہیں۔اس نے خدشے کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کے زیادہ اناج پیدا کرنے والے ممالک میں شامل ہونے کے باوجود پاکستان کی آدھی آبادی کو غذائی عدم تحفظ کا سامنا ہے۔

پاکستان میں ناقص غذا کے باعث پانچ سال سے کم عمر بچوں کی نشو ونما میں رکاوٹ اور حاملہ عورتوں میں ٹھٹھرانے اور انیمیا (خون میں سرخ ذرات کی کمی) جیسے دوامراض عام ہیں۔اس کے علاوہ حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی مائیں خوراک کی کمی کے باعث بیماری کی حالت میں رہتی ہیں۔

ایک تحقیقی رپورٹ ''پاکستان میں غذائی تحفظ کی صورتحال اور پالیسی کا چناؤ'' کے مطابق پنجاب کے سوا دیگر صوبوں کی غذائی صورت حال تشویشناک ہے۔ پنجاب کے 21 اضلاع میں غذائی بہتات ہے اور صرف نو اضلاع ایسے ہیں جن میں غذائی قلت دکھائی دیتی ہے۔ فاٹا، بلوچستان اور گلگت بلتستان کے سب سے زیادہ اضلاع میں غذائی قلت درپیش ہے۔ بلوچستان کے 22 اضلاع میں غذا کی شدید قلت ہے جبکہ تین اضلاع میں غذائی قلت کچھ کم ہے۔گلگت بلتستان کے چھ اضلاع میں غذائی قلت پائی جاتی ہے۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ سندھ کے اضلاع میں غذا کی فراہمی کا پیمانہ قدرے متوازی ہے۔ یہاں 7 اضلاع میں شدید غذائی قلت جبکہ 9 اضلاع میں غذائی صورتحال بہتر ہے اور 9 اضلاع فاضل غذا والے علاقے ہیں۔ فاٹا اور گلگت بلتستان کے سب سے زیادہ اضلاع میں غذائی قلت ہے۔ اس صورتحال کی وجہ غربت، بدانتظامی، غیر مساوی تقسیم، موسمی تبدیلی، زرعی پیداوار پر کم توجہ، شہری ترقی، بڑھتی ہوئی آبادی، افراط زر، قحط اور سیلابوں سے آنے والی قدرتی آفات کے باعث ہونے والی آبادی کی منتقلی ہے۔

وفاقی حکومت نے 2014ء میں نیشنل فوڈ سکیورٹی کمیشن (NFSC) قائم کیا جو طویل مدتی زرعی ترقی اور غذائی تحفظ کی بہتری کی قومی پالیسی تیار کرنے کی جانب ایک قدم ہے۔ وزیراعظم پاکستان اس کمیشن کے سربراہ ہیں۔ تاہم شیر خوار بچوں کی غذائیت کے حوالے سے 2013ء میں قائم کئے جانے والے بورڈ میں سدھار نہ آسکا جو ماں کا دودھ پلانے کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس قانون کو 2014ء میں بھی نافذ کرنے میں یہ بورڈ ناکام ہوگیا۔

اس سلسلے میں ناقص اور کم غذا پر قابو پانے کے لیے وفاقی حکومت کا ایک اور قدم اٹھایا۔ جس کا مقصد بچوں اور خواتین کی صحت کو بہتر بنانے میں مدد مہیا کرنا تھا۔ نیشنل ہیلتھ سروسز، ریگولیشنز اور کوارڈی نیشن (این ایچ ایس آر سی) کی وزارت نے 2014ء میں صوبوں کے اشتراک سے یہ رہنما اصول مرتب کئے تھے۔

ادویہ کی قیمتوں کا طریقہ کار

پاکستان میں ادویہ کی قیمتوں کا تعین متنازعہ ہے اور تاریخی طور پر یہ وفاقی حکومت کے دائرہ کار میں رہا ہے۔ صحت کا شعبہ صوبوں کو منتقل ہونے کے بعد بھی ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی آف پاکستان (DRAP) قائم کی گئی تاکہ دواؤں کی رجسٹریشن اور قیمتوں کا تعین ہوسکے۔ اتھارٹی 2014ء میں بھی ادویہ کی قیمتوں سے متعلق پالیسی بنانے میں کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

صحت کی وزیر مملکت سائرہ افضل تارڑ نے 2016ء کے وسط تک ادویہ کی قیمتوں کی پالیسی تیار کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان کے مطابق ادویہ کی قیمتوں کے تعین کا نظام افراط زر (CPI) سے جڑا ہوگا۔ مہنگائی میں کمی بیشی سے خود بخود قیمتوں میں اتار چڑھاؤ آئے گا۔ کچھ دوا سازوں نے 2013ء میں عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرلیا جس کی وجہ سے بازار میں کچھ دواؤں کی قیمتیں نسبتاً زیادہ ہیں۔ ادویہ ساز اداروں کے مالکوں کا کہنا ہے کہ انہیں مساوی طور پر قیمتیں بڑھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مالکان کے مطابق صرف مخصوص ادویات کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا اور وہ بھی اس عذر پر کہ مینوفیکچررز مالی مشکلات کے باعث کچھ دوائیں تیار نہیں کرسکتے۔

کچھ ادویات کی قیمتیں بازار کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہیں

بین الاقوامی اور مقامی ادویہ ساز کمپنیاں دواؤں کی قیمتیں بڑھانے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ بکنے والے برانڈ میں سے 61 فیصد کی قیمتیں بھارت اور بنگلہ دیش کی نسبت پاکستان میں بہت کم ہیں۔ان کے مطابق حکومت نے کیمیائی مرکب کی بنیادی اکائی کی 318 اقسام کی قیمت بڑھانے سے انکار کر دیا جن سے سینکڑوں دوائیاں بنائی جاتی ہیں۔ مالکان کا کہنا تھا کہ حکومت ان پر کچھ دوائیں 30 فیصد تک سستی کرنے کے لئے دباؤ ڈال رہی ہے۔

دوا ساز کمپنیوں کا مطالبہ ہے کہ عالمی ادارہ صحت (WHO) کا تجویز کردہ قیمتوں کے تعین کا نظام نافذ کیا جائے جسے ریفرنس پرائس میکنزم کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ کار دوائیوں کی قیمتوں کو پڑوسی ممالک میں انہی دواؤں کی اوسط قیمت سے منسلک کرتا ہے۔ فی الوقت دواؤں کی قیمتیں لاگت میں اضافے کے نظام کی روشنی میں متعین کی جاتی ہیں۔اس نظام کے مطابق ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی ادویہ ساز اداروں کے اخراجات کا تعین کر کے قیمتوں کا تقرر کرتی ہے۔اور قیمتوں کا یہ تعین ہر دوا پر الگ الگ کیا جاتا ہے۔

غیر محفوظ انتقال خون

قومی میڈیا نے جب خون میں چند ہیموگلوبن میں ایچ آئی وی۔ پازیٹو (ایڈز کے پائے جانے کی خبر نشر کی تو پوری دنیا میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خبر پاکستان میں تھیلیسیمیا کے مریضوں پر کام کرنے والی انجمنوں کے کنسورشیم کی طرف سے جاری کئے جانے والے ایک بیان پر مبنی تھی۔ اس بیان میں کہا گیا کہ ایڈز کے مریضوں کا عطیہ کردہ گندہ خون تھیلیسیمیا کے مریض بچوں کو لگا دیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں خطرہ تھا کہ ملک میں

انتقال خون کے محتاج تھیلسیمیا کے مریضوں کی 80 فیصد تک تعداد کو ہیپا ٹائٹس بی اور سی کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ محکمہ صحت نے اسے نا قابل اعتبار بیان قرار دیا کیونکہ متاثرہ بچوں کے بارے میں بتایا نہیں گیا کہ وہ کون تھے۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے دوران انتقال خون کے طریقہ کار میں موجود نقائص کا انکشاف ہوا۔

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (PIMS) کے ایک ڈاکٹر کے مطابق ہسپتال کے تھیلسیمیا سنٹر میں رجسٹرڈ 1250 مریضوں میں سے صرف ایک مریض میں ایڈز کے جراثیم پائے گئے۔ متاثرہ لڑکی راولپنڈی کی رہائشی ہے۔ اس کے خون میں ایڈز کے جراثیم اس وقت داخل ہوئے جب راولپنڈی کے ایک بلڈ بنک سے ملنے والا خون اس کے جسم میں منتقل ہو گیا۔ اس خون میں ایڈز کے جراثیم تھے۔

پاکستان میں انتقال خون کی سہولیات نہ تو منظّم ہیں نہ ہی باضابطہ اور مربوط۔ خون اور دوسری متعلقہ اشیاء کو دور دراز مختلف بلڈ بنکوں میں حاصل کر کے محفوظ کیا جاتا ہے۔ یہ بلڈ بنک سرکاری اور نجی طور کام کرنے والے بلڈ بنکوں سے خون حاصل کرتے ہیں۔ خون کے معیار کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان بنکوں میں کوالٹی کنٹرول کا کوئی نظام موجود نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مریض کی دیکھ بھال کے معیارات کا ذرہ برابر خیال نہیں رکھا جاتا۔ محفوظ خون کے حصول کا تقاضہ ہے کہ وہ صحت مند رضا کاروں سے حاصل کیا جائے، خون کا مناسب طریقے سے ذخیرہ یقینی بنایا جائے، عطیہ شدہ خون کی پڑتال کی جائے تا کہ یقین دہانی ہو جائے کہ یہ قابل انتقال امراض سے محفوظ ہے۔ خون کی جزئیات تیار کی جائیں تا کہ اس کے غیر ضروری طبی استعمال سے بچا جا سکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے حکومت پاکستان نے انتقال خون کی خدمات کے اجرا کا منصوبہ بنایا تا کہ عام حالات اور ہنگامی صورت حال میں خون کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ انتقال خون کی خدمات کے لیے G12 کے تعاون سے بنائی جانے والی قومی پالیسی اور حکمت عملی کا 2014ء سے 2020ء تک کا فریم ورک کی تیاری وزارت صحت کا اس جانب اٹھایا جائے والا ایک مثبت قدم ہے۔

محفوظ انتقال خون پروگرام (SBTP) کے مطابق پاکستان کو انتقال خون کے لئے خون کی شدید کمی کا سامنا ہے۔ عطیات کے ذریعے جمع کئے جانے والے خون کا تیس فیصد تھیلسیمیا کے مریضوں پر صرف کیا جاتا ہے۔ متاثرہ خون کے انتقال سے ان کے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ یہ خطرات بہت زیادہ ہیں کیونکہ ملک بھر کے بلڈ بنک بغیر مناسب پڑتال کے خون فروخت کر رہے ہیں۔

تولیدی صحت

تولیدی صحت کے حق کا مطلب یہ ہے کہ لوگ محفوظ اور اطمینان بخش جنسی زندگی کے قابل ہوں، تولید کی صلاحیت رکھتے ہوں اور انہیں آزادی ہو کہ کب اور کتنی بار تولیدی صلاحیت کا استعمال کرنا ہے۔

غیر محفوظ انتقال خون کی وجہ سے تھیلیسیمیا کے مریضوں کو ایڈز لاحق ہونے کا خطرہ ہے

پاکستان میں قومی تولیدی صحت کا پروگرام موجود ہے جو مرد و خواتین کو خاندانی منصوبہ بندی کی سہولت مہیا کرتا ہے۔ ماں کی صحت کا تحفظ، شیر خوار بچوں کی صحت، بانجھ پن کا علاج اور بالغوں میں تولیدی صحت سے متعلق امراض کے علاج کی سہولیات کی فراہمی ممکن بناتا ہے۔

اگرچہ عوام کو جنسی اور تولیدی صحت کے حقوق (ایس آر ایچ آر) کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے کئی کوششیں کی جارہی ہیں مگر تعلیم کی کمی، مذہبی اور سیاسی قدامت پسندی، خواتین کے پاس فیصلے کا اختیار نہ ہونا، لوگوں کی ہجرت، قدرتی آفات؛ تضادات اور بے دخلیوں کے خلاف عدم مدافعت کی وجہ سے ان کوششوں کے نتائج حوصلہ افزاء نہیں نکلے۔

ملک میں آبادی کی نصف تعداد ہونے کے باوجود پاکستان میں خواتین کو آج بھی اچھی صحت اور تعلیم کے حصول کے لیے جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ پاکستان میں آدھی سے زیادہ خواتین اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے بیاہ دی جاتی ہیں۔ زچگیکی پیچیدگیوں کے باعث ایک لاکھ میں سے 276 کی اموات ہو جاتی ہیں۔ بلند شرح اموات کی وجہ کم عمری کی شادیاں ہیں مانع حمل اشیاء کے استعمال کی شرح کئی سالوں سے 35 فیصد پر اٹکی ہوئی ہے۔

حاملہ خواتین کا حمل کے ابتدائی دور میں علاج کے دوران پتہ چلے کہ اسقاط ضروری ہے تو پھر تعزیرات پاکستان کے تحت اسقاط حمل کی قانوناً اجازت ہوتی ہے۔ ماضی میں تعزیرات پاکستان میں صرف وضع حمل کے وقت زچہ کی جان بچانے کے لیے اسقاط کی اجازت تھی۔تعزیرات کی ترمیمی دفعہ 338 کے مطابق حاملہ عورت کے بچے جس کے اعضاء مکمل نہ ہوئے ہوں اس کا ماں کی زندگی بچانے یا طبی علاج کی غرض سے اسقاط قانونی قرار دیا جائے گا۔

عورتوں کی حیثیت بارے میں قائم قومی کمیشن (این سی ایس ڈبلیو) نے تولیدی حفظان صحت اور حقوق بل 2014ء کا مسودہ دوبارہ تحریر کیا ہے جسے پارلیمنٹ سے منظوری کے لئے ہیلتھ سروسز، ریگولیشن اینڈ کوارڈی نیشن کی وزارت کے پاس جمع کرادیا ہے۔ پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد توقع ہے یہ قانون طویل مدت تک شہریوں کو تولیدی صحت اور حقوق کی فراہمی یقینی طور پر دوررس نتائج کی حامل ہوگی۔

سرکاری شعبے کے ترقیاتی پروگرام برائے بہبود آبادی کے لیے مختص رقوم میں خطیر اضافہ کیا گیا ہے۔حکومت کا ارادہ ہے کہ سی پی آر کی موجودہ شرح 35 فیصد سے بڑھا کر 2020ء میں 55 فیصد کردی جائے۔اس وقت ملک بھر میں 14,000 مراکز صحت کے ساتھ ساتھ 4500 مراکز خاندانی منصوبہ بندی کی سہولیات فراہم کررہے ہیں۔ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مراکز کی یہ تعداد کم ہے۔

ذہنی صحت

گزشتہ کچھ سالوں سے جنوبی ایشیا خصوصاً پاکستان میں سماجی اقتصادی تبدیلیوں کی وجہ سے نفسیاتی یا رویہ جاتی خرابیوں کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے علاوہ دہشت گردی کے واقعات کے سبب خوف اور عدم تحفظ کے احساس نے لوگوں کے اذہان کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ اس سے ان کی ذہنی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ایک تخمینے کے مطابق ملک کی پندرہ فیصد آبادی ہلکے پیمانے سے لے کر درمیانے درجے کے ذہنی عوارض میں مبتلا ہے اور ان امراض سے متاثرہ افراد کی زیادہ تعداد خواتین پر مشتمل ہے۔ذہنی صحت کے ماہرین کی کمی کی وجہ سے صورتحال خراب تر ہوئی ہے۔ پاکستان میں ذہنی امراض میں مبتلا 10,000 مریضوں کے لیے ایک معالج دستیاب ہے جبکہ ذہنی امراض کے چالیس لاکھ بچوں کے لیے صرف ایک ماہر موجود ہے۔

ذہنی امراض میں اضافہ ہوا ہے

پاکستان ایسوسی ایشن فار مینٹل ہیلتھ کے مطابق پاکستان میں ذہنی امراض کے 750 تربیت یافتہ معالج موجود ہیں جبکہ ہسپتالوں میں تیس ہزار بستروں کی گنجائش ہے اور مریضوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں زیادہ تر ذہنی امراض کا پتہ نہیں چلتا اور ان امراض میں مبتلا لوگوں کو عطائیوں، مزاروں، متبرک بزرگوں، نام نہاد روحانی معالجوں اور کالے علم کے عاملوں کے پاس جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ فاترالعقل افراد کی حرکات کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ روحوں کے زیر اثر ہیں۔

پاکستان میں ذہنی امراض کے مریضوں کے لیے قانونی تحفظ کا فقدان ہے۔ سندھ حکومت نے ذہنی صحت کے بارے میں قانون سازی میں کافی پیش رفت کی ہے۔ صوبائی اسمبلی نے ستمبر 2013ء میں 1912ء کے Lunacy Act کو ہٹا کر اس کی جگہ سندھ مینٹل ہیلتھ ایکٹ 2013ء کی منظوری دی۔ تاہم سندھ کے محکمہ قانون نے ابھی اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے قوانین وضوابط وضع کرنے ہیں۔ بقیہ تین صوبوں نے ابھی اس طرح کی قانون سازی روشناس نہیں کرائی۔

سندھ کے مینٹل ہیلتھ ایکٹ 2013ء کے مطابق اگر کوئی شخص کسی ذہنی مریض کے ساتھ کسی بھی قسم

کا غیر انسانی سلوک کرے جس میں سر پھوڑنا، جسم داغنا، کھولتا پانی ڈالنا، مار پیٹ کرنا، آسیب نکالنا یا زنجیر پہنا کر درخت وغیرہ سے باندھنا جیسے غیر انسانی سلوک کرے۔ ذہنی طور پر مفلوج بچے کا سر چھوٹا کرنے کے لیے ظالمانہ اقدام کرے، یا ایسے فرد یا بچے کو جذباتی سطح پر تکلیف پہنچائے یا اس کے ساتھ جنسی درندگی کا عمل کرے، تو وہ قابل سزا جرم کا مرتکب ٹھہرے گا جس پر اسے پانچ سال تک قید اور پچاس ہزار روپے جرمانے کی سزا ملے گی۔

پشاور میں آرمی پبلک سکول پر دہشت گرد حملے کے بعد حکومت نے قدرتی آفات، حادثات اور دہشت گرد حملوں کے شکار ہونے والوں کے لیے نفسیاتی ٹراما سنٹر قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ وزیر اعظم کی سربراہی میں قائم ہونے والی نیشنل سائیکو۔سوشل ایڈوائزری کونسل نے کیا۔

پیشہ وارانہ تحفظ اور صحت

پاکستان کی زرعی اور صنعتی افرادی قوت تمام قسموں کی بیماریوں میں گھری ہوئی ہے۔ محنت کشوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی اور اس کے طریقہ کار کے باعث صحت کے جن خطرات سے واسطہ پڑتا ہے ان سے تحفظ میسر نہیں۔ اگر آجر صحت اور سلامتی کے قوانین کی پاسداری کریں تو محنت کشوں کو صحت کی مطلوب سہولیات کا بوجھ کم ہوسکتا ہے۔ محنت کے صوبائی محکموں کی طرف سے باقاعدہ معائنہ کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے مگر بدقسمتی سے وہ محض خانہ پُری کے لیے معائنہ کرتے ہیں۔ ملک بھر میں مزدوروں کو تپ دق،

مزدوروں کو ٹی بی، پھیپھڑوں کے امراض، جوڑوں اور کمر کا درد، حادثاتی چوٹوں، جلنے، بینائی سے محرومی جیسے خطرات کا سامنا رہتا ہے

پھیپھڑوں کے عوارض، جوڑوں اور کمر درد، زخموں، جلنے اور بینائی کھودینے جیسے خطرات درپیش رہتے ہیں۔

پاکستان نے عالمی ادارہ صحت کے 189 میں سے 36 میثاقوں پر دستخط کئے ہیں۔ پاکستان کے ان منظور شدہ عالمی ادارہ صحت کے 36 میثاقوں میں سے جس ایک (C-45) میثاق پر دستخط کئے ہیں وہ پیشہ وارانہ تحفظ اور صحت سے متعلق ہے اور وہ بھی بالواسطہ طور پر۔ بدقسمتی سے پاکستان نے زیادہ اہم او ایس ایچ میثاقوں C-155, C-161 اور C-187۔ پر ابھی دستخط نہیں کئے۔

2012ء میں کراچی کی بلدیہ فیکٹری کی آتشزدگی کے بعد عالمی ادارہ صحت آئی ایل او نے کام کرنے کی جگہ پر تحفظ اور صحت بارے مشترکہ حکمت عملی مرتب کرنے کے لیے حکومت، آجروں اور ورکروں کی حمایت کی۔ پیشہ وارانہ تحفظ اور صحت، محکمہ محنت کی جانب سے معائنہ اور دورانِ کار چوٹ کی زرتلافی اور سماجی تحفظ جیسے تین بڑے شعبوں کے لیے 23 نکات پر مشتمل حکمت عملی پر اکتوبر 2013ء میں دستخط کئے گئے۔

ان 23 میں سے بارہ نکات پر عملدرآمد شروع ہو چکا ہے۔ پیشہ وارانہ تحفظ اور صحت کے لیے تین رکنی صوبائی سٹیئرنگ کمیٹی تشکیل دی جاچکی ہے۔ سندھ میں پہلی او ایس ایچ پالیسی کا مسودہ تیار کر کے کابینہ کی منظوری کے لیے بھجوا دیا گیا ہے۔ ایک خودمختار او ایس ایچ قانون کا مسودہ تیار ہو چکا جو حکومت مزدوروں اور آجروں کے زیر معائنہ ہے۔ متروک پیشہ وارانہ حفاظت اور صحت کے سندھ مرکز کی بحالی کا عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ محکمہ محنت کے معائنہ اور پیشہ وارانہ تحفظ اور صحت کی صورتحال کا تازہ ترین تجزیہ تیاری کے مراحل میں ہے۔

تاہم سمندر پار پاکستانیوں اور انسانی وسائل کی ترقی کی وفاقی وزارت اور دوسرے صوبوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ اس سے مشابہہ نظام اور متفقہ صوبائی لائحہ عمل اختیار کریں۔

پولیو

پاکستان میں پولیو کے خاتمے کی تاریخ کے حوالے سے 306 کیسوں میں سے 179 کیس فاٹا میں، 68 خیبر پختونخوا میں، 25 بلوچستان میں، 4 پنجاب اور 30 سندھ میں سامنے آئے۔ پاکستان میں پائے جانے والے کیس عالمی سطح پر پائے جانے والے 356 کیسوں کا 86 فیصد ہیں۔

ایمرجنسی آپریشن سنٹر کی جانب سے جاری کی گئی رپورٹ کے مطابق یہ طے شدہ امر ہے کہ پولیو کے 90 فیصد کیس ان علاقوں میں پائے گئے جہاں امن وامان کی مخدوش صورتحال اور دہشت گردوں کی ممانعت کے سبب پولیو ویکسین کے قطرے نہیں پلائے جاسکے۔ قومی وصوبائی سطح پر مختصر مدت کی 17 مہمات 2014ء کے دوران چلائی گئیں جن کا ہدف پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کو پولیو ویکسین کے قطرے پلانا تھا۔ بین الاقوامی برادری کا پرزور تقاضہ ہے کہ اس خطرے کے تدارک کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔

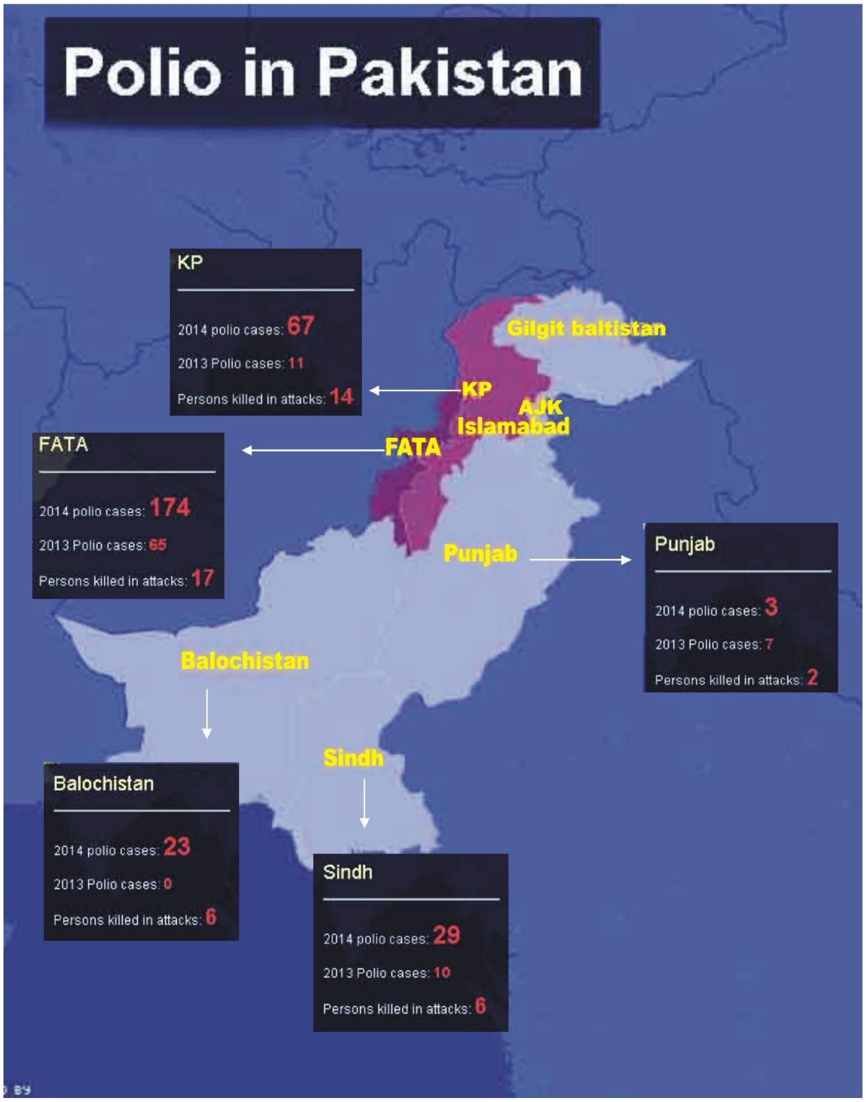

صوبوں میں پولیو کے کیسز

2015	2014	2013	2012	2011	2010	2009	صوبہ
0	4	7	2	9	7	17	پنجاب
1	30	10	4	33	27	12	سندھ
4	68	11	27	23	24	25	کے پی کے
2	179	65	20	59	74	20	فاٹا
0	25	0	4	73	12	11	بلوچستان
0	0	0	1	1		0	گلگت بلتستان
7	**306**	**93**	**58**	**198**	**144**	**89**	کل

سفر کی پابندیاں

بار بار متنبہ کرنے اور ملک سے پولیو کے خاتمے کے لیے مایوس کن کارکردگی پر عالمی ادارہ صحت ڈبلیو ایچ او نے پانچ مئی 2014ء سے پاکستان پر سفر کی پابندیاں عائد کرنے کی تجویز دے دی۔ یکم جون 2014ء سے لاگو ہونے والی ان بندشوں کے مطابق ملک سے باہر جانے سے قبل ہر عمر کے مسافروں کے لئے لازمی ہوگا کہ ان کو پولیو ویکسین کے قطرے پلوائے جائیں اور اس امر کی تصدیق کے لیے انہیں سٹرفکیٹ پیش کرنا ہوگا۔ مطلب یہ کہ بیرون ملک جانے والے مسافر پولیو کے قطرے پیئیں اور محکمہ صحت سے اس حوالے سرٹیفیکیٹ جاری کرائیں۔

روانگی کے لئے جاری کیا جائے والا سٹرفکیٹ ایک سال کے لیے کارآمد ہوگا جو روانگی کے وقت ایئرپورٹ، بین الاقوامی بارڈر اور بندرگاہ وغیرہ دکھایا جائے گا۔ جو مسافر روانگی کے وقت سٹرفکیٹ پیش نہ کرسکیں گے۔ ان کے لیے ان جگہوں پر پولیو ویکسین پلانے کے لیے ہنگامی بوتھ بنائے گئے ہیں۔

حال ہی میں کچھ ممالک نے فیصلہ کیا ہے کہ ویزہ کے خواہشمند پاکستانی درخواست کے ساتھ پولیو ویکسین پلائے جانے کا سٹرفکیٹ بھی پیش کریں جس کی ایک مثال بھارتی ویزہ کے حصول کا طریقہ ہے۔

پولیو رضا کاروں کی ہلاکتیں

پاکستان میں پولیو رضا کاروں پر پُرتشدد حملوں اور پولیو ورکروں کی ہلاکتوں سے پولیو ویکسین کی مہمات پر برے اثرات مرتب ہوئے۔ پولیو رضا کاروں پر الزام لگایا گیا کہ وہ سی آئی اے کے لیے جاسوسی اور اسلام مخالف قوتوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے واقعات فاٹا، خیبر پختونخوا اور کراچی میں رونما ہوتے ہیں تاہم اس سال بلوچستان اور پنجاب میں بھی پولیو ورکر قتل ہوئے۔ حکومتی اعدادوشمار سے پتہ چلتا ہے کہ 2014ء کے دوران پولیو ویکسین پلانے والی ٹیموں کے ممبران اور سہولت کاروں سمیت 45 افراد ہلاک ہوئے۔ سال کا سب سے زیادہ جان لیوا حملہ خیبر ایجنسی میں یکم مارچ 2014ء کو کیا گیا جب سڑک کنارے نصب بم پھٹنے سے پولیو ویکسین ٹیم کے گیارہ ممبران جاں بحق ہوگئے۔ عسکریت پسندوں نے ملک بھر میں پولیو ورکروں کی حفاظت پر مامور کئی سکیورٹی والوں کو بھی قتل کیا جو شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے اور انہیں مفلوج کرنے والی بیماریوں سے بچانے میں ریاست کی ناکامی کا ثبوت ہے۔

ملیریا

ملیریا ملک کی دوسری سب سے عام اور تباہ کن متعدی وباء ہے جو پاکستان میں سب سے زیادہ

علالت کا باعث ہے۔ ملک میں اس مرض کا نوے فیصد سے زیادہ بوجھ ملیریا زدہ 56 اضلاع پر ہے جن میں سے زیادہ تر بلوچستان میں واقع ہیں یعنی 29 میں سے سترہ اضلاع، فاٹا کی سات ایجنسیاں، سندھ کے بارہ اضلاع اور خیبر پختونخوا کے بارہ اضلاع۔

ایڈز

ایڈز کا پھیلاؤ ایک فیصد سے بھی کم تصور کیا جاتا ہے۔ ایڈز کنٹرول پروگرام کی توجہ (BCC) (Behavior Change Communication) پر مرکوز ہے۔ بی سی سی آبادی کے سب سے زیادہ متاثرہ لوگوں کو جنسی طور پر بیماری کی منتقلی کا علاج کرنے، محفوظ خون کی فراہمی اور متاثرین میں صحت یابی کی صلاحیت بڑھانے کی خدمات انجام دیتا ہے۔ ملک بھر میں خون کی سکریننگ کی سہولیات بڑھانے پر زور دیا جائے گا۔

نیشنل ایڈز کنٹرول پروگرام (NACP) کے مطابق حکومت کے پاس ایڈز کے رجسٹرڈ شدہ مریضوں کی تعداد 86000 ہے۔ ایڈز کے کیس وفاقی اور صوبائی سطح پر نیشنل ایڈز پروگرام کو رپورٹ کئے جاتے ہیں۔ این اے سی پی کی فنی کفالت اقوام متحدہ کی ایجنسیاں اور گلوبل فنڈ برائے ایڈز، ٹی بی و ملیریا کرتے ہیں۔

ہیپا ٹائٹس سی

دنیا بھر میں تقریباً پندرہ لاکھ افراد وائرل ہیپا ٹائٹس کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ پاکستان میں ہیپا ٹائٹس بی اور سی سے متاثرہ لوگوں کی تعداد اندازاً ایک کروڑ 80 لاکھ افراد ہیں اور اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ آغا خان یونیورسٹی ہسپتال کے مطابق سالانہ ڈھائی لاکھ ہیپا ٹائٹس متاثرین کا اضافہ ہورہا ہے۔ بیماری میں دوبارہ مبتلا ہونے والے اور علاج سے محروم افراد کا بگڑ کر جگر کے کینسر میں بدلنے کا احتمال ہوتا ہے۔ نتیجتاً پاکستان میں جگر کا کینسر تیزی سے پھیل رہا ہے۔

وزیراعظم پروگرام برائے ہیپا ٹائٹس روک تھام کا ہدف 2015ء تک ہیپا ٹائٹس بی اور سی کے کیسوں کی تعداد نصف تک کم کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آگاہی اور تبادلہ خیال سے عادات اور اطوار میں تبدیلی لانا مقصود تھا۔ ہیپا ٹائٹس کے زیادہ تر متاثرہ افراد کو ویکسین دی جائے گی۔ 150 ٹیچنگ اور ضلع ہیڈکوارٹر ہسپتالوں میں خون کی سکریننگ، تشخیص اور علاج کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی اور ہیپا ٹائٹس اے اور ای کی روک تھام کے لیے انتقال خون کے عمل کو محفوظ بنایا جائے گا۔

ملک میں ہیپا ٹائٹس کے واقعات کو کم کرنے کے لیے چاروں صوبوں میں G12 اور KWF کے

تعاون سے محفوظ انتقال خون کے پراجیکٹ کا نفاذ کیا جائے گا۔

ڈینگی

ڈینگی گزشتہ کئی سال سے پاکستان میں لوگوں کی صحت کے لئے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ مرض ایک مچھر کے کاٹنے سے لاحق ہوتا ہے لیکن ایک فرد سے دوسرے اشخاص کو منتقل نہیں ہوتا۔ یہ وباء ہر سال پھیلتی ہے اور پاکستان کے کئی شہروں تک پھیل چکی ہے۔

سندھ کے وزیر صحت کے مطابق 2014ء کے دوران سندھ میں بارہ اموات واقع ہوئیں وہ بھی گیارہ اموات کراچی میں اور ایک ڈینگی مریض حیدرآباد میں انتقال کر گیا۔ تاہم سندھ میں ڈینگی روک تھام پروگرام کے نمائندہ کے مطابق 2014ء کے دوران سندھ میں 15 اموات ہوئیں جو سب کی سب کراچی میں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ 1286 ڈینگی مریضوں کی سندھ کے مختلف سرکاری اور نجی ہسپتالوں میں تشخیص ہوئی۔ بقیہ سندھ میں رونما ہونے والے 36 مریضوں کے علاوہ سب کیس کراچی میں رپورٹ کئے گئے۔ 2013ء میں سندھ بھر میں 5750 ڈینگی کے کیس رپورٹ ہوئے جن میں سے 5058 کیسوں کا سراغ کراچی میں لگایا گیا۔ سندھ میں 2013ء کے دوران ڈینگی سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد 32 تھی۔

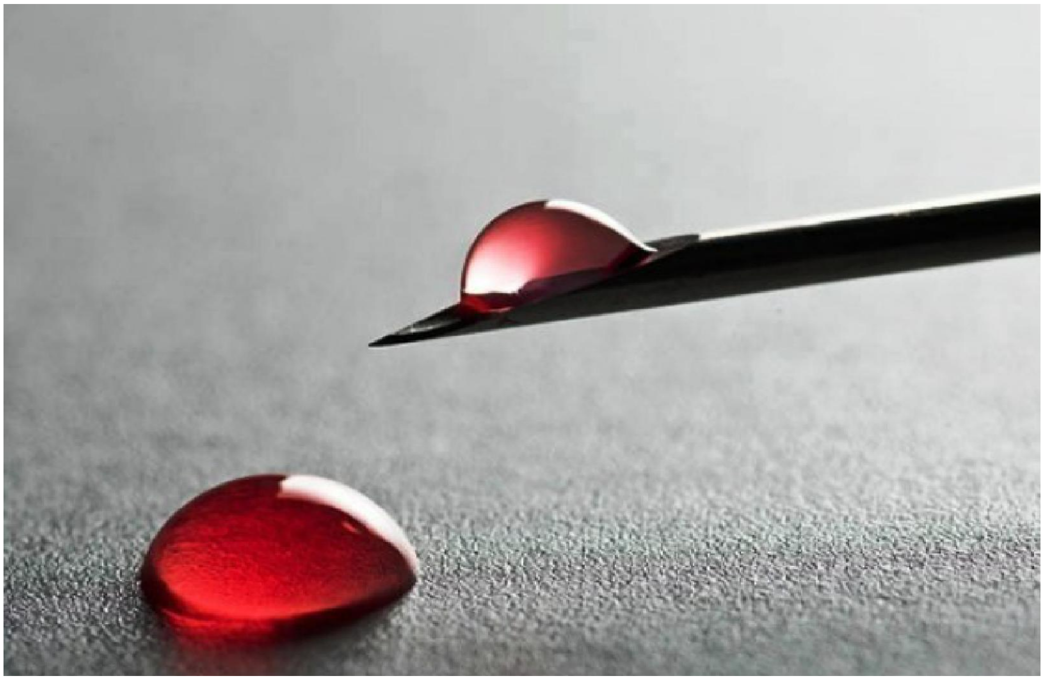

سالانہ ڈھائی لاکھ نئے مریض ہیپاٹائٹس سے متاثر ہوتے ہیں

پاکستان میں ڈینگی بخار عوامی صحت کے لیے بڑا خطرہ بن گیا ہے

پنجاب بھر میں ڈینگی کے مریضوں کی تعداد میں نمایاں کمی محسوس کی گئی۔ پنجاب میں راولپنڈی سب سے متاثرہ شہر تھا جہاں 2014ء میں 1460 مریضوں میں ڈینگی کی تشخیص کی گئی جہاں ڈینگی سے ایک خاتون انتقال کر گئی۔ پنجاب کے مشیر صحت نے کہا کہ حکومت کی کوشش سے ڈینگی کو وبائی صورت اختیار کرنے سے روک دیا گیا اور سال بھر میں لاہور میں صرف 92 ڈینگی کیس دریافت ہوئے۔ شیخوپورہ میں 32 لوگوں میں ڈینگی کے اثرات پائے گئے۔

خیبر پختونخوا کے ضلع سوات میں 2013ء کے مقابلے میں ڈینگی کیسوں میں 92 فیصد کمی دیکھی گئی۔ ضلع سوات کے محکمہ صحت کے مطابق اس سال ڈینگی کے 306 کیس منظر عام پر آئے جن میں کسی کے مرنے کی کوئی اطلاع نہیں۔ یہ 2013ء کے 9000 افراد کے ڈینگی میں مبتلا ہونے اور 30 اموات کے مقابلے میں تیز ترین کمی تھی۔ خیبر پختونخوا کے محکمہ صحت کے اعداد و شمار کے مطابق 2013ء کے دوران صوبے میں 11600 افراد ڈینگی بخار سے متاثرہ پائے گئے تھے۔

متاثرہ علاقوں میں کھڑے پانی سے صحت کے کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ڈینگی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ حکومت کی توجہ صحت و صفائی، حفظان صحت اور مچھروں کی افزائش کی جگہیں تلف کرنے کے لیے عام لوگوں کو آگاہی دینے پر مرکوز ہے۔ ڈینگی بخار کے خاتمے کی حکومتی مہم کی ناکامی کی ایک وجہ غیر معیاری مچھر مار سپرے اور کیمیکلز ہیں۔ بہت سے علاقوں میں مچھر مار دھونی بھی نہیں دی گئی۔

ٹی بی کنٹرول پروگرام

انڈیا، چین، ساؤتھ افریقہ اور انڈونیشیا کے بعد سب سے زیادہ ٹی بی کے پھیلاؤ والے 22 ملکوں کی صف میں پاکستان پانچویں نمبر پر ہے۔ نئے ٹی بی کیسوں کی تعداد 420,000 ہے جو آبادی کی شرح سے 348 مریض فی لاکھ افراد بنتی ہے۔ ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق گزشتہ برسوں میں ٹی بی میں مبتلا مریضوں کی تعداد پاکستان میں کم ہوئی ہے۔ ٹی بی کا پھیلاؤ جو 1990ء میں 566 مریض فی لاکھ آبادی تھا 2014ء میں کم ہوکر 348 مریض فی لاکھ آبادی رہ گیا ہے۔

پاکستان میں ٹی بی مخالف ویکسین کی کمی کا مسلسل سامنا ہے مگر سنجیدگی سے اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے 2014ء میں اس مسئلے کو اٹھاتے ہوئے شکایت کی کہ اس ویکسین کی نایابی کی وجہ سے لاکھوں بچے ٹی بی سے بچاؤ کے حفاظتی ٹیکوں سے محروم رہ گئے۔

اعضاء کی پیوندکاری

پچھلے کچھ سالوں تک پاکستان غیر قانونی انسانی اعضاء کی تجارت کا گڑھ جانا جاتا تھا۔ حال ہی میں انسانی اعضاء اور خلیات کی پیوندکاری سے متعلق منظور کیے گئے قانون اور اعضاء کی خرید و فروخت کو جرم قرار دینے پر زندہ عطیات کی پیوندکاری میں کمی واقع ہوئی ہے۔ گردے، دل، جگر، پھیپھڑے، لبلبہ اور معدے کی آنت جیسے اعضاء عطیہ کیے جاسکتے ہیں۔ کچھ انسانی ریشے بشمول آنکھ کا عطیہ، جلد، ہڈیاں، ہڈیوں کا گودا وغیرہ بھی عطیہ کیے جاسکتے ہیں۔ انسانی اعضاء کی پیوندکاری کی مجاز اتھارٹی ایچ او ٹی اے بھی ملک سے غیر قانونی اعضاء کی تجارت کے خاتمے کے لیے کوشاں ہے۔

گوکہ اعضاء کی غیر قانونی پیوندکاری کی تعداد میں کمی آئی ہے مگر حکام نے ابھی اس دھندے کو کلی طور پر ختم کرنا ہے۔ رضاکارانہ عطیہ کرنے والوں کی غیر موجودگی میں گردے بیچنے والے ضرورت مندوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے لوگوں کو زندگی میں بعد از مرگ اعضاء کے عطیات کا اعلان کرنے کی اہمیت سے روشناس کرانے کے لیے ملک بھر میں آگاہی کی مہم چلائی گئی ہے۔ محکمہ صحت کے تخمینے کے مطابق ہر سال 50 ہزار لوگ گردے فیل ہونے سے مرجاتے ہیں۔ جگر فیل ہونے سے مرنے والوں کی تعداد دس ہزار اور دل کے فیل ہونے سے مرنے والوں کی تعداد 6 ہزار افراد ہے۔

کراچی میں سندھ انسٹی ٹیوٹ آف یُورالوجی اینڈ ٹرانسپلانٹیشن (SIUT) اور اسلام آباد میں الشفاء ٹرسٹ ہسپتال بڑی کامیابی سے پیوندکاری کر رہے ہیں۔ SIUT نے کئی سالوں سے اعلیٰ ترین پیشہ

1990 میں ہر 100,000 افراد میں سے 566 افراد ٹی بی کے مریض تھے جبکہ 2014 میں یہ تعداد 348 تھی

وارانہ مہارت کے ساتھ بلا امتیاز تمام مریضوں کی بلامعاوضہ پیوند کاری کی۔ پنجاب میں صرف لاہور کے شیخ زیدہسپتال میں پیوندکاری کا مرکز ہے جس نے بھارتی سرجنوں کی مدد سے محدود پیمانے پر جگر کی پیوند کاری کی۔ تاہم حکومت پنجاب پاکستان کڈنی اینڈ لیور ٹرانسپلانٹ انسٹی ٹیوٹ اینڈ ریسرچ سنٹر کے قیام کا منصوبہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ 750 بستروں پر مشتمل ہوگا اور لاہور میں برکی روڈ پر پچاس ایکڑ رقبے پر تعمیر کیا جائے گا۔

اعضاء کی پیوندکاری کے قانون کا نفاذ ایک امتحان ہے اور قانون نافذ کرنے والوں نے کئی بار چھاپے مارے اور اعضاء کی تجارت کرنے والوں کو گرفتار کیا۔ مثال کے طور پر نومبر 2014ء کو فیڈرل انویسٹی گیشن اتھارٹی ایف آئی اے کے اہلکاروں نے کراچی ایئرپورٹ سے دو افراد کو مبینہ طور پر انسانی اعضاء کی تجارت میں ملوث ہونے کے الزام میں حراست میں لے لیا۔ وہ ماریشیئس جانے والی فلائیٹ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک پانچ لاکھ روپے کے عوض اپنا گردہ فروخت کرنے پر آمادہ تھا اور دوسرا اسے ساتھ لے جانے والا۔ اسی مہینے لاہور میں جوڈیشل مجسٹریٹ نے مبینہ طور پر ایک عورت کا گُردہ چرانے کے جرم میں تین مشکوک افراد کو پولیس کی تحویل میں دیا۔ عورت نے شکایت کی تھی کہ ساہیوال کے ایک ہسپتال میں لے جا کر اسے اس کی مرضی کے خلاف ایک گُردے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

خسرہ

خسرہ ایک چھُوتی وباء ہے جو کبھی مہلک بیماری کا روپ دھار کر ان بچوں میں تیزی سے پھیلتی ہے جنہیں حفاظتی ٹیکے نہیں لگے ہوتے۔ پاکستان اور امریکہ سمیت کئی ملکوں میں اس بیماری کا دوبارہ احیاء ہوا ہے۔

پاکستان میں صوبہ سندھ کے پسماندہ علاقوں میں دسمبر 2012ء میں خسرہ کی وباء پھوٹ پڑی۔ اس کے بعد ملک کے دوسرے حصوں بالخصوص پنجاب میں یہ نمایاں ہوئی۔ 2012ء میں خسرہ کے 12,354 کیس سامنے آئے جن میں سے 2975 کی تصدیق ہوگئی۔ 2013ء میں مشتبہ کیسوں کی تعداد تقریباً تین گنا بڑھ گئی۔ 33,314 کیسوں میں سے 8,616 کی تصدیق ہوگئی۔ 2012ء سے 2013ء تک ملک میں 600 بچے خسرہ کی وباء سے فوت ہوگئے۔

2014ء میں زیادہ تر حفاظتی ٹیکوں کی مہمات کی وجہ سے خسرہ کے کیسوں کی تعداد کم ہوگئی۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے مشیر صحت خواجہ سلمان رفیق نے بتایا کہ 2014ء میں خسرہ کے صرف 89 کیس رپورٹ ہوئے۔ اس کی وجہ 2013ء میں حکومت کی طرف سے ڈیڑھ ارب روپے کی لاگت سے خسرہ کے خلاف چلائی جانے والی مہم تھی۔ انہوں نے کہا کہ 2014ء میں رپورٹ کئے جانے والے خسرہ کیسوں میں سے کوئی بھی مہلک نہیں تھا۔ مشیر صحت نے اعلان کیا کہ 2.7 ارب روپے کی لاگت سے اسی طرح کی خسرہ مخالف مہم چلائی جائے گی۔

خسرہ کا کوئی خاص علاج نہیں اور لوگ چند دنوں میں خود بخود تندرست ہو جاتے ہیں۔ تاہم نادار اور غذائی قلت کے شکار بچوں اور لوگوں میں قوت مدافعت کی کمی کی وجہ سے خسرہ خطرناک پیچیدگیوں کا باعث بنتا ہے۔ اس مرض کے سبب اندھاپن، دماغی سوزش، شدید اسہال، کانوں کا متاثر ہونا اور نمونیہ کی تکالیف لاحق ہوسکتی ہیں۔

پاکستان میں قومی سطح پر خسرہ سے بچاؤ کے حفاظتی ٹیکوں کی اضافی سرگرمی شروع کی جارہی ہے۔ ویکسینیشن کی اس مہم کے دوران چھ کروڑ تیس لاکھ بچوں کو جن کی عمریں چھ ماہ سے دس سال ہوں خسرہ کے حفاظتی ٹیکوں کی ویکسین لگائی جائے گی۔ مطلوبہ عمر کے تمام بچوں کو خسرہ کی ویکسین لگائی جائے گی چاہے ان کو پہلے سے ویکسین لگ چکی ہو یا اس بیماری سے محفوظ رہے ہوں۔ وفاقی اور صوبائی سطح کے پروگرام کے تحت خسرہ مخالف مہمات چلائی جائیں گی۔

معذوری

عالمی ادارہ صحت کا کہنا ہے کہ پاکستان کی آبادی کا پندرہ فیصد حصہ PWD (Persons with disabilities) معذور افراد پر مشتمل ہے۔ پاکستانی حکام کے مطابق یہ تعداد کم ہے۔ صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے کیونکہ خاندان میں معذوری کو سماجی بدنامی سمجھ کر چھپایا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے گزشتہ حکومتوں نے معذور افراد کی بحالی کے لئے کوئی ابتدا نہیں کی۔ پاکستان نے

ایک معذور بھکاری اپنے ٹھکانے کی طرف رواں دواں

2011ء میں معذوروں کے حقوق کے میثاق پر دستخط کئے لیکن اس کے لئے لائحہ عمل وضع نہیں کیا۔اس کے علاوہ حکومت نے معذوروں کی تعداد کا تعین کرنے کے لیے قابل فہم اور مستند مردم شماری نہیں کی۔ عالمی ادارہ صحت کی مشاورت سے Pakistan disability Act 2015 مرتب کیا گیا جسے حکومت تو نافذ کرنا چاہتی ہے مگر اس کے جلد منظور ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔

معذوروں کے بارے میں قانون سازی کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ آسان نہیں کہ ان پر وہ عنایات کی جائیں جن کے وہ مستحق ہیں جب کہ ان کے لئے کوئی قانونی ڈھانچہ بھی موجود نہ ہو۔معذور افراد کو سرکاری اور نجی عمارات کے اندر جانے، سماج کی طرف سے روا امتیازی سلوک کا سامنا کرنے، ملازمتوں میں ان کے لیے کوٹہ مقرر ہونے کے باوجود انہیں ملازمتیں نہ دینے، حکومتی فلاحی سکیموں میں شامل نہ کرنے، سرکاری ٹرانسپورٹ میں مناسب جگہ مقرر نہ کرنے اور وہیل چیئر، مصنوعی اعضاء اور ثقل سماعت کے آلات کی کمی جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سفارشات

1۔ صحت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تمام صوبے صحت کے لئے مختص رقومات میں اضافہ کریں۔حکومت کو بیماری کے علاج کی بجائے اس سے بچاؤ پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے اور صحت مند طرز زندگی اپنانے کے لیے لوگوں کو آگاہی دینی چاہئے۔ ریاست کو یہ امر یقینی بنانا چاہئے کہ اس کے شہریوں کو پینے کا صاف پانی، آلودگی سے پاک تازہ ہوا اور ملاوٹ سے پاک غذا دستیاب ہو۔

تشخیصی سہولیات کو عام کیا جائے تاکہ لوگوں کو بروقت پتہ چل سکے کہ وہ کن امراض میں مبتلا ہیں۔

2۔ صوبوں کو حفظان صحت کے نظام کو مزید بہتر بنانا چاہئے اور لوگوں کو صحت کی سہولیات ان کے گھروں کے قریب ملنی چاہئیں۔ متروک شدہ پرائمری ہیلتھ یونٹ اور بنیادی ہیلتھ یونٹ بحال کئے جائیں اور ان کو مطلوبہ سٹاف اور آلات سے لیس کیا جائے۔ حکومت کو ایسی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت ہے جو اس بات کو یقینی بنائے کہ ڈاکٹروں اور پیرامیڈیکل سٹاف کو ملک کے پسماندہ علاقوں میں کام کرنے پر ذہنی تناؤ نہ ہو۔ سرکاری ہسپتالوں میں ناپید سہولتیں ترجیحی بنیادوں پر سرکاری ہسپتالوں میں فراہم کی جائیں۔

3۔ ادویہ کا موثر قانونی نظام وضع کیا جائے تاکہ صحت کے شعبہ سے بددیانتی اور بے ضابطگی کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔ پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل (PDMC) کو جعلی، غیر رجسٹرڈ اور سمگل شدہ ادویہ کی فروخت کے خلاف ڈٹ جانا چاہئے۔ عطائیوں کا مکمل صفایا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

4۔ عوام کو اعتماد میں لینے اور پولیو ویکسین ٹیموں کو تحفظ دینے سمیت ایسے اقدامات کئے جائیں جن کے ذریعے پاکستان پولیو سے پاک ملک بن جائے۔ خسرہ جیسی دیگر وباؤں سے بچاؤ کے لئے وقتاً فوقتاً حسب معمول اور ہنگامی مہمات چلائی جائیں۔

رہائشی سہولیات

ریاست، جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ہو کر معیار زندگی بہتر کر کے، عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنائے گی۔۔۔

آئین پاکستان [آرٹیکل نمبر- 38 (a)]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی کا حق رکھتا ہے۔ جو اس کے خاندان کی صحت اور فلاح اور بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔۔۔ جس میں رہائش کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل نمبر-25(1)]

موجودہ میثاق کی توثیق کرنے والے تمام رکن ممالک ہر شہری کے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے معقول معیار زندگی......بشمول مناسب خوراک، لباس اور ہاؤسنگ کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حالات زندگی میں مسلسل بہتری لانے کے اس کے حق کو بھی تسلیم کرتے ہیں......

معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی [میثاق آرٹیکل (1) 11]

پاکستان میں 2014 کے دوران متعدد عوامل رہائشی سہولیات پر اثر انداز ہوئے۔ شمالی وزیرستان میں طالبان اور بیرونی جنگجوؤں کے خلاف جون 2014 میں فوجی آپریشن ضرب عضب شروع ہوا جو 2015 تک جاری تھا۔ آپریشن کے باعث دس لاکھ سے زائد افراد اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے۔ اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد یا آئی ڈی پیز جنہیں حکومت نے عارضی طور پر بے دخل افراد یا آئی ڈی پیز کو صوبہ خیبر پختونخوا میں بنوں جیسے شہروں کے نزدیک قائم کیے گئے خیموں میں عارضی طور پر ٹھہرایا گیا تھا مگر اُن میں سے بیشتر نے حکومت کے قائم کردہ خیموں میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اگست اور ستمبر کے دوران سیلاب نے پنجاب میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو اُن کے گھروں سے بے دخل کیا۔ عمارتوں کو آگ لگنے کے خطرات، عمارتوں کا گرنا، اراضی پر غیر قانونی قبضے، رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں بے قابو اضافہ، شہروں کے مضافات میں غیر قانونی تعمیرات، کچی آبادی کے مکینوں کے مسائل پر

سیلاب نے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو بے گھر اور بیروزگار کیا

غیر مؤثر توجہ، قبرستانوں پر غیر قانونی قبضہ اور رہائش گاہ کے لیے قرضے کے حصول کے محدود مواقع وہ مسائل تھے جو سال کے دوران شدت اختیار کر گئے تھے۔

شہری آبادی (حتیٰ کہ دیہاتی آبادی کو بھی) کے مختلف طبقوں کو رہائشی سہولیات کے بہت محدود مواقع میسر تھے اور ملک بھر میں کچی آبادیوں اور شہروں کے مضافات میں جھونپڑیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس کا واضح ثبوت ہے۔ گھروں کی از سر نو مرمت، گھر بدلی اور تعمیر کے مطالبات ملک بھر کے شہری علاقوں میں نمایاں تھے۔

قانونی و ادارہ جاتی سیاق وسباق

آئینی لحاظ سے اقامت کاری بشمول منصوبہ بندی، تعمیر سازی اور ریگولیشن صوبائی شعبہ ہے۔ رہائشی سہولیات کے حوالے سے مقامی حکومت اور متعلقہ اداروں کا سیاق وسباق مستقل تبدیلی کی حالت میں ہے۔ سندھ میں مقامی حکومت کے ایک نئے قانون نے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف کے انتقال اختیارات کے منصوبے کی قانونی عمارت کی جگہ لی ہے۔ مگر چند اہم اداروں کو بحال نہیں کیا گیا جن میں کراچی ڈویلپمنٹ

اتھارٹی بھی شامل ہے جسے 2001 میں سابق سٹی ضلعی حکومت کراچی (سی ڈی جی کے) کو منتقل کیا گیا تھا۔ پنجاب میں صوبائی حکومت نے کمشنری نظام بحال کر دیا تھا لیکن لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی جیسے ترقیاتی ادارے بھی متجاوز اختیارات اور ذمہ داریوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی انتظامیہ نے مخلوط قسم کا مقامی نظم ونسق بحال کیا۔ بلوچستان کے سوا کسی صوبے نے مقامی حکومت کے انتخابات منعقد نہیں کروائے اور حکومتوں کے تعینات کردہ ایڈمنسٹریٹرز ہی مینونسپلٹیوں اور ترقیاتی اداروں کی باگ دوڑ سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ اس اتفاق رائے کے باوجود کیا جا رہا تھا کہ منتخب شدہ جمہوری اور اہل مقامی حکومتیں ہی رہائشی سہولیات کے مسائل سے اچھے طریقے سے نبٹ سکتی ہیں۔

معاشرتی

پاکستان میں شہر کاری کا عمل انتہائی تیزی سے ہو رہا ہے۔ شہری آبادی 1998 کی مردم شماری میں چار کروڑ 30 لاکھ تھی (کل آبادی کا 32 فیصد) تھی جو کہ ایک معقول اندازے کے مطابق اب ساڑھے چھ کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔ (نیچے دیا گیا جدول ملاحظہ کریں)۔ ایک اندازے کے مطابق 2030 تک 49.8 فیصد آبادی شہروں میں رہائش اختیار کر لیں گے۔ 17 شہروں میں فی کس دس لاکھ افراد کی آبادکاری کا قیاس کیا جا رہا ہے۔ چونکہ 1998 سے مردم شماری نہیں ہوئی اس لیے اندازوں اور منصوبہ بندی کے لیے بالکل درست اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں اور چونکہ زیادہ تر شہری آبادی کا تعلق نچلے اور نچلے، درمیانے طبقے سے ہے لہٰذا رہائشی سہولیات تک رسائی ایک بنیادی مسئلہ رہے گا۔

شہری علاقوں میں بدلتے سماجی عوامل رہائشی سہولیات کی ضروریات میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ شہروں میں مشترکہ خاندانی نظام منتشر ہو رہا ہے اور علیحدہ علیحدہ رہنے والے خاندان تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ کراچی جیسے بڑے شہروں اور قصبوں میں رہائشی سہولیات خصوصاً اپارٹمنٹس کے مطالبات میں اضافے کا مشاہدہ 1998 کی مردم شماری میں بھی کیا گیا تھا اور 2014 میں بھی ان مطالبات میں اضافے کا رجحان جاری تھا۔ موجودہ مکانات میں ہی ضرورت سے زائد افراد کا ٹھونسنا واحد حل رہ جاتا ہے جو کہ سماجی لحاظ سے ناقابل عمل حل ہے۔ بے گھر افراد سڑکوں کو اپنی عارضی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اکثر اوقات خطرناک حادثات کا نشانہ بنتے ہیں۔ 11 اکتوبر کو ایک بے گھر خاندان کے افراد ایم اے جناح روڈ کراچی پر واقع اسکول کے سامنے اپنے عارضی خیمے میں سوئے ہوئے تھے کہ ایک تیز رفتار گاڑی اُن کے اوپر سے گزر گئی۔ دو بچے فرید اور سجاد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

2014 میں اندازاً پاکستانی شہری آبادی

عوامل	پاکستان	خیبر پختونخواہ (بشمول فاٹا)	پنجاب	سندھ	بلوچستان	اسلام آباد
1998 کی مردم شماری کے مطابق آبادی	132,352,000	20,920,000	73,621,000	30,440,000	6,566,000	805,000
شہری آبادی، (1998 کی مردم شماری کے مطابق)	43,038,111	3,079,165	23,021,287	14,839,500	1,569,274	528,885
کل آبادی (اعداد و شمار کے بیورو کے اندازے کے مطابق)	202,386,661	32,179,755	111,704,255	47,351,414	9,701,548	1,809,314
شہری آبادی (اعداد و شمار کے بیورو کے اندازے کے مطابق)	65,775,665	4,800,485	34,963,432	23,107,490	2,318,671	1,118,720

ذریعہ معلومات: تنظیم برائے مردم شماری کے شائع کردہ کوائف اور 1998 کی مردم شماری پر مبنی آبادی میں اضافے سے متعلقہ تحقیقی پیپرز

انبار، ضرورت اور طلب

رہائشی سہولیات کی بڑھتی ہوئی طلب کی ایک بنیادی وجہ غیر تعمیر شدہ ہاؤسنگ کا انبار ہے جس کی آبادی کو اشد ضرورت ہے۔ سال کے اختتام تک بعض اندازوں کے مطابق یہ انبار 9 لاکھ ہاؤسنگ یونٹ تک پہنچ گیا تھا جس میں شہری آبادی کے لیے 30 لاکھ سے ساڑھے تیس لاکھ یونٹ درکار تھے اور تقریباً تمام کم آمدنی والے گھرانوں کے لیے تھے۔

ہاؤسنگ مارکیٹ میں رسد اور طلب کی صورت حال انتہائی غیر متوازن تھی۔ بعض اندازوں کے مطابق پاکستان کی 68 فیصد آبادی کے پاس رہائشی سہولیات کا صرف ایک فیصد سٹاک ہے جبکہ 56 فیصد اسٹاک زیادہ آمدنی والے 12 فیصد طبقے کے پاس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہری علاقوں میں رہائشی سہولیات کی غیر مستعمل منڈی ہے۔ ہاؤسنگ یونٹس کی طلب کو پورا نہیں کیا جا رہا خاص طور پر نچلے اور نچلے متوسط آمدنی والے طبقوں کے لیے۔

پلاننگ کمیشن پاکستان کے مطابق ہر سال 300,000 ہاؤسنگ یونٹ تعمیر کیے جاتے ہیں جن کی زیادہ تر تعمیر شہری علاقوں میں ہوتی ہے۔ یہ تعداد طلب کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے اور نتیجتاً شہری مراکز

میں طلب کردہ غیر تعمیری یونٹس کے انبار میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ جبکہ شہری علاقے، صحت، تعلیم، روزگار کی بہتر سہولیات، کاروبار کے بہتر مواقع اور تحفظ وسلامتی کی خاطر ہونے والی نقل ومکانی کے باعث آبادی سے پہلے ہی بھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ پسماندہ طبقات کے لیے کچی آبادیاں اور جھونپڑیاں ہی سہارا بنتی ہیں۔

آپریشن ضرب عضب اور قبائلی جھگڑوں نے خیبر پختونخوا اور فاٹا کی بہت بڑی آبادی کو کراچی اور دیگر شہروں میں نقل مکانی کرنے پر مجبور کیا۔ متعدد غیر بلوچ قبیلوں اور خاندانوں نے مجبوراً 2014 میں بلوچستان میں اپنے گھر بار چھوڑ کر کراچی یا دیگر قصبوں کا رُخ کیا۔

کراچی، لاہور اور پشاور کے مرکزی علاقوں میں قدیم عمارتوں کی مرمت نو کی اشد ضرورت ہوئی تھی۔ زلزلوں اور بارشوں کے خدشات کے باعث بے قاعدگی کے ساتھ تعمیر کردہ کثیر منزلہ عمارتیں اپنے باشندگان کے لیے خطرے کا باعث بنی رہیں۔

رہائشی سہولیات اور اراضی سے متعلقہ مسائل

شہری علاقوں میں زمین کی دستیابی اور انتظامات کی نوعیت کا رہائشی سہولیات پر براہ راست اثر مرتب ہوتا ہے۔ شہری علاقوں میں رہائشی سہولیات کے لیے اراضی کی فراہمی پر کئی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ شہری اراضی بھاری سرمایہ کاری کے لیے موزوں ہونے کی وجہ سے جنس کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

چنانچہ اُس کی قیمتوں میں اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ رہائشی سہولیات کے لیے اس کی دستیابی خاص طور پر نچلے اور متوسط آمدنی والے لوگوں کے لیے ناممکن ہو جاتی ہے۔ بڑے شہری مراکز کو سرکاری زمین پر تجاوزات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی بدولت رہائشی سہولیات کے لیے اُس کی دستیابی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ سیاسی مفاد اراضی کی فراہمی اور تقسیم کا تعین کرتا ہے جبکہ سماجی اور ترقی مثال کے طور پر رہائشی سہولیات سے متعلقہ مطالبات قابل ترجیح نہیں رہتے۔

کراچی میں مارکیٹ سے کم قیمت پر ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کو زمین کی الاٹمنٹ، شہر کے مضافاتی علاقے میں ڈی ایچ اے سٹی کی تعمیر، لاہور اور کراچی میں پراپرٹی ڈیلروں کی طرف سے تقسیم، غیر قانونی ذیلی تقسیم اور غیر قانونی ہاؤسنگ سکیموں کی تعمیر اس کی واضح مثالیں ہیں۔ بحریہ ٹاؤن نے بھی 2014 میں کراچی کے گرد ونواح میں ہاؤسنگ اسکیم کی تعمیر کا اعلان کیا اور زمین کی فوری فروخت اور سودا کاری کو جنم دیا۔ زمینوں کے بہت بڑے قطعات پہلے سے اعلان شدہ اسکیموں کے تحت منصوبہ بندی اور ڈویلپمنٹ کے باوجود غیر مستعمل پڑے ہوئے ہیں۔

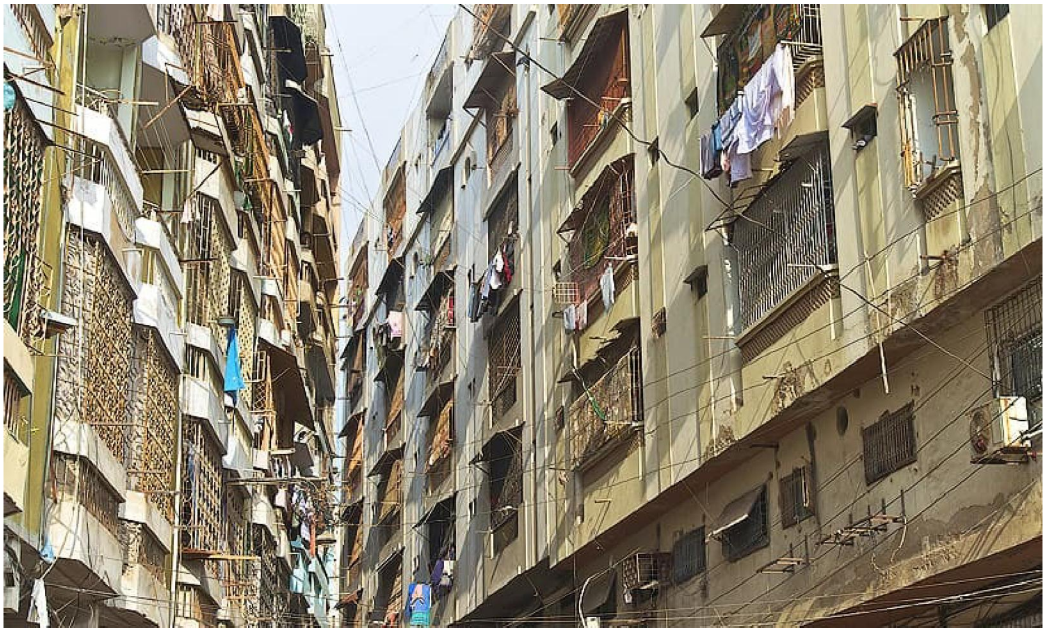

شہری علاقوں کی بہت بڑی آبادی ناقص منصوبہ بند علاقوں میں رہائش پذیر ہے

رہائشی سہولیات بطور رئیل اسٹیٹ

ہاؤسنگ ڈویلپمنٹ متوسط اور بالائی آمدنی والے طبقوں کے لیے سرمایہ کاری کا ذریعہ بھی ہے۔ متعدد ذیلی شعبے اور خدمات مثال کے طور پر ڈیزائن اور تعمیر سازی، دلالی، مارکیٹنگ، مالیاتی سروسز اور سرکاری اداروں کے ساتھ رابطہ کاری کے کام میں پراپرٹی ڈیلروں کی معاونت، رئیل اسٹیٹ کے شعبے کے ساتھ منسلک ہیں۔ رئیل اسٹیٹ کے امور کی انجام دہی میں معماروں، ڈویلپرز، ریگولیٹری ایجنسیوں، ڈویلپمنٹ اتھارٹیز، اسٹیٹ ایجنسیوں، خریداروں اور سرکاری حکام سمیت کئی فریقین شامل ہوتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے اشتہارات نئی اسکیموں کو ملک بھر میں مشتہر کرتے ہیں۔ تاہم انتہائی مہنگی قیمتوں کے باعث شہری اور دیہاتی غریب ان اسکیموں تک رسائی سے محروم رہتے ہیں۔

کم آمدنی والے طبقوں کے لیے رہائشی سہولیات

شہروں اور قصبوں کی غریب شہری آبادی کو رہائشی سہولیات کی فراہمی پالیسی سازوں، منصوبہ سازوں اور ڈویلپمنٹ ایجنسیوں کے لیے بنیادی حل طلب مسئلہ ہے۔ غربت کی علامات ظاہر کرتی ہیں کہ شہری آبادی سمیت ملک کی ایک بڑی آبادی کو مناسب روزگار اور سماجی ترقی کے موقع فراہم کئے جانے چاہئیں۔

کراچی سٹریٹیجک ڈویلپمنٹ پلان 2020 (کے ایس ڈی پی 2020ء) کے مطابق شہر کے غریب گھرانے جن کے اراکین زیادہ تر مختلف اقسام کی بے ضابطہ آبادیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ 2010ء میں ان کی تعداد 941,968 تھی۔ یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ اس زمرے میں آنے والے گھرانوں کی تعداد میں ہر سال مزید ایک لاکھ سے زائد گھرانوں کا اضافہ ہوجاتا ہے جن کے لیے اتنی ہی تعداد میں گھر اور متعلقہ سہولیات درکار ہیں۔ چونکہ کراچی دنیا ان کے ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں آبادی میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اس لیے شہر کے غریبوں کی ضرورت کا تخمینہ بھی بہت زیادہ ہے۔

ہاؤسنگ پالیسی بظاہر موزوں دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس میں کم آمدنی واے طبقات سے متعلق شقیں موجود ہیں۔ تاہم یہ پالیسی اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح ناکام رہی کیونکہ ماہرین کے مطابق ''اس کے نفاذ کے لیے اپنائے گئے طریق کار کم آمدنی والے طبقات کی سماجی اور معاشی حیثیت سے ہم آہنگ نہیں تھے''۔

حکومت نے کم آمدنی والے طبقات کو پانچ لاکھ گھروں کی تعمیر کے لیے قرضے فراہم کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ 15-2014ء کے بجٹ میں 6 ارب روپے مختص کئے گئے ہیں جو حال ہی میں قائم کی گئی کمپنی ''اپنا گھر لمیٹڈ'' کے ذریعے کم آمدنی والے گھرانوں پر خرچ کئے جائیں گے۔ اس کمپنی کی جانب سے تاحال کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ چونکہ رہائشی سہولیات اب ایک صوبائی موضوع ہے اس لیے پنجاب میں آشیانہ سکیم اور دیگر صوبوں میں اس جیسی کئی رہائشی سکیمیں شروع کی گئیں جن میں پنجاب کی آشیانہ ہاؤسنگ سکیم کامیابی سے چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مزید برآں حکومت نے بجٹ میں رہائشی سہولیات سے متعلق قرضوں کے لیے بھی 120 ارب روپے مختص کئے، جو کم آمدنی والے طبقات کو جاری کئے جانے تھے۔ تاہم اس پالیسی کو افقی توسیع، حد بندی سے متعلق سخت قوانین، عمارتوں کی بلندی کی حد اور رہن کی حد سے زیادہ لاگتوں، جیسے مسائل کا سامنا رہا۔

اسلام آباد میں کچی آبادیوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ بہتر انتظام وانصراف والے شہر، شہر کے غریبوں کو کم قیمت سہولیات فراہم نہیں کرسکے۔ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ریکارڈ کے مطابق اسلام آباد کے مختلف علاقوں میں پندرہ سے زائد کچی آبادیاں موجود ہیں جن کے گھرانوں کی تعداد اور کوائف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب یہ کچی آبادیاں وجود میں آجاتی ہیں تو ان آبادیوں کو باضابطہ بنانے اور انتظامیہ کی جانب سے کچی آبادی کے مکینوں کو بے دخل کرنے کا مشکل سوال جنم لیتا ہے۔ شہری علاقوں کی غریب کمیونٹیاں بے ضابطہ ڈویلپرز کو ترقیاتی اخراجات ادا کرتی ہیں۔ اوپی پی کی ترقیاتی رپورٹس یہ ظاہر کرتی

بیشتر غریب لوگ گارے کے بنے گھروں میں رہتے ہیں جن کی ہر سال مرمت کرنی پڑتی ہے

ہیں کہ کراچی کے زوبو گوٹھ جیسے علاقوں میں کنبے نہ صرف حکومت کو زمین کی قیمت ادا کرتے ہیں بلکہ اپنے رہائشی حقوق کے تحفظ کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی مالی طور پر مطمئن کرتے ہیں۔

متوسط اور زیادہ آمدنی والے طبقات بڑے شہروں میں سہولیات پر سرمایہ لگاتے ہیں، جس سے طلب میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسوسی ایشن آف بلڈرز اینڈ ڈویلپرز سے اکٹھی کی گئی معلومات ظاہر کرتی ہیں کہ صرف کراچی میں متوسط اور زیادہ آمدنی والے طبقات کے لیے چار لاکھ گھروں کی ضرورت ہے۔ امن وامان کی خراب صورتحال، غیر مناسبت طریق کار اور جائیداد کے انتقال اور اندراج کے حوالے سے قانونی اور انتظامی طریق کار میں پائی جانے والی خامیوں کے باعث اس ضرورت ایک بڑا حصہ چھین لیا جاتا ہے۔ طلب سے منسلک ایک اور اہم عنصر شہر کے گردونواح میں غیر منظور شدہ کم گنجان رہائشی علاقوں جیسے کہ پی ای سی ایچ ایس، فیڈرل بی ایریا کی سوسائٹیز ایریا اور کلفٹن کی گنجانی میں اضافہ ہے جہاں ایک منزلہ بنگلے مسمار کر کے ان کی جگہ کثیر منزلہ اپارٹمنٹ اور اسی طرح کی دیگر رہائش عمارتیں تعمیر کر دی جاتی ہیں۔ کراچی میں بہت سے سکیمیں یا تو اب بھی غیر آباد میں یا پھر جزوی طور پر استعمال کی جاتی ہیں جس کا سبب بدگمانی اور امن وامان کی خراب صورتحال ہے۔ لاہور اور فیصل آباد میں ایسوسی ایشن آف بلڈرز اینڈ ڈویلپرز کے شمالی علاقے کے اراکین کا یہ کہنا ہے کہ بے ڈھنگے طریقے سے بنائی گئیں رہائشی سکیموں کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ تاہم انضباطی

باضابطہ ہاؤسنگ فنانسنگ اداروں کے ذریعے رہائشی تعمیرات کے لیے جاری کیے گئے قرضے دو فیصد سے زائد نہیں تھے

پابندیاں اور زمین کی محدود دستیابی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام آباد میں سیاسی اور انتظامی اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی رہائشی سہولیات کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ وفاقی دارالحکومت سے ملحقہ علاقوں میں نئی سکیموں کے مسلسل اعلانات کئے جا رہے ہیں۔ سمندر پار پاکستانیوں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے لیے بہت سی مارکیٹنگ کمپنیوں نے اپنے پھیلاؤ کے لیے مشرق وسطیٰ، یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی دفاتر کھول رکھے ہیں۔

غلط سیاسی فیصلوں، ناکارہ اور زوال پذیر قانونی ڈھانچے، کمزور انتظامی کنٹرول، لینڈ ریکارڈ کے نامکمل اور غلطیوں سے بھرے نظام اور ایک غیر مناسب معاشی نظام کے شہری علاقوں کے رئیل سٹیٹ پر انتہائی برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

قومی احتساب بیورو نے جعلی رہائشی سکیموں جیسے کہ کیپٹل بلڈرز ہاؤسنگ سکیم اور نیو اسلام آباد ہاؤسنگ کے خلاف کریک ڈاؤن کیا۔ 2005ء میں اسلام آباد میں شروع کی گئی ایک سکیم نے 305 کنال رقبے پر مشتمل زمین پر زمین پر تین ہزار پلاٹ بک کیئے۔ بعدازاں اس نے عوام سے وصول کی گئیں رقوم سے راولپنڈی اور اسلام آباد میں مختلف زمینیں خریدیں جن کا رقبہ اٹھارہ سو کنال سے زیادہ تھا۔ نیب نے ملزموں سے ایک ارب سے زائد رقم وصول کی جو چیک کے ذریعے ان لوگوں میں تقسیم کی جانی تھی جن کے ساتھ دھوکا

کیا گیا تھا۔ متاثرین کو رقوم کی فراہمی کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں 30 متاثرین کو ان کی رقم پے آرڈر کے ذریعے واپس کر دی گئی۔

جولائی میں نیب خیبر پختونخوا نے پشاور کے علاقے سریزئی میں ایک رہائشی سکیم کی خریداری کے دوران مبینہ طور پر ایک کروڑ اسی لاکھ روپے کا غبن کرنے پر صوبائی ہاؤسنگ اتھارٹی کے محصول اراضی کلیکٹر اور اس کے ایک اعلیٰ افسر کے خلاف قانونی کارروائی کی۔

نیب چیئرمین نے فارمینیٹز ہاؤسنگ سکیم میں پچاس کروڑ روپے کے مبینہ گھپلے کے حوالے سے پنجاب کے ریجنل آفس سے رپورٹ طلب کی۔ اس رہائشی سکیم نے مبینہ طور پر دھوکے سے عوام کو ایسے پلاٹ فروخت کئے تھے جن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ایل ڈی اے) نے سکیم کے فیز ون کے لیے بارہ سو کنال زمین کی منظوری دی تھی لیکن سکیم کے مالکان نے ہزاروں کنال زمین فروخت کر دی جو ان کی ملکیت نہیں تھی۔

رہائشی سہولیات کے لیے قرضوں کی فراہمی اور لین دین

ہاؤسنگ فنانس ایک اہم ذیلی شعبہ ہے جس سے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد مستفید ہوتی ہے۔ یہ شعبہ لین دین میں پائے جانے والے خطرات، برے نظم ونسق اور امن وامان کی مسلسل خراب صورتحال کے باعث شدید متاثر ہوا ہے۔ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ باضابطہ ہاؤسنگ فنانس اداروں سے حاصل ہونے والی آمدنی دو فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ تقریباً 10 فیصد قرضوں کی فراہمی کا انتظام غیر رسمی ذرائع اور بقیہ رقم کا انتظام ذاتی بچت اور دیگر متعلقہ ذرائع سے کیا جاتا ہے۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کمپنی (ایچ بی ایف سی)، قومی مالیاتی بنکوں اور نجی بنکوں جیسے مالیاتی اداروں کا خیال ہے کہ ہاؤسنگ فنانس کے لیے قرضوں کی فراہمی انتہائی خطرناک ہے، جس کا سبب دھوکا دہی اور وہ واقعات ہیں جن کے باعث نام نہاد صارفین کے ساتھ طویل عرصے تک مقدمے لڑنے پڑتے ہیں۔ انتظامی اور قانونی ڈھانچے میں پائے جانے والی پیچیدگیوں کے باعث اندراج، انتقال اور نام کی تبدیلی کا کام سست روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ملک کے بڑے شہروں سمیت بہت سے علاقوں کے لینڈ ریکارڈ ناقص ہیں اور یہ بدعنوانی اور بے ضابطگی کا ذریعہ بھی بن چکے ہیں۔ جائیداد اور حتیٰ کہ قانونی طریقے سے حاصل کی گئی جائیداد کا لین بھی بے ضابطہ طریقے سے کیا جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے کالے دھن یا غیر قانونی / ناجائز طریقوں سے حاصل کی گئی دولت کو جائیداد کی خریداری کے ذریعے استعمال میں لانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک عام مختار نامے کے ذریعے بے نامی املاک کی خرید وفروخت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس قسم کے لین دین کے بارے میں زمینوں کے انتظام وانصرام کے ادارے

یا شعبہ اندراج کو آ گاہ نہیں کیا جاتا۔ ریاستی زمین کے بڑے قطعات کراچی کے مضافات میں جبکہ نجی زمین کے بڑے قطعات لاہور پشاور اور اسلام آباد کی حدود میں موجود ہیں۔ سرکاری اراضی کے لیے رہن کے معاملات کو مکمل ہونے میں چار ماہ اور نجی اراضی کے لین دین کے معاملات کو مکمل ہونے میں دو ماہ سے زائد کا عرصہ لگتا ہے۔ طریقہ کار میں ایک چھوٹی سی غلطی سے لین دین کا عمل ہفتوں اور مہینوں کی تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔

اراضی کا لین دین اکثر دیرینہ تنازعات کا باعث بنتا ہے جن کے مقدمات عدالتوں میں مہینوں اور سالوں تک چلتے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ دیکھا گیا ہے کہ مقدمہ لڑنے والے اپنے حق میں فیصلہ سنائے جانے کے باوجود اس سے مستفید نہیں ہو پاتے جس کی وجہ یہ ہے کہ کراچی اور سندھ کے جنوبی شہروں میں مخالف فریق کا کام کی جگہوں پر کافی اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ بااثر یا سیاسی کارکنوں کی مداخلت کے ذریعے تنازعات کے تصفیے کے بے ضابطہ طریق کار کبھی کبھار فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں لیکن ایسے اقدامات کے ذریعے جائیدادوں کے استحقاق کو رہن رکھنے کے قابل نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اگر چہ رہن شدہ اشیاء کی ضبطی سے متعلق قوانین اور دیگر قانونی ڈھانچے عدم ادائیگی کی صورت میں جائیداد پر قبضے کی اجازت دیتے ہیں تاہم ان جائیدادوں کی بہت کم قیمت لگتی ہے اور قرض دینے والوں کے نزدیک ان کی زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی۔

مئی میں پنجاب اسمبلی کے ایک اجلاس کے دوران ڈپٹی سپیکر سردار شبیر علی گورچانی پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے ڈی جی خان میں اوقاف کی زمین پر قبضہ کرنے کے لیے مقامی پولیس کو استعمال کیا۔

29 جنوری کو اورنگی پائلٹ پراجیکٹ۔ ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سلیم عالم الدین کی کار پر دھماکا خیز مواد سے حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گئے۔

2 فروری کو کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر آف لینڈ محمد اسحاق نیو کراچی میں شاہراہ عثمان پر پچاس فٹ چوڑی گرین بیلٹ پر غیر قانونی طور پر تعمیر کی گئی تعمیرات کو مسمار کر رہے تھے کہ اس دوران قبضہ گیروں نے تجاوزات کا خاتمہ کرنے والی ٹیم پر فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں محمد اسحاق جاں بحق ہو گئے۔

رہائشی سہولیات کی ایک بڑی طلب کے باوجود رہائشی سہولیات کے لیے قرضوں کی شرح جی ڈی پی کے ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ رسمی شعبے میں ایچ بی ایف سی ایک اہم ادارہ ہے جو نصف صدی سے زائد عرصے تک ایک سرکاری حمایت یافتہ خود مختار ادارے کے طور پر کام کرنے میں ناکامی کے بعد ایک کاروباری ادارے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایچ بی ایف سی کا نیٹ ورک شاید سب سے بڑا ہے جو ملک کے اسی شہروں میں پھیلا ہوا ہے، تاہم ادائیگیوں کے لحاظ سے مجموعی ہاؤسنگ فنانس میں اس کا حصہ ایک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان (ایس بی پی) کی جانب سے رہائشی سہولیات کے بارے میں جاری کئے گئے تازہ ترین

مالار، آواران میں ایک مزدور گھر کی تعمیر کے دوران پکی اینٹیں لگا رہا ہے۔ شہر میں زلزلے کے ایک برس بعد بھی تعمیر کا کام جاری ہے

کوائف کے مطابق تمام بنکوں اور ترقیاتی مالیاتی اداروں (ڈی ایف آئز) کے مجموعی واجب الادا ہاؤسنگ فنانس میں مسلسل تیسری سہ ماہی کے بعد اضافہ دیکھا گیا۔

ستمبر میں 2014 کے آخر تک یہ رقم 52 ارب نوے کروڑ تھی جو ایک سہ ماہی وار بنیاد پر 26 کروڑ بیاسی لاکھ یا 0.51 فیصد زیادہ ہے۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے رہائشی سہولیات سے متعلق اپنے مختصر تبصرے میں کہا کہ: ''2008 کے بعد رہائشی سہولیات کے لیے قرضوں کی فراہمی میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ توقع ہے کہ پالیسی ریٹ کم کرنے سے متعلق اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا موقف پاکستان میں ہاؤسنگ فنانس کی طلب اور گنجائش میں اضافہ کرنے میں مدد دے گا''۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن (ایچ بی ایف سی) اور اسلامی بنک کے علاوہ، بنکاری شعبے کے مجموعی قرضے سہ ماہی وار بنیاد پر کم ہو رہے ہیں۔ مکانیات کے لیے اسلامی بنکوں کے مجموعی واجب الادا قرضوں میں پچھلی سہ ماہی کے مقابلے میں 3.78 فیصد اضافہ دیکھا گیا جس کے بعد واجب الادا قرضوں کی مجموعی رقم چودہ ارب اٹھائیس کروڑ تک پہنچ گئی۔ اسی عرصے کے دوران ایچ بی ایف سی کے رہائشی سہولیات سے متعلق مجموعی واجب الادا قرضوں میں 0.7 فیصد اضافہ ہوا۔

کوائف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایچ بی ایف سی کے قرضوں کا ایک بڑا حصہ دس لاکھ روپے تک کے

چھوٹے قرضوں پر مشتمل تھا جبکہ اس کے برعکس دیگر اداروں کا رجحان پچاس لاکھ یا اس سے زائد رقم کے قرضوں کی فراہمی کی جانب تھا۔ ایسوسی ایشن آف بلڈرز اینڈ ڈویلپرز (آباد) کا کہنا تھا کہ معیشت کے حجم کے لحاظ سے ہاؤسنگ فنانس کے حصص کی شرح مایوس کن طور پر کم تھی۔

مندر کو مسماری کا سامنا

راولپنڈی میں انتظامیہ کی جانب سے ایک مندر کو مسمار کرنے کا منصوبہ تھا جس پر ملک کی ہندو برادری میں شدید غصہ پایا جاتا تھا۔ مہارشی والمکی سوامی جی مندر جو بلکناش مندر کے نام سے مشہور ہے، کے علاوہ ہندوؤں کے قبرستان اور ایک کمرے کے 53 گھروں کو مسمار کرنے کے منصوبے کے خلاف دائر کی گئی پٹیشن پر دیئے گئے فیصلے میں اس منصوبے کے خلاف حکم امتناعی جاری کیا گیا۔

آباد کا کہنا تھا کہ 5.2 ارب نوے کروڑ روپے کی بجائے رہائشی سہولیات کے لیے قرضوں کی رقم کم ازکم پانچ سو ارب ہونی چاہیے تھی۔ علاقے کی دیگر معیشتوں میں اس کا حصہ پانچ فیصد یا اس سے زیادہ ہے۔ بنکوں کو اپنی سالانہ ادائیگیوں کا کم ازکم پانچ فیصد رہائشی سہولیات کے لیے مختص کرنا چاہیئے۔

2014ء کی تیسری سہ ماہی کے آخر میں رہن کی شرح جی ڈی پی کا 0.45 فیصد تھی۔ آباد نے نئے گیس کنکشنوں اور بلند وبالا رہائشی عمارتوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ناقص پالیسیوں کی وجہ سے سرمایہ کار اپنا اربوں روپے کا سرمایہ واپس لے جارہے تھے۔

سٹیٹ بنک کے کوائف ظاہر کرتے ہیں کہ سہ ماہی کے دوران رہائشی سہولیات کے شعبے میں غیر ادا شدہ قرضوں کی شرح میں 1.75 فیصد اضافہ ہوا جس کے بعد مجموعی رقم پندرہ ارب ترانوے کروڑ ہوگئی۔ جولائی تا ستمبر کی سہ ماہی کے آخر میں غیر ادا شدہ قرضوں میں ایچ بی ایف سی کا حصہ 40 فیصد تھا۔ شراکت داروں کا کہنا ہے کہ بہت سے خطرات ہاؤسنگ فنانس کے شعبے کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ملک کی سرمایہ کاری مارکیٹ اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ مختلف قسم کے فراڈ اور سرمایہ کاری کے ایسے دیگر راستے سرمایے کے بہاؤ کو متاثر کرتے ہیں۔ پراپرٹی مارکیٹوں میں شفافیت کا فقدان ایک بنیادی رکاوٹ ہے۔ جائیداد کی قیمت کے بارے میں ناقص طور پر لگائے گئے تخمینوں اور غیر مناسب دستاویز سازی کے باعث اس شعبے میں موجود مواقع کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ رہن شدہ اشیاء کی ضبطی کے طریق کار پیچیدہ اور غیر مناسب ہیں۔ اس حوالے سے تقریباً 47 طریق کار کو پورا کرنا پڑتا ہے۔

ان میں وہ بے ضابطہ ادائیگیاں شامل نہیں جو افسروں کو کرنی ہوتی ہیں۔ مکانیات اور تعمیرات کے

کچی آبادیوں کی نمود سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کنٹرول شدہ شہر غریب شہری آبادی کے لیے اُن کی استطاعت کے مطابق مواقع فراہم کرنے میں ناکام ہیں

شعبے میں منتظموں اور سرمایہ کاروں کو بھی انہی خطرات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ رہائشی سہولیات کے شعبے میں کاروبار کی وسیع گنجائش ہے اور یہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے تاہم کاروبار کا نہایت کٹھن ماحول سرمایہ کاروں، مقامی تاجروں اور عام لوگوں کو بھی رہائشی سہولیات سے متعلقہ شعبوں میں سرمایہ کاری سے روکتا ہے۔

کچی آبادیاں

کچی آبادیوں کو ایک ایسے بے ضابطہ رہائشی علاقے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جو سرکاری اداروں کے زیرِ ملکیت زمین پر تعمیر کی گئی ہوں۔ جب کچھ آبادیاں وجود میں آئیں اور کراچی اور سندھ کے دیگر بڑے شہروں کے رہائشی علاقوں میں پھیل گئیں تو 1987ء میں سندھ کچی آبادی ایکٹ کی منظوری دی گئی اور کچی آبادیوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت درج ذیل امور اور انجام دیئے جانے تھے: کچی آبادیوں کی نشاندہی اور ان کی نگرانی، سماجی و معاشی اور تعین مالگزاری سروے کا انعقاد، ترقیاتی سکیموں کی تیاری اور شرائط کو پورا کرنے کے بعد لیز کی مدت میں اضافہ کرنا۔ موجودہ معیار کے مطابق 30 جون 1997ء سے پہلے تعمیر کی گئیں کچھ آبادیاں باضابطہ بنائے جانے کی اہل تھیں۔ لیکن کراچی

میں کچی آبادیوں کو باضابطہ بنانے کا عمل کافی سست رہا ہے۔ شہری علاقوں کے غریب طبقات، جو وہاں کئی سالوں سے آباد ہیں، انہیں ملکیتی حقوق حاصل نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے گھروں کی حالت کو بہتر بنانے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ شہر میں کچی آبادیوں کے مکینوں کی تعداد نوے لاکھ تھی۔ اس صورتحال کے پیش نظر شہر میں کچی آبادیوں کے مسائل کے حل کے لیے ایک تیز رفتار اور موثر طریقہ کار کی ضرورت ہے۔

پنجاب نے بھی ایک ایسے قانون کی منظوری دی جس کا نام پنجاب کچی آبادی ایکٹ 1992ء تھا۔ اس قانون کے تحت سرکاری زمین پر 31 دسمبر 2011ء کے بعد قائم کی گئیں کچی آبادیوں کو باضابطہ بنایا جانا تھا۔ 2010ء میں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے کچی آبادیوں کی باضابطگی کی جانچ کے لیے مختلف سائز کی 154 کچی آبادیوں کا سروے کیا۔ اسلام آباد جو کچھ عرصہ قبل قبضہ شدہ زمینوں سے پاک شہر سمجھا جاتا تھا اب اسے قبضہ شدہ آبادیوں کے حوالے سے متعدد مسائل کا سامنا تھا۔ اسلام آباد پولیس کے سروے کے مطابق شہر کے شہری اور دیہی علاقوں میں کم از کم 24 کچی آبادیاں موجود تھیں جن میں 13,521 خاندان رہائش پذیر تھے جن کی کل آبادی 84,591 تھی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران 674 مقدمات کا تعلق ان علاقوں کے مکینوں سے تھا۔ ان میں سے زیادہ تر جرائم کا تعلق منشیات اور شراب کی خرید و فروخت سے تھا۔

سی ڈی اے 24 کچی آبادیوں میں سے صرف 10 کو تسلیم کرتی ہے۔ کچی آبادیوں کے مکینوں نے کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) کے اسلام آباد کے اندر اور گردونواح میں 12 کچی آبادیوں کو مسمار کرنے کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ آپریشن عارضی طور پر روک دیا گیا۔

خیبر پختونخوا کچی آبادی ایکٹ 1996 میں پشاور اور دیگر علاقوں کے لیے بھی ایسی ہی شقیں موجود ہیں۔ کچی آبادیاں شہر کے اندر اور گردنواح میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کئی کچی آبادیاں ریلوے کی زمینوں پر بھی قائم کی گئی ہیں۔ اگرچہ سرکاری حکام نے کچی آبادیوں کو باقاعدہ ضابطہ بنانے کا اعلان کر رکھا ہے تاہم مقامی ادارے انتظامی اور قانونی وجوہات کی بنا پر اس اعلان پر عملدرآمد پر شک کا اظہار کرتے ہیں۔

انضباطی معاملات

سندھ بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی ایک اہم انضباطی ادارہ ہے۔ تاہم یہی ادارہ منصوبہ بندی کا ذمہ دار بھی ہے۔ یہ ایک انوکھا انتظام ہے جس کی جانچ پڑتال کا کوئی طریقہ کار موجود نہیں۔ لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں میں گزشتہ تین دہائیوں سے مناسب قوانین موجود ہیں۔ دی پنجاب لینڈ یوز (درجہ بندی، نئی درجہ بندی اور تعمیر نو) رولز 2008ء، جو پنجاب لوکل گورنمنٹ آرڈیننس 2001ء کے تحت تشکیل دیئے گئے تھے، رہائشی علاقوں کی درجہ بندی کے لیے فریم ورک مہیا کرتے ہیں اور ایل ڈی اے کو سروے منعقد کرنے اور تکنیکی

اور انتظامی ہدایات کے مطابق تجدید اور تعمیر نو کے لیے سکیمیں تیار کرنے کا مجاز بناتے ہیں۔ لاہور کے گرد و نواح کے علاقوں میں جو اہم مسئلہ درپیش ہے وہ جنوبی علاقوں میں کم گنجانی اور کم ترقی ہے۔ اگرچہ لاہور ماسٹر پلان 2001-2005 میں اس مسئلے کو مناسب طور پر اجاگر کیا تھا تاہم کم گنجان علاقوں کی تعمیر نو اور ان کی گنجانی میں اضافے کے لیے کوئی سکیم تیار نہیں کی گئی تھی۔ دی پنجاب پرائیویٹ ہاؤسنگ اینڈ لینڈ سب ڈویژن رولز 2010ء میں رہائشی اور دیگر املاک کی تعمیر اور خریداری کے لیے ایک انضباطی طریقہ کار مقرر کیا گیا ہے۔ تاہم سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے ڈویلپرز بہت سی قانونی اور انتظامی شقوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر منظور شدہ اور بے قاعدہ سکیموں کی تعمیر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسلام آباد میں سی ڈی اے نے زمین کی ترقی اور رہائشی سہولیات سے متعلق تعمیرات پر کڑی نظر رکھی ہوئے ہے۔ لیکن شہر کے گرد و نواح میں تعمیراتی کام کو جاری رکھتے ہوئے منصوبہ بندی پر ادارے کے اس اختیار کا اکثر تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ پشاور کو بھی ایسے ہی انتظامی اور قانونی مسائل کا سامنا ہے جس کا سبب ایک تکنیکی طور پر مناسب اور انتظامی طور پر موزوں ماسٹر پلان کی عدم موجودگی ہے۔

کرایے کی رہائشی سہولیات

پاکستان میں مکانیات تک رسائی کا ذریعہ ملکیتی حقوق ہیں۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں 67.6 فیصد مکانات میں گھروں کے مالکان رہائش پذیر تھے۔ کرایہ داروں کے طور پر رہائش پذیر گھرانوں کی شرح انتہائی کم تھی۔ پاکستان کے شہری علاقوں میں کرایہ داری کے حوالے سے کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔

پاکستان کے کرایہ داری سے متعلق قوانین عام طور پر کرایہ داروں کے حق میں ہیں۔ سندھ رینٹ کنٹرول آرڈیننس 1979ء اور پنجاب رینٹ ریسٹرکشن آرڈیننس 1959ء کی کئی شقیں ایک جیسی ہیں۔ مثال کے طور پر ان قوانین کے تحت کرایے میں تین سال کے بعد اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس کے مقابلے میں مہنگائی میں اضافے کی شرح بہت زیادہ ہے اس لیے اس سے مالک مکان کی آمدنی شدید متاثر ہوتی ہے۔ ٹیکس میں اضافے کا بوجھ عام طور پر مالک کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ قانون کرایہ دار پر ٹیکس میں اضافے کا نصف سے زائد بوجھ ڈالنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کرایہ دار کو صرف عدم ادائیگی پر گھر خالی کرنے کو کہا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے شہری علاقوں میں کرایے کی رہائش کا تناسب 20 فیصد اور سندھ کے شہری علاقوں میں 27 فیصد ہے۔ اسلام آباد جیسا شہر جہاں بہتر سہولیات موجود ہیں، وہاں کرایے کی رہائش کا تناسب 40 فیصد ہے۔ مالکان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کرایہ دار املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں جس کی عام مرمت کے ذریعے تلافی نہیں

کرایوں میں اضافہ

کی جاسکتی۔اس کے علاوہ ناجائز اور طویل المدتی حکم امتناعی کی وجہ سے بھی کرائے کی رہائش کے تناسب میں اضافہ نہیں ہو پارہا۔

سندھ رینٹل پریمیسز آرڈیننس 1979ء جائیداد کے مالک سے متعلق ہے۔مثال کے طور پر یہ قانون ''مناسب کرایہ'' مقرر کرنے پر زور دیتا ہے جو متفقہ طور پر یا پھر کرایہ داری سے متعلق ادارے کے معیار کے مطابق مقرر کیا جانا چاہئے۔قانون میں املاک کی مرمت اور بحالی کا سارا بوجھ مالک پر ڈال دیا گیا ہے۔ اگر کرایہ دار املاک کو کوئی نقصان پہنچائے تو اس سے اس کا معاوضہ وصول کرنے کا بمشکل ہی کوئی امکان ہوتا ہے۔کرایہ داروں سے گھر خالی کرانے کا خاطر خواہ جواز ہو بھی تو انہیں قانونی کارروائی کے ذریعے آسانی سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ان حالات میں لوگ ضرورت کے وقت بھی اپنی جائیدادوں کو کرایے پر دینے سے کتراتے ہیں۔اگر کرایہ داری کا معاہدہ کسی بیوہ یا کسی محروم طبقے کے زمرے میں آنے والے فرد کے نام پر کیا جائے تو مالک کے لیے گھر خالی کرانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔کرایہ دار جب بھی کرایہ داری کی مدت بڑھانا چاہے تو وہ با آسانی قانونی چارہ جوئی کا سہارا لے لیتا/لیتی ہے۔یہ مقدمات پانچ سے دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک چلتے رہتے ہیں۔

ان معاہدہ جاتی انتظامات میں اسٹیٹ ایجنٹ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر شامل ہوتے ہیں جو کرایہ دار اور مالک سے کمیشن حاصل کرنے کے لیے جلد از جلد معاملے کو حتمی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ کرایہ دار کی دستاویزات، پس منظر اور کوائف یا جائیداد کی حیثیت کا شاذ و نادر ہی جائزہ لیتے

لاہور کے گنجان آبادانارکلی بازار میں آگ لگنے کے باعث کم از کم 13 افراد جاں بحق ہوئے

ہیں۔ چونکہ بہت سے کرایہ دار یا مالکان ان دستاویزات کے پس منظر اور قانونی اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لیے آگے چل کر ان کے درمیان کوئی نہ کوئی تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

آتش زدگی کے واقعات

ملک کے رہائشی علاقوں میں آتش زدگی کا خطرہ موجود رہا۔ اگرچہ حادثاتی آتشزدگی کے واقعات مختلف علاقوں جیسے کہ کاروباری اور صنعتی علاقوں میں پیش آتے رہے تاہم رہائشی علاقوں میں لگنے والی آگ کے باعث عام لوگوں کو سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ 10 فروری 2014ء کو رحیم یار خان میں دہشت گردوں کے حملے کے باعث لگنے والی آگ کے نتیجے میں ایک خاتون جاں بحق ہوگئی۔ دہشت گردوں نے یوسف آباد اور بستی افضل حامد خمبارا میں گیس پائپ لائن کو نشانہ بنایا تھا۔ مئی 2014ء میں فیصل آباد کے ایک گنجان آباد علاقے میں ایل پی جی گیس بھرنے کے دوران ایک سلنڈر دھماکے سے پھٹ گیا جس کے نتیجے میں متعدد افراد زخمی ہوگئے۔ دسمبر کے آخری دونوں کے دوران ملک کو دو خوفناک حادثات کا سامنا کرنا پڑا۔ کراچی کی ٹمبر مارکیٹ میں لگنے والی آگ سے نہ صرف کروڑوں روپے کا نقصان ہوا بلکہ اس سے سینکڑوں خاندان اور کاروباری مراکز بھی متاثر ہوئے۔ ٹمبر مارکیٹ کے قرب وجوار میں واقع رہائشی عمارتیں بری طرح متاثر ہوئیں ان میں سے چند انسانی رہائش کے لیے غیر محفوظ ہوگئیں۔ لاہور کے گنجان آباد انارکلی بازار میں آگ بھڑک اٹھی جس نے الکریم مارکیٹ پلازہ کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا، جس کے نتیجے میں کم از کم 13 انسانی

جانیں ضائع ہوگئیں اور کاروبار اور انفراسٹرکچر کو شدید نقصان پہنچا۔ اس وقوعے سے محض ایک دن پہلے کراچی کی ٹمبر مارکیٹ جل کر راکھ ہوگئی تھی۔ اطلاعات کے مطابق، کثیر منزلہ الکریم مارکیٹ پلازہ، جہاں درجنوں دکانیں تھیں، وہاں داخلے اور اخراج کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ اس واقعے کا المناک پہلو یہ ہے کہ زیادہ تر اموات دم گھٹنے سے ہوئیں۔

سفارشات

1۔ اضلاع میں اراضی اور رہائشی سہولیات کا تخمینہ لگانے کی ضرورت ہے جو رہائشی سہولیات کی صورتحال کی بنیادی فہرست کے طور پر کام کرے۔ ہر ضلع میں ایک ہاؤسنگ ریسورس سنٹر قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طریقہ کار کی آزمائش کراچی، لاہور اور راولپنڈی/اسلام آباد میں کی جاسکتی ہے۔

2۔ پاکستان ادارہ شماریات کی معاونت سے ہاؤسنگ پرائس انڈیکس (ایچ پی آئی) اور رہائشی سہولیات تک رسائی کے گوشوارے (ایچ اے آئی) بھی متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔

3۔ ایچ بی ایف سی میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اسے ایک بااختیار اور تخلیقی ادارہ بنایا جاسکے۔ کمیونٹی کی سطح پر گروی گھروں کی فراہمی، گھروں کی تعمیر کے لیے اور کارپوریٹ تنظیموں کے ملازمین کو قرضہ جات کی فراہمی، بینکاری کے قابل نجی ہاؤسنگ سکیموں کی حوصلہ افزائی اور مجاز مالیاتی ذرائع سے عوام سے فنڈز کے حصول جیسے اقدامات کیے جائیں۔

4۔ کم آمدنی والے طبقوں کی معاونت کے لیے کئی ذرائع بروئے کار لائے جاسکتے ہیں۔ رہائشی سہولیات کے منصوبوں کے لیے رہائشی علاقے کی شرح میں رعایت برتنے جیسے اقدامات اٹھائے جاسکتے ہیں جن کا مقصد شہری علاقوں کے غرباء کی معاونت کرنا ہو۔ علاوہ ازیں، قابل انتقام ڈویلپمنٹ حقوق (ٹی ڈی آر)، قرب وجوار میں شہری رہائشی سہولیات کی گنجائش سے متعلق قواعد وضوابط پر نظرثانی کی جائے۔ اراضی کے مخلوط استعمال کے اصول کی بنیاد پر شہری علاقے کی ازسرنو ترقی کا عمل شروع کیا جاسکتا ہے اور پہلے سے شروع کی گئی کم آمدنی والے رہائشی منصوبوں کی حوصلہ افزائی بھی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

5۔ مختلف فارموں اور مکانات کی تعمیر پر کیے گئے تحقیقی کام سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

6۔ فائر بریگیڈ اور ریسکیو ڈیپارٹمنٹ جیسے شہری اداروں میں ربط سازی کی ضرورت ہے۔ ملک بھر میں تنگ گلیاں اور غیر قانونی تجاوزات آگ بجھانے اور ریسکیو کے امور کی انجام دہی میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرکاری عمارت تعمیر کرتے وقت حفاظتی انتظامات سے متعلقہ قواعد وضوابط پر سختی سے عملدرآمد کیا جائے۔

ماحولیات

تمام انسان، ایسے ماحول کا بنیادی حق رکھتے ہیں، جو ان کی صحت اور فلاح و بہبود کے تمام تقاضوں کو پورا کرے۔

تمام ممالک، ماحول کا تحفظ کریں گے اور قدرتی وسائل کو، موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے استعمال کریں گے۔

تمام ممالک، ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں مناسب اور موزوں معیار قائم کریں گے اور ماحولیاتی معیار اور قدرتی وسائل کے استعمال میں آنے والی تبدیلی کو مانیٹر اور متعلقہ اعداد وشمار کو منظر عام پر لائیں گے

ماحولیاتی تحفظ اور قابل توثیق ترقی کے لیے مجوزہ قانونی اصول [آرٹیکل 1-2 اور 4]

ماحول کے بارے میں خدشات ستر کی دہائی میں سامنے آنا شروع ہوئے جب تیز رفتار اور بے قابو ''ترقی'' کے ماحولیاتی نظام پر اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگے اور محدود وسائل کو خطرے کی علامت قرار دیا گیا۔

1972ء میں سٹاک ہوم میں اقوام متحدہ کی ماحول سے متعلق ہونے والی کانفرنس کا مرکزی موضوع یہ تھا کہ ایک صاف اور پائیدار ماحول انسانی حق ہے۔ سٹاک ہوم اعلامیے کا مقصد ایسے موثر اصول قائم کرنا تھا جن کی مدد سے ''دنیا بھر کے لوگوں کو انسانی ماحول کے تحفظ اور فروغ کے حوالے سے متحرک کرنے کے علاوہ ان کی رہنمائی بھی جا سکے۔

اس کے پہلے اصول میں ماحولیات پر زور دیا گیا ہے تا کہ ایک مشترکہ ذریعے کے طور پر اس کا نہ صرف موجودہ بلکہ مستقبل کی نسلوں کے لیے بھی تحفظ کیا جا سکے۔

اگرچہ ماحولیات سے متعلق حقوق آئین پاکستان کے بنیادی انسانی حقوق کا حصہ نہیں ہیں تاہم 2012ء میں بھوٹان میں ماحولیاتی انصاف پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں جنوبی ایشیائی ممالک کی عدلیہ کے لئے ماحول سے متعلق ایک مشترکہ تصور پیش کیا گیا۔ ان کے شراکتی اور استعداد / علم میں اضافہ کرنے والے

اقدامات میں سے ایک اہم اقدام یہ تھا کہ ''صاف اور صحت مند ماحول کے حق کو آئین میں بنیادی حق کے طور پر شامل کیا جائے۔''

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973ء کے آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق میں پانی، توانائی، بجلی یا پانی کو واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ تاہم اعلیٰ عدالتوں نے زندگی کے بنیادی حق کے معنی کو وسعت دے کر صاف پانی تک رسائی کے حق (مغربی پاکستان سالٹ مائنز لیبر یونین بنام دی ڈائرکٹر انڈسٹریز اینڈ مائنز ڈویلپمنٹ، پنجاب، لاہور، 1994 ایس سی ایم آر 2061)، بجلی کے حق (پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن بنام واپڈا، ڈبلیو پی 26524، 2011ء جس کا لاہور ہائی کورٹ نے 28 جنوری 2013ء کو فیصلہ سنایا)، اور صاف اور صحت مند ماحول کے حق (شہلا ضیاء بنام واپڈا، 1994 سپریم کورٹ 693) کو بھی اس میں شامل کر دیا جن کی آرٹیکل 9 (زندگی کا حق) اور آرٹیکل 14 (انسانی وقار) کی روشنی میں تشریح کی گئی ہے۔

پاکستان نے 15 کثیر طرفہ ماحولیاتی معاہدوں پر بھی دستخط کر رکھے ہیں جن کے تحت ریاست ان معاہدوں پر عملدر آمد کو یقینی بنانے کی پابند ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل معاہدے شامل ہیں:

1۔ حیاتیاتی تنوع سے متعلق میثاق (سی بی ڈی)۔
2۔ کارٹاجینا معاہدہ برائے حیاتیاتی تحفظ۔
3۔ حیوانات و نباتات کی کم ہوتی اقسام کی بین الاقوامی تجارت سے متعلق میثاق (سائٹس)۔
4۔ بین الاقوامی اہمیت کے آبی علاقوں بالخصوص آبی پرندوں کی آماجگاہوں کا میثاق (رامسر کنونشن)۔
5۔ ہجرت کرنے والی جنگلی حیات کے تحفظ سے متعلق میثاق (سی ایم ایس)۔
6۔ موسمی تبدیلی سے متعلق اقوام متحدہ کے فریم ورک کا میثاق (یو این ایف سی سی سی)۔
7۔ یو این ایف سی سی سی کا کیوٹو معاہدہ۔
8۔ اوزون کی تہہ کے تحفظ کے لئے ویانا کا میثاق۔
9۔ اوزون کی تہہ کو کم کرنے والے مادوں سے متعلق معاہدہ مونٹریال،
10۔ زمین کو صحرا بردہونے سے بچانے کے لئے اقوام متحدہ کا میثاق (یو این سی سی ڈی)۔
11۔ بین الاقوامی تجارت میں مخصوص خطرناک کیمکل اور حشرات کش ادویات کے حوالے سے پیشگی رضامندی سے متعلق روٹرڈیم میثاق۔
12۔ خطرناک فضلہ جات کی سرحد پار نقل و حمل کی روک تھام اور انہیں تلف کرنے سے متعلق باسل کا میثاق۔

13۔ آلودگی پھیلانے والے دائمی نامیاتی اجزاء سے متعلق سٹاک ہوم کا میثاق (پاپس)۔

14۔ اقوام متحدہ کا سمندر کے قانون سے متعلق میثاق (یواین کلوز)۔

15۔ عالمی ثقافت اور قدرتی ورثے کے تحفظ سے متعلق میثاق۔

حکومت اس معاملے پر تذبذب کا شکار رہی۔ یہ ان عوامل سے لاعلم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، کیونکہ تمام رپورٹس یا تو حکومت کے اشتراک سے یا پھر اس کے لئے تیار کی گئی تھیں۔ تاہم نظم ونسق میں پائے جانے والے خلاء سے اس تاثر کی تردید ہوتی ہے کہ حکومت ماحول کی تباہی کے خطرات سے آگاہ تھی یا اس کے بارے میں فکرمند تھی۔

ایک باہم مربوط دنیا جہاں اختلافات کا باعث بننے والے بین الاقوامی اور علاقائی تنازعات کے حل کے لئے فورم تشکیل دیے جا رہے ہیں وہاں پاکستان میں اٹھارہویں ترمیم کے بعد ماحولیات کا معاملہ صوبوں کے سپرد کر دیا گیا۔

وفاقی سطح پر وزارت ماحولیات کا نام تبدیل کر کے پہلے وزارت موسمی تبدیلی، پھر وزارت ڈیزاسٹر مینجمنٹ رکھ دیا گیا اور بعدازاں اسے کلائمیٹ چینج ڈویژن میں تبدیل کر کے منصوبہ بندی کمیشن کا حصہ بنا دیا گیا۔ تاہم یہ قانون واضح طور پر کہتا ہے کہ ''اٹھارہویں ترمیم سے پہلے وفاقی حکومت کی جانب سے منظور کئے گئے قوانین صوبوں میں اس وقت تک نافذالعمل رہیں گے جب تک متعلقہ صوبائی اسمبلی ان قوانین میں ترمیم یا انہیں منسوخ نہ کر دے۔''

اب ہر صوبائی اسمبلی کو اپنا اپنا بل منظور کرنا تھا، اور سندھ جس نے اب تک ایسا نہیں کیا تھا اس نے 20 مارچ 2014ء کو تحفظ ماحولیات بل کی منظوری دی۔ دیگر صوبے پہلے ہی بھوربن اعلامیے کی پیروی کرتے ہوئے سبز بنچ تشکیل دے چکے تھے۔

قانون سازی سے متعلق پیش رفت سست روی کا شکار رہی کیونکہ سیاسی نظام میں اسے سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ پلڈاٹ کی جانب سے 2013ء کے انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں کے منشور سے متعلق کئے گئے تجزیے میں یہ بات سامنے آئی کہ ماحول ان جماعتوں کی ترجیحات میں شامل نہیں تھا اور کچھ جماعتوں کے منشور میں تو یہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

جنگلات پر مشتمل علاقے

پاکستان تحریک انصاف نے خیبر پختونخوا میں ایک اتحادی حکومت بنائی۔ اس کی بدولت اسے سبز ترقی پروگرام شروع کرنے کا موقع ملا جسے پارٹی کے اراکین اور سابق وفاقی وزیر برائے ماحولیات ملک امین

اسلم نے تیار کیا تھا جو آئی یو سی این کے وائس چیئر پرسن بھی ہیں۔

ملک اسلم نے پاکستان کو درپیش بنیادی چیلنجوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جس میں توانائی، پانی، جنگلات، ٹرانسپورٹ، فضائی آلودگی، فضلہ بننے کا عمل، زراعت، حیاتیاتی تنوع کا تحفظ، ماحولیاتی نظام کی قدر و قیمت کے علاوہ ماحولیات کا مجموعی انتظام شامل ہیں۔

اس پروگرام کے تحت شراکت دار صوبے میں ایک ارب پودے لگائیں گے۔اس اقدام کا مقصد المناک حد تک کم ہوتے جنگلات میں اضافہ کرنا ہے۔اس منصوبے کا مقصد نہ صرف ماحول کو تباہی سے بچانا اور طوفانی بارشوں کے دوران زمین کے کٹاؤ پر قابو پانا بلکہ کاربن کے اخراج کو روکتے ہوئے ایک ٹن کاربن تیار کرنے کے سرٹیفیکیٹ کا حصول بھی ہے۔

شک وشبہات رکھنے والوں نے پانی کی قلت پر تشویش کا اظہار کیا ہے کیونکہ اتنی بڑی تعداد میں درختوں کی افزائش کے لئے پانی کے کثیر ذخائر درکار ہیں۔لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان، جہاں جنگلات کی کٹائی کی شرح جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے، کے المناک حد تک ناکافی جنگلات (4.8 % جو عالمی معیار کے مطابق 25% ہونے چاہئیں) میں اضافہ کرنے کے لئے ایک جارحانہ شجرکاری کی ضرورت ہے۔اس کے نتیجے میں پہلے ہی بارش اور سیلاب سے متعلق قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑا ہے کیونکہ قابل کاشت زمینوں میں کٹاؤ کا عمل جاری ہے اور پانی کے بہاؤ کو روکنے کے لئے کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔مقامی آبادیوں کی جانب سے جنگل اور جنگلی مصنوعات کے استعمال کے علاوہ ٹمبر مافیا اور مقامی حکام کی ساز باز یا پھر کمزور نظم ونسق کے باعث جنگلات کے ذخائر ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

گزشتہ سال شہریوں کے فعال کردار کی بدولت اس رجحان کا خاتمہ ہوا جب انہوں نے عدالتوں سے رجوع کر کے رخصت ہونے والے وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کے گلگت بلتستان کی ٹمبر موومنٹ سے متعلق اس فیصلے کو کالعدم قرار دینے کا مطالبہ کیا جس کے تحت جنگلات کا ایک بڑا ذخیرہ کاٹ دیا گیا۔

خیبر پختونخوا حکومت کی جانب سے جنگلات میں اضافہ اور ان کی دیکھ بھال سے متعلق مہم کی روشنی میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ دوسرے صوبوں کے لئے نمونہ ثابت ہوگا اور اس کی بدولت وہ آر ای ڈی ڈی (جنگلات کی کٹائی اور کمی کے باعث ہونے والے کاربن کے اخراج کو کم کرنا) جیسے بین الاقوامی طریق کار سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔اس طریقہ کار کا مقصد ترقی پذیر ممالک کو مراعات فراہم کرنا تھا تاکہ یہ ممالک جنگلی علاقوں سے کاربن کے اخراج کو کم کریں اور اس کے لئے ایسے طریق کار اپنائیں جن سے مستحکم ترقی کے حصول میں مدد ملے۔

پاکستان میں جنگلات پر مشتمل علاقہ انتہائی کم ہے

اس کے لئے ٹرافی ہنٹنگ جیسا پروگرام شروع کیا جا سکتا ہے جس کا آغاز پاکستان نے حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کے لئے کیا تھا۔ خطرات سے دوچار جنگلات کو بچانے سے متعلق اس پروگرام میں کمیونٹی مالی طور پر حصہ دار ہے۔ اسی طرح اگر کمیونٹی کو یہ احساس ہو جائے کہ جنگلات کے ذخائر کو بچانے، ان کا تحفظ کرنے اور ان میں اضافہ کرنے میں اس کا اپنا مالی مفاد ہے تو نظم و نسق کی کمزوری پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں، دیگر صوبوں کی صورتحال وہاں کی حکمران جماعتوں کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ماحول ان جماعتوں کے انتخابی منشور میں شامل نہیں۔

یہ ایک ایسے ملک کی صورتحال ہے جو گزشتہ تین سالوں سے عالمی موسمی خطرات کے گوشوارے میں دس سرفہرست ممالک میں شامل رہا ہے؛ جس کا جنگلات پر مشتمل رقبہ ایشیا میں سب سے کم اور جنگلات کی کٹائی کی شرح سب سے زیادہ ہے؛ ایک ایسا ملک جہاں پانی کم یاب ہوتا جا رہا ہے؛ جس کے شہر دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں شمار ہوتے ہیں؛ جہاں شہرکاری کی شرح جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے، اور جسے وسائل کے محدود استعمال، کچی آبادی میں سکونت اور نقل مکانی کے سماجی و معاشی اثرات جیسے مسائل کا سامنا ہے؛ جہاں ماحولیاتی تباہی کے باعث جی ڈی پی کا تقریباً 6 فیصد صحت پر خرچ ہو جاتا ہے۔

ان اقدامات کے علاوہ پاکستان نے ہزار سالہ ترقیاتی اہداف (ایم ڈی جیز) کے ہدف 7 کی بھی منظوری دی جس کا مقصد ''ماحولیاتی استحکام کو یقینی بنانا'' ہے۔ ان اہداف کے حصول کی جانب پاکستان کی پیش رفت کے جائزے سے متعلق یو این ڈی پی کی رپورٹ میں ہدف 7 کے بارے میں یہ کہا گیا:

''جہاں تک ایم ڈی جی 7 کا تعلق ہے، تو اگر پانی کے تین بہتر ذرائع کی بات کی جائے تو پاکستان نے بہتر آبی وسائل تک رسائی کا ہدف حاصل کرلیا ہے۔ ان تین ذرائع میں نلکے کا پانی، دستی نلکے کا پانی اور بجلی کی موٹر سے نکالا جانے والا پانی شامل ہیں۔ پاکستان نے نو لاکھ بیس ہزار گاڑیوں کو سی این جی گاڑیوں میں بدلنے کے ہدف کو بھی عبور کرلیا ہے اور اطلاعات کے مطابق 2008ء میں اٹھائیس لاکھ گاڑیاں سی این جی پر چل رہی تھیں۔ پاکستان مجموعی رقبے کے تناسب سے جنگلی حیات کے تحفظ کے لئے زمین کے تحفظ کے ہدف کے حصول کی راہ پر گامزن ہے، جو ایم ڈی جی 7 کا ایک ہدف ہے۔

اسی طرح جہاں تک ایم ڈی جی 7 یعنی ماحولیاتی تحفظ کو یقینی بنانے کا تعلق ہے تو اگرچہ پاکستان نے چند اہداف کے حوالے سے نمایاں پیش رفت کی ہے جس کی بدولت 2015ء کے اہداف حاصل ہونے کا امکان ہے، تاہم یہ جنگلات پر مشتمل علاقوں، ہائی سپیڈ ڈیزل میں گندھک کی آمیزش، آبادی کو صحت وصفائی تک رسائی سے متعلق مساوات پر مبنی اہداف سے کافی پیچھے تھا۔ ماحولیاتی مسائل سے متعلق آگہی کے فقدان کے علاوہ سرکاری ضوابط کی کھلی خلاف ورزی کے باعث اس کمی کو پورا کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

باوجود اس کے کہ پاکستان ان اہداف سے کافی پیچھے ہے جو پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد پر اثر انداز ہوتے ہیں، ان اہداف کو پورا کرنے کے عزم کا اظہار اس بات سے ہوتا تھا کہ پاکستان نے ریو+20 کے اجلاس میں مستحکم ترقیاتی اہداف کی منظوری دی۔ ان اہداف کو ایسی عمارت کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس کی بنیاد ایم ڈی جیز نے رکھی تھی۔ اس کا مقصد ایم ڈی جیز کے ادھورے کام کو مکمل کرنا، اور نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان اہداف کا ایجنڈا زیادہ جامع ہے اور ان میں ماحولیات کو ایک اہم موضوع کے طور پر شامل کیا گیا ہے جسے منصوبہ بندی کمیشن کی جانب سے اپنائے گئے وژن 2025ء سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔

یہ پاکستان تحفظ ماحولیات ایکٹ (پیپا 1997ء) میں بیان کی گئی ماحولیات کی تعریف سے ہم آہنگ بھی ہے، جس کے مطابق:

''ماحولیات'' کا مطلب ہے:

(الف) ہوا، پانی اور زمین؛

(ب) فضاء کی تمام تہیں ؛

(ج) تمام نامیاتی اور غیر نامیاتی مادے اور جاندار:

(د) ماحولیاتی نظام اور ماحولیاتی تعلقات ؛

(ہ) عمارتیں، شاہراہیں، سہولیات اور کام:

() گروہی زندگی کو متاثر کرنے والے تمام سماجی اور معاشی حالات ؛ اور

() ذیلی شق (الف) تا () میں بیان کئے گئے عناصر کے درمیان تعلق ؛

منصوبہ بندی کمیشن اور اقوام متحدہ پروگرام برائے ماحولیات (یو این ای پی) کی جانب سے ''پاکستان میں ماحولیاتی اور موسمی تبدیلی کا مشاہدہ'' کے عنوان سے تیار کی گئی رپورٹ کے مطابق 2000ء کے بعد اس احساس میں اضافہ ہوا ہے کہ ماحولیاتی مسائل کو معاشی ترقی پر فوقیت دی جانی چاہئے۔ شعبوں سے متعلق وضع کی گئی متعدد پالیسیاں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ نہ صرف ان کے ذریعے سماجی شعبوں کے درمیان ربط قائم کیا گیا ہے بلکہ ان پالیسیوں میں ماحولیات سے متعلق ایک زیادہ جامع حکمت عملی بھی اپنائی گئی ہے۔ ترجیحات میں یہ تبدیلی 1992ء میں اپنائی گئی قومی حکمت عملی برائے تحفظ کا تسلسل ہے۔

ان میں درج ذیل پالیسیاں اور پروگرام شامل ہیں:

پاکستان ایکشن پلان برائے حیاتیاتی تنوع 2000ء

پاکستان میں زمین کو صحرا برد ہونے سے بچانے سے متعلق قومی ایکشن پروگرام 2002ء

غربت میں کمی سے متعلق حکمت عملی 2003ء

قومی پالیسی برائے تحفظ توانائی 2006ء

قومی پالیسی برائے صحت وصفائی 2006ء

پاکستان پروگرام برائے آبی علاقہ جات 2007ء

انرجی سیکیورٹی ایکشن پلان 2005ء

پینے کے صاف پانی سے متعلق قومی پالیسی 2009ء

قومی پالیسی برائے آب 2005ء

قومی رینج لینڈ پالیسی

قومی پالیسی برائے جنگلات

قومی پالیسی برائے موسمی تبدیلی

یہ تمام پالیسیاں عملی طور پر ان تمام سرگرمیوں اور باہمی تعاملات کا احاطہ کرتی ہیں جو مستحکم نہ بھی ہوں تو انسانی حقوق پر اثر انداز ضرور ہوں گے۔

پانی تمام انسانوں، نباتات اور حیوانات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا، اسے علاقائی، بین الاقوامی اور صوبائی سطح پر دستیابی اور مساوی تقسیم کے زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے، اور بنیادی اصول دریا کے کنارے آباد نچلے دریائی علاقوں کے حقوق کا تحفظ ہونا چاہئے۔

پاکستان نے پہلے ہی سندھ طاس معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں جس کا تنازعات کے تصفیے کا اپنا طریقہ کار ہے جس کے مطابق ہندوکش اور ہمالیہ کے پہاڑوں سے آنے والے پانی کو پاکستان اور انڈیا میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دو بڑی جنگوں اور کئی کارگل جیسے کئی مسلح تنازعات کے باوجود یہ معاہدہ قائم رہا۔

بڑھتی ہوئی آبادی اور بالخصوص زراعت کے لئے پانی کی طلب کے باعث اس معاہدے کی تشریح سے متعلق کئی تنازعات نے جنم لیا۔ بین الاقوامی ثالثوں کے فیصلے اب تک انڈیا کے حق میں رہے ہیں جس کی وجہ موسمی تبدیلی کا عنصر ہے جو کہ معاہدے کے مسودے کی تیاری کے وقت مقبول عام نہیں تھا۔

انڈیا کی جانب سے مشرقی دریاؤں پر آبی ذخائر تعمیر کئے جانے کے باعث پاکستان میں کم پانی داخل ہوا۔ اس صورتحال کو ''آبی جنگیں'' قرار دیا گیا اور بہت سے لوگوں نے اس معاملے پر دونوں ممالک کے اختلافی موقف سے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ صورتحال اس وقت سنگین ہوگئی جب 2014ء میں چناب میں توقع سے زیادہ پانی داخل ہو گیا جس کے باعث بہت سے علاقوں میں سیلاب آ گیا اور اسے بھی اشتعال انگیزی کی علامت سمجھا گیا۔

عالمی بینک جیسی بین الاقوامی ایجنسیاں تجویز کرتی ہیں کہ ''ہمسایہ ممالک کے ساتھ یو این ڈی پی / عالمی ادارہ ماحولیات (جی ای ایف) کے ذریعے کام کیا جائے تاکہ صنعتی، گھریلو اور زرعی فضلہ جات کے موثر انصرام کے ذریعے کیمیائی اور حیاتیاتی آلودگی پر قابو پایا جا سکے۔''

اگر دریائے راوی کے زوال اور راوی میں شامل ہونے والے انڈیا کے ہڈیارا نالے سے پھیلنے والی آلودگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو تیسرے فریق کی نگرانی میں دوطرفہ مذاکرات ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ دریائے راوی سے وابستہ لوگوں کی زندگیوں کا انحصار اس دریا کی صحت پر ہے چاہے وہ کسان ہوں، ماہی گیر ہوں یا وہ کشتی مالکان ہوں جو ان کشتیوں کو نقل و حمل اور تفریح کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

پانی کی تقسیم کے پیچیدہ موضوع کے حوالے سے پائی جانے والی غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اختلافی آراء کے باعث نہ صرف ان دو ہمسایہ ممالک، بلکہ پاکستان میں صوبوں کے درمیان بھی بے

چینی پائی جاتی ہے۔ 1991ء پانی کی تقسیم آب ایوارڈ کے باوجود، نچلے دریائی علاقوں کے مکینوں کی جانب سے ہمیشہ یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انہیں مقررہ مقدار سے کم پانی جاری کیا گیا۔

صوبہ سندھ کے لئے مقرر کئے گئے 48.76 ملین ایکڑ فٹ پانی کے حوالے سے عالمی ماہرین کے پینل نے تجویز کیا کہ:

کوٹری بیراج سے پورا سال فی سیکنڈ پانچ ہزار کیوبک فٹ پانی کا اخراج تجویز کیا گیا ہے کیونکہ ماحولیات کے لئے سمندر کی جانب اتنا پانی بہانے کی ضرورت ہے جس سے ڈیلٹا کا علاقہ دوبارہ بھر جائے۔ اس نے تجویز دی کہ کسی بھی پانچ سالہ عرصے میں سیلاب کے دوران 25 ملین ایکڑ فٹ یا سالانہ پانچ ملین ایکڑ فٹ پانی چھوڑا جائے۔

دریائے سندھ کی سلامتی سے متعلق ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان اور ڈبلیو ڈبلیو ایف برطانیہ کی ایک رپورٹ میں دریا کے مربوط انصرام پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے یہ تجویز کیا گیا کہ کسانوں کو، بالخصوص فارم کی سطح پر، پانی کے استعمال سے متعلق فیصلہ سازی کے عمل میں شامل کیا جائے۔ فی الوقت انہیں ٹیکنالوجی کے فوائد، جیسے کہ موسم کی بروقت معلومات، فصلوں کی کٹائی اور فصل کے لئے ضروری لوازمات سے متعلق معلومات تک رسائی نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کے جدید ذرائع جیسے کہ کمپیوٹر، موبائل فون، اور آئی سی ٹی کے دیگر ذرائع تک رسائی کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک فضلہ جات کو تلف کرنے سے متعلق حفاظتی اقدامات بھی کئے جانے چاہئیں، جس کے لئے قانون سازی سے متعلق کوئی فریم ورک موجود نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے دیہی علاقوں میں ان آلات کا استعمال دیر سے شروع ہوا ہو تاہم شہری علاقوں میں ان کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان آلات کے متروک ہونے کی شرح بہت زیادہ ہے۔ چونکہ ان آلات کے بہت سے اجزاء نقصان دہ ہیں اس لئے انہیں تلف کرتے وقت ایسے رہنما اصولوں کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے جو باسل کنونشن کے مطابق ہوں۔

میثاق، قوانین اور ضوابط وہ بنیاد ہے جس پر کسی نظام کو فعال بنایا جاسکتا ہے۔ پانی سے متعلق تحقیقاتی رپورٹیں بھی ایسے جامع آبی قوانین کا تقاضہ کرتی ہیں جو پانی کے حقوق، استعمال، قدرو قیمت، تحفظ اور تعین قیمت، سبسڈی، لائسنس اور ماحول کو آلودہ کرنے پر جرمانوں کے نفاذ سے متعلق اصولوں کی تشریح کرتے ہوں۔

پانی کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لئے آبی ذخائر تعمیر نہیں کئے گئے جس کے باعث پانی کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ تاہم ایسا کوئی بھی منصوبہ تیار کرتے وقت ان علاقوں کے مکینوں کے حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے جہاں یہ ذخائر اور ڈیم تعمیر کئے جانے ہوں۔ اس کے علاوہ ثقافتی ورثے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے جسے خاص طور پر بالائی علاقوں میں خطرات لاحق ہیں۔ مثال کے طور پر گلگت بلتستان میں دیامیر

بھاشا ڈیم کی تعمیر سے گندھارا تہذیب کے نقش ونگار کا نام ونشان مٹ جانے کا امکان ہے۔

کوٹری بیراج سے پانی کے کم بہاؤ کے ایک برے اثر کا حوالہ آئی یو سی این پاکستان کی رپورٹ میں دیا گیا ہے جو کہ سندھ میں ماحولیاتی تباہی کی بدترین مثال ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ: ''یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ٹھٹھہ اور بدین کے ساحلی علاقوں میں کئی ہزار ہیکٹیر رقبے کی تباہی کا سبب سمندر میں خلل اندازی ہے، جس کے باعث اہم زرعی اراضی بنجر ہوگئی، پانی ذخیرہ کرنے والی چٹانیں آلودہ ہوگئیں اور ساحل سمندر کے قریب واقع دریا اور ڈیلٹا کے علاقوں کا ماحول تباہ ہوگیا۔ زمین اور پانی کے ذرائع کے انحطاط نے ماہی گیری اور زراعت کو بری طرح متاثر کیا جو مقامی آبادیوں کے دو بنیادی روزگار ہیں۔ اس کا نتیجہ روزگار سے محرومی، دورافتادہ علاقے کی جانب نقل مکانی اور غربت کی سطح میں اضافے کی صورت میں نکلا۔'' ساحلی علاقوں کے مکینوں کے انسانی حقوق پر جو سمجھوتے کئے گئے یہ چند نکات بذات خود ان سب کا احاطہ کرتے ہیں۔

زراعت، صنعت، شہری استعمال اور ماحولیاتی بہاؤ کے لئے پانی کی مساوی دستیابی اب بھی ایک باعث نزاع معاملہ ہے، بالخصوص موسمی تبدیلی کے باعث گلیشیئروں کے پگھلنے کے پیش نظر۔ پانی کے تحفظ کے فروغ کے لئے ماہرین تجویز کرتے ہیں کہ ڈیموں اور آبی ذخائر کی تعمیر کے علاوہ پانی پر دی گئی سبسڈیاں بھی ختم کی جائیں اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ پانی ایک مفت ذریعے کے طور پر دستیاب نہ ہو (پانی ذخیرہ کرنے والی چٹانوں کا انصرام)۔

زمین سے پانی نکالنے کے لئے بجلی کے استعمال پر دی جانے والی سبسڈی نے بلوچستان کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر تباہی برپا کی ہے، اور اس کے باعث زمین کی تہہ میں پانی کے ذخائر کم ہوگئے ہیں۔ ایک ایسا علاقہ جہاں غربت میں کمی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہاں ٹیکس عائد کرنا ایک ایسا اقدام ہے جس پر احتیاط سے غور کیا جانا چاہئے، تاہم کامیاب پائلٹ سکیمیں آئی یو سی این پاکستان جیسی ماحولیاتی تنظیمیں چلاتی رہی ہیں، ان سکیموں میں واٹر میٹرنگ کا طریقہ کار اپنایا گیا جس کا براہ راست نتیجہ پانی کے تحفظ کی صورت میں نکلا۔ آلودگی پھیلانے پر جرمانے کی ادائیگی کے تصور کے ذریعے بھی پانی کے ذرائع کو آلودہ ہونے سے بچانے میں مدد ملی ہے۔

ایک اور ایم ڈی جی جو حاصل نہ ہوسکا وہ تمام لوگوں کے لئے پینے کے صاف پانی کی دستیابی تھا۔ پانی کے معیار کا صحت پر براہ راست اثر پڑتا ہے کیونکہ پانی سے جنم لینے والی بیماریاں سب سے پہلے آبادی کے ان حصوں پر اثر انداز ہوتی ہیں جنہیں پینے کے صاف پانی تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

نیشنل اینوائرنمنٹ کوالٹی سٹینڈرڈز (نیکس) کی پیروی اور نگرانی نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری،

صنعتی اور کیمیائی فضلہ جات کے علاوہ بارش کے دوران زراعتی بہاؤ، جو اپنے ساتھ آلودگی بھی ندیوں، دریاؤں، جھیلوں اور سمندر میں لے جاتا ہے، کے باعث آبی گزرگاہیں آلودہ ہوچکی ہیں۔

کھلی ہوا میں پاخانہ کرنے اور پانی کو صاف کرنے کی سہولیات کے فقدان کا نہ صرف پانی کے معیار بلکہ ساحلی پٹی میں سمندری زندگی کی صحت اور تازہ پانی کے ذخائر پر بھی برا اثر پڑا۔ اس سے غذائی زنجیر کا ایک اہم جزو آلودہ ہوگیا اور اس کے باعث تجارت سے وابستہ آبادیوں کی صحت اور روزگار متاثر ہوا۔

فضلہ جات کا انصرام

ٹھوس فضلہ جات، صنعتوں اور ہسپتالوں کے نقصان دہ کیمیکل اور الیکٹرانک فضلہ جات کے محفوظ انصرام کا تعلق بھی صحت اور ماحول سے ہے۔ چینیوں اور ترکوں کے ساتھ کئی سال تک وقتاً فوقتاً ہونے والے مذاکرات کے باوجود ہم ٹھوس فضلہ جات کو تلف کرنے سے متعلق کوئی منصوبہ شروع نہیں کر پائے۔ نقصان دہ کیمیکل اور بھاری دھاتوں پر مشتمل صنعتی فضلہ بغیر صفائی کے سمندر یا آبی ذخائر میں شامل ہوجاتا ہے۔

مثال کے طور پر ضلع دادو کی منچھر جھیل اس سطح تک زہریلی ہوچکی تھی کہ ماہی گیروں کی پوری آبادی بے گھر ہوگئی کیونکہ ان سے ان کی خوراک اور روزگار کا ذریعہ چھین لیا گیا تھا۔

نقصان دہ کیمیکلز والے صنعتی فضلہ جات اور بھاری دھاتوں کو فلٹر کیے بغیر پانی میں چھوڑ دیا جاتا تھا

خوراک اور توانائی کی سلامتی کا دارومدار بھی پانی پر ہے۔

پانی کے کم ہوتے ذرائع کا غذائی تحفظ پر شدید اثر پڑے گا جو آبادی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی شرح، جو تمام ترقیاتی اہداف پر سبقت لے گئی ہے، کی وجہ سے پہلے ہی باعث تشویش معاملہ ہے۔

تاہم ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ملک میں اتنی زمین اور صلاحیت ہے کہ اگر اس زمین کا معقول استعمال کیا جائے تو یہ اپنی آبادی کو خوراک مہیا کر سکتا ہے۔ زراعت پر انحصار کرنے والا معاشرہ مختلف طریقوں سے توجہ مانگتا ہے۔ بے زمین کسانوں کو زمین فراہم کر کے، اور انہیں شراکت دار بنا کر زیر کاشت اراضی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

پٹے پر زمین کی فراہمی جیسے اقدامات محض دھوکا ہیں کیونکہ جن لوگوں کو پٹے پر زمین دی گئی وہ کبھی بھی زمین کے مالک نہ بن سکے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے شراکت داروں کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے سے بھی قاصر تھے۔

موسمی تبدیلی

مون سون کے تغیر پذیر انداز موسمی تبدیلی کا باعث بنے ہیں جس کی وجہ سے غذائی تحفظ کو خطرہ لاحق ہے۔ مسلسل تیسرے سال مون سون سے پہلے مارچ میں ہونے والی شدید بارشوں کی وجہ سے فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اس وقت منصوبہ سازوں کو ایسے منصوبہ تیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے یا تو متبادل فصل یا ایسی اقسام متعارف کرائی جا سکیں جو موسم کے بدلتے انداز کا مقابلہ کر سکیں۔

کسان برادری ان تبدیلیوں کے نشانے پر ہے اور انہیں سہارا دینے اور غذائی تحفظ کو یقینی بنانے میں ان کی مدد کرنے کے لئے خاطر خواہ حفاظتی اقدامات نہیں کئے گئے۔ کسان برادری کو اس شعبے کی ترقی سے متعلق تحقیق اور معلومات سے باخبر رکھنا ضروری ہے۔ کسانوں کو مسلسل تیسرے سال مون سون سے پہلے ہونے والی شدید بارشوں اور ژالہ باری کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔ اس بارشوں کی وجہ سے مال مویشیوں اور فصل کو نقصان پہنچا جو کٹائی کے لئے تیار تھی۔

موسمی تبدیلی کے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ مون سون کے اس بدلتے انداز کو دیکھتے ہوئے ملک کے زرعی شعبے میں فوری طور پر حسب ضرورت اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں لمز / ڈبلیو ڈبلیو ایف/ لیڈ کی جانب سے آئی ڈی آر سی کی فنڈنگ کے تحت معاشیاتی شماریات پر ہونے والی تحقیق میں یہ صاف ظاہر تھا کہ جن کسانوں نے گردش فصل اور متبادل فصل جیسے حسب ضرورت طریقہ کار اپنائے انہیں 40 فیصد زیادہ پیداوار حاصل ہوئی۔

پاکستان میں موسمیاتی تبدیلیوں کی درست پیشین گوئیوں کا فقدان

کسانوں کی تحریک، جو اب بھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے، کی بحالی نو کے ذریعے کمزور کاشتکاروں کے حقوق کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ پیشہ ورانہ کسان انجمنیں، جو اب ضلع اور حتیٰ کہ کچھ یونین کونسلوں میں بھی تشکیل دی جارہی ہیں، انہیں مضبوط کرنے کے ضرورت ہے تاکہ کاشتکار برادری کے لئے حفاظتی اقدامات کو یقینی بنایا جاسکے۔ کسان برادری کے متحد ہونے سے حکومت کو ایک ایسا ساتھی مل جاتا ہے جس سے وہ قیمتیں اور سبسڈیاں طے کرتے وقت مذاکرات کرسکتے ہیں۔ گزشتہ دو سالوں میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسانوں نے اپنے لئے بہترین نرخ مقرر کروانے کے لئے پہلے سے زیادہ فعال کردار ادا کیا۔

ماہرین زرعی معاشیات، جیسے کہ ڈاکٹر پرویز عامر، کے مطابق اس مسئلے کا حل یونین کونسل کی سطح تک مرکزیت کا مکمل خاتمہ ہے۔ ڈاکٹر پرویز کا کہنا ہے کہ پاکستان کے نومختلف زرعی ماحول کو مختلف مسائل درپیش ہیں اس لئے ان کا حل بھی چھوٹی سطح پر تلاش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کے حقوق کے تحفظ کیا جاسکے اور تمام لوگوں کے لئے غذائی تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔

کسانوں کو مسائل کے حل کے لئے مرتب کی جانے والی شراکتی حکمت عملی کا حصہ ہونا چاہئے اور گفتگو اور نفاذ میں خواتین کی شمولیت پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ خواتین ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد زراعت کے شعبے سے وابستہ ہے مگر ان میں سے زیادہ تر اجرت پر کام کرنے والے ایسے بے آواز کسان

اسلام آباد میں سول سوسائٹی کے اراکین ٹنل پراجیکٹ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

ہیں جنہیں فصل کے چناؤ یا قیمتوں سے متعلق فیصلوں میں اپنی رائے دینے کا اختیار نہیں۔ انہیں اپنے مرد ساتھیوں کے برابر معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا، اور زراعت میں استعمال ہونے والے کیمیکل کے باعث ان کی صحت کو جو خطرات لاحق ہیں، انہیں ان سے بھی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا۔

ماہی گیری کے شعبے کی صورتحال بھی کچھ ایسی ہی ہے جس سے خواتین مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد وابستہ ہے۔ ساحل سمندر، دریاؤں اور نہروں کے کنارے آباد ماہی گیر اپنے علاقے کے ماحول کی تباہی کے باعث کم مچھلیاں پکڑ پاتے ہیں، جس کے باعث وہ نہ صرف محرومی کا شکار ہیں بلکہ اس سے ان کے ذریعہ معاش کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ یہاں بھی غیر قانونی جال کو باضابطہ بنانے میں غفلت اور قوانین کے غیر موثر نفاذ کا براہ راست اثر ماہی گیر آبادیوں پر پڑا۔ یہ قوانین اندرون صوبہ جات بڑے جال کے ذریعے شکار کے علاوہ بڑے جال سے مچھلی پکڑنے والے بین الاقوامی ماہی گیروں کو ایکسکلوز وا کنامک زون کے باہر، اور بیشتر اوقات اس کے اندر شکار کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

ماہی گیری سے وابستہ کئی دیہات کے نوجوان ملاحوں کی ایک بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں نقل مکانی کر گئی ہے۔ اس سے نہ صرف ان برادریوں کے سماجی ڈھانچے میں بگاڑ پیدا ہوا بلکہ اس سے آس پاس کے ان شہری علاقوں پر بھی بوجھ پڑا جو ایک مقناطیس کا کام کرتے ہیں اور ان لوگوں کو ان شہروں کی طرف کھینچتے

ہیں جن کا انفراسٹرکچر اور شہری سہولیات اس قابل نہیں کہ وہ نقل مکانی کرنے والی آبادی کی ضروریات کو پورا کرسکیں۔

آبی وغذائی تحفظ اور بجلی کی قلت

ماحولیاتی حقوق سے متعلق مسائل کا بجلی تک رسائی سے بھی تعلق ہے جس کا اثر غذائی اور آبی تحفظ پر پڑتا ہے۔ بجلی کی رسد اور طلب کا فرق سیاسی طور پر ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔ موجودہ حکومت بجلی کے بحران کے حل کے حوالے سے کیے گئے وعدوں کے ذریعے اقتدار میں آئی لیکن یہ مسئلہ دور دور تک حل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

بجلی کی قلت نے زراعت اور صنعت سمیت تمام شعبوں کو متاثر کیا چاہے اس کا سبب پیداوار تھا یا پھر ترسیل۔ اس کے غیر معمولی اثرات کے نتیجے میں نہ صرف پیداوار متاثر ہوئی بلکہ بے روزگاری اور غربت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ بجلی کے انفراسٹرکچر، جس میں تکنیکی خامیوں کے علاوہ عملیاتی خامیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں، میں اصلاح کے علاوہ توانائی کے دیگر ذرائع بھی تلاش کیے جا رہے ہیں۔

آئی پی آئی (ایران پاکستان انڈیا) پائپ لائن یا موجودہ آئی پی پائپ لائن پر وقفے وقفے سے ہونے والے مباحثوں اور تاپی (ترکمانستان افغانستان پاکستان انڈیا) کے لئے بیرونی حمایت کے علاوہ تھر میں کوئلے کے ذخائر پر بھی توجہ دی جارہی ہے جنہیں ملک کے توانائی سے متعلق تمام مسائل کا حل قرار دیا جارہا ہے۔

ماہرین ماحولیات کے علاوہ شہری حقوق کے کارکن ان دو پہلوؤں کے حوالے سے خبردار کرتے رہے ہیں: پہلا، کوئلے کا معیار، اور اس میں گندھک کی آمیزش، جو ماحول کے لئے نقصان دہ ہے، اور دوسرا، مقامی وسائل سے مستفید ہونے سے متعلق مقامی برادریوں کے حقوق۔

جہاں تک کوئلے، بالخصوص تھر کے کوئلے کا تعلق ہے، تو اس کا استعمال اس میں پائے جانے والے معدنی اجزاء کی وجہ سے بہت سے نقصانات کا باعث بنتا ہے۔ آلودہ توانائی کا یہ ذریعہ ہوا کے معیار سے متعلق گوشوارے میں پاکستان کے درجے میں بہتری لانے میں مدد نہیں دے گا۔ ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کے شہری علاقوں کی فضائی آلودگی سے ہونے والا نقصان جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے جو پاکستان میں اموات اور امراض کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ایسا عام طور پر شہروں میں دیکھنے میں آیا ہے جس کا سبب گاڑیوں سے خارج ہونے والا ڈیزل کا دھواں، ہوا میں مضر صحت مادوں کی آمیزش اور جنگلات کی کمی ہے جو کاربن کو جذب کرنے کا کام کرتے ہیں۔ تاہم یہ کہا جاتا ہے کہا کھدائی کے ذریعے زمین سے نکالے جانے والے کوئلے اور تیل کے محدود ذخائر سے کم توانائی حاصل ہوتی ہے جو نہ صرف پیسے کا ضیاع ہے بلکہ اس سے غیر شہری علاقوں میں ہوا کا معیار بھی بری

طرح متاثر ہوگا۔

زمین سے کوئلہ اور تیل نکالنے والی صنعتیں ماحول کے لئے کافی نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں۔ایک اور اہم بات جس کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی کھدائی میں پانی وافر مقدار میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ شیل گیس کے معاملے میں دیکھا گیا جسے توانائی کے بحران کا زیادہ موثر حل قرار دیا جا رہا ہے۔ان دونوں کے لئے پانی کی ایک بہت بڑی مقدار درکار رہے۔پاکستان جیسے پانی کی قلت کے خطرے سے دوچار ملک میں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔

معدنی ایندھن سے مستفید ہونے سے متعلق بحث میں شراکت داروں کی شمولیت یا تو بہت کم رہی ہے یا پھر انہی اس میں شامل ہی نہیں کیا جاتا رہا۔تھر ملک کے غریب ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔یہاں بہت کم لوگوں کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔یہاں کی آبادی ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کا ایک بہت بڑا مسئلہ پینے کے پانی کی دستیابی ہے۔ان لوگوں کا مکمل انحصار زیر زمین پانی پر ہے۔گیس کے حصول کے لئے پانی کے استعمال سے اس قدرتی ذریعے پر ان لوگوں کا حق شدید خطرے میں پڑ جائے گا۔تھر کے لوگ اپنی آبائی زمین اور اس کے وسائل پر اپنے حق سے محروم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

مقامی لوگ

''مقامی لوگوں'' کی حالت بھی تھر کے لوگوں جیسی ہی ہے جنہیں آئین میں مقامی لوگوں کے طور پر بیان نہیں کیا گیا، اور ان کے حقوق کے لئے کسی قسم کے قوانین موجود نہیں۔روایتی ماہی گیری اور مویشی پروری سے وابستہ کئی آبادیاں اقوام متحدہ کی جانب سے بیان کی گئی تعریف کے زمرے میں آتی ہیں جس نے تمام ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ اپنی قومی تعریفیں مرتب کریں اور ان کے تحفظ کے لئے قوانین بنائیں۔تاہم پاکستان نے اس حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جس زمین پر سفر کرتے ہیں یا جس پر وہ رہتے ہیں اس پر ان کے حقوق، اور اس زمین کے وسائل انہیں انصاف سے رجوع کرنے کا موقع دیے بغیر ان سے چھین لئے جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ برادریوں کے حقوق کو نہ صرف تھر میں خطرات درپیش ہیں، بلکہ ساحل کے کنارے رہنے والی آبادیوں کو بھی ان کی زمین سے محروم کیا جا رہا ہے اور ترقیاتی سکیموں کے نام پر ان سے روایتی روزگار کے ذرائع چھینے جا رہے ہیں۔مثال کے طور پر، پاکستان کی ساحلی پٹی جو کہ انڈیا کے سرحدی علاقے سر کریک سے شروع ہوتی ہے، سندھ کے ساحل کے ساتھ دو لاکھ تینتالیس ہزار ہیکٹیرز اور بلوچستان کے ساحل کے ساتھ سات ہزار چار سو ہیکٹیرز پر محیط ہے۔

ساحلی جنگلات

مینگروز فار فیوچر کے مطابق، پاکستان میں ساحلی جنگلات کی معاشی اہمیت ان میں پناہ لینے والے ماہی گیری کے ذرائع کی وجہ سے ہے۔ایک اندازے کے مطابق سمندر سے پکڑی جانے والی 80 فیصد مچھلیاں اپنی زندگی کا ایک حصہ ساحلی جنگلات کی ندیوں میں گزارتی ہیں، یا ساحلی جنگلات کے ماحولیاتی نظام میں موجود غذائی زنجیر پر انحصار کرتی ہیں۔ساحلی جنگلات سے نکلنے والے جھینگے ملک کی مچھلی کی برآمدات سے حاصل ہونے والے 10 کروڑ ڈالرز زرمبادلہ کا 64 فیصد ہیں۔

پاکستان میں ایسے قوانین موجود ہیں جن کی تحت ساحلی جنگلات کی کٹائی پر پابندی ہے، اور پاکستان نے ساحلی علاقوں میں ایک دن میں سب سے زیادہ پودے لگانے والے ملک کے طور پر دو مرتبہ اپنا نام گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں درج کرایا لیکن اس کے باوجود سمندری مسکن کا خاتمہ اور تباہی جاری ہے۔ سمندری وسائل میں کمی کا ان برادریوں پر براہ راست اثر پڑتا ہے جن کے ذریعہ معاش کا انحصار ماہی گیری پر ہے۔ پاکستان فشر فوک فورم کے اندازے کے مطابق ماہی گیری سے وابستہ افراد کی تعداد چالیس لاکھ ہے، جن میں سے بیس لاکھ افراد سمندری ماہی گیری اور باقی افراد دریائی ماہی گیری سے وابستہ ہیں۔

ترقیاتی منصوبے

لوگوں کے علاقوں پر جبری طور پر بڑے ترقیاتی منصوبے اور رہائشی سکیمیں تعمیر کی گئیں اور انہیں ان ترقیاتی منصوبوں کے فوائد سے محروم رکھا گیا۔اس کے علاوہ، ساحل کے ساتھ واقع صنعتیں اپنا فضلہ بغیر صفائی کے سمندر میں خارج کرتی ہیں۔لہٰذا وہ ندیاں اور دریائی گزرگاہیں جو کبھی سمندری حیات سے مالا مال تھیں اب ان میں سمندری حیات بہت کم رہ گئی ہیں۔ ماحولیاتی تنظیموں کی جانب سے تجربے کے لئے اکٹھے کئے گئے نمونے یہ ظاہر کرتے تھے کہ مچھلیوں اور دیگر سمندری حیات میں بھاری دھاتوں کے عناصر موجود تھے۔ نیکس کی ہدایات کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے جس کے تحت صنعتیں فضلہ جات کو صاف کرنے والے پلانٹ لگانے کی پابند ہیں۔

کراچی جیسے بڑے شہر میں صنعتی اور شہری فضلہ براہ راست سمندر میں پھینکا جا رہا ہے جس سے سمندر کی صحت شدید خطرے میں ہے اور صوبائی تحفظ ماحولیات ایجنسی نے آلودگی پھیلانے والوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی۔اگر جرمانے عائد کئے بھی جاتے ہیں تو وہ اتنے معمولی ہوتے ہیں کہ وہ منافع خوری کے خلاف بے اثر ثابت ہوتے ہیں، اور اسی وجہ سے ماحولیاتی تباہی کا عمل جاری ہے۔

لاہور کینال کے کنارے لگے درخت گرائے گئے

ماحولیاتی تحفظ کے لیے شہریوں کا سرگرم کردار

2014ء کی ایک خاص بات ماحولیاتی مسائل سے متعلق حقوق پر مبنی فعالیت تھی۔ عدالتی اور شہری سطح پر ماحولیات سے متعلق آگہی میں اضافہ ہوا اور ایک واضح پیش رفت دیکھنے میں آئی۔ شہلا ضیاء کیس، جس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ایک صاف اور صحت مند ماحول زندگی کا حق ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں حکومت فعال نہیں تھی وہاں شہریوں کی ایک بڑی تعداد نے حقوق کی خلاف ورزیوں کی نشاندہی کی۔

مثال کے طور پر اسلام آباد میں مارگلہ ہلز ٹنل کیس، جو کہ محفوظ علاقوں اور نیشنل پارکس سے متعلق قوانین سے متصادم تھا، یا لاہور کینال روڈ کیس جس میں درختوں کی بڑے پیمانے پر کٹائی کی جانے والی تھی، کی نشاندہی کرنے میں شہریوں نے فعال کردار کیا اور اس کے خلاف قانون سے رجوع کیا۔

مارگلہ ہلز ٹنل کیس میں یہ منصوبہ تو ملتوی کردیا گیا لیکن لاہور کینال کیس میں نشیب وفراز دیکھنے میں آئے اور پنجاب حکومت اس منصوبے کی تکمیل میں جزوی طور پر کامیاب ہوگئی جس پر شہری یہ معاملہ سپریم کورٹ میں لے گئے۔

حیاتیاتی تنوع کے تحفظ سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی کے معاملے پر حکومتی شعبے پیچھے ہٹتے دکھائی دیے، جس پر شہریوں نے مداخلت کی، جیسا کہ ہوبارا بسٹرڈ پرندوں کے معاملے میں دیکھا گیا جس کے

شکار کے لئے دفتر خارجہ نے غیر قانونی طور پر لائسنس جاری کئے تھے جو ایسا کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

بلوچستان ہائی کورٹ نے فوری طور پر شکار پر پابندی عائد کردی اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی کاروائی کی گئی۔ خیبر پختونخوا میں بھی محکمہ جنگلی حیات کے اہلکاروں کو اس وقت معطل کردیا گیا جب شہریوں نے میڈیا کے ذریعے نادر پرندوں کے شکار میں ان کی ملی بھگت کو بے نقاب کیا۔

ایک اور مثبت پیش رفت اس وقت دیکھنے میں آئی محکمہ جنگلی حیات سندھ اور ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان کی کوششوں سے 200 بلیک پونڈ کچھوؤں کو چین سے پاکستان لایا گیا۔ ان کچھوؤں کو چین سمگل کیا گیا تھا باوجود اس کے کہ پاکستان نے 1979ء سے سائٹس (حیوانات و نباتات کی خطرے سے دوچار اقسام کی بین الاقوامی تجارت سے متعلق میثاق) پر دستخط کر رکھے ہیں۔

پاکستان کے شہریوں کے ماحولیاتی حقوق کے حوالے سے شاید اہم ترین پیش رفت اس وقت دیکھنے میں آئی جب سندھ ہائی کورٹ نے کراچی کے ساحل پر قائم کینپ پاور پلانٹ، جو اس وقت غیر فعال ہے، کے پہلو میں دو نئے پاور پلانٹ کے مقام کے خلاف ایک پٹیشن سماعت کے لئے منظور کی۔

شہریوں کا بنیادی موقف یہ تھا کہ ایسے پراجیکٹ کے لئے ایک ای آئی اے، یعنی ''ماحولیاتی اثرات کا تجزیہ'' ضروری تھا جس میں پراجیکٹ کی فوائد اور نقصانات پر مکمل بحث کی جاتی ہے، اور شہریوں کے خدشات اور تحفظات سنے اور دور کئے جاتے ہیں۔ اس عمل کو ''قومی اہمیت کے پراجیکٹ'' کے نام پر نظر انداز کیا گیا، لیکن اسے ضوابط کی خلاف ورزی قرار دیا گیا۔

ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ اس قسم کی پٹیشن سماعت کے لیے منظور کی گئی اور ای آئی اے کے ضوابط کی مطابقت میں مقدمے کی کھلی سماعت کے انعقاد کے احکامات دیے گئے۔ ای آئی اے کے ضوابط کی پاسداری کے بغیر منصوبے شروع کرنے کا سوال اب کراچی کے علاقے کلفٹن کے بحریہ ٹاؤن فلائی اوور اور اسلام آباد میٹرو کے بارے میں بھی اٹھایا جا رہا ہے۔

سفارشات

☆ موجودہ قوانین اور ضوابط کی من وعن پیروی سے انسانوں کے ماحولیاتی حقوق اور حیوانات و نباتات کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے گا۔

☆ ''آلودگی پھیلانے پر جرمانوں'' کے تصور کو مرکزی دھارے میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ نہ صرف ایسی کسی بھی ''ترقیاتی'' سرگرمی کے اثرات کو کم کیا جا سکے جن میں استحکام پذیری کے عنصر کو

نظر انداز کیا گیا ہو بلکہ یہ مستقبل کے کسی بھی منصوبے کے ڈیزائن کی مزاحمت کرے جس میں ماحولیاتی تحفظ کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔

☆ وکلاء اور عدلیہ کے اراکین کی استعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ ماحولیات سے متعلق مقدمات کو نمٹا سکیں۔

☆ سرکاری شعبوں کی استعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ ماحول کی نگرانی اور تحفظ کر سکیں۔

☆ شہریوں کی ان تنظیموں میں اشتراک قائم کیا جائے جو ماحولیاتی مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر ان مسائل کا تعلق انسانی حقوق کے معاملات سے ہے۔

مہاجرین

تمام بنی نوع انسان عظمت اور حقوق کے حوالے سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں عقل اور ضمیر ودیعت ہوا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

[اقوام متحدہ کا عالمی منشور۔ آرٹیکل نمبر 1]

پاکستان 2014ء کے اختتام پر لاکھوں نقل مکینوں کا مسکن تھا۔ ان میں افغان مہاجرین جنہوں نے اپنے ملک میں 1979ء سے جاری کشیدگی کے مختلف مراحل کے دوران اپنے گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں سکونت اختیار کی تھی اور اندرونِ ملک نقل مکین افراد شامل تھے۔

2014ء کے اختتام پر، دنیا بھر میں سب سے زیادہ پناہ گزینوں کی تعداد پاکستان میں رہائش پذیر تھی جن میں سے تقریباً تمام کا تعلق افغانستان سے ہے۔ ان میں سے تقریباً 15 لاکھ افغان مہاجرین رجسٹرڈ ہیں جبکہ اتنی ہی تعداد میں غیر رجسٹرڈ ہیں اور ملک میں غیر قانونی طور پر رہائش پذیر ہیں۔ تمام افغان مہاجرین کی ان کے اپنے وطن واپسی کے لیے کئی بار حتمی تواریخ طے کی جاتی رہیں۔ آخری حتمی تاریخ کا اعلان جون 2013ء میں کیا گیا جب رجسٹرڈ مہاجرین کو دسمبر 2015ء کے اختتام تک پاکستان میں رہنے کی اجازت دی گئی۔

2014ء کے اختتام پر افغانستان کی صورتحال اور زیر نظر سال کے دوران افغانوں کی وطن واپسی کی رفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی وطن واپسی کے لیے طے شدہ حالیہ حتمی تاریخ پر بھی پورا نہیں اترا جا سکے گا۔

2014ء کا سال بھی پاکستان کے لیے نقل مکانی سے متعلقہ کئی بحران لے کر آیا اور اس سال بھی ملک نے ''رہنما اصول برائے اندرون ملک نقل مکانی'' پر قانون سازی کرنے یا ان سے استفادہ کرنے کو

مناسب نہ سمجھا۔ مذکورہ رہنما اصولوں کو اقوام متحدہ نے 1998 میں مرتب کیا تھا۔ لاکھوں اندرون ملک نقل مکینوں کی اکثریت فاٹا میں انتہا پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن اور ستمبر میں پنجاب اور گلگت بلتستان میں تباہ کن سیلاب کے دوران اپنے گھروں سے بے دخل ہوئی تھی۔ کچھ نقل مکانی تھر اور چولستان کے صحراؤں سے ہوئی تھی جہاں خشک سالی نے ہزاروں شہریوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔

شمالی وزیرستان ایجنسی، فاٹا سے مسلح کشیدگی کے سبب نقل مکانی کرنے والے افراد کی تعداد حکام کے لیے بھی حیرانی کا باعث تھی اور اس سے بے دخل آبادیوں کی امداد اور تحفظ کے لیے منصوبہ بندی کے فقدان کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

گلگت بلتستان ریجن میں عطا آباد جھیل بننے کے نتیجے میں متاثر ہونے والے لوگ اپنی بے دخلی کے پانچویں برس بھی بے گھر ہی رہے اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پیدا ہونے والی دراڑوں نے مزید دیہاتوں کے متاثر ہونے اور لوگوں کی بے دخلی کے خدشات کو جنم دیا ہے۔ ڈیرہ بگٹی، بلوچستان کے بعض باشندے بالآخر اپنے گھر واپس جانے میں کامیاب ہوگئے۔ عدالتی حکم ناموں اور اہم قومی شاہراہ پر طویل دھرنے کے بعد ہی ان کی حالتِ زار پر توجہ دی گئی۔

اگرچہ بے دخلی کے نتیجے میں بے دخل ہونے والے افراد کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تاہم ان پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں میں ان کی مشاورت بہت کم تھی یا نہ ہونے کے برابر تھی۔ متاثرہ آبادی میں بھی سب سے زیادہ غیر محفوظ خواتین اور بچے تھے اور فیصلہ سازی کے عمل میں ان کی شمولیت یا کنٹرول مزید کم تھا۔ اس مسئلے کو شناخت اور جنس کے تناظر سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور کشیدگی کے باعث بے دخل ہونے والی خواتین شناختی دستاویزات کی کمی یا جرگے کے فیصلے کے تحت امدادی سامان کے حصول سے محروم رہیں۔

1971ء سے بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانی تاحال وطن واپسی کے منتظر ہیں اور ان کا انتظار ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ ان کی حالت زار پر واحد قابل ذکر توجہ عدالت عظمیٰ نے دی جب عدالت نے 2014ء میں بنگلہ دیش سے پاکستانیوں کی وطن واپسی کی پٹیشن کو باضابطہ سماعت کے لیے منظور کرلیا۔

افغان مہاجرین

پاکستان نہ تو 1951ء میں اقوام متحدہ کے منظور کردہ مہاجرین کنونشن کا فریق ہے اور نہ ہی پاکستان نے اس کنونشن کے پروٹوکول 1967ء پر دستخط کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان، افغانستان اور اقوام متحدہ کے ادارے یو این ایچ سی آر کے سہ رکنی معاہدے کے تحت پاکستان میں رجسٹرڈ افغانیوں اور ان کی رضا کارانہ واپسی کے معاملے کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔

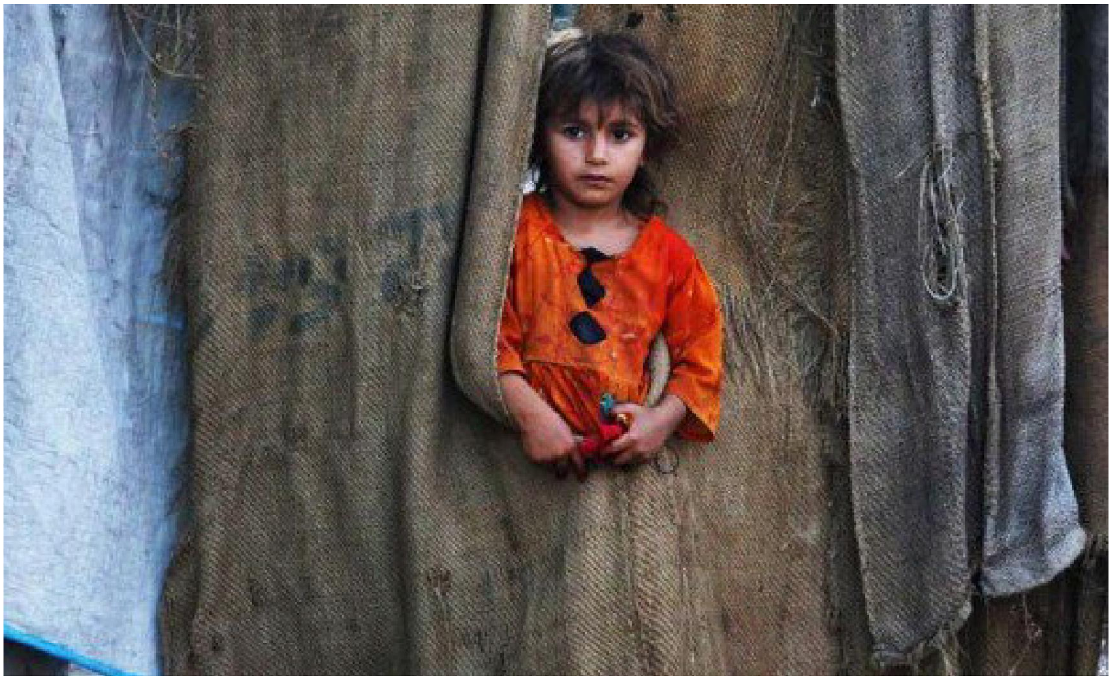

2014 کے اختتام پر پاکستان میں دنیا کے تمام دیگر ممالک کی نسبت زیادہ مہاجرین رہائش پذیر تھے اور تقریباً تمام کا تعلق افغانستان سے تھا

06-2005ء میں پاکستان میں افغانیوں کی رجسٹریشن کا عمل شروع کیا گیا جو کہ پاکستان میں اس نوعیت کا تاحال واحد اقدام ہے۔ نیشنل ڈیٹا بیس ورجسٹریشن اتھارٹی میں اپنی رجسٹریشن کروانے والوں کو رجسٹریشن کی تصدیق (پی او آر) کے تحریری کارڈز دیئے گئے۔ یواین ایچ سی آر نے کارڈز کے حامل افراد کی مدد کی اورانہیں جبری بے دخلی سے تحفظ فراہم کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ماسوائے رجسٹرڈ افغانیوں کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کے کسی قسم کی رجسٹریشن نہیں کی گئی۔ 2013ء میں وفاقی کابینہ کے فیصلے کے بعد رجسٹرڈ افغانیوں کی وطن واپسی کی حتمی تاریخ کو 2015ء کے اختتام تک توسیع دے دی گئی۔

چند خاص حالات واقعات کے استثنٰی کے ساتھ، نادرا نے یواین ایچ سی آر کی معاونت سے دسمبر 2014ء میں اُن رجسٹرڈ افغان مہاجرین کے پی او آر کارڈ کی تجدید کا عمل مکمل کیا جن کے کارڈ 2012ء کے اختتام پر زائد المیعاد ہوگئے تھے۔ یہ تجدیدی عمل فروری 2015ء کے وسط تک جاری رہنے کی توقع کی جا رہی تھی۔ افغانیوں کی رضا کارانہ واپسی سے متعلقہ پاکستان، افغانستان اور یواین ایچ سی آر کے دستخط شدہ سہ رکنی معاہدے کی رُو سے تجدیدی پی او آر کارڈز 31 دسمبر 2015ء تک قابل استعمال ہیں۔ مذکورہ معاہدہ افغان مہاجرین کی رضا کارانہ واپسی پر زور دیتا ہے۔

ایچ آر سی پی مہاجرین کے اعداد و شمار کی فراہمی اور پاکستان میں مہاجرین کے مسائل سے نمٹنے میں

مدد کرنے پر یو این ایچ سی آر کا معترف ہے۔ سال کے اختتام تک اکٹھا ہونے والے اعداد و شمار جو کہ پی او آر کارڈز کے کوائف پر مبنی ہیں، کے مطابق 15 لاکھ رجسٹرڈ افغان مہاجرین پاکستان میں قیام پذیر ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ملک میں موجود غیر رجسٹرڈ افغانوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہے۔

سال کے اختتام تک، نادرا نے پی او آر کارڈز کے حامل افراد کے 30,913 نوزائیدہ بچوں کی رجسٹریشن کی اور اٹھارہ برس سے کم عمر 8,454 افغان بچوں کو پیدائشی سٹیفکیٹ جاری کیے گئے۔ پیدائشی سٹیفکیٹ کے اجراء کے طریقہ کار کو حال ہی میں آسان کیا گیا ہے جس کے باعث اس اہم دستاویز کے اجراء میں اضافے کی توقع کی جا رہی ہے۔

5 لاکھ سے کچھ زائد افغان مہاجرین 76 افغان خیموں یا مہاجر دیہاتوں (ان مقامات کو یو این ایچ سی آر کی طرف سے دیا گیا نام) میں رہائش پذیر ہیں جبکہ دیگر ان خیموں سے باہر سکونت پذیر ہیں۔ مہاجر دیہاتوں میں سے 65 خیبر پختونخوا میں، دس بلوچستان میں اور ایک پنجاب میں ہے۔

یو این ایچ سی آر کی معاونت سے پاکستان سے افغان مہاجرین کی وطن واپسی

(2004-2014)

برس	وطن واپس جانے والے افراد کی تعداد
2004	383,598
2005	449,520
2006	133,015
2007	364,476
2008	282,496
2009	51,290
2010	109,383
2011	52,096
2012	83,423
2013	31,800
2014	12,991
کل	**1,954,088**

ذرائع: یو این ایچ سی آر

غیر رجسٹرڈ افغانیوں کو کسی قسم کی محفوظ حیثیت حاصل نہیں تھی اور ان کے ساتھ باشندگان بیرون ملک ایکٹ 1949ء کے تحت نبٹا جا رہا تھا۔

یو این ایچ سی آر کا معاونت شدہ وطن واپسی کا پروگرام 2014ء میں پورا سال جاری رہا۔ اس پروگرام کے تحت صرف پی او آر کارڈ زیافتہ رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی معاونت کی گئی۔ زیر نظر سال کے دوران، رضا کارانہ وطن واپسی پروگرام کے تحت 12,991 رجسٹرڈ افغان (2,684 خاندان) وطن واپس گئے۔ یہ گزشتہ 11 برسوں کے دوران یو این ایچ سی آر کی معاونت سے وطن واپس جانے والوں کی سب سے کم تعداد

تھی۔ اس سے قبل سب سے کم تعداد 2013ء میں ریکارڈ کی گئی تھی جب وطن واپسی پروگرام کے تحت 31,800 افغان وطن واپس گئے تھے۔

2014ء میں یو این ایچ سی آر کی معاونت سے افغان مہاجرین کی وطن واپسی

صوبہ/علاقہ	خاندان	افراد
خیبر پختونخوا	1096	5320
بلوچستان	1088	5359
سندھ	256	1141
پنجاب	225	1076
اسلام آباد	19	95
کل	**2,684**	**12,991**

ذریعہ معلومات: یو این ایچ سی آر

صوبہ خیبر پختونخوا میں تقریباً دس لاکھ رجسٹرڈ افغان مہاجرین رہائش پذیر ہیں۔ وہاں سے 2014ء میں صرف 5,320 افغان (1,096 خاندان) اپنے ملک واپس گئے۔ یہ تعداد 2013ء میں وطن واپس جانے والے 16,250 مہاجرین کی تعداد سے بھی کم ہے جو کہ پہلے ہی گزشتہ چند برسوں میں کم ترین تعداد تھی۔

یہ کم تعداد مہاجرین کے اس خیال کی عکاسی کرتی ہے کہ ابھی تک افغانستان خاص طور پر ملک کے مشرقی اور جنوبی علاقوں کے حالات اس قابل نہیں کہ وہ واپس وطن جاسکیں۔ غربت کے علاوہ افغانستان میں قدرتی آفات، عدم تحفظ اور سیاسی عدم استحکام کے باعث بھی وہ وطن واپسی کا فیصلہ لینے سے عاری ہیں۔

اس قسم کی کوئی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں کہ زیر نظر سال کے دوران پاکستان نے رجسٹرڈ مہاجرین کو جبری طور پر ان کے ملک واپس بھیجا ہو۔

یو این ایچ سی آر کے دائرہ اختیار میں غیر رجسٹرڈ افغان شامل نہیں تھے۔ تاہم ایسے افراد پناہ گزین کے درجے کے حصول کے لیے یو این ایچ سی آر سے رجوع کر سکتے تھے جنہیں افغانستان واپسی کی صورت میں اپنے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خطرہ ہو یا انہیں کسی دوسری قسم کا سنگین خطرہ لاحق ہو۔ 2014ء کے دوران یو این ایچ سی آر نے پناہ کی طلب گار افغانیوں سے 5,702 درخواستیں وصول کیں۔ حکومت پاکستان نے ان افغانیوں کو پی او آر کارڈز جاری کرنے پر آمادگی ظاہر کی جنہیں یو این ایچ سی آر نے مہاجرین کی حیثیت کا تعین کے طریقہ کار کے تحت مہاجرین تسلیم کیا تھا۔ اس فیصلے کا اطلاق 2015ء میں ہوگا۔ یو این ایچ سی آر، پاکستان نے تقریباً 666 غیر افغان پناہ گیروں کی امداد بھی کی جن میں سے بیشتر کا تعلق صومالیہ، ایران اور عراق سے تھا۔

پاکستان میں افغان مہاجرین کی کثیر تعداد سے ملک کے وسائل اور امن وعامہ پر پڑنے والے اثرات بھی بحث ومباحثے کا حصہ بنے رہے۔ خاص طور پر آرمی پبلک سکول پشاور پر طالبان کے بہیمانہ حملے کے بعد پاکستان سے افغانیوں کی جلد وطن واپسی پر زور دیا جانے لگا ہے۔

عام مشتبہ افراد

16 دسمبر کو خیبر پختونخوا کے دارالحکومت پشاور میں آرمی پبلک سکول پر حملے نے پاکستان میں پناہ لینے کے مواقع پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں اور یہاں تک کہ رجسٹرڈ افغان مہاجرین کے خلاف بھی عمومی جذبات کو ہوا ملی ہے۔

دسمبر کے آخری دو ہفتوں میں خیبر پختونخوا کی حکومت نے وفاقی حکومت سے افغان مہاجرین کی جلد از جلد واپسی جبکہ اس عرصہ کے دوران ان کی نقل وحرکت پر پابندی اور انہیں صوبے سے باہر کسی اور جگہ منتقل کرنے کا مطالبہ کیا۔ حملے کے اگلے ہفتے میں خیبر پختونخوا کی حکومت نے کہا کہ دہشت گردانہ حملے کی منصوبہ بندی افغانستان میں ہوئی تھی۔ مزید برآں، افغان مہاجرین کو ایک ماہ کے اندر اندر صوبہ چھوڑنے کی ہدایت کی۔

وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا نے کہا کہ افغان مہاجرین کی موجودگی اور لامحدود نقل وحرکت صوبے میں جرائم اور بدامنی کی مستقل وجہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خیبر پختونخوا افغان مہاجرین کی موجودگی کی وجہ سے ہی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ صوبائی کابینہ نے افغان مہاجرین کی وطن واپسی پر مکمل اتفاق رائے کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ نہ صرف ہماری معیشت پر بوجھ ہیں بلکہ سنگین جرائم میں اضافے کا سبب بھی ہیں۔ انہوں نے وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا کہ افغان مہاجرین کی وطن واپسی کے لیے طے شدہ وقت میں تبدیلی لائی جائے اور کہا کہ صوبائی حکومت مزید ایک سال انتظار نہیں کرسکتی۔ انہوں نے کہا کہ وطن واپسی تک افغانیوں کو خیبر پختونخوا سے باہر خیموں تک محدود رکھا جائے۔

23 دسمبر کو ریاستوں اور سرحدی حدود کے وزیر نے یو این ایچ سی آر کے نمائندے کے ہمراہ ایک پریس کانفرنس کے دوران اس تاثر کو رد کردیا کہ پشاور سکول پر حملے کے بعد افغان مہاجرین کو ان کی رضامندی کے بغیر وطن واپس بھیجا جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ رجسٹرڈ افغان مہاجرین کبھی بھی دہشت گردی کے واقعات میں ملوث نہیں رہے اور یہ کہ انہیں طے شدہ میعاد کے مطابق باعزت طریقے سے رضاکارانہ بنیاد پر ہی وطن واپس بھیجا جائے گا۔ بعدازاں خیبر پختونخوا حکومت کے ایک ترجمان نے کہا کہ حکومت صوبے کے مختلف شہروں میں تقریباً پانچ خیمے بنانے اور رجسٹرڈ مہاجرین کو ان خیموں تک محدود رکھنے پر غوروفکر کررہی ہے۔

ہری پور میں پابندیاں

اطلاعات کے مطابق، خیبر پختونخوا میں افغان شہریوں کے خلاف کارروائی کی پہلی کڑی کے طور پر دسمبر کے آخری ہفتہ میں ضلع ہری پور میں پولیس نے رجسٹرڈ و غیر رجسٹرڈ افغان شہریوں کو کہا کہ وہ مختص شدہ خیموں میں منتقل ہوں اور رات کے وقت خیموں سے باہر نہ نکلا کریں۔

اطلاعات کے مطابق پولیس نے ہری پور کے متعدد مقامات پر لاؤڈ سپیکرز کے ذریعے اعلانات کیئے کہ اگر کسی افغان مہاجر نے شہر کی حدود میں کرائے پر رہائش لے رکھی ہے تو وہ تین دن کے اندر اندر مکان خالی کردے اور شہر سے باہر قائم خیمے میں منتقل ہوجائے۔ انہوں نے مکان مالکان کو بھی تنبیہ کی کہ اگر وہ فوجداری مقدمات سے بچنا چاہتے ہیں تو تین دن کے اندر افغانیوں سے اپنا مکان خالی کروالیں۔

ضلعی پولیس آفیسر ہری پور نے کہا کہ افغانیوں کی نقل وحرکت پر پابندی مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 144 کے تحت ایک برس قبل عائد کی گئی تھی اور پولیس نے محض سابقہ حکم نامے کی تجدید کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ افغان مہاجرین کی نقل وحرکت کو صبح آٹھ بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک محدود کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یہ آرڈر رجسٹرڈ و غیر رجسٹرڈ دونوں قسم کے افغان مہاجرین پر لاگو ہوتا ہے۔ پولیس آفیسر نے کہا کہ دفعہ 144 کا اطلاق پی او آر کارڈ زرکھنے والوں پر بھی ہوتا ہے جس کے تحت کسی بھی مقام پر پانچ یا پانچ سے زائد افراد کے اکٹھا ہونے پر پابندی عائد ہے۔

اطلاعات کے مطابق افغان تاجروں کو صبح آٹھ بجے کے بعد شہر جانے کی اجازت تھی تاہم ان کے لیے رات آٹھ بجے سے پہلے شہر کی حدود سے باہر نکلنا ضروری تھا۔

حتمی تاریخ کے گزرنے کے بعد افغان مہاجرین شہر کے ایک مرکزی مقام پر بطور احتجاج جمع ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ سینکڑوں افغان خاندان کئی برسوں سے کرائے کے مکانات میں قیام پذیر ہیں چنانچہ تین دن کی مہلت نا کافی تھی۔ انہوں نے کہا کہ بعض افغان خاندان کاروبار چلا رہے تھے اور مناسب سہولیات کے بغیر خیموں میں ان کی دوبارہ منتقلی سے ان کے لیے کئی مشکلات پیدا ہوں گی۔ انہوں نے کہا کہ ان کے بچے مختلف سکولوں میں زیر تعلیم ہیں اور وہ خیموں کے حالات میں رہنے کے عادی نہیں ہیں۔ مظاہرین نے انتظامیہ سے فیصلے پر نظر ثانی کرنے یا کم از کم حتمی تاریخ میں توسیع کرنے کا مطالبہ کیا تا کہ وہ مختص شدہ علاقوں میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ قیام پذیر ہو سکیں۔

صوبائی حکام نے بعد میں کہا کہ وفاقی حکومت کی پالیسی کے تحت رجسٹرڈ مہاجرین صوبے میں رہ سکتے ہیں، چنانچہ پولیس انہیں گرفتار نہیں کرے گی۔

یہ مئوقف نہ صرف صوبائی حکومت کا تھا بلکہ دسمبر کے اواخر میں قومی جرگہ کے مقررین سمیت دیگر حلقوں نے بھی صوبائی حکومت کی پیروی کرتے ہوئے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کرنے اور افغان مہاجرین کی بلاتاخیر وطن واپسی پر زور دیا۔

اندرونِ ملک نقل مکانی

2014ء میں بھی اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد کی تعداد ملک میں موجود افغان مہاجرین کی تعداد سے زیادہ تھی۔ نقل مکانی کی بنیادی وجہ مسلح تصادم اور قدرتی آفات تھیں۔ تقریباً 20لاکھ افراد فاٹا کی ایجنسیوں خیبر اور شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کی بدولت اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے اور لاکھوں آئی ڈی پیز طالبان کے خلاف گزشتہ فوجی کارروائیوں کے بعد قبائلی علاقہ جات سے متصل اضلاع میں گل سڑ رہے ہیں۔ ان اعداد وشمار میں وہ ہزاروں خاندان شامل نہیں ہیں جو رجسٹرڈ نہیں تھے اور اپنے میزبان گھرانوں یا رشتہ داروں کے پاس قیام پذیر ہیں۔

2014ء میں مسلح تصادم کے باعث ہونے والی تمام نقل مکانی کی وجہ جون میں شمالی وزیرستان جبکہ اکتوبر میں خیبر ایجنسی میں جنگجو انتہا پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن ہے۔ گزشتہ برسوں میں انتہا پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن کے دوران فاٹا سے نقل مکانی کرنے والے لاکھوں افراد ابھی تک بے گھر تھے۔

اطلاعات کے مطابق نقل مکینوں میں سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا خواتین کو کرنا پڑا تھا اور ان مسائل کے ازالے کے لیے خاطر خواہ انتظامات دیکھنے کو نہیں ملے۔

اپنی مدد آپ

شمالی وزیرستان سے آبادی کا انخلاء جون میں آپریشن کے آغاز سے بہت پہلے ہی فوجی آپریشن کے ڈر کے باعث شروع ہو گیا تھا۔ کسی اور جگہ پناہ کے متلاشی خاندان جنوری 2014ء کے اوائل سے ہی وہاں سے نقل مکانی کرتے نظر آئے۔ 15 جون کو شروع ہونے والے فوجی آپریشن کے آغاز کے نزدیکی ایام میں متاثرہ آبادی کو راستوں کی بندش، بجلی کے تعطل اور ذرائع نقل وحمل کی کمی کے باعث کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اطلاعات کے مطابق ہزاروں افراد نے سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا کیونکہ وہ ٹرانسپورٹ کے بڑھتے ہوئے اخراجات برداشت کرنے سے قاصر تھے۔

شمالی وزیرستان سے نقل مکانی کے مسئلے سے نبٹنے کے لیے مناسب منصوبہ بندی کی کمی حتیٰ کہ متاثرہ آبادی کی درست تعداد جیسے اعداد وشمار کے فقدان کی نشاندہی ہوئی ہے جس کے باعث اپنے گھروں سے بے

دخل شہریوں کو اس سے زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے جتنا انہیں مناسب منصوبہ بندی کی موجودگی میں کرنا پڑتا تھا۔

1998ء میں ہونے والی آخری مردم شماری کے مطابق پورے فاٹا (شمالی وزیرستان جس کا ایک حصہ ہے) کی آبادی 31 لاکھ افراد تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان اعداد و شمار میں خواتین کی کثیر تعداد شامل نہیں کیونکہ قبائلی مرد اپنے خاندان کی خواتین کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے عموماً گریز ہیں۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق، شمالی وزیرستان کی آبادی 360,000 سے زائد تھی۔ ایک اندازے کے مطابق فوجی آپریشن کے وقت شمالی وزیرستان کی آبادی تقریباً 5,000,00 تھی۔

تاہم، انخلاء کا حجم فرض شدہ تعداد سے کہیں زیادہ تھا۔ فوجی آپریشن کے آغاز کے صرف پہلے ہفتے کے دوران رجسٹریشن کروانے والے نقل مکینوں کی تعداد 400,000 افراد تک پہنچ گئی تھی اور آپریشن کے پہلے ماہ کے اختتام تک یہ تعداد دس لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ وزیر دفاع کے بقول حکومت کو توقع تھی کہ جون کے اختتام تک شمالی وویرستان سے بے دخل افراد کی تعداد 700,000 کے قریب ہوگی۔

نومبر میں ایک اور روز یر نے کہا کہ بے دخل افراد کی تعداد تقریباً 20 لاکھ افراد تھی جن میں پندرہ لاکھ رجسٹرڈ اور پانچ لاکھ غیر رجسٹرڈ تھے۔ شمالی وزیرستان سے لوگوں کی بے دخلی نے باجوڑ، کرم اور جنوبی وزیرستان والی نقل مکانیوں سے پیدا ہونے والے بحرانوں میں مزید اضافہ کر دیا جہاں کی متاثرہ آبادی کو ان کے علاقے میں امن و امان کی خراب صورتحال کے باعث ابھی تک واپس نہیں بھیجا جا سکا تھا۔

اکتوبر میں، سکیورٹی فورسز نے خیبر ایجنسی میں ایک کالعدم جنگجو گروہ کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا۔ آپریشن کے پہلے تین ہفتوں کے دوران تیراہ اور باڑہ سے بے دخل ہونے والے افراد کی تعداد 2,45,482 (34,054 خاندان) تک پہنچ گئی۔ دسمبر کے وسط تک خیبر ایجنسی سے بے دخل ہونے والے 597,386 افراد کی رجسٹریشن کی گئی۔

فاٹا ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے عملے نے کہا کہ وہ 2009 اور 2010 سے رجسٹرڈ شدہ نقل مکینوں اور ابھی حال ہی میں نقل مکانی کرنے والوں کو ایک وقت کا پکا پکایا کھانا اور مفت ٹرانسپورٹ فراہم کر رہے ہیں۔ خیبر پختونخوا کے ضلع نوشہرہ کے نزدیک قائم جلوزئی کیمپ میں منتقل ہونے والے ہزاروں افراد نے سرکاری امداد نہ ملنے یا برائے نام امداد ملنے کی شکایات کیں۔ بعض کا کہنا تھا کہ وہ کھلے آسمان تلے رہ رہے ہیں اور انہیں بہت کم خوراک اور ادویات مہیا کی جاتی ہیں۔ کیمپ میں پہلے سے ہی باڑہ سے نقل مکانی کرنے والے 5,000 خاندان گزشتہ پانچ برسوں سے قیام پذیر تھے۔ متعدد خاندان جو مکان کرائے پر لینے کے متحمل نہیں

ہو سکتے تھے،ان کا کہنا تھا کہ وہ جلوزئی کیمپ میں عارضی طور پر رہنے کے لیے آئے ہیں۔

انہیں خوش آمدید نہ کہا گیا

ایک طرف تو شمالی وزیرستان میں تصادم سے متاثرہ لوگوں نے جنگجوؤں کے خلاف فوجی آپریشن شروع ہونے سے قبل ہی اپنے گھر بار چھوڑنا شروع کر دے جبکہ دوسری طرف ایسی اطلاعات منظر عام پر آئیں کہ بعض صوبائی حکام فاٹا سے بے دخل ہونے والے شہریوں کی اپنے صوبے میں داخلے کی مخالفت کر رہے تھے۔ جون میں خیبر پختونخوا کی اسمبلی نے دیگر صوبوں میں آئی ڈی پیز کے داخلے پر پابندی کو افسوسناک قرار دیا۔اُس سے ایک دن قبل صوبائی گورنر نے سندھ اور بلوچستان میں شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز کے داخلے پر پابندی کو افسوسناک قرار دیا تھا۔

جون کے وسط میں صوبائی وزیر اطلاعات سندھ نے کہا کہ دیگر صوبوں سے سندھ آنے والوں کی سندھ کی صوبائی سرحدوں پر رجسٹریشن کی جائے گی اوران سے دورے کا مقصد اور میزبان کا نام معلوم کرنے کے بعد ہی انہیں سندھ میں داخلے کی اجازت دی جائے گی۔تاہم،قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے رہنما جو سندھ کی حکمران جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، نے جولائی کے اوائل میں کہا کہ کوئی فرد بھی بے دخل افراد کو ملک کے کسی بھی حصے میں داخل ہونے سے روکنے کا مجاز نہیں ہے۔ پنجاب حکومت نے بھی اندرون ملک نقل مکین افراد کے پنجاب میں داخلے پر پابندی کے تاثر کو زائل کیا۔

جولائی کے اوائل میں کئی سندھی قوم پرستوں جماعتوں نے سندھ میں آئی ڈی پیز کے داخلے کے خلاف 'سندھ بچاؤ' تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ وہ کئی روز تک پنجاب اور سندھ کے مابین چلنے والی ٹریفک کو بند کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔مظاہرین نے پنجاب۔سندھ کی ایک مرکزی شاہراہ کو پورے ایک دن تک بند کئے رکھا۔اس سے اگلے روز انہوں نے گھوٹکی اور کندھ کوٹ چوک پر دھرنا دیا۔تاہم اس روز مظاہرین نے صرف آئی ڈی پیز والی بسوں اور ٹرکوں کو روکا جبکہ دیگر گاڑیوں کو جانے دیا۔

آئی ڈی پیز کی اپنے وطن واپسی کی حتمی تاریخ طے کرنے سے انکار

20 نومبر کو ریاستوں وسرحدی حدود کے وفاقی وزیر نے کہا کہ شمالی وزیرستان ایجنسی کا 90 فیصد سے زائد علاقہ دہشت گردوں سے آزاد کروالیا گیا ہے مگر تقریباً 20 لاکھ اندرون ملک نقل مکینوں کی واپسی کے لیے کوئی حتمی تاریخ نہیں دی جاسکتی۔ان کا کہنا تھا کہ حکومت جاری جنگ کے دوران بے دخل افراد کو ان کے علاقے میں واپس بھیج کر دہشت گردوں کو یہ موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی کہ وہ انہیں انسانی ڈھال کے طور پر

استعمال کریں۔

فاٹا میں قبل ازیں ہونے والے فوجی آپریشنوں کے دوران فاٹا کے دیگر علاقوں سے بے دخل ہونے والے لوگ سال بھر مطالبہ کرتے رہے کہ انہیں علاقوں میں واپس بھیج دیا جائے جو دہشت گردوں سے پاک کرا لیے گئے تھے۔ تاہم، فاٹا کے دیگر علاقوں سے بے دخل افراد کی بہت کم تعداد ہی 2014ء میں اپنے گھر کو واپس جا سکی۔

نظر انداز کیے جانے کی شکایت

شمالی وزیرستان، باجوڑ، مہمند، خیبر اور اورکزئی ایجنسی میں جاری تصادم سے بچنے کے لیے وہاں سے بے دخل ہونے والے افراد نے شکایت کی کہ اگست کے بعد سے وفاقی اور صوبائی حکومتیں ان پر توجہ نہیں دے رہیں جب سے دو احتجاجی دھرنے وفاقی دارالحکومت کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا خیال تھا کہ وفاقی اور خیبر پختونخوا دونوں سطحوں پر حزب اقتدار اور حزب اختلاف ان کی ضروریات پر توجہ دینے کی بجائے اقتدار کی کھینچا تانی میں مصروف تھیں۔ ان کی شکایت تھی کہ دھرنوں نے نہ صرف حکومت کی توجہ پر غلبہ پا لیا ہے بلکہ آئی ڈی پیز کے خدشات کو میڈیا پر بھی توجہ نہیں دی جاری ہے۔ وہ غالباً اب حکومتی ترجیحات کا حصہ بھی نہیں رہے۔

سخت الفاظ کا تبادلہ

اطلاعات کے مطابق شمالی وزیرستان آپریشن کے آغاز کے بعد ہزاروں مقامی باشندے افغانستان نقل مکانی کر گئے تھے۔ پاکستان سے بے دخل افراد کو خوش آمدید کہنے کے افغانی حکام کے بیان پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے پاکستانی حکام نے کہا کہ شمالی وزیرستان سے بے دخل افراد کو ورغلانے کی بجائے قابل کو اپنی توجہ ان افغان مہاجرین کی باعزت واپسی پر دینی چاہیئے جو گزشتہ کئی عشروں سے پاکستان میں قیام پذیر ہیں۔ ریاستوں و سرحدی حدود کی وزارت نے جون میں قابل کے اس دعوے کی نفی کی کہ 100,000 افراد نے شمالی وزیرستان سے افغانستان نقل مکانی کی تھی۔ وزارت کا کہنا تھا کہ پاکستانی فوج کے آپریشن کے کچھ عرصہ بعد شمالی وزیرستان کے 33,000 افراد افغانستان سے پاکستان واپس آ گئے تھے۔

بے گھر افراد کو عدم تحفظ کا سامنا

اندرون ملک نقل مکینوں کو اپنے گھروں سے بے دخل ہونے کے علاوہ اپنے خیموں میں یا رجسٹریشن کی غرض سے حکام کے قائم کردہ مقامات پر جنگجوؤں کی دھمکیوں اور حملوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ بعض اوقات ایسا لگتا تھا کہ جن خطرات کے باعث ان لوگوں نے نقل مکانی کی تھی وہ ابھی تک ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔

اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے افراد

بے دخل افراد کو ہنگو میں 28 ستمبر کو ایک بھیانک حملے کا سامنا کرنا پڑا جب اورکزئی ایجنسی فاٹا سے نقل مکانی کرنے والوں کے لیے قائم محمد خواجہ کیمپ میں بم دھماکہ ہوا اور تین بچوں سمیت آٹھ افراد ہلاک جبکہ 12 زخمی ہو گئے۔ مرنے اور زخمی ہونے والے تمام افراد کا تعلق اورکزئی ایجنسی سے تھا جو 2008ء میں وہاں فوجی آپریشن شروع ہونے کے بعد اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے تھے۔ اورکزئی سے تعلق رکھنے والے تقریباً 100 خاندان خیمے میں قیام پذیر تھے جبکہ کئی دیگر خاندان زیادہ تر ہنگو اور کوہاٹ میں کرائے کی رہائش گاہ پر یا اپنے رشتہ داروں کے ہاں قیام پذیر تھے۔

10 جون کو انتہا پسندوں نے اسی خیمے کو راکٹوں اور دستی بموں کا نشانہ بنایا۔ اس سے قبل انتہا پسندوں نے متاثرہ آبادی کو 11 جون تک خیمہ چھوڑنے یا سخت نتائج کے لیے تیار رہنے کی دھمکی دی تھی۔ جون والے حملے کے بعد کئی بے دخل افراد نے خیمہ چھوڑ دیا۔ البتہ اطلاعات کے مطابق بعض بے دخل افراد نے ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ سفر کرنے کے لیے ان کے پاس رقم نہیں تھی اور ان کی موت اگر طالبان کے ہاتھوں سے لکھی جا چکی ہے تو وہ اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔

11 مئی کو خیبر ایجنسی پشاور میں بے دخل افراد کے لیے قائم رجسٹریشن سنٹر پر خودکش بم دھماکے میں پانچ افراد ہلاک اور 10 زخمی ہو گئے۔ خیبر ایجنسی کی وادی تیراہ اور باڑہ میں گھر واپس جانے کی منصوبہ بندی

کرنے والے نقل مکینوں کی خیمے میں رجسٹریشن کی جا رہی تھی اور انہیں چھ ماہ کے لیے 25000 روپے اور راشن دیا گیا۔

اطلاعات کے مطابق، جون میں شمالی وزیرستان سے بے دخل ہونے والے خاندانوں نے فرنٹیئر ریجن (ایف آر) بنوں کے علاقے بکا خیل میں قیام پذیر ہونے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں پمفلٹس کے ذریعے انتہا پسندوں نے دھمکیاں دی تھیں۔

متاثرہ خاندانوں نے بتایا کہ ان کا تحفظ ان کی سب سے پہلی ترجیح تھی اور اپنے تحفظ کے لیے وہ اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے تھے۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے بکا خیل کی بجائے ضلع بنوں یا لکی مروت میں ریلیف کیمپ قائم کیا جائے کیونکہ بکا خیل میں انہیں انتہا پسندوں کی دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں۔

نقل مکانی کی روک تھام

اطلاعات کے مطابق جولائی میں فاٹا کے علاقے باجوڑ ایجنسی میں ممکنہ فوجی کارروائی اس وقت روک دی گئی جب مقامی مہموند قبائل کے جرگہ اور سکیورٹی فورسز کے مابین معاہدہ ہوا تھا کہ جرگہ انتہا پسندوں کو پناہ نہیں دے گا اور ان پر حملوں میں سکیورٹی فورسز کی مدد کرے گا۔

نقل مکین عورتوں کی محرومیاں

اپنے مقامی علاقوں میں موجودگی کی طرح وہاں سے بے دخلی کی صورت میں بھی نقل مکین آبادی کا سب سے غیر محفوظ طبقہ خواتین ہی تھیں۔ ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں میں ان سے مشاورت نہ کی گئی اور ان کی خاص ضروریات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔

فاٹا کی مقامی روایات کے تحت خواتین کی نقل و حرکت، تعلیم اور سماجی رابطہ سازی پر پابندی کی وجہ سے وہ امدادی اشیاء تک رسائی حاصل کرنے کے لیے درکار خود اعتمادی سے محروم تھیں۔ اطلاعات کے مطابق علاقے میں خواتین کی شرح خواندگی صرف تین فیصد تھی۔ کئی خواتین کے پاس قومی شناختی کارڈ نہیں تھے جو کہ امدادی سامان تک رسائی کے لیے ضروری تھے۔ خواتین کے لیے الگ رجسٹریشن مراکز نہیں تھے۔

شناختی کارڈ رکھنے والی خواتین بھی امداد کے حصول سے محروم رہیں۔ اطلاعات کے مطابق جرگے کے ایک فیصلے کے تحت جسے بعض سیاسی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل تھی، کیمپوں میں شمالی وزیرستان سے تعلق رکھنے والی خواتین امدادی سامان لینے کی مجاز نہیں تھیں۔ اس سے وہ خواتین شدید متاثر ہوئیں جن کے خاندان

میں کوئی مرد نہیں تھا یا جن خاندانوں کی سربراہ بیوہ عورتیں تھیں یا جن خواتین کے خاوند، بھائی یا باپ بیرون ملک برسرروزگار تھے۔

اطلاعات کے مطابق خیموں میں موجود نوجوان عورتوں کو جنسی ایذارسانی کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کے باعث کئی خاندان اپنی کمسن بچیوں کی شادی کرنے پر مجبور ہوئے۔

سول سوسائٹی کی تنظیموں نے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ امدادی تنظیموں کے عملے کے پاس اور خیموں میں خواتین کے لیے بنیادی سہولیات کا فقدان تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سارا بندوبست مردوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے دخلی جیسی صورتحال میں خواتین کی ضروریات سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان عوامل کے باعث خواتین کو مردوں کی نسبت زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

تعلیم اور بچے

ستمبر، خیبر پختونخوا کی حکومت نے شمالی وزیرستان سے بے دخل ہونے والے بچوں کو سرکاری سکولوں میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا۔ آئی ڈی پیز کے لیے کچھ خیمہ نما سکول بھی کھولے گئے۔ البتہ، بے دخل افراد کی ایک شکایت یہ تھی کہ تعلیم کا موجودہ انفراسٹرکچر بے دخل آبادی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ ایسی اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ بے دخل خاندانوں کے بچے جماعت میں سب سے پیچھے کھڑے رہتے تھے یا کمرہ جماعت کے دروازے پر کھڑے رہتے تھے جس کی وجہ سیٹوں کی کمیابی تھی۔

بعض ایسے بچوں کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں جو بے دخلی کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ انہیں اپنے خاندان کی مالی معاونت کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

شعبہ تعلیم کو ستمبر میں ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب چھٹیوں کے بعد سکول کھلنے کا وقت قریب تھا مگر شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز نے ابھی تک ان 572 سکولوں کو خالی نہیں کیا تھا جنہیں وہ بطور رہائش استعمال کر رہے تھے۔

سیالکوٹ سے نقل مکانی

پاکستانی۔ ہندوستانی بارڈر پر ہندوستانی فورسز کی گولہ باری سے سیالکوٹ کے کئی دیہاتوں سے تقریباً 40,000 افراد کو نقل مکانی کرنا پڑی تھی۔ کئی افراد نے نزدیکی دیہاتوں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ گولہ باری کے نتیجے میں سینکڑوں گھر تباہ ہوئے۔

پاکستانی بارڈر پر ہندوستانی فوج کی گولہ باری سے سیالکوٹ کے درجنوں دیہاتوں سے تقریباً 40,000 افراد کو اپنا گھربار چھوڑنا پڑا

بالآخر گھروں کو واپسی

بگٹی قبائل کا 100 افراد کا قافلہ فروری کے اوائل میں بلوچستان کے ضلع ڈیرہ بگٹی پہنچا۔ وہ تقریباً نو برس قبل اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے تھے۔ انہوں نے دو ہفتہ قبل بھی اپنے ضلع کا رخ کرنے کی کوشش کی تھی مگر سکیورٹی فورسز نے انہیں ڈیرہ بگٹی داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بے دخل بگٹیوں نے بطور احتجاج بین الصوبائی شاہراہ بند کر دی تھی اور آٹھ دن تک احتجاج جاری رکھا تھا۔ بعدازاں بگٹیوں نے بلوچستان ہائی کورٹ سے رجوع کیا جس نے بے دخل افراد کو حکام کے پاس رجسٹریشن کروانے کے بعد ضلع ڈیرہ بگٹی واپس جانے کی اجازت دے دی۔

مشکلات اور مواقع

آبادی کی وسیع پیمانے پر ہونے والی نقل و حرکت نے میزبان کمیونٹیوں میں صحت کے انفراسٹرکچر کو شدید متاثر کیا۔ ضلع بنوں کے شعبہ صحت کے اہلکاروں نے بتایا کہ ضلع نے اتنی بڑی بے دخل آبادی کی میزبانی اس سے قبل کبھی نہیں کی تھی اور اتنے زیادہ لوگوں کے لیے صحت کی موجودہ سہولیات ناکافی تھیں۔ اطلاعات کے

مطابق عالمی ادارہ صحت نے استعداد سازی کے عمل میں حکام کی مدد کی تھی۔ خیبر پختونخوا کے شعبہ صحت نے بھی تدریسی ہسپتالوں سے ڈاکٹروں کو نقل مکین افراد کی خدمت کے لیے ان کے خیموں میں بھیجا تھا۔ وزیرستان سے بے دخلی نے بچوں کو پولیو ویکسینیشن لینے کا موقع فراہم کیا جنہیں شمالی وزیرستان میں گزشتہ دو برسوں سے پولیو کے قطرے نہیں پلائے جا سکے تھے۔ آئی ڈی پیز کی وسیع نقل وحرکت اور سیلاب کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی نے پولیو وائرس کے پھیلاؤ کے خدشات کو بڑھا دیا تھا۔

مساوی سلوک کے لیے احتجاج

ضلع نوشہرہ کے جلوزئی کیمپ میں مقیم بے دخل افراد نے اگست میں پشاور پریس کلب کے سامنے احتجاج کیا جو 50 روز تک جاری رہا۔ ان کا بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ انہیں شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز کے مساوی راشن اور معاوضہ دیا جائے۔ ان کا اصرار تھا کہ حکومت کو شمالی وزیرستان کے آئی ڈی پیز اور قبائلی ایجنسیوں سے پہلے سے بے دخل ہونے والے افراد جو کیمپوں میں ہیں یا اپنے رشتہ داروں کے ہاں قیام پذیر ہیں، ان کے مابین امتیاز نہیں برتنا چاہئے۔

قدرتی آفات

ستمبر کے پہلے ہفتے میں مون سون کی موسلا دھار بارشوں کے نتیجے میں پنجاب، گلگت بلتستان اور آزاد جموں وکشمیر میں سیلاب آیا جس نے 25 لاکھ سے زائد افراد کو متاثر کیا۔ ہزاروں مکانات کی جزوی یا مکمل تباہی کے علاوہ مال مویشی اور فصل کی کٹائی کے ایام میں فصلوں کو پہنچنے والے نقصانات نے لوگوں کے ذرائع آمدن کو شدید متاثر کیا۔ نیشنل ڈیزاسٹر منیجمنٹ اتھارٹی کے مطابق پنجاب میں 23 اضلاع گلگت بلتستان میں پانچ اور آزاد جموں کشمیر میں 10 اضلاع سیلاب کی زد میں آئے تھے۔

پنجاب حکومت نے کہا کہ گزشتہ پانچ عشروں میں صوبے نے اتنے بڑے سیلاب کا سامنا نہیں کیا۔ سیلاب کے باعث 3,450 دیہات تباہ اور پانچ لاکھ سے زائد افراد اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے۔

اکتوبر کے اوائل میں، وفاقی حکومت نے سیلاب اور شمالی وزیرستان سے بے دخل ہونے والے افراد کی بحالی نو کے لیے بین الاقوامی برادری سے مدد مانگی۔

2014ء کے سیلاب کا نشانہ بننے والی پاکستانی قوم مسلسل چار برسوں سے سیلاب سے شدید متاثر ہو رہی ہے جس سے موثر اقدامات کے فقدان کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اگرچہ بعض رپورٹس میں سیلاب کو بار ہا پیش آنے والا 'قدرتی عمل' قرار دیا گیا مگر سیلاب کے نتیجے

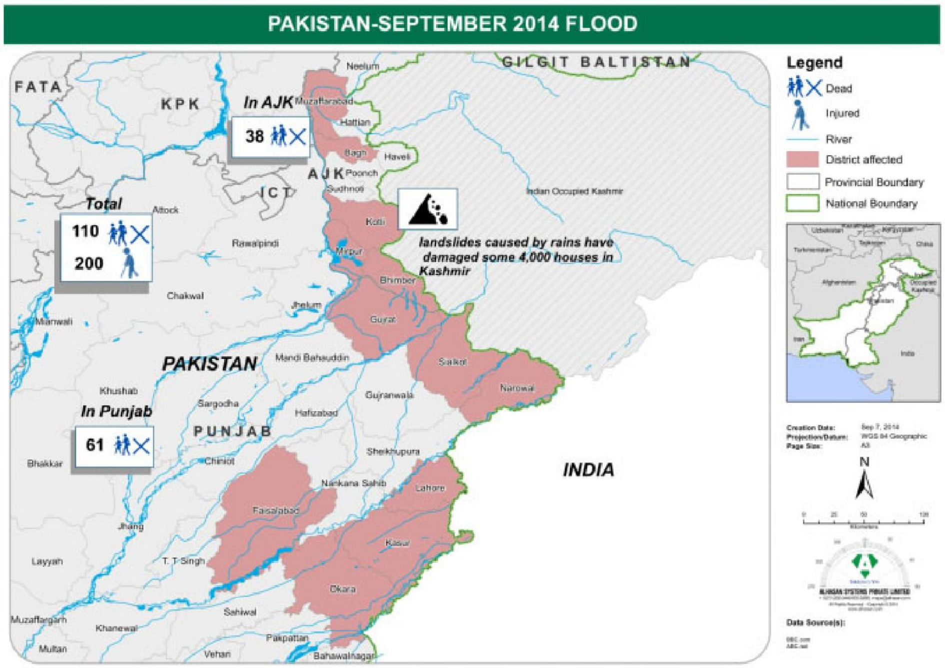

2014 میں سیلاب کی تباہ کاریاں

میں ہونے والی بے دخلی کو 'قدرتی آفت' قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس کا بنیادی سبب ناقص منصوبہ بندی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات میں سیلاب متاثرین کو انتہائی مایوس ہوکر امدادی ٹرکوں پر جھپٹتے ہوئے دکھایا گیا۔

ہنزہ میں بے گھر

ہنزہ، گلگت بلتستان کے تین دیہات......عطاء آباد سرت اور عین آباد پانچ برس قبل زمین سرکنے کے باعث تباہ ہوگئے تھے جس کے متاثرین گزشتہ پانچ برسوں سے بے گھر ہیں۔ دیگر تین دیہات ششکت، گلمت اور غلکن اس وقت ڈوب گئے جب ملبے نے دریائے ہنزہ کے پانی کے بہاؤ کو بند کردیا تھا۔ متاثرہ دیہاتوں کی آبادی 7,400 افراد سے زائد تھی۔ تقریباً 3000 افراد جنوری 2010 سے تین عارضی کیمپوں میں رہائش پذیر تھے۔ کیمپوں میں بنیادی سہولیات کی کمی تھی اور وہ موسم گرما میں انتہائی گرم جبکہ موسم سرما میں انتہائی سرد ہوجاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی اپنے گھروں میں جلد واپسی حکام کی ترجیحات میں شامل نہیں تھی۔ اکتوبر میں، یہ اطلاعات منظر عام پر آئیں کہ گاؤں گلمت کی قریبی وادی نگر کے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر دراڑیں پڑ گئی ہیں اور انہوں نے دریائے ہنزہ کی طرف سرکنا شروع کردیا ہے جسکی بدولت 5000 افراد اپنے گھروں اور زندگیوں سے محروم ہوسکتے ہیں۔ گلمت گاؤں فاکر سے دور نہیں تھا جو کہ نگر میں

سیلاب نے لاکھوں لوگوں کو بے گھر کیا

ہی واقع تھا اور اسی قسم کی صورتحال کا سامنا کر رہا تھا۔ ستمبر کے وسط میں فاکر کی اراضی کا بہت بڑا حصہ دریا میں گر گیا تھا جس کی بدولت دریا کے پانی کا بہاؤ عارضی طور پر رک گیا تھا۔ مقامی باشندوں نے مطالبہ کیا کہ ماہرین علاقے کا فوری سروے کریں مزید مستقبل میں کسی قدرتی آفت کا نشانہ بننے سے بچا جا سکے تاہم سال کے اختتام تک اس مطالبے کا نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔

صحرا میں بے یار و مددگار

صحرائے تھر، سندھ اور صحرائے چولستان، پنجاب کے ہزاروں لوگوں کو خشک سالی کی وجہ سے اپنے گھر بار چھوڑنا پڑے۔ صحرا کے باشندوں کو پینے کے پانی اور مویشیوں کے چارے کی قلت کے باعث نقل مکانی کرنا پڑی کیونکہ برساتی پانے والے تالاب خشک ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چولستان سے سال کے آخری ربع میں ہونے والی نقل مکانی کا سبب وہاں مویشیوں میں پھیلنے والی بیماری تھی۔

ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق مارچ میں تھر کے ہزاروں افراد نے نقل مکانی کی کیونکہ تھرپارکر نے مسلسل تیسرے برس بھی خشک سالی کا سامنا کیا۔ جو تھوڑی بہت گھاس بچی تھی اسے ہوا سے اڑنے والی ریت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اطلاعات کے مطابق چرواہے اپنے مویشیوں کے ہمراہ پانی اور چارے

صحرائے تھر، سندھ اور صحرائے چولستان، پنجاب کے ہزاروں افراد نے خشک سالی کے باعث اپنے گھربار چھوڑے

والے علاقوں کی طرف نقل مکانی کر گئے جبکہ بعض اطلاعات کے مطابق نوجوانوں نے کام کی تلاش میں کراچی اور حیدر آباد کا رخ کیا کیونکہ صحرا میں بارش کے فقدان کا مطلب روزگار کا فقدان ہوتا ہے۔

بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانی

بنگلہ دیش میں 1971ء سے پھنسے لاکھوں پاکستانیوں کی لاقومیتی حیثیت کے خاتمے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بہاریوں کے طور پر پہچانی جانے والی اردو بولنے والی کمیونٹی کو مہاجرین جیسے حالات کا سامنا تھا اور وہ امتیازی سلوک کا شکار تھے۔ ان کا اصرار ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے وقت وہ پاکستانی تھے اور انہیں اپنے وطن واپس بھیجا جانا چاہئے۔ البتہ پاکستان نے ان کی شہریت کو تسلیم کرنے اور انہیں پاکستان لینے سے انکار کیا تھا۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران بنگلہ دیش نے ان بہاریوں کو حق رائے دہی دے دیا جو 1971ء کی جنگ کے وقت کمسن تھے یا بعد ازاں پیدا ہوئے تھے۔ جو لوگ 1971ء میں بالغ تھے انہیں کسی قسم کا قانونی رتبہ حاصل

نہیں تھا۔ انہیں سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں یا یوں کہہ لیں کہ بنیادی سہولیات تک رسائی حاصل نہیں تھی۔

ان پھنسے پاکستانیوں کی حالت زار کو واحد قابل ذکر توجہ 2014ء میں سپریم کورٹ کی طرف سے ملی جب عدالت نے بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی وطن واپسی کے لیے 2009ء میں دائر کی گئی پٹیشن کو باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کر لیا۔

پٹیشنر کا موقف تھا کہ آئین وقانون کی رُو سے حکومتِ پاکستان اس وقت اپنے شہریوں کو وطن واپس بلانے سے انکار کرنے کی مجاز نہیں۔ پٹیشن میں عدالت سے یہ استدعا بھی کی گئی کہ وہ حکومت کو ہدایت جاری کرے کہ بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی دیکھ بھال کی جائے اور نہیں خوراک اور ادویات فراہم کی جائیں جب تک کہ انہیں پاکستان واپس نہیں بلایا جاتا۔ 2014ء کے اختتام تک اس معاملے کا فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔

سفارشات

☆ پاکستان، افغانستان اور بین الاقوامی برادری کو چاہیئے کہ وہ لاکھوں افغانیوں کی طویل بے دخلی کے مسئلے کا دیرپا حل ڈھونڈنے کے لیے اپنی کوششوں میں تیزی لائیں۔ جب تک وہ پاکستان میں ہیں، ان کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں۔

☆ ہنگامی ردعمل کا مظاہرہ صرف ابتدائی اقدام کے طور پر کرنا چاہیئے اور اسے اندرون ملک نقل مکانی سے منسلک مسائل کا حل نہیں سمجھنا چاہیئے۔

☆ فیصلہ سازی کے عمل میں نقل مکینوں کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے تا کہ ان کے مسائل میں کمی آ سکے۔ کیمپوں کے قیام، رجسٹریشن کے عمل اور ان کی واپسی کے انتظامات میں ان سے مشاورت کی جائے۔ جبری بے دخلی کے مسئلہ کو ان سماجی اقدار سے نبٹنے کے لیے ایک موقع کے طور پر لیا جانا چاہیئے جو اقدار خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک کا سبب بنتی ہیں تا کہ روایات کو خواتین کے حقوق کی پامالیوں کے لیے استعمال نہ کیا جا سکے۔

☆ اندرون ملک نقل مکینوں کی رجسٹریشن کا طریقہ کار انتہائی سادہ اور آسان بنایا جائے اور اسے احسان کی بجائے استحقاق سمجھا جائے۔

☆ صحت، تعلیم اور معیشت سمیت دیگر معاملات کے حوالے سے خواتین اور بچوں پر نقل مکانی کے غیر متناسب اثرات کا نوٹس لیا جائے اور ان کا ازالہ کیا جائے۔ معاونت اور صحت کی نگہداشت میں نفسیاتی مشاورت کو بھی شامل کیا جائے۔

☆ ان پاکستانیوں کی فی الواقع لاقومیت کو ختم کرنے کے لیے فوری اور بامعنی اقدام کیا جائے جو چار عشروں سے زائد عرصے سے بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ضمیمے

ضمیمہ - 1

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں

ایچ آر سی پی نے 2014 کے دوران انسانی حقوق کے تمام معاملات سے متعلق وسیع تر سرگرمیوں کا اہتمام کیا تا کہ شہریوں میں بنیادی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے متعلق شعور پیدا کیا جا سکے۔ متعدد سرگرمیوں کا مقصد ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال کا مشاہدہ کرنا اور انسانی حقوق کے بہتر تحفظ اور ادراک کے لیے ایڈووکیسی کرنا تھا۔ ایچ آر سی پی کے چیپٹر اور ٹاسک فورس دفاتر نے ملک بھر میں انسانی حقوق کے معاملات پر ورکشاپس، فیکٹ فائنڈنگ مشن، سیمینارز، تحقیق اور ریلیوں کا اہتمام کیا۔ اپنے عقائد کے باعث غیر محفوظ کمیونٹیوں پر ایچ آر سی پی کے ماہرین کے گروپ نے مذہبی اقلیتوں کے معاملات اور خدشات کو اجاگر کرنے کے لیے میٹنگوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایچ آر سی پی کی اکانومی واچ نے وفاقی وصوبائی بجٹ میں انسانی حقوق کے بنیادی امور کے لیے مالیاتی وسائل کی تخصیص کی مانیٹرنگ کی۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کو انسانی حقوق کے بارے میں حساس بنایا گیا۔ امن اور رواداری سے متعلق معاملات پر کمیونٹیوں کی کے شمولیت کے لیے ملک کے تمام اضلاع میں عوامی اجلاس منعقد کیے گئے۔

ایچ آر سی پی نے او ایم سی ٹی کے اشتراک سے ایذا رسانی کے خلاف اقوام متحدہ کے میثاق کے نفاذ سے متعلق کراچی میں دو مشارتی اجلاس منعقد کیے۔ اجلاس میں غیر ملکی اور مقامی ماہرین اور ملک کے تقریباً تمام علاقوں سے تعلق رکھنے والے شراکت داروں نے شرکت کی۔ معلومات تک رسائی سے متعلق وفاقی اور صوبائی قوانین کا تجزیہ کرنے کے لیے اسلام آباد میں ایک ورکشاپ اور صوبائی سطح پر انتخابی اصلاحات سے متعلق کئی ورکشاپیں منعقد کی گئیں۔ اسلام آباد میں منعقد کردہ ایک اور ورکشاپ میں الیکشن کمیشن کو مکمل خودمختار اور

کیٹ کے نفاذ پر اسلام آباد میں مشاورتی تقریب

زیادہ موثر بنانے کے طریقوں پر بحث کی گئی۔ ایچ آر سی پی نے تمام صوبوں میں انسانی حقوق کے کارکنوں کو تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور فروغ کی اہمیت سے متعلق تربیت فراہم کی۔

سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر ایچ آر سی پی کے دفاتر اور ڈسٹرکٹ کور گروپس نے ملک بھر ریلیاں اور سیمینار منعقد کئے جن میں انہوں نے ملک میں سزائے موت کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ ایچ آر سی پی نے چاروں صوبائی دارالحکومت میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے کنونشن منعقد کئے جن میں معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے کردار پر بحث کی گئی۔ کسانوں کے حقوق سے متعلق بھی ایک کنونشن منعقد کیا گیا جس کا مقصد ملک میں کسانوں کی جدوجہد کو نمایاں کرنا تھا۔

ایچ آر سی پی نے 2014ء میں بلوچستان، کراچی اور تھر میں فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجے۔ کمیشن کے صوبائی چیپٹر آفسز نے بھی کئی فیکٹ فائنڈنگ مشن منعقد کئے۔

تمام دفاتر میں ہونے والے ماہانہ اجلاسوں میں ایچ آر سی پی کے اراکین نے علاقائی اور قومی سطح پر انسانی حقوق کے مسائل پر بحث کی۔ ایچ آر سی پی کے مرکز شکایات کو متعدد معلومات، شکایات اور اطلاعات موصول ہوئیں۔

ایچ آر سی پی کی ویب سائٹ اور بلاگ کو انسانی حقوق کے معاملات پر کمیشن کے مؤقف اور اقدامات پر لاتعداد تبصرے موصول ہوئے۔ انسانی حقوق کے مختلف پہلوؤں بارے معلومات لینے کے لیے

سینکڑوں طلباء، محققین، صحافیوں اور انسانی حقوق کے مختلف پہلوؤں میں دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد نے ایچ آر سی پی کی آن لائن آرکائیو پر گفتگو کی جسے بہتر رسائی کے لئے 2014ء میں بہتر بنایا گیا تھا۔ 2014ء کے دوران ادارے کی اہم سرگرمیوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ورکشاپس/سیمینار/اجلاس

24 جنوری، پشاور: انسانی حقوق کی صورتحال سے متعلق برین سٹارمنگ اجلاس، جس میں این جی اوز کے نمائندوں اور فدھ کے ایک وفد نے شرکت کی۔

25 اور **26** جنوری، کراچی: فدھ اور ایچ آر سی پی کی ورکشاپ: پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی صورتحال؛ چیلنجز اور ردعمل

29 جنوری، کراچی: پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی صورتحال سے متعلق فِدھ کے لئے پریس کانفرنس، جس میں مقامی، غیر ملکی میڈیا اور سول سوسائٹی کے اراکین نے شرکت کی۔

31 جنوری، کراچی: دلاور خان تنولی نے محنت کشوں کے حقوق کی خلاف ورزی کے معاشرے پر اثرات پر گفتگو کی۔

14-16 فروری، لاہور: ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' سے متعلق پنجاب، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان کے تربیت کاروں کی تربیت (ٹی او ٹی)۔

17 فروری، کراچی: ''جنوبی ایشیا میں انسانی حقوق کی صورتحال'' سے متعلق اے ایچ آر سی پی کے

الیف آئی ڈی ایچ اور ایچ آر سی پی کی مشترکہ ورکشاپ

پالیسی ڈائیلاگ: مقامی حکومت کے انتخاب میں خواتین کی نمائندگی

رکن بصیر نوید کا خطاب۔

18 فروری، اسلام آباد: ''بلدیاتی انتخابات میں خواتین کی نمائندگی'' کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے اوکسفام، پاکستان مرکز برائے شہری تعلیم، خویندو کور، ساپ پی کے اور ایس اے ایف ڈبلیو سی او کے تعاون سے ایک پالیسی بحث کا انعقاد کیا گیا، جس میں اہم سیاسی جماعتوں، صوبائی حکومتوں، قومی کمیشن برائے مقام نسواں، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور میڈیا کے نمائندوں نے شرکت کی۔

20 فروری، حیدر آباد: سندھ میں جبری گمشدگیوں کے واقعات سے متعلق اجلاس

21-23 فروری، لاہور: ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' سے متعلق پنجاب، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان کے تربیت کاروں کی تربیت (ٹی او ٹی)۔

25 فروری، کراچی: اقلیتوں کے حقوق پر کام کرنے والی سول سوسائٹی کی تنظیموں کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز کی محترمہ رضیہ جعفر اور محترمہ نیّر سلام کی میٹنگ کا اہتمام کیا۔

27 فروری، کراچی: ایچ آر سی پی کونسل اراکین (سندھ) کا اجلاس۔

28 فروری، کراچی: ماہانہ اجلاس، ''ادب اور انسانی حقوق'' پر گفتگو کے لئے ڈوچ ویلے، جرمنی کے رکن شامل شمس کو مدعو کیا گیا۔

7 مارچ، کراچی: آرٹس کونسل میں خواتین کا دن منایا۔

پشاور: مرکزی گروپ کی اقلیتوں کے نمائندوں کے ساتھ مشاورت۔

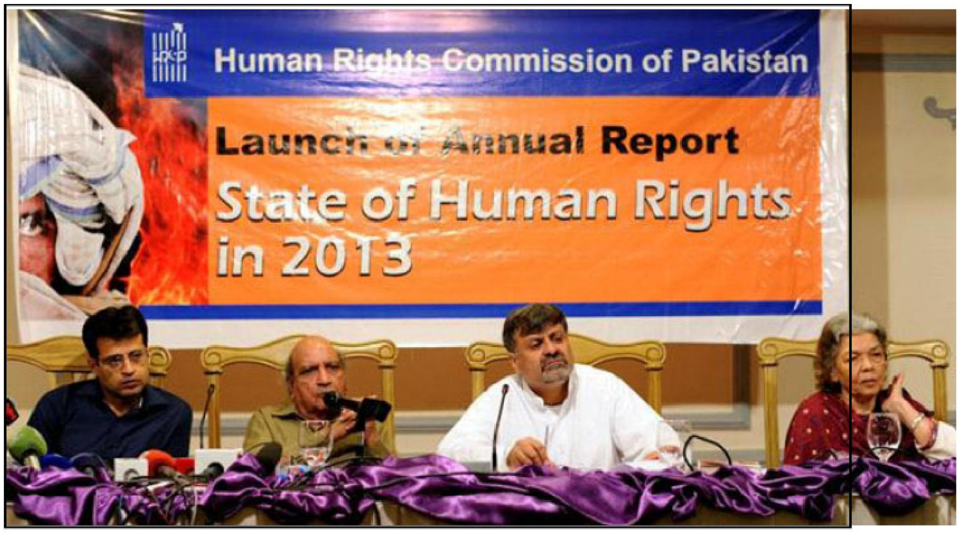

سالانہ رپورٹ کی چھپاعت:''2013 میں انسانی حقوق کی صورت حال''

14 مارچ، حیدرآباد: ''تھر کی خشک سالی کے حوالے سے قدرتی آفات میں لوگوں کے حقوق'' سے متعلق اجلاس اور تھر میں خشک سالی سے ہلاک ہونے والے بچوں کے لئے شمعیں روشن کی گئیں۔

19 مارچ، حیدرآباد: ایسوسی ایشن آف رورل ڈویلپمنٹ (اے آر ڈی) کے اشتراک سے تھر کی مذہبی اقلیتوں کے حقوق سے متعلق مشاورت۔

20 مارچ، حیدرآباد: بدین کے گاؤں نیو دھمبالو میں تین ہندو لڑکوں کے خلاف توہین مذہب کا مقدمہ درج کئے جانے سے متعلق سول سوسائٹی کا اجلاس۔

21 مارچ، حیدرآباد: ڈی آئی جی حیدرآباد کے ساتھ میٹنگ، جس میں توہین مذہب کے مقدمے کے اندراج کے بعد علاقے کے ہندوؤں کو تحفظ فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

21 مارچ، کراچی: ایچ آر سی پی کے اراکین کا اجلاس۔

22-23 مارچ، کندھ کوٹ، سندھ: ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

25-26 مارچ، پنو عاقل: ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

29-30 منڈی بہاؤالدین: ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی

راشد رحمان کے لیے تعزیتی ریفرنس

اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

28 مارچ، کراچی: روچی رام کا لیکچر: پیر پگارا اسبغت اللہ، آزادی کے سپاہی اور جدید دور سے ان کی مناسبت۔

31 مارچ، تربت: خواتین کے عالمی دن سے متعلق سیمینار۔

4 اپریل، حیدر آباد: خواتین مخالف سرگرمیوں کے خلاف سندھ اسمبلی کے قانون کے بارے میں اجلاس۔

5 اپریل، حیدر آباد: تعلیم سے متعلق شراکت داروں کے ایک اجلاس میں شرکت کی۔

5-6 اپریل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

12-13 اپریل، سوات، خیبر پختونخوا: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

12-13 اپریل، کہروڑ پکا، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

19-20 اپریل، کوئٹہ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت''

راشد رحمان کے لیے شمعیں روشن کی گئیں

کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

19-20 اپریل، گمبٹ، سندھ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

22-23 اپریل، بولان، بلوچستان: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

22-23 اپریل، مہراب پور: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' کے بارے میں تربیتی ورکشاپ۔

22 اپریل، راجن پور: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں ضلعی اجلاس۔

23 اپریل، لیہ: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں ضلعی اجلاس۔

24 اپریل، اسلام آباد: سالانہ رپورٹ'' پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال' کی تقریب رونمائی۔

28 اپریل، کوئٹہ: اقلیتوں کے حقوق بارے مرکزی گروپ کی مشاورت۔

28-29 اپریل، کوئٹہ: یونیورسٹی آف بلوچستان اور بی یو آئی ٹی ای ایم ایس میں سروے کا انعقاد۔

پریس کانفرنس: ''جنوبی ایشیا میں انسانی حقوق کے نظام کی تشکیل پر اتفاق رائے''

30 اپریل، حیدرآباد: مزدوروں کے عالمی دن کے حوالے سے ''نج کاری اور محنت کشوں کے حقوق'' بارے ایک گول میز مشاورت۔

30 اپریل، کراچی: ای یو بی آئی کی پنشن میں اضافے کے لئے اجلاس۔

3 مئی، ساہیوال: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق بارے ضلعی اجلاس۔

3 مئی، خانیوال: ڈسٹرکٹ بار خانیوال میں جبری گمشدگیوں اور ایذا رسانی پر مشاورت۔

3-4 مئی، لالیاں: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

6 مئی، ملتان: ملتان پریس کلب کے اشتراک سے پریس کی آزادی پر مشاورت۔

8 مئی، گلگت: وکیل اور ایچ آر سی پی کے ریجنل کوآرڈینیٹر راشد رحمان، جنہیں ملتان میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا، کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اجلاس۔

8 مئی، حیدرآباد: راشد رحمان کے لئے تعزیتی اجلاس۔

8 مئی، اسلام آباد: راشد رحمان کے لئے تعزیتی اجلاس اور شمعیں روشن کرنے کی تقریب۔

9 مئی، کراچی: راشد رحمان کے لئے تعزیتی اجلاس اور ان کے قتل کے خلاف احتجاج۔

9 مئی، کوئٹہ: راشد رحمان کے لئے تعزیتی اجلاس۔

جنسی ہراسیمگی کے خلاف قوانین اور اُن کے نفاذ پر مشاورت

10-11 مئی، کالام، خیبر پختونخوا: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

10-11 مئی، قصور، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

13-14 مئی، بہاولنگر، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

14-15 مئی، بحرین، خیبر پختونخوا: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

17-18 مئی، اوکاڑہ، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

12 مئی، حیدرآباد: لائیوسٹاک ڈیپارٹمنٹ کے ملازمین کے مطالبات پر گفتگو کے لئے اجلاس۔

17 مئی، حیدرآباد: ایک انٹرنیٹ ریڈیو (وائس آف سندھ-لندن) کے اشتراک سے ''میڈیا سے رقابت پر شہریوں کی تشویش'' پر مشاورت۔

20 مئی، سکھر: جبری تبدیلی مذہب اور جبری شادیوں پر ورکشاپ۔

21 مئی، کراچی: جیو، جنگ گروپ کے لئے کام کرنے والے صحافیوں سے اظہار یکجہتی کے لئے اجلاس۔

23 مئی، حیدرآباد: ایچ آر سی پی حیدرآباد کے اراکین کا ماہانہ اجلاس۔

23 مئی، حیدرآباد: قید سے رہائی پانے والے مزدوروں کے ساتھ میٹنگ۔

24-25 مئی، میلسی، پنجاب: "تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت"، پر تربیتی ورکشاپ۔

27 مئی، کراچی: "اظہار رائے کی آزادی کو درپیش چیلنج"، پر سیمینار۔

27 مئی، حیدرآباد: حیدرآباد کی بار ایسوسی ایشن کے عہدیداران کے ساتھ میٹنگ، جس میں وکلاء اور انسانی حقوق کے محافظوں پر ہونے والے ٹارگٹ حملوں پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

28 مئی، اسلام آباد: سیفما اور آس فاؤنڈیشن کے اشتراک سے راشد رحمان کی یاد میں اجلاس۔

30 مئی، کراچی: پروفیسر ڈاکٹر سحر انصاری کی جانب سے "جدید دور میں ادب اور صحافت کے رجحانات" کے موضوع پر گفتگو۔

30-31 مئی، ہنگو، خیبر پختونخوا: "تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت"، پر تربیتی ورکشاپ۔

3 جون، حیدرآباد: والمکی ہندو نوجوانوں کے ساتھ میٹنگ، جنہوں نے ٹنڈو یوسف ٹاؤن میں اپنے قدیم قبرستان پر قبضہ کرنے کی کوششوں کے خلاف شکایت کی۔

3 جون، حیدرآباد: "مذہبی ہم آہنگی میں میڈیا کا کردار"، پر مزاح نگاروں کی ورکشاپ۔

5 جون، کوئٹہ: ضلع لورالائی کے علاقے دکی میں آگہی میں اضافے کے لئے ڈسٹرکٹ پروگرام۔

6 جون، کوئٹہ: زیارت میں آگہی میں اضافے کے لئے ڈسٹرکٹ پروگرام۔

7-8 جون، علی آباد، گلگت بلتستان: "تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت"، پر تربیتی ورکشاپ۔

7-8 جون، سمارو، سندھ: "تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت" پر تربیتی ورکشاپ۔

9-10 جون، ٹنڈو باگو: "تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت" پر تربیتی ورکشاپ۔

11 جون، اسلام آباد: ساؤتھ ایشینز فار ہیومن رائٹس (سحر) اور ایشین فورم برائے انسانی حقوق و ترقی (فورم ایشیا) کے ایک وفد کے ساتھ سیکریٹری امور خارجہ اور سارک کے ڈی جی کی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ اس میٹنگ کا مقصد علاقے کے لئے انسانی حقوق سے متعلق ایک جنوبی ایشیائی طریقہ کار تشکیل دینے کے

ایچ آر سی پی کی مشاورت: 2015 کے بعد پاکستان کا ترقیاتی ایجنڈا

امکانات اور انسانی حقوق سے متعلق وسیع تر تعاون پر مشاورت کرنا تھا۔

11-12 جون، نگر، گلگت بلتستان: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

12 جون، حیدرآباد: ضلع سانگھڑ کے علاقے سانجھورو کے ایک زمیندار کی جانب سے مبینہ طور پر حاجی سوبھو نامی کسان کو قتل کرنے کی کوشش کی مذمت کرنے کے لئے اجلاس۔

14-15 جون، نوابشاہ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

11 جون، اسلام آباد: سحر اور فورم ایشیا کے ایک وفد کے لیے سارک ممالک کے سفیروں اور ہائی کمیشنروں کے ساتھ ایک اجلاس کا اہتمام کیا۔ اس اجلاس کا مقصد علاقے کے لئے انسانی حقوق سے متعلق ایک جنوبی ایشیائی طریقہ کار تشکیل دینے امکانات اور انسانی حقوق سے متعلق وسیع تر تعاون پر مشاورت کرنا تھا۔

12 جون، اسلام آباد: ''انسانی حقوق سے متعلق ایک جنوبی ایشیائی طریقہ کار کے لئے اتفاق رائے قائم کرنے'' کے لئے سحر اور ایشین فورم برائے انسانی حقوق و ترقی (فورم ایشیا) کے لئے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا۔

11-12 جون، گلگت: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی

حیدرآباد: طلباء کوانسانی حقوق کی آ گاہی

اہمیت'' پرتربیتی ورکشاپ۔

13-14 جون، غذر، گلگت بلتستان: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پرتربیتی ورکشاپ۔

14-15 جون، دوڑ، سندھ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اورتحقیق کی اہمیت'' پرتربیتی ورکشاپ۔

16-17 جون، گلگت: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اورتحقیق کی اہمیت'' پرتربیتی ورکشاپ۔

16-17 جون، دیامیر، گلگت بلتستان: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پرتربیتی ورکشاپ۔

17 جون، کوئٹہ: کوئٹہ کے موسیٰ گرلز کالج میں آگہی میں اضافے سے متعلق ضلعی پروگرام۔

20 جون، حیدرآباد: مالی سال 2014-15 کے لئے سندھ کے بجٹ پر مشاورت۔

20 جون، حیدرآباد: ہالہ ٹاؤن میں بگری برادری کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر اجلاس۔

24-25 جون، پشین: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اورتحقیق کی اہمیت'' پرتربیتی ورکشاپ۔

کوئٹہ میں یوتھ فیسٹیول

25 جون، حیدرآباد: پریس کلب کے باہر اجلاس، جہاں پر خیمہ زن کسان خاندانوں کے عمائدین نے ایچ آر سی پی کو اپنے احتجاج کی وجوہات سے آگاہ کیا۔

26 جون، کراچی: ایچ آر سی پی نے مختلف این جی اوز کے تعاون سے ''ایذارسانی کے متاثرین کے حمایت میں عالمی دن'' سے متعلق ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔

26 جون، گلگت: ایذارسانی کے متاثرین کی حمایت کا عالمی دن منانے کے لئے سول سوسائٹی کی تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ میٹنگ۔

26 جون، کوئٹہ: ایذارسانی کے متاثرین کی حمایت کے عالمی دن کے حوالے سے کوئٹہ پریس کلب کے باہر احتجاج۔

26-27 جون، زیارت: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت''، پر تربیتی ورکشاپ۔

26-27 جون، تخت بھائی، خیبر پختونخوا: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت''، پر تربیتی ورکشاپ۔

27 جون، گلگت: ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں نوجوانوں کا کردار اور گلگت بلتستان میں جمہوری ترقی'' پر ورکشاپ۔

انتخابی اصلاحات پر مشاورت

27 جون، کراچی: ''تنازعات کے حل'' پر مومن خان مومن کا ماہانہ خطاب۔

28 جون، حیدر آباد: ''پانی کی ترسیل اور حفظان صحت کے شہریوں کی صحت پر اثرات'' کے موضوع پر مشاورتی اجلاس۔

28 جون، اسلام آباد: پاکستان میں جنسی ایذا دہی سے متعلق قوانین اور ان کے نفاذ پر مشاورت۔

4 جولائی، حیدر آباد: کسانوں کے احتجاج کے حوالے سے سول سوسائٹی کی تنظیموں، ایچ آر سی پی، پلر، پی ایف ایف، اور سپارک کا مشترکہ اجلاس۔

4 جولائی، کراچی: ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے (یو ڈی ایچ آر) پر لیکچر۔

7 جولائی، حیدر آباد: جاوید میمن نامی سیاسی کارکن، جن کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بدین بس سٹاپ کے قریب پھینک دیا گیا تھا، نے ایچ آر سی پی کو بتایا کہ انہیں نامعلوم افراد نے 25 نومبر، 2013ء کو اغوا کے بعد تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ان سے سندھ میں ہونے والے دھماکوں، ہتھیاروں اور پارٹی کی فنڈنگ کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔

17 جولائی، کراچی: سندھ لوکل گورنمنٹ ایکٹ 2013 کے تناظر میں ''مقامی حکومت: مشکلات اور امکانات'' پر ورکشاپ۔

18 جون، کراچی: اپنے عقیدے کی بنا پر غیر محفوظ برادریوں سے متعلق ایچ آر سی پی کے ایکسپرٹ

گروپ کا اجلاس۔

21 جولائی، کراچی: کراچی کی صورتحال پر فیکٹ فائنڈنگ مشن کے حقائق سے متعلق ایچ آر سی پی کی پریس کانفرنس۔

22 جولائی، حیدرآباد: کسانوں اور ایک زمیندار کے درمیان تنازعے کا متبادل حل۔

5 اگست، کراچی: ایچ آر سی پی، پلر اور پی ایف ایف نے بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری میں لگنے والی آگ سے متعلق ایک اجلاس منعقد کیا۔

8 اگست، اسلام آباد: ایچ آر سی پی کے راولپنڈی، اسلام آباد کے اراکین اور وکلاء کا ماہانہ اجلاس۔

8-9 اگست، میہڑ، سندھ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

9 اگست، قصور: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

9-10 اگست، لیّہ، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

10 اگست، گوجرانوالا: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

10-11 اگست، سہون شریف: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

11-12 اگست، کوٹ ادو: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

12-13 اگست، رتوڈیرو، سندھ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

16-17 رحیم یار خان، پنجاب: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

19 اگست، ننکانہ صاحب: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

19-20 اگست، احمد پور شرقیہ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

23 اگست، سکھر: انتخابی اصلاحات پر اجلاس۔

فاٹا میں خصوصی قوانین اور اصلاحات پر مشاورت

23-24 اگست، ایبٹ آباد: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

27-28 اگست، مانسہرہ: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

29 اگست، اسلام آباد: ایچ آر سی پی کے اراکین کا ماہانہ اجلاس۔ اردو اخبارات پر شکیل چودھری کا خطاب۔

30-31 اگست، شانگلہ، خیبر پختونخوا: تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

29 اگست، کراچی: سندھ نیشنل پارٹی کے سیکریٹری اطلاعات ایوب قریشی کی ''جمہوریت اور پاکستان'' پر گفتگو۔

29 اگست، کراچی: ملک کی جمہوری قوتوں سے اظہار یکجہتی کے لئے جے اے سی کا مظاہرہ۔

29 اگست، دالبندین: دالبندین پریس کلب میں آگہی میں اضافے کا پروگرام۔

30 اگست، وہاڑی: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

30 اگست، اسلام آباد: ''پاکستان کا 2015ء کے بعد کا ترقیاتی ایجنڈا'' کے عنوان پر منعقد ہونے والے مشاورتی اجلاس میں ہزار سالہ ترقیاتی اہداف اور اگلے پندرہ سالوں کے لئے اہم ترجیحی ترقیاتی اہداف کے حصول کے حوالے سے پاکستان کو درپیش چیلینجوں کی نشاندہی کی گئی۔

4 ستمبر، حیدرآباد: انسانی حقوق کے حوالے سے سینٹ بوناوینچر سکول، پھلیلی، حیدرآباد کے طلباء سے ملاقات۔

4 ستمبر، کوئٹہ: خاران کے انٹر گرلز کالج میں آگہی میں اضافے کا پروگرام۔

4-5 ستمبر، گلگت: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

6-7 ستمبر، دینیور: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

6-7 ستمبر، ٹمیاری: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

9 ستمبر، کوئٹہ: انتخابی اصلاحات سے متعلق رابطہ اجلاس۔

9-10 ستمبر، سانگھڑ، سندھ: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

9-10 ستمبر، منی مرگ، گلگت بلتستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

11-12 ستمبر، جامشورو، سندھ: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

13-14 ستمبر، ٹنڈو الہیار: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

13-14 ستمبر، گھنچے، گلگت بلتستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

16-17 ستمبر، مٹھی، تھرپارکر: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

16-17 ستمبر، شگر، گلگت بلتستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

12 ستمبر، اسلام آباد: بنوں کے آئی ڈی پیز اور بے گھر بچوں سے متعلق وکلاء اور صحافیوں کا

اجلاس۔

14 ستمبر، تربت: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

19 ستمبر، حیدرآباد: سیسیلیا بورجیا آف میٹا ریسرچ، نیدرلینڈز کو سندھ کے ساحلی علاقوں کی ماہی گیر آبادیوں سے متعلق بریفنگ دی گئی۔

20 ستمبر، حیدرآباد: سکاٹ لینڈ کے ریفرنڈم کے ادراک سے متعلق فورم۔

20 ستمبر، اسلام آباد: انتخابی اصلاحات پر مشاورتی اجلاس، جس میں سیاسی جماعتوں، سول سوسائٹی اور میڈیا کے نمائندوں نے شرکت کی۔

20-21 ستمبر، اُتھل، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

21 ستمبر، تربت: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

23 ستمبر، سرگودھا: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

23-24 ستمبر، بیلہ ٹاؤن، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

25 ستمبر، نصیرآباد: ضلعی آگہی پروگرام۔

25 ستمبر، اسلام آباد: فاٹا میں خصوصی قوانین اور اصلاحات پر مشاورت۔

26 ستمبر، جھل مگسی: ضلعی آگہی پروگرام۔

27 ستمبر، جعفرآباد: ضلعی آگہی پروگرام۔

10 اکتوبر، اسلام آباد: ماہانہ اجلاس۔

6 اکتوبر، حیدرآباد: حیدرآباد میں ایچ آر سی پی کی سرگرمیوں کے جائزے کے لئے ایچ آر سی پی، سندھ چیپٹر آفس، کراچی میں اجلاس۔

8 اکتوبر، کوئٹہ: بلوچستان کے بلدیاتی اداروں پر مشاورت۔

9 اکتوبر، کوئٹہ: انتخابی اصلاحات سے متعلق رابطہ اجلاس۔

10 اکتوبر، گلگت: سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے حوالے سے سول سوسائٹی کے نمائندوں کا مشاورتی اجلاس۔

14 اکتوبر، حیدرآباد: حیدرآباد میں ادیبوں اور فنکاروں کے کونشن سے متعلق تعارفی اجلاس۔

18 اکتوبر، گلگت: گلگت بلتستان پر ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن کی رپورٹ ''ایک نئی گریٹ گیم کی گرفت میں'' کے جائزے پر اجلاس۔

18 اکتوبر، تربت: بچوں، خواتین، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر تربیتی ورکشاپ۔

18-19 اکتوبر، تھل، پنجاب: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

21 اکتوبر، حیدرآباد: ہالہ ٹاؤن، ٹیاری میں اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر مشاورت۔

21-22 اکتوبر، شورکوٹ، پنجاب: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

24-25 اکتوبر، کبیروالا، پنجاب: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

22 اکتوبر، ٹنڈو محمد خان: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

24 اکتوبر، ملتان: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے شعبہ اردو کے سربراہ قاضی عابد کا انسانی حقوق پر خطاب۔

25 اکتوبر، سیالکوٹ: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

25 اکتوبر، کوئٹہ: بلوچستان کے ادیبوں اور فنکاروں کا کنونشن۔

28 اکتوبر، ٹوبہ ٹیک سنگھ: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

31 اکتوبر، جامشورو: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

31 اکتوبر، حیدرآباد: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

27-28 اکتوبر، چترال: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

یکم نومبر، چنیوٹ: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

1-2 نومبر، شرینگل، خیبر پختونخوا: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

1-2 نومبر، دیپالپور، پنجاب: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے

حیدرآباد: سندھ کے ادیبوں اور فنکاروں کا کنونشن

لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

4-5 نومبر، ایدن زئی، خیبر پختونخوا: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

6-7 نومبر، کراچی: ''پاکستان میں ایذا رسانی کے خلاف میثاق: نفاذ اور احتساب کی جانب'' پر مشاورت، جس میں بلوچستان اور سندھ کے صحافیوں، وکلاء، سابق ججوں، ڈاکٹروں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے شرکت کی۔

8-9 نومبر، مالاکنڈ: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

9 نومبر، حیدرآباد: حیدرآباد میں سندھ کے ادیبوں اور فنکاروں کا کنونشن، جس میں سندھی اور اردو زبانوں کے ادیبوں، شاعروں، میڈیا کے نمائندوں اور فنکاروں نے شرکت کی۔

10-11 نومبر، اسلام آباد: پاکستان میں ایذا رسانی کے خلاف میثاق: نفاذ اور احتساب کی جانب'' پر مشاورت، جس میں اسلام آباد، پنجاب، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان کے صحافیوں، وکلاء، سابق ججوں، ڈاکٹروں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے شرکت کی۔

11 نومبر، سبی: سبی میں گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج میں ضلعی آگہی پروگرام۔

12-13 نومبر، رزار، کے پی: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

13 نومبر، کراچی: انتخابی اصلاحات پر بحث۔

14 نومبر، حیدر آباد: سول سوسائٹی کی کارکن زیب النساء کے بیٹے کی غیر قانونی حراست پر مشاورت۔

14-15 نومبر، دشت، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

14-15 نومبر، لچھی، کے پی: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

15 نومبر، اسلام آباد: معلومات تک رسائی سے متعلق صوبائی قوانین کا جائزہ لینے کے لئے ورکشاپ۔

15-16 نومبر، ملتان: قومی کسان کنونشن، جس میں پاکستان کے تمام صوبوں سے تعلق رکھنے والے کسانوں اور ملازمین نے شرکت کی۔

16-17 نومبر، پسنی، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

17 نومبر، کوئٹہ: بلوچستان یوتھ فیسٹیول۔

21-22 نومبر، بولان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

22-23 نومبر، مچھ: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

23-24 نومبر، مسلم باغ: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

26-27 نومبر، ڈیرہ الہیار: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

28 نومبر، کراچی: ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کی بحالی پر مشاورت۔

30 نومبر، لاہور: یوتھ فیسٹیول۔

2-3 دسمبر، ژوب: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

3-5 دسمبر، سانگھڑ، میرپورخاص، ٹھٹھہ، سجاول: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

5-6 دسمبر، نصیرآباد، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

5-6 دسمبر، ڈیرہ مراد جمالی، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

7 دسمبر، ملتان: ''رواداری کے فروغ میں ادیبوں کا کردار'' پر ادیبوں کا کنونشن۔

8-9 دسمبر، خانوزئی، بلوچستان: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

10 دسمبر، کوئٹہ: سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی میں تعلیم کے بہادر طلبگاروں کے لئے امن ایوارڈ۔

13-14 دسمبر، میرپور، آزاد کشمیر: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم و تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

13-14 دسمبر، دھیرکوٹ: انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے ''تکثیری اقدار کے فروغ کے لئے انسانی حقوق کی تعلیم اور تحقیق کی اہمیت'' پر تربیتی ورکشاپ۔

12-16 دسمبر، شکارپور، سکھر، نوشہروفیروز، گھوٹکی، خیرپور: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

22 دسمبر، ملتان: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

22 دسمبر، بہاولپور: اقلیتوں، خواتین، بچوں اور مزدوروں کے حقوق پر ضلعی اجلاس۔

26-27 دسمبر، مٹھی: کھلی سماعت اور سول سوسائٹی کے ساتھ ملاقات۔

29 دسمبر، کراچی: ''خواتین کی تنخواہیں اور ملازمت'' پر مشاورت۔

11 جنوری، کراچی: کراچی میں ایک 12 سالہ لڑکی سے جنسی زیادتی کے واقعے سے متعلق حقائق معلوم کیے۔

20 جنوری، پشاور: ڈسٹرکٹ جیل، ملتان کے جوڈیشل لاک اپ میں قتل کے الزام میں قید 29 سالہ حسین خان کو زہر دیے جانے کے الزامات کی چھان بین۔

21 جنوری، حیدرآباد: وہ حالات معلوم کئے جن میں ایک سیاسی کارکن مشتاق احمد سومرو کو سندھ زرعی یونیورسٹی کے ایمپلائز ریذیڈینشل کالونی سے اغوا کیا گیا۔

22 جنوری، پشاور: سکھ برادری سے تعلق رکھنے والے 60 سالہ بکھون سنگھ کی ٹارگٹ کلنگ کے حقائق معلوم کئے، جنہیں تنگی بازار، ضلع چارسدہ میں اپنی دکان سے گھر جاتے ہوئے نشانہ بنایا گیا۔

22 جنوری، حیدرآباد: ضلع عمرکوٹ کے علاقے کنڑی ٹاؤن میں پولیس چھاپے کے دوران ایک دو سالہ بچے کی ہلاکت اور تین افراد سمیت ایک سات سالہ بچی کے زخمی ہونے کے واقعے کے بارے حقائق معلوم کئے۔ تمام افراد کا تعلق کولہی برادری سے تھا جنہیں عمرکوٹ کی ایک عدالت نے زمیندار کی تین سالہ غلامی سے آزاد کرایا تھا۔

30 جنوری، حیدرآباد: جتی ٹاؤن کے قریبی ساحلی گاؤں میں آباد ہندو خانہ بدوش قبیلے ''بھگری'' کی شکایات کی چھان بین کی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ان پر چند افراد نے حملہ کیا جنہوں نے ان پر تھر سے جبری گداگری کے لئے ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کرنے کا الزام عائد کیا۔

5-6 مارچ، پشاور: زرعی یونیورسٹی پشاور میں انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز کے اشتراک سے مذہب اور عقیدے کی آزادی کی بیس لائن سٹڈی۔

29 اپریل، حیدرآباد: رانو میگھواڑ کے اغوا پر اس کے خاندان، علاقے کے دکاندار، چشم دید گواہان اور پولیس سے ملاقات۔

15 مئی: سنگدی اور سورنگی کی کوئلے کی کانوں کا دورہ۔

22 مئی: مچھ میں آب گم کی کوئلے کی کانوں کا دورہ۔

7 جون: دکی کی کوئلے کی کانوں کا دورہ۔

11 جون: شرگ، ضلع ہرنائی میں کوئلے کی کانوں کا دورہ۔

20-17 جون، کراچی: کراچی فیکٹ فائنڈنگ مشن۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق بڑھتی ہوئی شکایات کو دیکھتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اس نتیجے پر پہنچا کہ گزشتہ سال کراچی میں رینجرز کی جانب سے شروع کیا گیا آپریشن اپنے اہداف کو حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ مشن، جس نے میڈیا کے نمائندوں، سول سوسائٹی، سیاسی جماعتوں، اقلیتوں، حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے علاوہ متاثرین کے اہل خانہ سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کراچی کی صورتحال کا تجزیہ کیا، نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ ''آپریشن کے مقاصد حاصل نہیں ہوئے تھے۔''

17 فروری، حیدرآباد: سیاسی کارکن صاحب خان گھوٹو کی گولیوں سے چھلنی نعش برآمد ہونے کے واقعے کے بارے میں حقائق معلوم کئے۔ گھوٹو، جو جے ایس ایم کے کارکن تھے، 14 فروری 2014ء کو سکھر میں لاپتہ ہو گئے تھے۔

یکم اگست، گوجرانوالا: گوجرانوالا میں ہجوم کے انصاف کے واقعے کے بارے میں حقائق معلوم کئے۔ ایک خاتون اور اس کی دو کمسن پوتیاں اس وقت دم گھٹنے کے باعث جاں بحق ہو گئیں جب تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل ہجوم نے طیش میں آ کر احمدیوں کے چند گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ ہجوم کے طیش کا سبب خانہ کعبہ کی وہ تصویر تھی جو ایک 18 سالہ احمدی شخص نے فیس بک پر اپ لوڈ کی تھی، جسے وہ مذہب کی توہین سمجھتے تھے۔

10-8 اگست، تربت: تربت میں اجتماعی قبروں کی دریافت کے دعووں کی چھان بین۔

24 ستمبر، ملتان: چلڈرن ہسپتال، وہاڑی میں مبینہ طور پر آکسیجن کی عدم دستیابی کے باعث چار نومولود بچوں کی ہلاکت سے متعلق حقائق معلوم کئے۔

12-10 اکتوبر، کوئٹہ: بلوچستان کی صورتحال پر فیکٹ فائنڈنگ مشن۔

25 اکتوبر، ملتان: خانیوال میں نام نہاد غیرت کے نام پر عبدالغفور نامی شخص کے قتل کے بارے میں حقائق معلوم کئے۔

5 نومبر، کوٹ رادھا کشن: ضلع قصور کے علاقے کوٹ رادھا کشن میں ایک توہین مذہب کے الزام پر ایک مسیحی جوڑے کو بھٹے میں جلائے جانے کے واقعے سے متعلق حقائق معلوم کئے۔ ایچ آر سی پی قرآن کی مبینہ بے حرمتی کے کوئی شواہد نہیں ملے تھے اور اس واقعے کا سبب بظاہر اجرت اور واجب الادا رقم کا تنازعہ تھا۔

26 نومبر، حیدرآباد: بغیر وارنٹ جبری مشقت سے رہائی پانے والے مزدوروں کے ہوسری کیمپ پر پولیس کے چھاپے، اور خواتین اور بچوں پر تشدد اور ان سے نقدی اور زیورات چھیننے کے الزام سے متعلق

ایذا رسانی کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے عالمی دن پر ریلی کا اہتمام

حقائق معلوم کیے۔ کیمپ میں موجود دیہاتیوں نے وقوعے کی تصدیق کی تاہم پولیس نے اس کی تردید کی۔

27 نومبر، حیدرآباد: مہران یونیورسٹی کے سرگرم طالب علم کملیش کمار سے متعلق حقائق اکٹھے کیے جنہیں 26 نومبر کو یونیورسٹی ہاؤسنگ سوسائٹی، جامشورو سے اغوا کیا گیا تھا۔

3 دسمبر، ملتان: لیّہ کے علاقے کوٹ سلطان میں تین افراد کی جانب سے ایک طالبہ کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنائے جانے کے واقعے سے متعلق حقائق معلوم کیے۔

مظاہرے/ ریلیاں/ احتجاج/ دورے

28 جنوری، کراچی: ایچ آر سی پی کی ایک ٹیم نے ان شیعہ ہزارہ افراد سے ملاقات کی جو بلوچستان میں بس پر ہونے والے حملے میں زخمی ہوئے تھے اور انہیں علاج کے لئے آغا خان ہسپتال، کراچی منتقل کیا گیا تھا۔

9 فروری، حیدرآباد: جیے سندھ متحدہ محاذ کے قوم پرست کارکن محمد علی نوناری نوری آباد کے قریب نازک حالت میں پائے گئے جس کے بعد ایک وفد نے واقعے کی چھان بین کی۔ انہیں گیارہ ماہ پہلے اغوا کیا گیا تھا۔

10 جنوری، اسلام آباد: 2013ء میں دو بم دھماکوں میں جاں بحق ہونے والے کوئٹہ کے شیعہ ہزارہ افراد کی یاد میں شمعیں روشن کی گئیں۔

24 جنوری، کراچی: ایچ آر سی پی نے پوسٹر فارٹو ماروا اور آرٹس کونسل کے اشتراک سے ''سب کا

گھر'' کے عنوان سے اشتہارات کی نمائش کا اہتمام کیا۔

2 فروری، حیدرآباد: لاپتا بلوچوں سے اظہار یکجہتی اور بلوچستان کے علاقے خضدار اجتماعی قبروں کی دریافت کے خلاف شمعیں روشن کرنے کی تقریب۔

2 فروری، کراچی: ایچ آر سی پی کے ایک وفد نے اولڈ سلاٹر ہاؤس، لیاری کے مکینوں کی بے دخلی اور ان کی بحالی پر گفتگو کرنے کے لئے سندھ رینجرز کے بریگیڈیئر باسط سے ملاقات کی۔

14 فروری، پشاور: بے دخل ہونے والے افراد کے حالات جاننے کے لیے جلوزئی کیمپ کا دورہ کیا۔

15 فروری، تربت: تعلیم کی صورتحال جاننے کے لیے علاقے کا دورہ کیا۔

28 فروری، اسلام آباد: ایچ آر سی پی کے اراکین نے لاپتا افراد کی بازیابی کے لئے لانگ مارچ کرنے والے افراد کا استقبال کیا۔

8 مارچ، حیدرآباد: خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ریلی کا انعقاد، جس میں سندھ یونیورسٹی کے طلباء اور ہوسری ہاری کیمپ سے تعلق رکھنے والے کسان خواتین نے شرکت کی۔

17 مارچ، حیدرآباد: ایچ آر سی پی اور اقلیتوں کی تنظیموں نے ایک مظاہرے کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے لاڑکانہ میں ایک مندر کو نقصان پہنچانے کے واقعے پر تشویش کا اظہار کیا۔

26 مارچ، حیدرآباد: ٹنڈو جام سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکن مشتاق علی سومرو کے اہل خانہ سے ملاقات کی۔ انہیں جبری طور پر لاپتا کیے جانے کے دو ماہ بعد انسداد دہشت گردی کی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ عدالت نے انہیں جیل بھیج دیا تھا۔

28 مارچ، حیدرآباد: حیدرآباد کی کالی ماتا کالونی میں ہنومان مندر کا دورہ کیا جسے ایک حملے میں نقصان پہنچا تھا۔ ڈپٹی کمشنر حیدرآباد سے بھی ملاقات کی جس میں غیر مسلموں اور ان کی عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

3 اپریل، حیدرآباد: مندر پر حملے کے خلاف مظاہرہ اور واک۔

16 اپریل، حیدرآباد: فرضی سکولوں خلاف اور تعلیمی پالیسی میں اصلاحات کے لیے عوامی جمہوری پارٹی کی جانب سے کی گئی مارچ کے شرکاء کا استقبال کیا۔

12 اپریل، حیدرآباد: بلوچستان اور سندھ میں انسانی حقوق کی صورتحال اور سیاسی ہلاکتوں پر نشست۔

سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر ریلی

30 اپریل، کراچی: ان بلوچ طلباء سے ملاقات کی جنہوں نے بی ایس او کے صدر زاہد بلوچ کی بازیابی کے لئے کراچی پریس کلب کے باہر بھوک ہڑتال کررکھی تھی۔

یکم مئی، کراچی: یوم مئی ریلی۔

یکم مئی، حیدرآباد: حیدرآباد پریس کلب میں یوم مئی ریلی اور سیمینار۔

5 مئی، حیدرآباد: لاپتا شخص روجیل لغاری کے اہل خانہ سے ملاقات کے لیے قاسم آباد کے علاقے نسیم نگر کا دورہ کیا۔

9 مئی، حیدرآباد: راشد رحمان کے قتل کے خلاف احتجاج۔

10 مئی، سکھر: راشد رحمان کے قتل کے خلاف اجلاس اور ریلی۔

10 مئی، گلگت: گلگت بلتستان کی سول سوسائٹی کے اشتراک سے راشد رحمان کی یاد میں شمعیں روشن کرنے کی تقریب۔

11 مئی، تربت: راشد رحمان کے قتل کی مذمت کے لئے مظاہرہ۔

23 جون، حیدرآباد: ہندو برادری کے اراکین سے ملاقات کی جنہوں نے کالی ماتا مندر کی زمین پر قبضے کے خلاف بھوک ہڑتال کررکھی تھی۔

13 مئی، حیدرآباد: گروی مشقت کے حوالے سے پولیس اور انسانی حقوق کے علاقائی مراکز کے

عہدیداروں سے ملاقات کی۔

14 مئی، حیدرآباد: لاپتا بلوچوں سے اظہاریکجہتی کے لیے علامتی بھوک ہڑتال۔

21 مئی، حیدرآباد: چار گروی ہاریوں کے اغوا کے خلاف مظاہرہ۔

26 مئی، کوئٹہ: بلوچستان کے علاقے پنجگور میں لڑکیوں کی تعلیم کو درپیش خطرات کے خلاف احتجاج۔

27 مئی، کراچی: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے بلوچستان سٹوڈنٹ آرگنائزیشن (بی ایس او۔اے) کے احتجاج کرنے والے کارکن لطیف جوہر سے ملاقات کی جو گزشتہ 37 دن سے کراچی پریس کلب کے باہر بھوک ہڑتال پر تھے۔

یکم جون، حیدرآباد: زاہد بلوچ کی بحفاظت بازیابی کے لیے بھوک ہڑتال کرنے والے لطیف جوہر سے اظہاریکجہتی کے لیے چوبیس گھنٹے کی بھوک ہڑتال۔

12 جون، حیدرآباد: بلوچ قوم پرست لیڈر کائر بخش مری کے لیے شمعیں روشن کرنے کی تقریب۔

20 جون، حیدرآباد: بلوچستان اسمبلی کے رکن ہینڈری مسیح کے لیے اجلاس اور شمعیں روشن کرنے کی تقریب، جنہیں کوئٹہ میں قتل کر دیا گیا تھا۔

22 جون، حیدرآباد: کسان لیڈر مائی بختاور کی برسی۔

26 جون، حیدرآباد: ایذا رسانی کے متاثرین کی حمایت کے عالمی دن کے موقع پر واک۔

26 جون، حیدرآباد: ایذا رسانی کے متاثرین کی حمایت کے عالمی دن کے موقع پر ریلی۔

26 جون، تربت: ایذا رسانی کے متاثرین کی حمایت کے عالمی دن کے موقع پر اجلاس اور ریلی۔

10 جولائی، حیدرآباد: زرعی ملازمین سے ناروا سلوک کے خلاف مارچ۔

17 جولائی، حیدرآباد: لالو رائنک کے علاقے میں پولیس کی فائرنگ کے واقعے میں بچ جانے والے افراد سے اظہاریکجہتی کے لیے ملاقات کی۔ اس واقعے میں ایک معمر خاتون اور اس کا بیٹا جاں بحق اور کئی افراد شدید زخمی ہوئے تھے۔

9 اگست، حیدرآباد: اسرائیل کے جنگی جرائم کے خلاف ریلی۔

10 اگست، حیدرآباد: ایک مشاورت کا انعقاد کر کے دنیا بھر کے مقامی لوگوں کا دن منایا۔

14 اگست، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے سندھ یونیورسٹی کے طالب علم آصف پنہور کی والدہ سے ملاقات کی جو نسیم نگر، قاسم آباد، حیدرآباد سے لاپتا ہو گیا تھا۔

سندھ اور بلوچستان میں زیرِحراست افراد کی ہلاکتوں کے خلاف ریلی

15 اگست، حیدرآباد: جیے سندھ قومی محاذ۔ آریسر گروپ (جے ایس کیو ایم۔ اے) کے ترجمان عامر آزاد پنہور نے ایچ آر سی پی کے دفتر کا دورہ کیا اور انٹیلی جنس ایجنسیوں اور پولیس کی جانب سے ہراساں کیے جانے کی شکایت کی۔

10 اکتوبر، حیدرآباد: سزائے موت کے خلاف عالمی دن منانے کے لیے ریلی اور سٹریٹ تھیٹر پرفارمنس۔

10 اکتوبر، ملتان: سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر ریلی۔ شرکاء نے سزائے موت کے خاتمے کے لیے صدر پاکستان کے نام ایک پٹیشن پر دستخط کیے۔

16 اکتوبر، حیدرآباد: خوراک کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی اور مشاورت۔

21 اکتوبر، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کی ٹیم اور خواتین کی ایک تنظیم نے گھریلو تشدد کی شکایت پر عیسیٰ کالونی کا دورہ کیا۔

6 نومبر، کراچی: کوٹ رادھا کشن کے ایک بھٹے میں ایک مسیحی جوڑے کو جلائے جانے کے واقعے کے خلاف احتجاج میں حصہ لیا۔

27 نومبر، حیدرآباد: لاپتا کارکن آصف پنہور کے اہل خانہ سے ملاقات کی جن کی گولیوں سے چھلنی نعش لاڑکانہ سے برآمد ہوئی تھی۔

29 نومبر، حیدرآباد: سندھ کے سیاسی کارکنوں کی گمشدگیوں اور دورانِ حراست ہلاکتوں کے خلاف

احتجاج۔

یکم دسمبر، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کی ٹیم نے لیاقت یونیورسٹی ہسپتال، حیدرآباد کا دورہ کیا جہاں سیاسی کارکنوں سروائچ پیرزادہ اور واجد لانگاہ کی گولیوں سے چھلنی نعشیں لائی گئی تھیں۔ انہیں 13 اگست اور 17 ستمبر کو کراچی سے اغوا کیا گیا تھا۔

8 دسمبر، حیدرآباد: تین لڑکیوں کا جل بھیل، ماری کولہی اور بادل کولہی کے اغوا کے خلاف سول سوسائٹی کا مشترکہ احتجاج۔

9 دسمبر، حیدرآباد: سندھ اور بلوچستان کے سیاسی کارکنوں کی دوران حراست ہلاکتوں کے خلاف ریلی۔

10 دسمبر، سکھر: انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے این جی اوز کے اشتراک سے ریلی۔

10 دسمبر، حیدرآباد: ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، جامشورو اور مقامی این جی اوز کے اشتراک سے انسانی حقوق کا عالمی دن منانے کے لیے ریلی۔

14-15 دسمبر، حیدرآباد: سندھ میں جاں بحق ہونے والے لاپتا افراد کی تفصیلات اکٹھی کیں۔

10 دسمبر، ملتان: انسانی حقوق کے عالمی دن پر ایک ریلی میں شرکت کی جس کا اہتمام کمیشن برائے امن وانصاف نے کیا تھا۔

17 دسمبر، حیدرآباد: پشاور سکول حملے کے متاثرین کے لیے شمعیں روشن کرنے کی تقریب۔

18 دسمبر، حیدرآباد: برصغیر کے ایک ترقی پسند دانشور سوبھو گیان چندانی کے لیے تعزیتی اجلاس۔

25-27 دسمبر، حیدرآباد: عوامی اجتماعات اور سول سوسائٹی کے نمائندوں سے مشاورت کے لیے تھر کے علاقے مٹھی کا تین روزہ دورہ۔

جیل کے دورے

13 مارچ، پشاور: قیدیوں کے حالات جاننے کے لیے نوشہرہ جوڈیشل لاک اپ کا دورہ۔

14 مارچ، پشاور: قیدیوں کے حالات جاننے کے لیے صوابی جوڈیشل لاک اپ کا دورہ۔

18 مارچ، پشاور: قیدیوں کے حالات جاننے کے لیے ڈسٹرکٹ جیل ڈگر (بونیر) کا دورہ۔

21 مارچ، پشاور: قیدیوں کے حالات جاننے کے لیے ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ (بونیر) کا دورہ۔

24 مارچ، پشاور: قیدیوں کے حالات جاننے کے لیے سب جیل چارسدہ (بونیر) کا دورہ۔

مرکز شکایات

2014ء کے دوران ایچ آر سی پی کو 1,500 شکایات موصول ہوئیں۔ ان شکایات کی موضوع وار تفصیلات درج ذیل ہیں۔

شکایات کی نوعیت

پولیس/انتظامیہ کے مظالم	500
غیر ریاستی عناصر/اثر ورسوخ رکھنے والے افراد کے مظالم	506
خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی/ گھریلو تشدد	286
متفرق	368
بیرون ممالک سے شکایات	40
کل	1,500
حکام کو لکھے گئے خطوط	600
موصول شدہ جوابات	168

ایچ آر سی پی کی ویب سائٹ **www.hrcp-hrcp.org** پر ماہانہ اردو جہد حق، ادارے کی جانب سے جاری کردہ پریس ریلیزوں سمیت تمام مطبوعات کا الیکٹرانک ورژن، اور ایچ آر سی پی کے مشن اور سرگرمیوں سے متعلق معلومات دستیاب ہیں۔ ویب سائٹ کا آن لائن آرکائیو سیکشن اگست 2012 میں متعارف کرایا گیا جس کا استعمال طلباء، محققین اور صحافی کرتے ہیں۔

مطبوعات

☆ انسانی حقوق کی صورتحال 2013ء (انگریزی/اردو

☆ عبادت گاہوں پر ٹارگٹ حملے۔ اپنے عقیدے کی بنا پر غیر محفوظ برادریوں سے متعلق ایچ آر سی پی کے ایکسپرٹ گروپ کی رپورٹ۔

☆ جرگہ آج بھی سندھ میں مقبول عام ہے۔ ایچ آر سی پی کا سروے۔

☆ ایک نئی گریٹ گیم کی گرفت میں؟ گلگت کے لیے ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن کی رپورٹ۔

☆ قید میں اور دھتکارے ہوئے۔ پاکستان میں جیلوں کا سروے۔

☆ عقیدہ اور دادرسی۔اپنے عقیدے کی بنا پر غیر محفوظ برادریوں سے متعلق ایچ آر سی پی کے ایکسپرٹ گروپ کی رپورٹ۔

☆ سزائے موت بند کرو۔ذہنی بیماری جرم نہیں

☆ پاکستان کی مذہبی اقلیتیں (اردو)

☆ بچوں کے حقوق؟

☆ خواتین: ایذا رسانی اور محرومی

☆ محنت: ملازمت کے مساوی مواقع

☆ سزائے موت بند کرو (اردو/انگریزی)

☆ تشدد بند کرو۔

☆ کیلنڈر 2015۔انسانی حقوق کے پانچ عظیم محافظوں کو خراج تحسین

☆ جہدِ حق: 12 ماہانہ رسالے

ایچ آر سی پی کا انٹرن شپ پروگرام 2014ء

ایچ آر سی پی کا موسم گرما کا انٹرنشپ پروگرام 2014ء جون میں شروع ہوا اور جولائی میں ختم ہوا، جس میں پانچ انٹرنز نے ایچ آر سی پی کے ساتھ چار سے چھ ہفتوں تک کام کیا۔ان انٹرنز نے انسانی حقوق سے متعلق تحقیق کا شعبے کا انتخاب کیا، جسے محدود کرنے میں ایچ آر سی پی کے عملے نے ان کی مدد کی تاکہ ایک واضح موضوع حاصل ہو سکے۔ پروگرام کے دوران انٹرنز کو مختلف تحقیقی موضوعات کے ماہرین سے ملنے کا موقع ملا، ادارے کے ذرائع تک رسائی حاصل رہی، عملے کے اراکین کے ساتھ اپنے کام سے متعلق میٹنگوں اور کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔

مندرجہ ذیل انٹرنز نے کامیابی کے ساتھ انٹرنشپ کے دوران کی گئی تحقیق سمیت تمام رپورٹس جمع کروائیں۔

☆ قاسم علی، یونیورسٹی آف ونڈسر، امریکہ۔

☆ ناڈجاؤ نشے، ہائلڈشیم یونیورسٹی، جرمنی

☆ علی فتح خواجہ، بیننگٹن کالج، ورمونٹ، امریکہ، جن کا تعلق پاکستان سے تھا۔

☆ نورین شاہد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

☆ علی نور، لمز، لاہور، پاکستان

ضمیمہ - 2

اہم مسائل پر کمیشن کا مؤقف

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 2014ء میں ایسے واقعات اور معاملات پر تبصروں اور آراء کا سلسلہ جاری رکھا جو عوام کے حقوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ 2014ء کے دوران کمیشن نے اہم مسائل پر جو موقف اختیار کیے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

عقیدے کی آزادی

8 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کراچی میں واقع ایک مزار میں چھ افراد کے قتل کی شدید مذمت کی ہے اور جنگجو انتہا پسندوں کے ہاتھوں شہریوں کی ہلاکتوں پر قابو پانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق مذکورہ چھ افراد کو طالبان نے قتل کیا ہے۔

بدھ کو ذرائع ابلاغ کو جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا ہے کہ کراچی میں چھ نوجوانوں کو بظاہر اس بنا پر قتل کیا گیا ہے کہ انہوں نے مزار کی زیارت کی تھی جو کہ اس بات کا ثبوت ہے اگر کسی مزید ثبوت کی ضرورت تھی کہ آج پاکستان میں زندہ رہنے کا استحقاق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو سفاک قاتلوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں جو طویل عرصہ سے لوگوں میں یہ احمقانہ سوچ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے اقدامات اور مذہب کے مابین کوئی تعلق استوار ہے۔

اس واقعے میں سفاکانہ بربریت کے متاثرین کا جرم محض مزار پر حاضری دینا تھا۔ نعشوں کے پاس چھوڑی گئی ایک پرچی جس میں خبردار کیا گیا تھا کہ ''جو کوئی بھی مزار کا دورہ کرے گا اس کا بھی یہی انجام

ہوگا''ح، اس بات کی ضمانت نہیں کہ مزاروں پر نہ جانے والے لوگ قاتلوں کی خون کی ''نہ بُجھنے والی پیاس'' سے محفوظ رہیں گے۔ چند برس پہلے عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر ہونے والے بم دھماکے میں آٹھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مزاروں پر ہونے والے ایسے حملے پشاور اور ملک کے دیگر علاقوں میں بھی دیکھے گئے ہیں۔ سرکاری حلقوں کی جانب سے مذمت اور ہمدردی کے الفاظ ان متاثرہ خاندانوں یا عوام کی بہت بڑی تعداد کے لیے باعث تسکین نہیں ہیں جو صرف امن کے قیام کے حامی ہیں اور انتہا پسند جنگجوؤں کے ہاتھوں لا حاصل ہلاکتوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ایچ آر سی پی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت لوگوں کو ایسے مظالم سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ٹھوس حکمت عملی وضع کرے اور عوام کو اس سے آگاہ کرنے اور اور اس پر عملدرآمد کرنے کے لیے واضح اقدامات کرے۔

28 جنوری: بین الاقوامی وفاق برائے انسانی حقوق (FIDH) اور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (HRCP) کی جانب سے منعقد کردہ دو روزہ ورکشاپ کے اختتام پر شرکاء ورکشاپ نے مطالبہ کیا ہے کہ شہریوں کو مذہب کی بنیاد پر تشدد، ناروا سلوک اور ظلم وستم کا نشانہ بنائے جانے کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے فوری اقدامات کئے جائیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے مذہبی اقلیتی گروہوں اور مسلم اقلیتی مسالک کے افراد نے کراچی میں منعقد کردہ ورکشاپ میں شرکت کی اور خود کو درپیش ابتر حالات کا ذکر کیا۔ مذہب کی بنیاد پر ادارہ جاتی بدسلوکی کے ارتکاب میں حکام کے کردار کی نشاندہی کی گئی۔ شرکاء کا کہنا تھا کہ پاکستان برابری، وقار، قانون کی حکمرانی اور انسانی حقوق کے تحفظ پر زور دینے والے اقوام متحدہ کے معاہدات کی پاسداری کرنے کا پابند ہے جس کے باوجود حکام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے معاملات میں ضروری مداخلت نہ کر کے خود کو 'بین الاقوامی میثاق برائے شہری وسیاسی حقوق' سمیت انسانی حقوق کے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ شرکاء نے کئی سطحوں پر غیر مناسب اور غیر موثر مداخلت کی نشاندہی کی۔

- عقیدے سے بالاتر ہو کر تمام پاکستانیوں کے انسانی حقوق کے احترام، تحفظ اور فروغ پر زور دیا گیا۔ مذہبی عقیدے کی بنیاد پر حقوق کی پامالی کرنے والوں کو سزا سے استثنیٰ حاصل ہونے پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے جرائم کے ارتکاب کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ایسے جرائم کی مقدمہ سازی میں شریک ججوں اور وکلاء کو لاحق عدم تحفظ کے معاملے کو بھی اجاگر کیا گیا۔
- عدالتی شعبہ میں درپیش مشکلات میں تضحیک مذہب کا قانون اور معاشرے پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ پاکستان کو چاہیئے کہ وہ اس قانون کو ختم کرے یا کم از کم فوری طور پر حفاظتی انتظامات متعارف کروائے تا کہ شہریوں بالخصوص مذہبی اقلیتی گروہوں کے خلاف اس قانون کا ناجائز استعمال نہ کیا

جا سکے۔ اس سے پہلے پاکستان سے یہ مطالبہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق سے متعلقہ معاہدات میں بھی کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز تحریر و تقریر کے خلاف عدالتی کارراوئی ہونی چاہیے۔

- قانونی اور عملی لحاظ سے پایا جانے والا ناروا سلوک بھی تشویش کی بنیادی وجہ ہے۔ احمدی ووٹرز کے لیے علیحدہ فہرست کا خاتمہ، ہندوؤں اور سکھوں کے لیے تدوین شدہ قانون شخصی کی عدم موجودگی، مذہبی اقلیتی گروہوں کی موثر نمائندگی میں کمی، آئندہ ہونے والی مردم شماری میں مذہبی اقلیتوں کے خدشات کا ازالہ کرنا اور اقلیتی مذہبی مقامات کا انتظام و انصرام اقلیتوں کو دینا بنیادی مسائل قرار دیا گیا جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔
- ادارہ جاتی ناروا سلوک بھی معاشرے میں نفرت کو پروان چڑھاتا ہے جیسا کہ نصاب اور سکول کی کتب میں اقلیتوں کی غیر مناسب نمائندگی میں اصلاح کی فوری ضرورت ہے، کیونکہ پاکستان بین الاقوامی انسانی حقوق کے معاہدے کے حوالے سے اس کی تعمیل کا پابندی ہے۔ مذہبی تعلیم اگر کسی ایک مذہب کے حوالے سے دی جاتی ہے چاہے وہ اکثریت کا مذہب ہی کیوں نہ ہو تو اس کو عمومی نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔ مذہبی تفریق کے پورے سلسلے میں خواتین اور لڑکیاں دوہرے طریقے سے اذیت کا شکار ہیں، خاص طور پر جبری مذہبی تبدیلی اور جنسی تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان مقدمات کی تفتیش اور عدالتی کارروائی ہونی چاہیے۔ خواتین اور لڑکیوں کو محفوظ پناہ ملنی چاہیے اور ان پر ہونے والے ظلم کا ازالہ کیا جائے اور نقصانات کی تلافی کی جائے۔ مظلوم خواتین اور لڑکیوں کے اہل خانہ کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جائے۔
- دیدہ دانستہ طور پر کیا جانے والا ناروا سلوک ایسے حالات کو فروغ دے رہا ہے جن میں مٹھی بھر انتہا پسند عناصر کے دباؤ تلے ملک بھر میں سیاسی تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس قسم کے تشدد پر موثر طریقے سے قابو نہیں پایا گیا۔ بالخصوص انتہا پسندوں کی جانب سے فاٹا میں سکھوں سے جزیہ (تحفظ فراہم کرنے کا معاوضہ) طلب کرنے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ بالخصوص خیبر ایجنسی میں اطلاعات کے مطابق طالبان جزیے کی رقم کی وصولی کا تحریری اقرار نامہ مہیا کرتے رہے ہیں۔

ابتدا میں اقلیتیں ہی تشدد کا نشانہ بنتی تھیں مگر اب سول سوسائٹی اور ترقی پسند عناصر بشمول انسانی حقوق کے مدافعین اور انسانی حقوق کا مطالبہ کرنے والے باشعور شہری اور ان کا دفاع کرنے والے خاص طور پر آزاد میڈیا بھی اس تشدد کی زد میں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پاکستانی قوم کی بنیادی اقدار اور اس کی سماجی و معاشی بقا کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ایسے تشدد کا جواب اس کی بنیادی وجوہات کا ازالہ کرتے

ہوئے اور تمام پاکستانیوں، چاہے ان کا عقیدہ اور مذہب کوئی بھی ہو، کے انسانی حقوق کے احترام اور برابری کے فروغ کو یقینی بناتے ہوئے دیا جائے۔

ایف آئی ڈی ایچ جس کا مرکزی دفتر پیرس میں ہے، دنیا کا سب سے قدیم انسانی حقوق کا ادارہ ہے اور یہ ادارہ 175 تنظیموں پر مشتمل ایک این جی او ہے اور یہ ادارہ 100 سے زائد ممالک میں کام کر رہا ہے۔ پاکستان کا دورہ کرنے والے ایف آئی ڈی ایچ کے وفد میں انسانی حقوق کے چار نامور اراکین شامل تھے جن کے نام یہ ہیں، شوان جابرین، (فلسطین)، روزمیری تراجانو (فلپائن)، انتونی میڈلین (فرانس) اور احسان علی فوزی (انڈونیشیا)

21 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں ایک قدیم مندر جس کو انڈر پاس اور پلوں کی تعمیر سے خطرہ لاحق ہے، کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان سے مداخلت کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

چیف جسٹس کو لکھے گئے ایک خط میں ایچ آر سی پی کی چیئرپرسن نے لکھا کہ مفاداتی گروہوں نے کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (کے ایم سی) کی ملی بھگت سے کلفٹن کے علاقے کے اردگرد بغیر کسی پیشگی اطلاع کے انڈر پاس اور پلوں کی تعمیر شروع کردی ہے۔

انہوں نے لکھا کہ اتنا بڑا منصوبہ جس سے کہ شہر کے ایک تاریخی حصے کی شکل مسخ ہو جائے گی، قانون کے مطابق ماحولیاتی اثرات کے جائزے (عوامی سماعت کے ذریعے) کے عمل سے نہیں گزرا۔ چیئرپرسن نے واضح کیا کہ اس منصوبے کی وجہ سے 150 برس پرانے شری رتنیشور مہادیو مندر جو کہ انڈر پاس سے چند میٹر کے فاصلے پر واقع ہے، پر پڑنے والے برے اثرات ایچ آر سی پی کے لیے شدید تشویش کا باعث ہیں۔ چیئرپرسن نے لکھا کہ ہر سال ہزاروں ہندو اور سکھ عقیدت مند مندر کا دورہ کرتے تھے جو کہ جہانگیر کوٹھاری پریڈ کے نیچے ایک غار میں واقع ہے۔

چیئرپرسن نے مزید کہا کہ "منصوبے کے لیے جاری کھدائی اور بعد میں مندر کے قریب سے بڑی تعداد میں گزرنے والی ٹریفک کی وجہ سے پیدا ہونے والے زمینی ارتعاش کے باعث یہ عبادت گاہ منہدم ہو سکتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ گزشتہ چند سالوں سے سندھ کی ہندو برادری کو انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کا سامنا ہے۔ چند سال پہلے ایک اور تجارتی منصوبے، پورٹ گرینڈ کی وجہ سے لکشمی نارائن مندر جو کہ ایم اے جناح روڈ پر ایم اے جناح پل کے قریبی علاقے نیٹی جیٹی میں واقع ہے، کی رسائی، خلوت اور احاطوں پر شدید اثرات مرتب ہوئے تھے۔ خط میں چیف جسٹس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ معاملے کی وضاحت کے لیے کے ایم

سی کے اہلکاروں کو عدالت طلب کریں اور اس بات کی یقین دہانی کرائیں کہ مندر کے تحفظ کے لیے تمام ضروری کئے جائیں گے۔

31 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے صحافی رضا رومی اور سندھ میں مندروں پر حملوں ایسے تشویش ناک واقعات پر انتباہ کا اظہار کرتے ہوئے انہیں عدم برداشت کی نئی لہر کے غماز قرار دیا ہے۔

پیر کے روز جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن کا کہنا تھا: ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو پچھلے دنوں میں ہونے والے متعدد واقعات پر گہری تشویش ہے جن میں صحافی رضا رومی پر لاہور میں ہونے والا حملہ، ہندو مندروں پر ایک کے بعد دوسرے حملے، تازہ ترین حیدر آباد میں، اور ساون مسیح کو توہین مذہب کے ایک مقدمے میں سزائے موت کا دیا جانا شامل ہیں۔

''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کا ماننا ہے کہ عدم برداشت کی ایک نئی لہر ابھر کر سامنے آ رہی ہے اور یہ واقعات اسی تحریک کا شاخسانہ ہیں۔ ساون کے خلاف عدالت کی سزا تو رہی ایک طرف، توہین مذہب کے الزام کے بعد لاہور میں مسیحی اکثریتی آبادی جوزف کالونی میں مارچ 2013 میں ہونے والا حملہ اور سو سے زاید گھروں کا جلایا جانا اسی لہر کا حصہ ہے۔ یہ بات باعث تشویش ہے کہ جب کہ ساون کو تو سزائے موت کا حق دار قرار دیا گیا، گھروں کے جلانے اور لوٹنے کے مقدمات پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

''عدم برداشت کی اس نئی لہر کے تناظر میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی حکومت سے گذارش ہے کہ وہ خاموش تماشائی نہ بنی رہے۔

''رومی پر ہونے والا ٹارگٹ حملہ جرأت اظہار کے حامل تمام صحافیوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ اگر جانے مانے صحافیوں پر لاہور کے مرکز میں اس طرح بے دھڑک حملہ کیا جا سکتا ہے تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اظہار کی آزادی میں ملک کے دیگر حصوں میں ذرائع ابلاغ سے منسلک افراد کو کیسی مشکلات کا سامنا ہے۔

''ہمیں ایسے علاقوں میں عدم برداشت کے پھیلاؤ اور عبادت گاہوں پر حملوں اور انہیں جلانے پر انتہائی تشویش ہے جہاں مختلف عقائد کے حامل افراد صدیوں سے امن و آشتی سے اکٹھے بستے آ رہے ہیں۔ ہندو مندروں پر حملے فوری طور پر روکنا ایسا مشکل بھی نہیں۔ تحفظ کے بہتر اقدامات اور حالیہ حملوں میں ملوث افراد کو حراست میں لینے کا ایک فوری اثر ہوگا۔ طویل مدتی طور پر عدم برداشت کو اکھاڑ پھینکنے اور مجرموں کے لیے ہمدردی یا ان کی بریت کے خاتمے ایسے اقدامات کرنا ہوں گے۔

کمیشن سیاسی اور مذہبی رہنماؤں پر زور دیتا ہے کہ وہ توہین مذہب کے قانون کے غلط استعمال کے تشہیر پانے والے واقعات کے بعد اس میں اصلاحات کا مطالبہ کرنے کے بعد اس پر قائم نہ رہنے کی روش ترک کر دیں۔

حکومت کو بھی توہین مذہب کے قانون پر بحث کی فوری ضرورت کے باوصف اس موضوع پر بحث ومباحثہ کے انعقاد ایسی پہل قدمی کرنی چاہیے۔''مسئلہ ملک کے کسی ایک حصہ تک محدود نہیں اور یہ تشویش ناک روش تبھی بدل سکتی ہے جب وفاقی اور صوبائی حکومتیں اور سول سوسائٹی مل کر فوری اور مخلصانہ اجتماعی کوششیں کریں۔''

28 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے گوجرانوالہ میں بلوائی حملے میں احمدی برادری کے چار افراد کے قتل اور پانچ گھروں کو نذر آتش کئے جانے کی شدید مذمت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے ظلم اور بربریت اپنے عروج پر ہے۔

پیر کو جاری کردہ ایک بیان میں کمیشن نے کہا:''ایچ آر سی پی گوجرانوالہ میں تضحیک مذہب کے الزام کے تحت جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والے چار افراد کے قتل پر شدید غم زدہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ چار دیگر احمدیوں کو تشویش ناک حالت میں ہسپتال داخل کرایا گیا ہے۔ ملک اور بالخصوص پنجاب کی موجودہ صورتحال میں تضحیک مذہب کا الزام، چاہے یہ بے بنیاد ہی کیوں نہ ہو، ان بہیمانہ ہلاکتوں سے سردمہری برتنے کا باعث بنتا ہے۔ ہلاک ہونے والے افراد پر تو بالواسطہ طور پر بھی تضحیک مذہب کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ ان کا واحد جرم یہ تھا کہ وہ احمدی تھے۔ خواتین اور بچوں کو ان کے عقیدے کی بنا پر ان کے گھروں میں آگ لگانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ظلم اور بربریت اپنے عروج پر ہے۔

متاثرہ کمیونٹی، حقوق کا احترام کرنے والے شہری اور سول سوسائٹی اس ہجوم کے احتساب کا مطالبہ کرتے ہیں جس نے مقتولین اور زخمیوں کی آہ وپکار پر خوشی سے نعرے لگائے۔ تاہم اگر انصاف کی امیدوں پر کچھ حد تک بھی پورا اترا جاتا تو ہجوم میں شامل کئی افراد کو اس بھیانک کارروائی کا حصہ بننے سے روکا جا سکتا تھا۔

علاوہ ازیں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی نفرت اور عدم رواداری کے ہاتھوں اس حد تک اندھے ہو چکے ہیں کہ بچوں کے سفاکانہ قتل کو بھی باجواز سمجھتے ہیں جس کی مثال ہمیں گوجرانوالہ کے وقوعے سے ملی ہے۔ ایچ آر سی پی کے لیے زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ ان دونوں رجحانات میں سے کسی ایک پر بھی قابو پانے کی کوشش کی جا رہی۔ ہجوم لوگوں کے گھر جلانے کے بعد جو کہ تضحیک مذہب کے ملزم بھی نہیں تھے، ٹیلی ویژن کے کیمرہ کے سامنے آنے کے لیے ناچ رہا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پورے وقوعے کا تضحیک مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اور اس کا مقصد پہلے سے ستم زدہ کمیونٹی کو نشانہ بنانا تھا۔ اس لیے گوجرانوالہ یا پاکستان میں کسی بھی جگہ قیام پذیر نشانہ بننے والی کمیونٹی کے اراکین کے احساسات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔

نومبر **5**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کوٹ رادھا کشن کے ایک بھٹے پر

مشتعل ہجوم کے ہاتھوں ایک مسیحی جوڑے کے قتل کی شدید مذمت کی ہے۔ مقتول میاں بیوی اُسی بھٹے پر کام کرتے تھے۔ بعدازاں جوڑے کی لاشوں کو بھٹے میں آگ لگا کر جلا دیا گیا تھا۔

علاقہ میں بھیجی گئی فیکٹ فائنڈنگ ٹیم کے ابتدائی مشاہدات کے بعد، کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کو مسیحی جوڑے اوران کے نامولود بچے کے بہیمانہ قتل سے ملنے والا دُکھ ناقابل بیان ہے۔ دردناک قتل کے مقام پر جانے والی ایچ آر سی پی کی ٹیم کو قرآن پاک کی بے حرمتی کے کوئی شواہد نہیں ملے۔

یوں لگتا ہے کہ مقتول شہزاد کا معاوضہ جات یا رقم کی پیشگی ادائیگی کی وصولی کے معاملے پر بھٹہ مالک کے ساتھ تنازعہ چل رہا تھا۔ مذکورہ رقم بھٹہ مالک نے مسلمان مزدوروں کے دو خاندانوں کو ادا کی تھی اور وہ فرار ہو گئے تھے۔ بھٹہ مالک نے شہزاد سے مطالبہ کیا کہ وہ مفرور خاندانوں کو دی گئی رقم واپس کرے کیونکہ اُسی نے مالکان سے ان کا تعارف کروایا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزاد اور اس کی بیوی شمع کو بھٹہ پر شدید پیٹا گیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ بعض گواہوں کے مطابق شہزاد کی موت تشدد کے دوران ہو گئی تھی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد، جب نزدیکی دیہاتوں میں مبینہ بے حرمتی کی افواہ پھیلائی گئی اور مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اعلانات کئے گئے تو سینکڑوں افراد کا ہجوم بھٹے کی طرف رواں دواں ہوا۔

دریں اثناء، ایک قریبی پولیس چوکی سے چار پولیس اہلکار بھٹے پر پہنچے اور تقاضا کیا کہ میاں بیوی کو ان کے حوالے کر دیا جائے ورنہ بھٹے کی طرف بڑھنے والا ہجوم ان کو مار ڈالے گا۔ تاہم ایچ آر سی پی کی ٹیم کو یہ معلوم ہوا کہ بھٹہ مالکان نے اپنے ملازمین کو ہدایت کی کہ مقتولین کو پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ پولیس اہلکاروں کو بھٹے پر مارا پیٹا بھی گیا۔

ایچ آر سی پی تاحال پولیس کے مطابق واقعے کی تفصیلات کے حوالے سے پولیس کا بیان حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔ ڈی پی او نے کہا ہے کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور چالیس لوگ گرفتار کئے جا چکے ہیں جن میں بھٹہ مالک بھی شامل ہے۔

ایچ آر سی پی کسی بھی طریقے سے تفتیش پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتا لیکن وہ انسانوں کے اس بہیمانہ قتل پر اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہے کہ جیسے ہی ان مسیحی میاں بیوی پر قرآن پاک کی بے حرمتی کا الزام لگا تو ان کو شک کا فائدہ ملنے کا کوئی امکان ختم ہو گیا۔ ان کے مذہبی عقیدے نے بھی ظاہری طور پر ان کی جانوں کے لیے خطرات بڑھائے۔ ایچ آر سی پی سنجیدگی سے یہ امید کرتا ہے کہ ارباب اقتدار اس پہلو پر بھی توجہ دیں گے اور یہ افسوسناک واقعہ ان کو تمام شہریوں کی زندگی کی حفاظت کے ریاستی فرض کو پورا کرنے کی ایک بار پھر

یاد دہانی کرائے گا۔ پولیس کا جائے وقوعہ پر پہنچ جانے کے باوجود مقتول میاں بیوی کو بچانے سے قاصر رہنا ریاست کی گھٹتی ہوئی عملداری کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ وہ تمام افراد چاہے وہ بھٹے پر تھے یا آس پاس کے گاؤں میں، جنہوں نے مقتولین کے خلاف تشدد پر لوگوں کو اکسایا اور جنہوں نے پولیس کو انہیں بچانے سے روکا ان سب کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جانا اشد ضروری ہے۔ بھٹہ مزدوروں کا استحصال اس بھیانک واقعے کے پس منظر کا اہم حصہ ہے اور ایچ آر سی پی یہ امید اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان شہریوں کا قتل غلامی سے ملتے جلتے ان طریقوں کے بغیر بلاتاخیر خاتمے کی کوششوں کی اساس بنے گا جن کے خاتمے کا آئین میں وعدہ کیا گیا ہے۔

امن و امان

جنوری 9: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے لیاری سمیت کراچی کے تشدد زدہ علاقوں میں شہریوں کی زندگیوں کو درپیش عدم تحفظ پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ محض سیاسی وابستگی کی بنا پر چار افراد کا قتل اور پانچویں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنائے جانے کے واقعہ پر پایا جانے والا غم و غصہ ہمیں اس امر پر ندامت کا احساس دلانے کے لیے کافی ہونا چاہئے کہ بندرگاہ والا شہر کس حد تک سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستہ جرائم پیشہ گروہوں میں منقسم ہو کر رہ گیا ہے۔

جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا کہ کراچی میں تشدد اس حد تک معمول کا کام بن چکا ہے کہ اب تو شہریوں کے خلاف پہلے سے زیادہ سنگین مظالم کی اطلاعات بھی خاص توجہ کا مرکز نہیں بنتیں۔ تاہم حال ہی میں لیاری میں محض سیاسی جماعت سے وابستگی کے باعث چار افراد کا قتل اور ان کی خاتون کی عصمت دری کا وقوعہ کئی وجوہات کے باعث پریشان کن امر ہے۔

متاثرین کو بظاہر ان کے خاندان کے سربراہ کی سیاسی وابستگی کی وجہ سے غنڈوں کے گینگ نے علاقے سے بے دخل کیا۔ مجرموں کو پکڑنے کے حوالے سے پولیس افسران نے یہ بات واضح کی کہ اس واقعے کی وجوہات سیاسی نوعیت کی تھیں اور یہ کہ متاثرین نے اپنے گھر واپس جانے کی ہمت کی تھی جس کے ردعمل میں یہ حملہ انتقامی کارروائی کے طور پر کیا گیا۔ مزید براں یہ کہ پولیس بھی متاثرین کی لیاری میں واپسی پر پہلے سے آگاہ نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کراچی میں لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے پر معمور ذمہ داران گزشتہ ہفتے کے خطرناک حقائق سے بے خبر رہے ہیں۔ پولیس کی جانب سے اس قسم کا موقف اپنانا امن و امان کے قیام کی بنیادی ذمہ داری نبھانے میں ناکامی پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے۔

کراچی پر قبضہ کرنے کے لیے مختلف گروہوں کے مابین جنگ کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن اس حد تک گر

جانا اور کسی لڑکی کو اس کے باپ کی سیاسی وابستگی کی بنا پر جنسی زیادتی کا نشانہ بنانا یقیناً ایک نئی چیز ہے۔ چنگیز خان کی مثالیں یاد آتی ہیں۔

اس صورتحال کا الزام واضح طور پر سیاسی جماعتوں پر عائد ہونا چاہئے جنہوں نے شہر کی لسانی بنیادوں پر تقسیم کی سرگرم حمایت کی ہے یا اسے خاموشی سے قبول کیا ہے۔ ایچ ارسی پی امید کرتا ہے کہ اب سیاسی جماعتیں کراچی کو اپنے سابقہ یا موجودہ جرائم پیشہ عناصر سے چھٹکارا دلانے کی سرگرم حمایت کریں گی یا کم ازکم اس عمل کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ ایچ آرسی پی کا ماننا ہے کہ حکومت کراچی میں خون ریزی کے خاتمے میں ناکامی کی صورت میں لوگوں کے زندگی کے حق اور دیگر حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری سے غفلت برت رہی ہے۔ چونکہ اس وقت شہر بدترین افراتفری کا شکار ہے چنانچہ حکومت کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ کم ازکم اپنی طرف سے معاملات میں بہتری لانے کی کوشش کررہی ہے۔

27 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آرسی پی) نے ہفتہ کے روز بلوچستان کے ضلع خضدار سے 15 مسخ شدہ نعشوں کی برآمدگی پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ کمیشن نے وفاقی حکومت اور بلوچستان کی صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مقتولین اوران کے قاتلوں کی فوری شناخت کو یقینی بنایا جائے۔

وفاقی وزیرداخلہ اور بلوچستان کے وزیراعلیٰ کے نام لکھے گئے خطوط میں ایچ آرسی پی نے کہا کہ نعشیں ناقابل شناخت حد تک مسخ شدہ تھیں۔ ابھی تک مقتولین اور قاتلوں کا سراغ نہیں لگایا جاسکا۔ ابتدائی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ 15 افراد تقریباً ایک ماہ قبل ہلاک ہوئے تھے جن کی نعشوں کو جنگلی جانوروں نے نوچا ہوا تھا۔

ایچ آرسی پی نے مطالبہ کیا ہے کہ فوری تحقیقات کی جائیں اور وقوعے کے اصل حقائق جاننے اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کئے جائیں۔ مزید کہا کہ اگر ضروری ہو تو مقتولین کی شناخت معلوم کرنے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کرایا جائے۔ بلوچستان میں تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر، ٹارگٹ کلنگ، لوگوں کو جبری غائب کرنے اور ان کی نعشوں کو ٹھکانے لگانے جیسے واقعات کے باعث اس قسم کی تحقیقات اور زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ ایچ آرسی پی حکومت سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ جبری غائب کئے گئے افراد کے ان رشتہ داروں کے ساتھ تعاون کرے جو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا مقتولین ان کے عزیز واقارب تو نہیں ہیں۔

ایچ آرسی پی کا وفاقی وصوبائی حکومتوں سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ وہ بلوچستان میں تشدد، لاقانونیت اور ہلاکتوں کے مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔ کمیشن نے زور دیا ہے کہ اس حوالے سے باضابطہ قانونی کارروائی اور انسانی حقوق کا احترام کیا جائے اور مسائل کے حل کے لیے سیاسی ذرائع تلاش کئے جائیں۔

3 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے اسلام آباد کی ضلعی عدالتوں پر ہونے والے حملے، جس میں جاں بحق ہونے والے افراد میں ایک جج اور متعدد وکلاء شامل تھے، کی مذمت کی ہے اور شدید تشویش کا اظہار کیا ہے کہ وفاقی دارالحکومت بھی ایسے حملوں سے محفوظ نہیں ہے۔

میڈیا پر دیئے جانے والے بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی اسلام آباد کی ضلعی عدالتوں کی حدود میں ہونے والے حملے اور ایڈیشنل جج اور وکلاء کے قتل پر شدید پریشانی میں مبتلا ہے۔ یہ حملہ سکیورٹی کے نظام میں سنگین خامی کی نشاندہی کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکیورٹی حکام اسلام آباد کو خطرناک عناصر سے پاک کرنے یا شہر میں ان کا داخلہ روکنے سے قاصر ہیں۔

11 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 3 مزدوروں اور کوسٹ گارڈ کے دو اہلکاروں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بلوچستان کے ایک باغی گروہ کی تحویل میں ہیں۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کوسٹ گارڈ کے دو اہلکار اور تین مزدور بلوچستان لبریشن فرنٹ کی تحویل میں ہیں۔ کمیشن مذکورہ گروہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان افراد کو انسانی بنیادوں پر رہا کرے۔ ایچ آر سی پی مذکورہ گروہ اور صوبے میں سرگرم دیگر گروہوں سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ غیر جنگجو افراد بالخصوص ان غریب مزدوروں کو نقصان نہ پہنچائیں جو کہ بلوچستان میں موجود تشدد اور بدامنی کے ماحول میں رہتے ہوئے محنت ومشقت کر کے اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جبری گمشدگی

9 2 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بلوچ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن۔آزاد (بی ایس او-آزاد) کے چیئرمین زاہد بلوچ، جنہیں گزشتہ ماہ کوئٹہ سے اغواء کیا گیا تھا، کی جبری گمشدگی پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور ان کی بحفاظت رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کو، زاہد بلوچ، جنہیں 18 مارچ کو سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد، جو کے سیکیورٹی ایجنسیوں کے اہلکار بتائے جاتے تھے، نے کوئٹہ سے اغواء کیا تھا، کے واقع پر سخت تشویش ہے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات ان کی غیر تسلیم شدہ حراست ہے جسے اب ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔

''بی ایس او۔آزاد نے گزشتہ دس دن سے کراچی پریس کلب کے باہر بھوک ہڑتالی کیمپ لگایا ہوا ہے

تاکہ زاہد بلوچ کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالا جاسکے۔ایچ آر سی پی زاہد کی زندگی کو لاحق خطرے اور حراست کے دوران ان کی خیروعافیت کے بارے میں سخت فکرمند ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان کی حراست کا فوری طور پر اعتراف کیا جائے اور ان کی رہائی کا حکم دیا جائے۔ایچ آر سی پی یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ حراست کے دوران ان کے ساتھ برا سلوک یا تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

''ہم ایک عرصے سے اس بات کی تلقین کرتے رہے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کسی بھی ملزم پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور اسے جبری گمشدہ نہ کیا جائے۔ایچ آر سی پی کے خیال میں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ جبری گمشدگیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف ان کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے فوری طور پر قانونی کارروائی کی جائے۔ایچ آر سی پی مجرموں کو حاصل سزا سے استثنٰی کو چیلنج کرنے کی خواہش رکھنے والوں کو بھی عاجزی سے یہ تجویز پیش کرنا چاہتا کہ زاہد کے اغواء کے وقت موقع پر موجود متعدد گواہان کی شہادتیں ریکارڈ کرنا سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔

5 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے سندھ میں جبری گمشدگیوں کے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے واقعات پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ گم ہونے والے افراد مُردوں میں تبدیل ہورہے ہیں۔ جو لوگ گم کئے گئے وہ نوجوان ہیں جن کی زیادہ تعداد فعال سیاسی کارکنوں کی ہے جنہیں گذشتہ چند ماہ کے دوران صوبے کے مختلف حصوں سے اٹھایا گیا۔ان میں سے متعدد افراد کی مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں۔ ایچ آر سی پی نے مطالبہ کیا ہے کہ ایسے بھیانک رجحان کو ختم کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں اور قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ ''ایچ آر سی پی سندھ میں عام شہریوں خصوصاً قوم پرست سیاسی جماعتوں کے فعال کارکنوں کی جبری گمشدگی اور گمشدگی کے ہفتوں یا مہینوں بعد ان کی مسخ شدہ لاشیں ملنے کی بڑھتی ہوئی اطلاعات پر سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے۔کمیشن نے کہا کہ ''متعدد واقعات میں سکیورٹی فورسز کے ملوث ہونے کی شہادتیں ملی ہیں جبکہ چند معاملات میں ان کا کردار کافی مشکوک نظر آتا ہے۔ پاکستان بھر میں گزشتہ ایک دہائی کے دوران اس حوالے سے حکام کا جو کردار رہا ہے اس حوالے سے دیکھا جائے تو سکیورٹی اداروں کے ایسے معاملات میں ملوث ہونے کا یقین ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں''۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے مزید کہا کہ ''دنیا بھر میں اس قسم کی جبری گمشدگیوں کے نتائج کبھی حکام کی خواہشات کے مطابق نہیں نکلے۔ بلکہ اس قسم کے واقعات نے ہمیشہ جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور لوگوں میں نفرت کے جذبات کو پیدا کیا ہے جس کے باعث لوگ اور علاقے ایک دوسرے کے قریب ہونے کی

بجائے دور ہوتے چلے گئے ہیں۔قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف نے سندھ میں بلوچستان جیسی صورتحال پیدا کرنے کے خلاف متنبہ کیا اور واضح کیا ہے کہ صوبے میں گولیوں سے چھلنی لاشیں بھیجنے کے نتائج انتہائی منفی ہوں گے''۔

''یہ انتہائی قابل مذمت بات ہے کہ کوئی ریاست اپنے شہریوں کو اغواء کرنا شروع کر دے۔ایسے وقت میں کہ جب پاکستان متعدد چیلنجوں میں گھرا ہوا ہے، اس کے بدترین دشمن ہی ملک کے کسی حصے میں جبری گمشدگیوں میں تسلسل دیکھنا پسند کریں گے۔ ایچ آر سی پی طویل عرصہ سے مطالبہ کر رہا ہے کہ جبری گمشدگیوں کے ذمہ داروں کے خلاف مقدمے چلائے جائیں۔ یہ مطالبہ اس لئے بھی کیا جاتا ہے کہ مقدمے نہ چلانے کے باعث دوسرے حکام کو بھی شہہ ملتی ہے کہ وہ خود کو اس قسم کے جرائم میں ملوث کریں۔کمیشن ایک بار پھر اپنے مطالبہ کو دہراتا ہے کہ جبری گمشدگیوں میں ملوث تمام حکام کو، چاہے ان کا تعلق کسی بھی ادارے سے کیوں نہ ہوں، گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمے چلا کر عدالتوں کے ذریعے انہیں قرار واقعی سزائیں دلوائی جائیں۔ورنہ اس عفریت سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا''۔

''ایچ آر سی پی، سندھ میں جبری گمشدگیوں کی مذمت کرنے پر قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کو خراج تحسین پیش کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ حکومت اس آواز میں اپنی آواز بھی شامل کرے گی اور اس رویے کے سدباب کے لئے فوری اقدامات کرے گی۔کمیشن حکومت پر زور دیتا ہے کہ حکومت پاکستان جبری گمشدگی سے تمام لوگوں کو تحفظ مہیا کرنے والے انٹرنیشنل کنونشن کی بغیر کسی تاخیر کے توثیق کرے اور اس پر فوری عمل درآمد کرائے۔ پاکستان ان دوسرے ممالک سے اس سلسلے میں مدد حاصل کرے جنہیں اس عفریت کا سامنا تھا اور جنہوں نے اس کنونشن کی توثیق کر کے عمل درآمد کیا۔کمیشن سول سوسائٹی اور قومی میڈیا سے بھی کہتا ہے کہ اس انتہائی منفی رجحان کو روکنے کے لئے اس کی تشہیر کرے اور اس بات کو دیکھے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا اعادہ نہ ہو اور قومی مفاد کے تحفظ میں اپنا کردار ادا کرے''۔

صحت

7 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے اُن حالات پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جن کے باعث عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) نے پاکستان پر بیرونی سفر کے حوالے سے پابندیاں عائد کی ہیں تاکہ دیگر ممالک میں پولیو کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔کمیشن نے اس امر پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ڈبلیو ایچ او کے اعلان کے بعد بھی بیماری کے پھیلاؤ پر قابو پانے کے لیے حکمت عملی تبدیل نہیں کی گئی۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا، ایچ آر سی پی کو انتہائی افسوس ہے کہ حکومت نے پولیو وائرس کے خاتمے کے لیے موثر اقدامات نہیں کیئے تھے جس کے نتیجے میں ڈبلیو ایچ او نے بیرون ملک سفر کرنے والے پاکستانیوں پر پابندیاں عائد کی ہیں۔ اس سے بھی افسوس ناک امر اس قسم کے بے معنی بیانات ہیں جن میں تین ماہ کے اندر پابندی کو ختم کروانے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ڈبلیو ایچ او کے فیصلے کے بعد پیدا ہونے والی پریشانی پہلے محسوس ہونی چاہیئے تھی۔ پولیو مخالف مہم کا الزام صرف موجودہ حکومت پر ہی عائد نہیں کیا جا سکتا مگر سال کے پہلے چار ماہ میں پولیو کے اطلاع شدہ واقعات میں حیران کن اضافے سے اسلام آباد کو خدشات سے خبردار رہنا چاہیئے تھا۔ حکام اس حوالے سے پیش رفت کرنے میں ناکام رہے جو ملک میں پولیو وائرس کے پھیلاؤ کا سبب بنا، وہ پولیو کے عملے کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پیش قدمی کے سلسلے میں ڈبلیو ایچ او کے ساتھ حکمت عملی مرتب کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ان ناکامیوں کے نتیجے میں ملک پابندیوں کی پیشگی تنبیہ بھی نہ لے سکا۔

کسی دوسرے ملک کا وزیر صحت اور پولیو کے خاتمے کے لیے مقرر کردہ وزیراعظم کا مرکزی نمائندہ مستعفی ہو جاتے، بصورت دیگر انہیں مستعفی ہونے کے لیے کہا جاتا۔ مگر پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان دونوں عہدیداران کی برطرفی پولیو کے خاتمے میں پاکستان کی مکمل ناکامی کو تسلیم کرنے اور نئی شروعات کی طرف پہلا قدم ہو سکتا ہے۔

اظہار رائے کی آزادی

19 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ایک میڈیا چینل کو بند کرنے کی غرض سے چلائی جانے والی عداوت پر مبنی مہم پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور میڈیا کے اداروں کے مابین ہم آہنگی قائم کرنے اور صورتحال کی سنگینی میں کمی لانے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ میڈیا کی آزادی کا تحفظ کیا جا سکے اور صحافیوں کو لاحق خطرات کو کم کیا جا سکے۔

اپنے ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ: ''ایچ آر سی پی جیو کے خلاف عداوت پر مبنی مہم اور جس طریقے سے اسے بند کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے، پر زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا''۔

''اس بات سے قطع نظر کے ایچ آر سی پی یا کوئی اور جیو کے اداراتی فیصلے کے بارے میں کیا سوچتا ہے، تضحیک مذہب کے الزامات کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر نکلنے پر اکسانا انتہائی خطرناک رجحان ہے''۔

ایچ آر سی پی اس امر کی نشاندہی کرنے پر مجبور ہے کہ خوف کا جو ماحول پیدا کیا گیا ہے، وہ جیو کے لئے کام کرنے والے ملازمین کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ انہیں دھمکایا جا رہا ہے اور متعدد کو حملوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر اس فتنہ کو جاری رہنے دیا گیا تو اس رجحان میں اضافہ ہوگا اور یہ صورتحال کنٹرول سے باہر ہو سکتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی صفوں میں پیدا ہونے والی پھوٹ سخت جدوجہد کے بعد ذرائع ابلاغ کو ملنے والی آزادی کے

لیے نیک شگون نہیں ہے۔ایچ آر سی پی کا حکومت سول سوسائٹی اور میڈیا کی تنظیموں سے مطالبہ ہے کہ وہ صورتِ حال کو ٹھنڈا کرنے اور خوف وہراس کو ختم کرنے کے لیے تمام ضروری اقدامات کریں تاکہ ذرائع ابلاغ کی آزادی کو مزید حملوں سے بچایا جاسکے۔

ستمبر 5: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے نامور کالم نگار کامران شفیع کی زندگی کو درپیش خطرات اور صحافیوں پر تشدد کے حالیہ واقعات کی شدید مذمت کرتے ہوئے وفاقی وصوبائی حکومتوں پر زور دیا ہے کہ وہ میڈیا کے نمائندوں کے یقینی تحفظ پر توجہ دیں۔ جمعہ کو جاری کردہ ایک بیان میں کمیشن نے کہا:

''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے نامور کالم نگار کامران شفیع کو ایک سابق فوجی افسر کی جانب سے موصول ہونے والے چند دھمکی آمیز خطوط دیکھے ہیں جو ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔حکومت کو انہیں مناسب تحفظ فراہم کرنا چاہئے۔اس حقیقت سے، کہ انہیں دھمکیاں دینے والا شخص ایک سابق فوجی افسر ہے، یا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس نقطہ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ عدم رواداری اور تشدد کے جراثیم اب معاشرے کے ان حصوں میں بھی پھیل چکے ہیں جو اس سے قبل منظّم اور ذمہ دار تصور کئے جاتے تھے''۔

''کامران شفیع کو ملنے والی دھمکی کو میڈیا کے افراد کی زندگیوں کو لاحق خطرات میں اضافے کے تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ چند روز پہلے کوئٹہ کے ایک معروف صحافی ارشاد مستوئی اور ان کے دو ساتھیوں کو ان کے دفتر میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر پورے ملک نے اسلام آباد کے ریڈ زون میں پولیس اور مظاہرین کی جانب سے صحافیوں پر تشدد کرنے اور ان کا سامان توڑنے کا منظر دیکھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ میڈیا برادری نہ صرف ریاستی اداروں بلکہ سیاسی اور مذہبی انتہا پسندوں کے حملوں کی بھی زد میں ہے۔ بلوچستان میں صحافیوں کے تحفظ پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے جہاں گزشتہ پانچ برسوں کے دوران 30 سے زائد صحافیوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔اسی طرح فاٹا میں بھی صحافیوں کو خطرات کا سامنا ہے جس کے باعث ان میں سے چند کو مجبوراً یہ پیشہ اور اپنی رہائش ترک کرنا پڑی''۔

''میڈیا کی آزادی فعال جمہوریت کے قیام کے لئے اولین شرط ہے اور ریاستی اور غیر ریاستی عناصر دونوں ہی اس کے تحفظ کی ذمہ داری کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام کے وسیع تر مفادات کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں''۔

تعلیم

16 جون: بلوچستان کے شہر پنجگور میں عسکریت پسندوں کی طرف سے سکولوں کو زبردستی بند کرانے پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے اسے انتہا پسندی کی بدترین شکل قرار دیا اور کہا کہ یہ اقدام ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

کمیشن برائے انسانی حقوق کی طرف سے جاری کئے گئے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ اس سے قبل 25 اپریل 2014ء کو تنظیم الاسلام الفرقان نامی ایک غیر معروف گروپ نے پنجگور کے پرائیویٹ سکولوں کے خلاف پمفلٹ تقسیم کئے جن میں کہا گیا کہ ان سکولوں میں مغربی طرز کی تعلیم دی جارہی ہے۔ اس کے بعد نقاب پوش حملہ آوروں نے تین سکولوں کو تباہ کر ڈالا۔ ایک سکول وین کو آگ لگا دی اور لڑکیوں کو تعلیم دینے سے روکنے کے لئے اساتذہ اور عملہ کے دوسرے ارکان پر تشدد کیا۔ اس گروپ کے مطابق بچیوں کو تعلیم دینا اسلام میں حرام ہے۔ ان واقعات سے کم از کم 35 پرائیویٹ سکولوں اور انگریزی زبان کے 30 مراکز کے خلاف اس گروپ کی طرف سے کئے جانے والے پرتشدد اقدامات کے باعث یہ ادارے بند کرنے پڑے جس کے باعث پچیس ہزار طلبہ پر تعلیمی اداروں کے دروازے بند ہو گئے۔

بیان میں کہا گیا ہے کہ صوبہ بلوچستان میں انتہا پسندی میں ہونے والی بڑھوتری انتہائی قابل تشویش ہے۔ عسکریت پسند تعلیم حاصل کرنے والی بچیوں ان کے اساتذہ اور پنجگور کے عوام کے لئے خطرہ بن چکے ہیں۔ پاکستان میں بچیوں کو سکولوں میں جانے سے روکنا نئی بات نہیں۔ اس کی بدترین مثال ملالہ یوسف زئی پر ہونے والا حملہ تھا اور اب یہ خطرہ ملک کے اُن علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے جو پہلے اس سے محفوظ تھے۔

کمیشن صوبائی حکومت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ سکولوں کو ملنے والی ان دھمکیوں کا اس طرح سامنا کرے جس سے اس کے عزم کا واضح اظہار ہو کہ وہ طلباء و طالبات دونوں کو اور ان کے سکولوں کو مکمل تحفظ فراہم کرے گی اور سکولوں کو بند کرانے والے عناصر کے ساتھ سختی سے نمٹے گی۔

اکتوبر **31**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے زور دیا ہے کہ ہر بچے کو لازمی اور عالمگیر تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے فوری اقدامات کئے جائیں جس کی پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 25 اے میں ضمانت دی گئی ہے

یہ مطالبہ ایچ آر سی پی کی جانب سے لاہور میں منعقد کردہ ایک مشاورتی اجلاس میں کیا گیا جس کا مقصد پاکستان بھر میں عالمگیر تعلیم کی صورتحال پر بحث کرنا اور ہر بچے کے سکول میں داخلے کے امکانات اور اس حوالے سے درپیش چیلنجوں کی نشاندہی کرنا تھا۔ شرکاء نے واضح کیا کہ پاکستان میں سکول سے باہر پرائمری سکول جانے کی عمر کے بچوں بالخصوص لڑکیوں کی شرح بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کی شرح خواندگی مایوس کن ہے جبکہ زندہ رہنے اور سکولوں میں داخلے کی شرح بھی انتہائی کم ہے۔ تقریب کے شرکاء میں ڈاکٹر اے ایچ نیئر، عمران خان (الف اعلان)، ڈاکٹر طارق رحمان (بی این یو)، علی قاسمی (لمز)، بائیلہ رضا جمیل (ادارہ تعلیم و آگاہی) اور سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے ماہر تعلیم شامل تھے۔

بحث کا مرکزی موضوع صوبائی قانون سازی اور عالمگیر تعلیم سے متعلق قوانین کا نفاذ، صنفی مساوات اور عالمگیر تعلیم کے حصول میں مدرسوں کا کردار تھا۔ شرکاء نے مطالبہ کیا ہے کہ تعلیم کے لیے زیادہ بحث مختص کرنے کے علاوہ اس بحث کے موثر استعمال کی صلاحیت میں بھی اضافہ کیا جائے تاکہ مستحکم ترقیاتی اہداف اور سرعت پذیر کے اہداف حاصل کئے جاسکیں۔ اجلاس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ حکومت، متفکر شہریوں، این جی اوز اور میڈیا کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے عوام کو متحرک کیا جائے تاکہ سکول جانے کی عمر کے تمام بچوں کو سکولوں میں داخل کروا کر ان کے تعلیم کے حق کو یقینی بنایا جاسکے۔

سزائے موت

11 ستمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ان خبروں پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے کہ پھانسی کی سزاؤں پر عملدرآمد پر عارضی پابندی کے باوجود قتل کے ایک مجرم کو 18 ستمبر کو اڈیالہ جیل میں پھانسی دے دی جائے گی۔ ایچ آر سی پی نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ پھانسی پر عملدرآمد کو فوری طور پر روکا جائے اور پھانسیوں پر عارضی پابندی کا اعلان کیا جائے۔

11 ستمبر کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''یہ اطلاعات ایچ آر سی پی کے لئے باعث تشویش ہیں کہ سزائے موت کے ایک قیدی شعیب سرور، جو اس وقت ہری پور جیل میں قید ہے، کو اڈیالہ جیل راولپنڈی میں 18 اگست کو پھانسی دے دی جائے گی۔ مذکورہ مجرم کو 1996ء میں واہ کینٹ میں ایک شخص اویس نواز کو قتل کرنے کے جرم میں 2 جولائی 1998ء کو سزائے موت سنائی گئی تھی۔ مقتول کے بھائی نے مجرم کی تمام اپیلیں خارج کئے جانے اور صدر کی جانب سے رحم کی اپیل مسترد کئے جانے کے باوجود اس کی سزا پر عملدرآمد میں التواء کے خلاف ہائی کورٹ سے رجوع کیا تھا۔ عدالت نے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کو سزا پر عملدرآمد کا حکم دیا۔

ملک میں تاحال آخری بار سزائے موت کے کسی سول قیدی کو 2008ء میں پھانسی دی گئی تھی۔ اس کے بعد سے پھانسیوں پر پابندی عائد رہی۔ ایچ آر سی پی حکومت کو باور کرانا چاہتا ہے کہ 2008ء میں جن وجوہات کی بناء پر پھانسیوں پر پابندی عائد کی گئی تھی، ان میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس پس منظر میں 15 ستمبر کو سرور کی سزائے موت پر عملدرآمد ایک رجعت پسندانہ اقدام ہے جس سے بہت سے اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ مجرم کے رشتہ داروں نے ایک مرتبہ پھر صدر سے سزا کو ختم کرنے کی درخواست کی ہے اور وہ خون بہا کے ذریعے معاملہ طے کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ ایچ آر سی پی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس پھانسی اور تمام زیرغور پھانسیوں پر عملدرآمد روکا جائے اور پھانسیوں پر غیررسمی معطلی کو بلاتاخیر رسمی شکل دی جائے۔ ہم صدر

مملکت سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ رحم کی اپیلوں پر ہمدردانہ غور کریں اور سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کردیں۔

''ایچ آر سی پی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت سزائے موت کے خاتمے کے حوالے سے فوری اقدامات کرے۔ ایچ آر سی پی اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ حکومت شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی میثاق کے اضافی معاہدے پر دستخط کرے، جس کا مقصد سزائے موت کا خاتمہ ہے۔

مزدوروں کے حقوق

19 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق HRCP کے زیر اہتمام ملتان میں منعقد ہونے والے تیسرے کسان کنونشن نے مطالبہ کیا ہے کہ زرعی اصلاحات کے راستے میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ کھیت مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مناسب قانون بنایا جائے اور زرعی شعبے کو درپیش مسائل سے نمٹنے کے لئے پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا جائے۔

ملتان میں گزشتہ روز منعقد ہونے والے سالانہ کسان کنونشن میں ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والی کسان تنظیموں، کسان دوست اور انسانی حقوق کے کارکنوں نے کسان کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا۔ شرکاء نے گزشتہ 2 سالہ کسان کنونشن کی سفارشات کی توثیق کرتے ہوئے ملک کے کسانوں کے مطالبات کو نئی شکل دی۔ 25 نکاتی ملتان اعلامیہ منظور کیا جس سے اگلے سال کسانوں کے حقوق کے تحفظ کی جدوجہد کے خدوخال واضح کئے گئے۔ کنونشن کے مرتب کردہ مطالبات کردہ مطالبات حسب ذیل ہیں۔

1- سرکاری زمین بے زمین کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

2- بے زمین ہاری فی خاندان کو 15 ایکڑ زمین دی جائے۔

3- کھیت مزدور عورتوں میں سرکاری زمین مردوں کے برابر تقسیم کی جائے۔

4- 1977 کے زرعی قانون میں ترامیم کی جائیں۔

5- زرعی اصلاحات کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کر کے زرعی اصلاحات کے لیے ضروری قانون سازی ہنگامی بنیادوں پر کی جائے۔

6- شعبہ زراعت کی ترقی کے لئے 5 سالہ زرعی منصوبے کا اعلان کیا جائے۔

7- کسانوں میں مضبوط تنظیم سازی کے عمل کو مزید مضبوط کیا جائے۔

8- ILO کے توثیق شدہ کنونشن کے مطابق کھیت مزدوروں کو یونین سازی اور معقول اجرت کا حق دیا جائے۔

9- کھیت مزدوروں، صنعتی مزدوروں کے مساوی حقوق تسلیم کئے جائیں۔
10- کھیت مزدوروں کے بچوں کو پرائمری سے اعلیٰ تعلیم مفت فراہم کی جائے۔
11- کھیت مزدور/عورتوں بچوں کو طبی سہولیات فراہم کی جائیں۔
12- سیلاب زدہ، جنگ زدہ اور بارڈر ایریا میں رہنے والے کھیت مزدوروں کا اقتصادی تحفظ کیا جائے۔
13- کم اراضی رکھنے والے مالکان کو دکار تمام سہولیات مہیا کی جائیں۔
14- مہنگائی کے تناسب سے فصل کے ریٹ مقرر ہونے چاہئیں۔
15- چھوٹے کاشتکاروں کی فصلات کی انشورنس کا بندوبست کیا جائے۔
16- کھیت سے منڈی تک پختہ سڑک اور ٹرانسپورٹ کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔
17- جن چھوٹے کاشتکاروں کی زمین دریا برد ہو گئی ہیں۔انہیں متبادل سرکاری رقبہ الاٹ کئے جائیں۔
18- زرعی اراضی کو رہائشی کالونیوں میں تبدیل کرنے پر کسانوں کو معاوضے دیئے جائیں۔
19- جعلی الاٹمنٹوں پر عدالتی کمیشن بنایا جائے اور تحقیقات کرائی جائیں اور قدیم آبادکار لوگوں کو ان کا حق واپس دلایا جائے۔
20- سندھ اور بلوچستان میں جاگیرداروں کے قبضہ کرنے کی کاروائیوں کی روک تھام کی جائے۔اور ہاریوں کے لئے رہائشی کالونیاں بنائی جائیں۔
21- بلوچستان کا ریونیو ریکارڈ کمپیوٹرائز ہونا چاہئے۔
22- نہری پانی کی مساوی تقسیم ہونی چاہئے۔اپر پنجاب کی نسبت جنوبی پنجاب میں نہری پانی کا وقت کم ہے۔جس کی لازمی تحقیق ہونا چاہئے۔
23- جن علاقوں میں دریا اور نہری پانی دستیاب نہیں ہے۔رودکوہیوں کے نظام کو بہتر کیا جائے۔وہاں پر لازمی ڈیم بنائے جائیں۔
24- مزارعین کا نام ریونیو ریکارڈ میں لازمی طور پر درج کیا جائے۔
25- اوکاڑہ، خانیوال اور دیگر علاقوں میں ملٹری یا سیڈ فارموں کی اراضی کی ملکیت عرصہ دراز سے قابض مزارعین کو منتقل کی جائے۔

پولیس کی زیادتیاں

دسمبر **4**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے لاہور میں نابینا مظاہرین پر پولیس تشدد کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس پرتشدد اقدام نے ڈنڈا برداروں کی درندگی کے چہرے پر سے نقاب نوچ لیا ہے۔ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نابینا مظاہرین پر پولیس تشدد کی

مذمت کرتا ہے۔ ان نابینا افراد کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ وزیراعلیٰ کے سیکرٹریٹ پر جا کر اپنا احتجاج ریکارڈ کروانا چاہتے تھے''۔

کمیشن نے مزید کہا کہ ''ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا کہ مظاہرین حدود میں رہتے ہوئے اپنے مطالبات کے حق میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ نہ تو عوامی تحفظ کے لئے کوئی خطرہ تھے اور نہ ہی امنِ عامہ کو ان سے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ نہ تو متشدد ہوئے اور نہ ہی انہوں نے کسی شکل میں کسی قسم کے تشدد کا مظاہرہ کیا۔ کیا کسی بھی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سفید چھڑیاں ڈنڈا بردار پولیس کے لئے کسی قسم کا خطرہ تھیں''۔

کمیشن نے مزید کہا کہ ''اگر مظاہرین وزیراعلیٰ کے سیکرٹریٹ تک پہنچ جاتے تو یقینی طور پر آسمان نہ گر پڑتا۔ وزیراعلیٰ یا ان کی جگہ ان کے اختیارات استعمال کرنے والے حکام یا کوئی سینئر نمائندہ اگر مظاہرین سے مل لیتا اور ان کے مطالبات سن لیتا تو بہت ہی بہتر ہوتا۔ تاہم اب افسوسناک بات یہ ہے کہ چیزوں کو بہتر کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان نابینا مظاہرین پر اس روز تشدد ہوا جو معذوروں کے عالمی دن کے موقع پر منایا جا رہا تھا۔ اس شرمناک واقعہ سے اس روز کی اہمیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اگر اس قسم کے بدنما واقعات بھی حکومت کو جگا نہیں سکتے تو سمجھ لینا چاہئے کہ نابینا افراد یقیناً اندھوں اور دل نہ رکھنے والے لوگوں سے مدد طلب کر رہے ہیں''۔

''جو لوگ پنجاب پولیس کو بلاضرورت طاقت کے استعمال سے روکنے کا درس دیتے نہیں تھکتے انہیں چاہئے کہ وہ اس خواہش کو ختم کر دیں۔ پنجاب پولیس جو اپنی بہیمیت اور انسان دشمنی کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے، شاید اس سے زیادہ نیچے نہیں گر سکتی۔ پنجاب حکومت کو اس واقعہ پر شرم آنی چاہئے اور اس شرمناک واقعہ کو ''تحقیقات'' کے نقاب کے اندر چھپانا نہیں چاہئے۔ ایسی تحقیقات جو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتیں سوائے اس کے کہ چند پولیس والوں کو معطل کر دیا جائے۔ پولیس والے جو مظاہرین کو پیٹتے ہیں اور وہ جو مارنے کا حکم دیتے ہیں انہیں انصاف کے کٹہرے میں لانا چاہئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پولسنگ اور ہجوم پر قابو پانے کے تصور کو عوام دوستی کے نکتہ نظر سے دیکھا جانا چاہئے۔ کچھ لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاہور میں جسمانی طور پر معذور افراد نے یہ کیسے یقین کر لیا کہ اپنی بات منوانے کا بہترین راستہ وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ کے باہر جمع ہو کر نعرے لگانا ہے۔ ان سوالوں میں سے کسی کے جواب سے بھی طرزِ حکمرانی کے مختلف نقطہء ہائے نظر پر اترانے والے ملک بھر کے رہنما اطمینان محسوس نہیں کریں گے''۔

بچے

16 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے پشاور میں فوج کے زیرِ انتظام چلنے والے سکول پر طالبان کے حملے میں 120 سے زیادہ بچوں کے قتل کو قومی سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس قومی المیہ سے ان

لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جواب بھی سمجھتے ہیں کہ طالبان اور پاکستان ایک ساتھ موجود رہ سکتے ہیں۔

بیان میں کمیشن نے کہا کہ ایچ آر سی پی کو پشاور کے آرمی پبلک سکول پر طالبان کے حملے میں عظیم جانی نقصان پر شدید صدمہ پہنچا ہے۔ یہ قومی المیہ ہے، جس پر پوری قوم کو شدید دُکھ ہوا ہے۔ آج کا دن پاکستان میں ماتم کا دن ہے۔ تمام پاکستانی دہشت گردی کے اس مکروہ عمل سے بے حد دُکھی ہوئے ہیں اور ان کے دل شہید ہونے والے بچوں کے والدین کی طرح ہی دُکھی ہیں۔

اگرچہ دہشت گردی کا ہدف فوج کے زیرِ انتظام چلنے والا سکول تھا لیکن یہ تو ایک سکول تھا۔ بچے طالبان کے خلاف نہیں لڑ رہے۔ اس کے باوجود اس مکروہ عمل کے ہدف کا چناؤ اور بھاری تعداد میں بچوں کی ہلاکتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس خونریزی کا مقصد زیادہ سے زیادہ بچوں کو قتل کرنا تھا۔

مذہب سمیت مسلح تصادم کے قواعد بچوں کو نشانہ بنانے کا کوئی جواز فراہم نہیں کرتے لیکن یہ کوئی راز نہیں رہا کہ قاتل اور انہیں سکول پر حملہ کرنے کے لیے بھیجنے والوں کے دلوں میں نہ تو مذہب کا احترام ہے اور نہ ہی وہ مہذب رویہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان کے لیے بچوں کو نشانہ بنانا اس لیے معمول کی بات ہے کہ ان کا مقصد صرف اور صرف خون بہانا ہے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اپنے اس یقین کا اعادہ کرتا ہے کہ طالبان اور پاکستان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور جو کوئی اب بھی اس کے برعکس تصور کرتا ہے اس کو نادان ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت آج کے انتہائی تکلیف دہ واقعہ سے بہت پہلے ہی ثابت ہو چکی ہے کہ علم کے حصول اور بچوں کی زندگیوں کے حوالے سے طالبان کی سوچ کیا ہے۔ ان کے آج کے بدترین عمل نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ جب تک طالبان کو مکمل طور پر شکست نہیں دے دی جاتی پاکستان میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا۔

بچوں کے اس سفاکانہ قتل نے ایک بار پھر واضح کر دیا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف جنگ کا مطلب کیا ہے اور اگر اس دلسوز سانحہ سے بھی ان لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور جواب بھی طالبان کے بارے میں نرم لفظوں کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنی گردنیں ریت میں دبائے ہوئے ہیں اور جواب بھی دہشت گردوں کے خلاف آپریشن شروع کرنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے نہیں تھکتے۔

ایچ آر سی پی وفاقی اور تمام صوبائی حکومتوں سے کہتا ہے کہ وہ یکجا ہو کر، متحد ہو کر اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے سخت ترین اقدامات کریں اور انہیں یہ کام ترجیحی بنیادوں پر کرنا چاہئے۔ خیبر پختونخوا حکومت کو عسکریت پسندوں کے لئے اپنی دوستانہ پالیسی پر نظرِ ثانی کرنی چاہئے اور وہ اپنے عمل کے ذریعے شہریوں کو دہشت گردوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ کمیشن نے کہا کہ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ طالبان کے خلاف

جنگ درحقیقت پاکستانی بچوں کی زندگیوں کے لئے جنگ ہے، بربریت کرنے والے طالبان اوران جیسوں سے بچوں کے مستقبل کوتحفظ دینے کی جنگ ہے۔

دسمبر **18**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پشاور میں بچوں کے قتل عام کے واقعے کی فوری اور جامع تحقیقات کرنے اور قوم کے مستقبل کے قاتلوں کے بلواسطہ یا بلاواسطہ معاونت کرنے والے تمام عناصر کو بے نقاب کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

کمیشن نے اپنے ایک بیان میں کہا: ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ پشاور میں خوفناک غارت گری پر انتقامی یا جذباتی ہونے کی بجائے نہایت سوچا سمجھا اور موثر ردعمل ظاہر کیا جائے۔ یہ وقت محض عوامی ہمدردیاں جیتنے یا لفاظی سے رائے عامہ کا رُخ موڑنے کا نہیں ہے۔ ایچ آر سی پی کو یقین ہے کہ پھانسیوں پر غیر رسمی پابندی پر نظرثانی کرنے سے پاکستان کو درپیش چیلنج حل نہیں ہوگا۔ تحقیقاتی نظام اور عمومی طور پر پورے فوجداری نظام انصاف میں موجود خامیوں پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ محض سزا کی بجائے منصفانہ سزا کو یقینی بنایا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ انتہا پسندی یا نفرت انگیز تقاریر میں ملوث تمام افراد اور گروہوں کا سزا سے استثنیٰ ختم کیا جائے۔ الفاظ کی حد تک کالعدم انتہا پسند جنگجو گروہوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی میں بھی مزید تاخیر مہلک ہوگی۔

ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ پشاور میں بچوں پر المناک حملے کے تمام پہلوؤں سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔ ایسے قیامت خیز سانحے کی معلومات کی فراہمی صرف نیوز میڈیا کے ذریعے ہی کافی نہیں تھی۔

عوام کا مطالبہ ہے اور وہ پُر امید ہیں کہ قوم کے مستقبل کے معماروں پر بدترین دہشت گردانہ حملہ کرنے والے دہشت گردوں کی بلواسطہ یا بلاواسطہ مدد کرنے والے تمام عناصر کو بے نقاب کرنے کے لیے بلاتاخیر مکمل تحقیقات کی جائیں گی۔ قتل عام کے وقوعے کی پیشگی نشاندہی کرنے میں خفیہ معلومات کے ڈھانچے کی ناکامی کی وجوہات کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ وقوعے کے تحقیقاتی عمل میں افغانستان میں ہی نہیں بلکہ دہشت گردوں کے حمایتی سلسلے کے تمام روابط کا جائزہ لیا جائے۔

''ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ بے رحمی سے ذبح کیے گئے ہمارے بچوں اوران کے والدین نے ریاست کی ناقص سمت بندی اور عقیدے کے نام پر عدم رواداری کو فروغ دینے کی ایک بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اب یہ ضروری ہے کہ ماضی کی اس روش کو ترک کیا جائے اور تمام متعلقہ فریقین یکساں موقف اپنائیں اور ایک مربوط انسداد دہشت گردی پالیسی کے ذریعے اس دائمی غارت گری کا خاتمہ کریں۔ یہ امید کی جانی چاہئے کہ اچھے اور برے طالبان کے روایتی نقطہ نظر کو ترک کرنے کے حالیہ عہد کا پاس رکھا جائے۔

''یہ بات سب پر واضح ہونی چاہیئے کہ دہشت گردوں کی حمایت کرنے سے محض دہشت گردی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس بات کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے کہ دہشت گردوں سے تعلقات رکھنے والے یا ان کے سرگرم حمایتی اپنے کیے پر نادم ہیں۔ یہ غم زدہ قوم مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سیاسی جماعتیں جوان سفاک قاتلوں سے قطع تعلق کرنے سے انکاری ہیں یا جوان کا دفاع کرنے پر کمر بستہ ہیں انہیں کسی کی بھی نمائندگی کرنے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔

''اس امر پر سب متفق ہیں کہ پاکستان اور افغانستان میں ہونے والی دہشت گردی ایک علاقائی مسئلہ ہے۔اگر یہ دونوں ممالک طالبان اور دیگر دہشت گردوں سے ان کی محفوظ پناہ گاہوں سے چھین لیں تو ان کے پاس انسانیت کو لاحق اس سنگین خطرے کو ختم کرنے کا ایک بہترین موقع ہوگا۔

''لوگ یہ پوچھنے پر مجبور ہو چکے ہیں کہ یہ کیسی ریاست ہے کہ جہاں مٹھی بھر لوگ آتے ہیں اور ہماری آئندہ نسلوں کو وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیتے ہیں۔کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر ہم ان سنگین حالات میں بھی کوئی موثر اقدام کرنے میں ناکام رہے تو مہذب اقوام کی فہرست میں پاکستان کا نام برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

انصاف کا انتظام وانصرام

24 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے تحفظ پاکستان (ترمیم شدہ) آرڈیننس 2014 کے نفاذ پر تشویشناک امر کا اظہار کیا ہے۔کمیشن نے کہا کہ مذکورہ قانون ان حقوق کی خلاف ورزی ہے جن کی آئین میں ضمانت دی گئی ہے اور یہ خلاف قانون سرگرمیوں کو قانونی جواز فراہم کرتا ہے۔ جمعہ کو جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا کہ اس آرڈیننس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنہیں قبول کرنا حقوق کا احترام کرنے والے افراد کے لیے مشکل ہوگا۔ حکام کو کسی فرد کے حراستی مقام یا ایسی حراست کی وجوہات کے بارے میں معلومات فراہم نہ کرے، کسی فرد کو عام جیلوں کی بجائے حراستی مراکز میں نظر بند کرے، مشتبہ افراد کی نئی درجہ بندیاں، مثال کے طور پر ''غیر ملکی دشمن'' یا ''جنگجو دشمن''، کسی بھی مشتبہ فرد کی نظر بندی کی مدت میں توسیع کرنے جیسی دفعات خدشات کو جنم دینے کا بنیادی سبب ہیں۔

ایچ آر سی پی یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ جب عدالت عظمیٰ نے سکیورٹی فورسز کی طویل اور بلا اعلان حراستوں کو غیر قانونی قرار دیا تھا اور قانون سازی کرانے کا مطالبہ کیا تھا تو اس نے جس چیز کا مطالبہ کیا تھا کیا وہ اسی قسم کے آرڈیننس تھے؟ حقوق کی توہین کرنے اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو غیر معمولی

اختیارات دینے کے لیے غیر معمولی حالات کا حوالہ دینا پاکستان میں جبری گمشدگیوں کے سیاق وسباق کے حوالے سے خاص طور پر تکلیف دہ امر ہے۔ مذکورہ آرڈیننس پاکستان میں جبری گمشدگیوں کے ساتھ مفاہمت کے مترادف ہوگا اور اس سے سزا سے استثنیٰ کو تقویت ملے گی۔

ایچ آر سی پی پُر امید ہے کہ واضح بے ضابطگیوں کو قانونی جواز دینے کی نیت سے نافذ کیا گیا آرڈیننس عدلیہ کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ نیا آرڈیننس مشتبہ افراد کو ان کے بیشتر حقوق سے محروم کر دے گا، تاہم اس سے ملک کو تحفظ فراہم کرنے یا پاکستان میں وسیع پیمانے پر ہونے والی قتل وغارت کے ذمہ دار عناصر کو جوابدہ ٹھہرانے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ پارلیمان کی موجودگی میں انتہائی اہم معاملے پر آرڈیننس کے نفاذ کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ پارلیمان کو متنازعہ قانون کا جائزہ لینے کی اجازت دینی چاہیے تھی۔

26 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے دہشت گردی سے متعلق مقدمات کی سماعت کے لیے فوجی افسروں کی سربراہی میں خصوصی عدالتیں قائم کرنے کے فیصلے پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا کہ تمام جماعتوں نے اس ناخوشگوار فیصلے کی حمایت کی جس سے کمیشن کو مایوسی ہوئی حالانکہ ان میں سے چند جماعتوں نے پہلے ان عدالتوں کے قیام پر تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ ایچ آر سی پی کو اس اقدام پر کئی تحفظات ہیں۔

پہلا یہ کہ اس فیصلے سے عدلیہ کمزور ہوگی۔ اس کے علاوہ ان عدالتوں کے قیام سے ملک میں ایک آزاد اور مضبوط عدالتی نظام پر عدم اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے ماضی میں کئی فوجی عدالتوں کو غیر آئینی قرار دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ شہریوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلانے کا معاملہ ہمیشہ سے ہی متنازعہ رہا ہے اور ایک بار پھر اعلیٰ عدلیہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ''فوری انصاف'' کا نظام کبھی بھی شفاف نہیں رہا اور نہ ہی تیز رفتار ثابت ہوا ہے۔

تیسرا یہ کہ اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ سیاسی اختلاف رائے رکھنے والے افراد بالخصوص وہ جن کا تعلق بلوچستان اور سندھ سے ہے، وہ ان فوجی عدالتوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

ایچ آر سی پی کا یہ موقف ہے کہ اس کی بجائے تحقیقات اور مقدمہ چلانے کے عمل میں اصلاح کی جائے اور اسے مضبوط بنایا جائے۔ اصلاحات میں تشدد اور جبر کی بجائے تفتیش کے سائنسی طریق کار کے علاوہ گواہان، وکلاء اور ججوں کے تحفظ سے متعلق پروگرام شامل کیے جائیں۔ جلد بازی میں کیا گیا یہ فیصلہ اس لیے بھی قابل اعتراض ہے کہ سپریم کورٹ بذات خود دہشت گردی کے مقدمات کو فوری طور پر نپٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔

21 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے امید کا اظہار کیا ہے کہ عدالتِ عظمیٰ آسیہ بی بی کے مقدمے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے گی۔ یاد رہے کہ آسیہ بی بی توہین رسالتؐ کے مقدمہ میں سیشن کورٹ سے ملنے والی سزا کے خلاف اپیل کو ہائی کورٹ نے گزشتہ ہفتے مسترد کر دیا تھا۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا ہے کہ آسیہ بی بی کی اپیل پر عدالتی فیصلے نے بڑی تعداد میں لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے اور اب تمام نظریں سپریم کورٹ پر لگی ہوئی ہیں۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ کوشش ہونی چاہئے کہ تبصرہ کر کے عدالتی عمل میں مداخلت سے باز رہا جائے لیکن اس مقدمہ سے پیدا ہونے والے حالات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس وقت پاکستان ایک مشکل صورتحال سے دوچار ہے اس لیے کہ جس طرح توہین رسالتؐ کا استعمال کیا جا رہا ہے اور اس پر جس طرح عمل درآمد ہو رہا ہے، اس کا تنقیدی نظر سے جائزہ نہیں لیا گیا۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ پاکستان کی عدلیہ ایک غریب عورت کو انصاف مہیا کرنے میں ناکام نہیں ہوگی۔ اصل معاملہ تو قانون سازوں اور علماء کے ہاتھوں میں ہے۔ اس قانون پر عملدرآمد سے جو ردعمل پیدا ہوگا، اس کے اثرات کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں میں کٹرپن اور عدم برداشت کا احساس شدت اختیار کر جائے گا جس کے باعث ہمیں مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کمیشن کو توقع ہے کہ جب عدالت عظمیٰ مقدمہ کی سماعت کرے گی تو وہ اس کو بھی دیکھے گی کہ کس طرح ہجوم نے عدالت کے اندر داخل ہو کر سماعت کے دوران عدالتوں کے اردگرد چکر لگا کر توہین آمیز سلوک روا رکھا تھا۔

ایچ آر سی پی کو یقین ہے کہ سماعت کے دوران عدالتِ عظمیٰ معاملے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے گی اور ثبوتوں کے معیار کی سختی کے ساتھ جانچ پڑتال کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف آسیہ بی بی کے مقدمہ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ حکومت اور عوام دونوں کو اس قسم کے معاملات پر نتائج کے حوالے سے دیکھنا ہوگا۔

جمہوری نظم ونسق

10 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ کے کارکن کے اغواء اور قتل کی شفاف انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔ کمیشن کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ایم کیو ایم کی ان شکایات کی چھان بین کی جائے کہ ان کے کارکنوں کو ماورائے عدالت قتل اور غیر قانونی حراست کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ایچ آر سی پی نے کہا: ایم کیو ایم نے بارہا شکایت کی ہے کہ کراچی میں اس کے کارکنوں کو ان کی سیاسی وابستگی کی بنا پر غیر قانونی گرفتار کیا جا رہا ہے اور ماورائے عدالت قتل کیا جا رہا ہے۔ پارٹی نے قانون نافذ کرنے

والے اداروں کے اہلکاروں کو ان مظالم کا مورد الزام ٹھہرایا ہے بالخصوص گزشتہ برس اگست سے کراچی میں شروع ہونے والے آپریشن کے بعد۔

یہ انتہائی سنگین نوعیت کے الزامات ہیں اور ایچ آر سی پی ہمیشہ سے پر امید رہا ہے کہ پاکستان بھر میں کہیں بھی ایسے الزامات منظر عام پر آئیں تو ان کی مکمل تحقیقات کی جائیں گی اور حکام سے بار ہا یہ استدعا کرنے کی نوبت نہیں آنی چاہئے۔

ایچ آر سی پی کو سلمان نوار الدین جسے ایم کیو ایم کا رکن بتایا جاتا تھا، کے قتل پر شدید تشویش ہے۔ مقتول کو 3 فروری کو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اٹھایا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بھتیجے کو بھی اٹھایا گیا تھا مگر بعد ازاں اسے رہا کر دیا گیا۔ سلمان کی حراست سے اگلے روز اس کی نعش شاہ لطیف ٹاؤن کراچی سے برآمد ہوئی۔ اطلاعات کے مطابق نعش پر اذیت رسانی کے گہرے نشانات تھے۔ اس اطلاع کی تصدیق پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی ہوئی تھی۔

ایچ آر سی پی حکومت اور بالخصوص وزیر اعلیٰ سندھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سلمان کے قتل اور دیگر تمام مقدمات کی عدالتی تفتیش کو یقینی بنائیں جن میں سیاسی وابستگی کی بنا پر افراد کی غیر قانونی حراست، جبری گمشدگیوں یا ماورائے عدالت قتل کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

21 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کی جانب سے اپنے کارکنوں کے اغوا، تشدد اور ماورائے عدالت ہلاکتوں پر احتجاج کی جانب توجہ دلاتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ابھی تک ان الزامات کی تحقیقات کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

جاری کئے گئے بیان میں کمیشن نے کہا کہ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو معلوم ہوا کہ جمعہ کے روز کورنگی کے علاقے سے ایم کیو ایم کے دو کارکنوں کی تشدد زدہ لاشیں ملیں۔ یہ دونوں افراد گزشتہ ایک ماہ سے لا پتہ تھے۔

پاکستان کے تمام شہریوں بشمول ان لوگوں کے جو کراچی کو اپنا گھر کہتے ہیں کا مفاد کراچی کے امن سے وابستہ ہے۔ اسی لیے کراچی کو بڑھتے ہوئے تشدد سے نجات دلانے کے لئے آپریشن کے آغاز کو سب نے سراہا تھا۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کا مطالبہ ہے کہ شہر میں امن کی بحالی کے لئے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی تمام کوششیں قانون اور انسانی حقوق کے عین مطابق ہونی چاہئیں۔

کمیشن وفاقی اور صوبائی حکومتوں سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ایم کیو ایم کی شکایتوں کی فوری تحقیقات پارٹی اور متاثرہ خاندانوں کے اطمینان کے مطابق کی جائیں۔

05اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ''مسندِ اقتدار پر کسے قابض ہونا چاہئے'' کے حوالے سے جاری لڑائی پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ موجودہ صورتحال ریاستی امور کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ کمیشن نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ لوگوں کے حقیقی مسائل پر توجہ دے اور وہ لوگ جو اسلام آباد کی جانب مارچ اور دیگر منصوبوں کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں ان پر زور دے کہ اس خطرے کو محسوس کریں جو ان کے حالیہ اقدامات کے باعث ملک کے غیر مستحکم جمہوری نظام کو لاحق ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''نام نہاد آزادی مارچ اور دیگر حربوں، جن کا مقصد حکومت پر دباؤ بڑھانا ہے، سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس صورتحال کی ذمہ دار تمام سیاسی جماعتیں ہیں۔ حکومت نے عمران خان کے ساتھ معاملات طے نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی، جب انہوں نے چار حلقوں میں دھاندلی کا الزام عائد کیا تھا اور حکومت معاملے کا سیاسی حل تلاش کرنے کی بجائے فرار کے ماورائے سیاست راستے تلاش کرتی رہی ہے۔ ایک ایسے وقت میں کہ جب اصل خطرہ لاقانونیت، ٹارگٹ کلنگ، فرقہ وارانہ تشدد، انسانی حقوق کے کارکنان کے قتل اور بے روزگاری سے متعلق لوگوں کی شکایات کو دور کرنے میں حکومت کی ناکامی یا عدم دلچسپی ہے، حکومت نے عمران خان اور طاہر القادری کو سب سے بڑا خطرہ تصور کر کے بھی بہت بڑی غلطی کی ہے۔ عمران خان جس بنیاد پر لوگوں کو اسلام آباد کی جانب مارچ کرنے پر اکسا رہے ہیں وہ زیادہ تر لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں اور انہوں نے بہت زیادہ بوجھ اپنے سر لے کر غلطی کی ہے۔

ڈاکٹر قادری اور عمران خان کا یہ خیال درست نہیں کہ ان کی سرگرمیوں سے نظم ونسق کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور حکومت کا یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ لوگوں کو غیر فعال جمہوریت کے دفاع پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ عام انتخابات میں نمایاں بدانتظامی پائی گئی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انتخابات مجموعی طور پر سرکاری مداخلت سے آزاد تھے جس کا مشاہدہ ماضی میں کیا جاتا تھا۔ بہرحال، بے ضابطگی کے خلاف شکایات کی اہمیت کا فیصلہ جمہوری اداروں کو ملنے والے احترام کے تناظر میں کیا جائے۔ جمہوریت میں مقررہ وقت سے قبل انتخابات منعقد کروانے کا مطالبہ جائز ہوسکتا ہے مگر اس کا دارومدار حکومت کی کارکردگی کی ناکامی اور دوسرے فریق کی جانب سے معقول متبادل کی اہلیت پر ہونا چاہئے۔ خاص طور پر پاکستان کے حالات میں جب کہ ہم ابھی تک جمہوریت کی بنیاد قائم کرنے کی تگ ودو میں ہیں اور اس مرحلے پر اسے جھٹکا دینے کا فائدہ صرف ماورائے آئین قوتوں کو ہی پہنچے گا۔

ایچ آر سی پی کو کُرسی پر قبضہ کی جنگ اور ریاستی امور کو مسلسل نظر انداز کرنے کے معاملے پر شدید تشویش ہے۔ یہ طُول پکڑتا تماشہ نہ صرف حکمرانوں اور اُن کے مخالفین بلکہ عوام کی توجہ کا مرکز بھی بنا ہوا ہے

جوکہ محض انسانی سرمائے اور وقت کا ضیاع ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہر کوئی اپنی ذمہ داری کا احساس کرے اور اندرون ملک نقل مکانی، ملک میں جاری تصادم، امن وامان اور معیشت کی صورتحال سمیت اہم مسائل پر توجہ دے اور دنیا میں پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کی کوشش کرے۔

دسمبر **9**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے پیر کو فیصل آباد میں ہونے والے متشدد سیاسی تصادم پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے امن وامان کے قیام کے لیے مناسب اقدامات نہ کرنے اور پاکستان تحریک انصاف کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعے صورت حال کو قابو میں رکھنے میں ناکامی پر حکام کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ ''ایچ آر سی پی کو فیصل آباد میں ہونے والے پرتشدد واقعات پر شدید دُکھ ہوا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان تحریک انصاف کا ایک نوجوان کارکن جاں بحق ہوا جبکہ پولیس والوں سمیت متعدد افراد زخمی ہوئے۔''

''یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ امن وامان کو برقرار رکھا جائے، اور شہریوں کے جان ومال کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ حالات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پیر کو ہونے والا مظاہرہ متشدد ہوسکتا تھا اس لیے کہ حکمران جماعت اور پی ٹی آئی دونوں کی طرف سے اشتعال انگیز بیانات آ رہے تھے اس کے باوجود حکام نے مناسب اقدامات کرنا ضروری نہیں سمجھا اور نہ ہی امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب طریقے اختیار کیے۔ پولیس والے اسلحہ کے استعمال کو خاموشی سے دیکھتے رہے اور گولیاں چلانے والوں کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کو اس سارے معاملے سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ فیصل آباد میں پاکستان تحریک انصاف اور حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ن) کے کارکنوں کے درمیان ہونے والے پرتشدد تصادم نے نہ صرف یہ کہ موجودہ کشیدہ سیاسی صورتحال کو مزید کشیدہ بنا دیا ہے بلکہ سیاسی کشمکش میں تشدد کے عنصر کو پروان چڑھایا ہے۔ اس انتہائی تکلیف دہ تصادم کی ٹی وی چینلوں کے ذریعے کوریج کے باعث پی ٹی آئی کے کارکن کا قاتل چھپا نہیں رہ گیا۔ اس لیے اس کو فوری طور پر گرفتار کر کے اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

''دوسرا تشویشناک معاملہ یہ ہے کہ پی ٹی آئی کے کارکن تشدد کے بل بوتے پر دکانیں اور دفاتر بند کراتے رہے۔ اُنھوں نے ٹائر جلا کر راستے بند کر دیئے اور میڈیا کے لوگوں کے خلاف بھی طاقت کا استعمال کیا۔ دونوں پارٹیوں کے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے اور دونوں جماعتوں کے رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ اپنے کارکنوں کو قابو میں رکھیں اور انہیں خود کو اپنے کارکنوں کے اعمال کا ذمہ دار سمجھنا چاہیے۔

ایچ آر سی پی سمجھتا ہے کہ حکمران جماعت کی یہ سوچ غیر حقیقت پسندانہ ہے کہ پی ٹی آئی کی مہم ختم ہو جائے گی۔اور عوام اس کے فیصلوں پر کان نہیں دھریں گے۔ دونوں فریقوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ مذاکرات کے ذریعے اس صورتحال پر قابو پائیں۔اس حوالے سے انہیں ابتدائی قدم یہ اٹھانا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی بند کریں اور اشتعال انگیز تقاریر نہ کریں۔اور اس طرح سیاسی فضا میں موجود کشیدگی کو ختم کریں۔کمیشن نے کہا کہ فیصل آباد کے واقعات نے اس اہمیت کو ایک بار پھر اجاگر کیا ہے کہ میڈیا کے لوگوں کو تحفظ مہیا کیا جانا چاہیے۔اور میڈیا والوں کا تحفظ حکام کے علاوہ سیاسی جماعتوں کا بھی فرض ہے۔

جون **3**: جئے سندھ متحدہ محاذ (جے ایس ایم ایم) کے کارکن منیر چولیانی کے اغواء اور بہیمانہ قتل پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا کہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقع سندھ میں جاری پریشان کن رجحان کا تواتر ہے جہاں قوم پرست گروہوں اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستہ افراد کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔

اپنے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا:''جے ایس ایم ایم کے میڈیا کوآرڈینیٹر منیر چولانی کا قتل انتہائی قابل مذمت ہے۔منیر چولانی جو جسمانی لحاظ سے معذور تھے اور وہیل چیئر کے بغیر چلنے پھرنے سے قاصر تھے، انہیں اس وقت اغواء کیا گیا جب وہ 29 مئی کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ لاڑکانہ میں واقع اپنے گاؤں سے قصبہ سن، ضلع جام شورو جارہے تھے۔ایک سفید جیپ میں سوار مسلح افراد نے ان کی کار کا پیچھا کیا اور شاہراہ انڈس کے نزدیک انہیں روکا۔ان کی بیوی کا کہنا تھا کہ مسلح افراد نے سیاسی کارکن کو کار سے باہر گھسیٹا، انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ان کی نعش تین گھنٹے بعد سہون سے برآمد ہوئی۔عینی شاہدین کے مطابق چار افراد نے چولانی کو جیپ سے نکالا جن کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور انہیں سر میں گولی ماردی۔

سندھ میں قوم پرست جماعتوں کے اراکین کے قتل کی شرح خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔اس سے بھی پریشان کن امر یہ ہے کہ کسی بھی وقوعہ میں ملوث قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا گیا۔جے ایم ایم نے چولانی کے قتل کا الزام ریاستی اہلکاروں پر عائد کیا ہے۔یہ انتہائی ضروری ہے کہ مذکورہ الزام کی مکمل تحقیقات ہو جو جماعت اور رشتہ داروں کو مطمئن کر سکے،ایک ایسا کام جواب تک سندھ میں پیش آنے والے کسی بھی وقوعے میں نہیں کیا گیا۔

درحقیقت اپریل 2011ء میں سانگھڑ میں قتل ہونے والے تین سیاسی کارکنان میں منیر چولیانی کا بھتیجا بھی شامل تھا۔بعدازاں ان کی نعشوں کو کار میں رکھ کر آگ لگادی گئی۔قاتل تاحال مفرور تھے۔ایچ آر سی پی کی

ایک فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے اس واقعے کے دو ہفتے بعد معاملے کی معتبر اور جامع تحقیقات نہ کرنے پر شدید تشویش کا اظہار کیا تھا۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران اس خدشے کو دور کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔

ایچ آر سی پی کو شبہ ہے کہ یہ ہلاکتیں سندھ میں بلوچستان جیسی افراتفری پھیلانے کی سازش ہے اور ان کوششوں کی پرزور مزاحمت کی جانی چاہیے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ان سفاکانہ ہلاکتوں کے خاتمے کا پختہ عزم کیے بغیر یہ صورتحال تبدیل نہیں ہوگی۔ کمیشن وفاقی وصوبائی حکومتوں اور عدلیہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ سندھ میں سیاسی کارکنوں کو منظم طریقے سے نشانہ بنائے جانے کا نوٹس لیا جائے اور قاتلوں کی بلاتاخیر شناخت اور انہیں سزا دینے کے لیے فوری طور پر عدالتی تحقیقات کا انعقاد کیا جائے تاکہ سزا سے استثنیٰ کے احساس کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ماضی کے تجربے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایچ آر سی پی کو یہ تقاضہ بھی کرنا چاہیے کہ عوام کو ایسی تحقیقات کے نتائج سے باخبر رکھا جائے۔

خواتین کے حقوق

7 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے مطالبہ کیا ہے کہ صنفی مساوات کے فروغ کے لیے کیے جانے والی کوششیں رسمی اقدامات اور زیرالتوا قانون سازی تک محدود نہیں رہنی چاہئیں اور خواتین کی معاشی آزادی کے لیے فوری اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ 8 مارچ کو خواتین کے عالمی دن کے موقع پر جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا: ''ملک بھر میں لڑکیوں اور خواتین کو متعدد چیلنجوں کا سامنا ہے۔ قانون سازی سے متعلق چند مثبت تبدیلیوں کے نفاذ میں ناکامی کے علاوہ قانون میں مجوزہ تبدیلیوں کی منظوری میں بے جا تاخیر کے باعث خواتین کی انسانی حقوق کی صورتحال بدتر ہوتی جارہی ہے، اگرچہ ایچ آر سی پی سمجھتا ہے کہ خواتین کے عالمی دن کو گزشتہ سال کے دوران ہونی والی پیش رفت اور درپیش چیلنجوں کی نشاندہی کے موقعے کے طور پر منانا ضروری ہے تاہم صرف یہ کرنے سے زمینی حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔ رسمی اقدامات یا ہر سال 8 مارچ کے موقع پر جذباتی بیانات دینے سے لڑکیوں اور خواتین کی حالت میں تبدیلی کی امید نہیں۔

''نام نہاد غیرت کے نام پر قتل کی شکل میں خواتین کے خلاف تشدد میں کمی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ عورتوں پر تیزاب پھینکنے اور جبری طور پر مذہب کی تبدیلی کے واقعات بھی بدستور رونما ہو رہے ہیں۔ ملک کے اندر شورش زدہ علاقوں، جیسا کہ فاٹا اور مالاکنڈ کی خواتین اور لڑکیوں اور ملک کے اندر مختلف وجوہات کی بنا پر بے گھر ہونے والی خواتین پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے وقت جب انتہا پسند

جنگجوؤں کے ساتھ مذاکرات حکومت کی ترجیحات میں شامل معلوم ہوتے ہیں، اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ شورش زدہ علاقوں میں خواتین کی پریشانیوں اور مسائل کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے اور ان کے حقوق پر سمجھوتہ نہ کیا جائے۔

''8 مارچ کے لیے اس سال کا موضوع ''خواتین کے لیے مساوی حقوق میں ہی سب کی بہتری ہے'' خاص طور پر پاکستان کی صورتحال سے ہم آہنگ ہے۔ مختلف ممالک کے تجربے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاں جہاں صنفی مساوات، خواتین کی خودمختاری اور مختلف شعبوں میں ان کا وسیع کردار ہے وہاں خواتین کی حالت اور معاشی اور سماجی ترقی کی صورتحال بہتر ہے اور زیادہ رواداری پائی جاتی ہے۔'' موجودہ تناظر میں پاکستان میں زیرالتوا قانون سازی کو جلد از جلد مکمل کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ کم عمری کی شادی کی ممانعت اور اس جیسے دیگر قوانین جو اس وقت مقنّنہ کے سامنے ہیں۔ ہندوؤں کے ازدواجی قانون اور مسیحوں کے قانون طلاق میں ترامیم کی منظوری میں مسلسل تاخیر بھی خواتین کے مسائل میں اضافے کا باعث ہے۔

ایچ آر سی پی یہ سمجھتا ہے کہ لڑکیاں اور خواتین جن مسائل سے دوچار ہیں وہ اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے جب تک انہیں برابری، معاشی آزادی، بشمول تعلیم، روزگار اور وراثت میں ان کے حصے جیسے حقوق میسر نہیں ہوتے۔ محض قوانین بنا دینے سے ہی ان سماجی رویوں میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی جو صنفی مساوات کے وقوع پذیر ہونے میں حائل ہیں۔ اس حوالے سے اب تک کی پیش رفت خاصی غیر امید افزا ہے اور اس میں بہتری کی خاصی گنجائش ہے۔

مارچ 12: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اسلامی نظریاتی کونسل (سی آئی آئی) کی اس سفارش کی شدید مذمت کی ہے کہ مسلم خانگی قوانین کو کالعدم قرار دیا جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ خواتین کے حقوق کے دفاع پر ثابت قدم رہے۔

آج کمیشن کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے متنازعہ سربراہ مولانا شیرانی نے ایک ایسے وقت میں ملک کی محروم خواتین کے حقوق پر بھرپور حملہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جب ریاست مذہبی سپاہیوں کا روپ دھارے ہوئے انتہا پسندوں کے سنگین خطرے اور تھر میں انسانی المیے کا سامنا کر رہی ہے۔ مزید یہ کہ اُنہوں نے یہ حملہ عین اُس وقت کیا جب پوری دنیا خواتین کے عالمی دن کے موقع پر اُن کے ساتھ اظہار یک جہتی کر رہی تھی۔

مذکورہ سفارش کا مقصد یہ ہے کہ والدین / سرپرستوں کو اپنی چھوٹی بچیوں کی شادی کرنے کی اجازت دی جائے اور دوسری شادی کے خواہش مند افراد کو اس مقصد کے لیے اپنی پہلی بیوی سے اجازت لینے سے استثنیٰ

فراہم کیا جائے۔ یہ کوشش خواتین اور لڑکیوں کے بنیادی حقوق پر گھناؤنے حملے کے مترادف ہے۔ مولانا شیرانی اور ان کے ساتھیوں نے جن مفروضوں کو اپنی سفارشات کی بنیاد بنایا ہے وہ نہ صرف پاکستان کے آئین اور عالمگیر انسانی حقوق سے متصادم ہیں بلکہ مذہب کی روح کے بھی منافی ہیں جس کی پیروی کا یہ معززین دعویٰ کرتے ہیں۔ عوام یہ جاننے میں حق بجانب ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل جس نے کچھ عرصہ پہلے تمام قوانین کی چھان بین مکمل کرنے کا دعویٰ کیا تھا، اُسے اس خاص لمحے پر ہی ''مسلم خانگی قوانین آرڈیننس 1961'' میں خامیاں دریافت کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا ہے۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ مولانا شیرانی خواتین کے خلاف ایک نیا محاذ کھولنے اور ریاست پر انتہا پسند جنگجوؤں کی گرفت مضبوط کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ اقدام کرتے ہوئے اُنہوں نے اس امر کی معقول وجہ فراہم کی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے افعال، اس کے اختیارات اور اس کے وجود کے جواز پر مکمل نظرثانی کی جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ سی آئی آئی کی سازش کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے۔

مارچ 14: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جنسی تشدد کا نشانہ بننے والی لڑکی کی موت پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جس نے اس وجہ سے خود کو آگ لگا لی کہ پولیس رپورٹ سے ملزم کو اپنی ضمانت منظور کروانے میں مدد ملی تھی۔ اپنے ایک بیان میں کمیشن نے کہا ''مظفر گڑھ میں اجتماعی جنسی تشدد کا نشانہ بننے والی لڑکی کی موت کا دکھ ناقابل بیان ہے۔ اس کی قربانی ملک میں جنسی تشدد کے متاثرین کی مشکلات کی عکاسی کرتی ہے جو انہیں ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کی کوشش کے دوران پیش آتی ہیں۔ اس حقیقت کا ہر کسی کو علم ہے کہ پاکستان میں جنسی تشدد کے بہادر متاثرین ہی اپنے معاملے سے پولیس یا عدالت کو آگاہ کرتے ہیں۔ مذکورہ لڑکی جمعرات کو مظفر گڑھ میں واقع بیٹ میر ہزار پولیس سٹیشن پہنچی اور تحقیقاتی پولیس افسر کے سامنے پولیس رپورٹ کے خلاف احتجاج کیا جس کی وجہ سے ملزم کی ضمانت منظور ہوئی تھی۔

''اس واقعے کا افسوسناک ترین پہلو یہ ہے کہ ایک 18 سالہ لڑکی جو قانونی تربیت سے محروم تھی، کو اس بات کا پتہ لگانے میں دو ماہ کا عرصہ لگا کہ اسے متعدد مسائل کا سامنا ہے۔ قانون اور فوجداری انصاف کے ماہرین کو اس سے کم عرصے میں اس بات کا ادراک ہونا چاہئے تھا۔ رویوں میں اچانک اور معجزاتی تبدیلی رونما ہونے سے قطع نظر، یہ بات تقریباً حتمی ہے کہ پاکستان میں خواتین کے خلاف جنسی تشدد کے سیاق وسباق کے حوالے سے لڑکی کی آزمائش اور دردناک موت کے مثبت اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔ چیف جسٹس نے واقعہ کا از خود نوٹس لیا ہے۔ اگر صرف از خود نوٹس ہی کسی تبدیلی کا باعث بن سکتا تو اس وقت پاکستان ایک اصلاح شدہ ملک ہوتا۔ ایچ آر سی پی امید کرتا ہے کہ حکومت تاخیر سے ہی سہی، کم از کم عصمت دری کرنے والوں پر

مقدمہ چلانے کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے گی اور فوری طور پر اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اپنے منصوبے کا اعلان کرے گی کہ جنسی تشدد سے متاثرہ کسی اور فرد کو توجہ حاصل کرنے کے لیے خود کو آگ نہ لگانی پڑے۔

28 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے لاہور میں ایک خاتون کے قتل پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے، جسے اس کے اہل خانہ نے پسند کی شادی کرنے پر لاہور ہائی کورٹ کے قریب اینٹیں مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ منگل کے روز لاہور ہائی کورٹ سے چند گز کے فاصلے پر فرزانہ پروین کو جس طریقے سے قتل کیا گیا اس پر ایچ آر سی پی کو سخت دھچکا پہنچا ہے۔ اس کا جرم محض اتنا تھا کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ قانون یہ حق تمام بالغ شہریوں کو فراہم کرتا ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں نہیں، جہاں ریاست اس کی خلاف ورزی کو روکنے میں ناکام رہتی ہے۔

پروین کو اس کے تقریباً بیس رشتہ داروں نے قتل کیا جن میں اس کا باپ اور بھائی بھی شامل تھے جنھوں نے اس پر اور اس کے خاوند پر اینٹوں اور ڈنڈوں سے حملہ کیا۔ جائے وقوعہ کے قریب اور ہائی کورٹ میں موجودہ لوگوں اور پولیس اہلکاروں میں سے کسی نے بھی مداخلت نہ کی۔

مذکورہ خاتون اس مقدمے میں اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے لئے عدالت آئی تھی جو اس کے خلاف خاندان کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر دائر کیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق پروین کے اہل خانہ نے 12 مئی کو ہونے والی سماعت کے دوران اسے اور اس کے خاوند کو بھی دھمکیاں دی تھیں۔

پروین کا قتل فوری اشتعال کے نتیجے میں پیش آنے والا واقعہ نہیں ہے کیونکہ اس کی شادی کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ اس کا خاندان واضح طور پر اسے قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ پروین کے والد نے جب خود کو پولیس کے حوالے کیا تو وہ اپنے کئے پر شرمندہ نہیں تھا اور اس نے بہیمانہ قتل کو ''عزت کے نام پر قتل'' قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اپنے کئے پر افسوس نہیں ہے۔

شہریوں کی زندگیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے فریضہ کی ادائیگی میں حکام کی ناکامی کے باعث ایسے ظالمانہ اقدامات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ نام نہاد ''غیرت کے نام پر قتل'' کا نشانہ بننے والی خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد ان کی زندگیوں کو محفوظ کرنے میں کسی بھی قسم کی دلچسپی کے بارے میں پائے جانے والے مغالطّوں کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ صرف 2013ء میں، ایچ آر سی پی نے ذرائع ابلاغ کی رپورٹس سے ''غیرت کے نام پر'' 900 خواتین کے قتل کے واقعات قلمبند کئے تھے۔ ان خواتین کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ ریاست نے اس جاگیردارانہ رواج کا مقابلہ نہیں کیا جسے مذہبیت اور تعصب کی حمایت حاصل تھی۔

ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ اس شرمناک جرم کی بھرپور مذمت کرے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ پروین کے قاتل اپنے بزدلانہ اقدام کو عزت کے نام پر قابل ستائش قرار دے کر انصاف کے کٹہرے سے بچ نہ جائیں۔ حکومت کو اس جرم کے پیچھے پائی جانے والی جاگیردارانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے لیے عوامی آگاہی کی مہم شروع کرنے کے بارے میں بھی غوروفکر کرنا چاہیے اور اس چیز کو یقینی بنانا چاہیے کہ قاتل عزت کے بے جا تصورات کا سہارا لے کر سزا سے نہ بچ جائیں۔

29 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی جانب سے کراچی میں منعقد کردہ مشاورت کے اختتام پر کہا گیا کہ ملک میں ملازمت پیشہ خواتین کے حقوق کی آگہی پھیلانے، جنس سے قطع نظر مساوی کام کے مساوی معاوضے کو یقینی بنانے، معاشرے اور ملکی معیشت میں خواتین کی خدمات کا اعتراف کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

''خواتین کا معاوضہ وروزگار'' کے عنوان سے منعقد ہونے والی مشاورت کے شرکاء نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ گھروں میں رہ کر کام کرنے والی خواتین (ایچ بی ڈبلیو) اور گھریلو ملازمین کو مزدور کا درجہ دیا جائے تاکہ وہ بھی سماجی تحفظ کی سہولت سے مستفید ہو سکیں۔ شرکاء کا کہنا تھا کہ ملکی معیشت کا 35 فیصد غیر رسمی شعبے کی طرف سے آتا ہے اور لاکھوں ملازمین خصوصاً خواتین اس شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ یہ ملازمین نہ تو یونین سازی کر سکتے ہیں اور نہ ہی کم از کم مقررہ اجرت سمیت اپنے دیگر حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جو مزدوروں کو پاکستان کے قوانین یا پاکستان کے توثیق کردہ انسانی حقوق کے عالمی معاہدات کے تحت حاصل ہیں۔

انسانی حقوق کی معروف کارکن خالدہ غوث نے روزگار کے رجحانات، جنس کی بنیاد پر امتیازی سلوک، استحصال اور ایک جیسے کام پر مردوں اور عورتوں کے لیے غیر مساوی معاوضے جیسے معاملات پر ایک مقالہ پیش کیا۔ ایچ بی ڈبلیوز اور گھریلو ملازمین کے حقوق پر مامور گھریلو ملازمین کی تنظیم کی عہدیدار زہرا علی نے کہا کہ ان ملازمین کے حوالے ہمہ گیر پالیسی کے حوالے سے یکساں معاوضے پر ایک خاص قسم کی مشکل درپیش آئی تھی کیونکہ ان کے کام کی نوعیت مختلف تھی خاص طور پر ایچ بی ڈبلیوز مہارت یافتہ ملازمین تھے۔ سماجی کارکن ڈاکٹر سجاد نے کام کے دوران پیش آنے والے حادثات اور زچگی کے دوران خواتین ملازمین کو صحت کے مسائل کے بارے گفتگو کی۔ سول سوسائٹی کی کارکن فرحت پروین نے لیبر سے متعلقہ قوانین پر سیر حاصل گفتگو کی اور خواتین مزدوروں کے لیے اجتماعی معاملات سازی کی اہمیت اجاگر کی۔

شرکاء میں خواتین ملازمین، طلباء وطالبات، سماجی کارکنوں، خواتین ڈاکٹرز اور سول سوسائٹی کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔

انسانی حقوق کے محافظین

اپریل 10: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ملتان سنٹرل جیل کے اندر کمرہ عدالت میں تضحیک مذہب کے ملزم کے وکیل کو دی جانے والی دھمکیوں پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ جن افراد نے دھمکیاں دی تھیں ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور وکیل صفائی کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔

جمعرات کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ایچ آر سی پی کو کھلی عدالت میں تضحیک مذہب کے ملزم جنید حفیظ کے وکلاء کو ملنے والی دھمکیوں پر شدید تشویش لاحق ہے۔ ملزم کے وکیل راشد رحمان اور اللہ داد 09 اپریل، بروز بدھ کو مقدمے کی سماعت کے موقع پر جج کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ سکیورٹی تحفظات کے باعث مقدمے کی سماعت ملتان سنٹرل جیل میں ہو رہی ہے۔

ملزم کی بریّت کے لیے دلائل کے دوران، تین افراد نے جج کی موجودگی میں راشد رحمان ایڈووکیٹ کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''آپ اگلی مرتبہ عدالت نہیں آسکیں گے کیونکہ آپ اب مزید زندہ نہیں رہ سکیں گے۔'' مسٹر رحمان نے دھمکی کی جانب جج کی توجہ دلائی تاہم اطلاع کے مطابق جج صاحب خاموش رہے۔

تضحیک مذہب کے ملزم کو وکیل حاصل کرنے اور اُس کی خدمات جاری رکھنے کے حوالے سے جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں اُن سے ہر فرد آگاہ ہے۔ ایچ آر سی پی اسے ملزم کو قانونی نمائندگی دینے سے دانستہ انکار کے مترادف سمجھتا ہے۔

ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ محض متعصب افراد کی ہی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ ملزم کو قانونی نمائندگی نہ ملے۔ اگر یہ شرمناک کھیل جاری رہا تو ایچ آر سی پی یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوگا کہ ملزم کو قانونی نمائندگی حاصل کرنے کی اجازت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور یہ کہ ٹرائل جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ مذکورہ مقدمے میں وکیل کو دھمکیاں دینے والے تینوں افراد کے خلاف بلا تاخیر قانونی کارروائی کی جائے اور وکیل صفائی کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

مئی 8: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو اپنے ملتان ٹاسک فورس کے کوآرڈی نیٹر راشد رحمان ایڈووکیٹ کے قتل کا شدید افسوس ہے۔

مسٹر رحمان انسانی حقوق کے پُرعزم کارکن اور پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے اور ایچ آر سی پی کے ساتھ تقریباً 20 برسوں سے وابستہ تھے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کمیشن نے ایک بیان کے ذریعے حکام کو آگاہ کیا تھا کہ ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں جہاں راشد رحمان تضحیک مذہب کے ایک ملزم کی وکالت کر رہے تھے، اُنہیں وکلاء استغاثہ کی طرف سے

دھمکیاں دی گئی تھیں۔ مقدمے کی سماعت سکیورٹی خدشات کے باعث جیل میں کی جارہی تھی۔ اطلاعات کے مطابق، جج نے اپنی موجودگی میں ملنے والی دھمکیوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ تین افراد نے جج کی موجودگی میں وکیل صفائی راشد رحمان ایڈووکیٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''آپ اگلی مرتبہ عدالت نہیں آئیں گے کیونکہ آپ اب مزید زندہ نہیں رہ سکیں گے۔''

یہ قابل افسوس امر ہے کہ ایچ آر سی پی یا مسٹر رحمان کے تحفظات پر کوئی توجہ نہ دی گئی اور راشد کو دھمکیاں دینے والے تین افراد کی گرفتاری کے لیے کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ اس سے پہلے جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے مطالبہ کیا تھا کہ وکیل کو دھمکیاں دینے والے تینوں افراد کے خلاف بلاتاخیر قانونی کارروائی کی جائے اور وکیل صفائی کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ راشد رحمان کو دھمکیاں دینے والے افراد کے خلاف فوری طور پر مقدمہ درج کیا جائے اور اُن کے قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ اگر اس اپیل کو نظرانداز کیا گیا کوئی بامعنی کارروائی نہیں کی جاتی تو یہ انسانی حقوق کی تحریک اور مسٹر رحمان کے اہل خانہ کے لیے انصاف کا مذاق اڑانے والی بات ہوگی۔

راشد رحمان نے ایک ایسے معاشرے میں تضحیک مذہب کے ملزم کی وکالت کرنے کا جرأتمندانہ فیصلہ کیا تھا جہاں متعصب لوگوں کے خیال میں ملزم کو دفاع کا کوئی حق نہیں ہے۔ اُن کی موت کی صورت میں، ایچ آر سی پی انسانی حقوق کے ایک پُرعزم اور بہادر کارکن سے محروم ہوگیا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی کی طاقتیں جنہیں ریاست اپنے قابو میں نہیں لارہی، اس اقدام سے معرکہ تو جیت سکتی ہیں مگر جنگ نہیں جیت سکتیں۔

پولیس کی زیادتیاں

جون **18**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ڈاکٹر طاہرالقادری کے سیکرٹریٹ کے باہر پولیس کی پُرتشدد کارروائی کی شدید مذمت کی۔ اس پُرتشدد کارروائی میں آٹھ افراد جاں بحق ہوئے اور کم ازکم 90 لوگ زخمی ہوئے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا کہ ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق منگل کے روز رونما ہونے والے ناخوشگوار واقعہ کی پرزور الفاظ میں مذمت کرتا ہے جس میں ڈاکٹر طاہرالقادری کے سیکرٹریٹ کے اطراف میں سڑک پر نصب رکاوٹیں ہٹانے کے لئے انتظامیہ کی مبینہ کوشش میں دوخواتین سمیت آٹھ افراد جاں بحق ہوئے''۔

''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق متاثرہ خاندانوں کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ یہ اموات محض تجاوزات ہٹانے کی کوشش میں واقع ہوئیں۔ یہ رکاوٹیں کئی سال

سے نصب تھیں اور بہت سے لوگوں کے نزدیک ڈاکٹر طاہر القادری کی پاکستان آمد کے موقع پر ان رکاوٹوں کو ہٹانے کے پس پردہ سیاسی محرکات تھے''۔

یہ پہلا واقعہ نہیں جس میں پولیس کی تربیت میں کمی اور ہجوم پر بلا اشتعال قابو پانے کی کمزوری آشکار ہوئی ہو اور شاید نہ ہی یہ آخری غلطی ہو گی۔ اس واقعہ نے سیاسی حکومت کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ مظاہروں پر قابو پانے کی نااہلی کو بھی آشکار کر دیا ہے۔ ایچ آر سی پی یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ مسٹر قادری کی طرف سے کی جانے والی جارحیت کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہوتی، ضروری تھا کہ تشدد سے احتراز کیا جاتا۔

اس افسوسناک واقعے کی تحقیقات شروع کر دی گئی ہیں، اور ان تحقیقات میں واقعہ کے ذمہ داروں کا تعین بلا خوف و خطر ہونا چاہیے اور سابقہ روایات کے برعکس تحقیقات کے نتائج کو منظر عام پر لایا جائے۔ جامع تحقیقات میں اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ سرکاری اہلکاروں کی طرف سے طاقت کا بے محابہ استعمال کیوں ہوا۔ تحقیقات کے دوران اس بات کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ کیا سرکاری اہلکاروں کو مذہب کے حوالے سے یا کسی سیاسی منظرنامے کی صورت میں قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت دی جانی چاہیئے۔

ایچ آر سی پی کا موقف ہے کہ اس المناک واقعے کو سیاسی رنگ نہ دیا جائے اور نہ ہی لاشوں پر سیاست چمکائی جائے۔ میڈیا کو اس معاملے میں محتاط روّیہ اپنانا چاہیئے۔

فیکٹ فائنڈنگ مشن

27 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے مطالبہ کیا ہے کہ تھر کو درپیش متعدد مسائل کے حل کے لیے مقامی آبادی کی مشاورت سے فوری اقدامات کیے جائیں جن میں خاص طور پر بچوں کی اموات کا سبب بننے والے اور خشک سالی کے باعث پیدا ہونے والے مسائل شامل ہیں۔

ایچ آر سی پی کے تھرپارکر کے دورے کے اختتام پر جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی اپنے مختصر دورے میں تھر کی صورتحال کی پیچیدگیوں کے تجزیے میں حائل رکاوٹوں سے بخوبی واقف ہے۔ البتہ ایچ آر سی پی تھر کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مرد و خواتین، سول سوسائٹی کے کارکنان اور ترقیاتی ماہرین کا شکرگزار ہے جنھوں نے ہمیں اپنے تجربات سے مستفید کیا۔

''ایچ آر سی پی تھر میں کم سن بچوں کی اموات کی جانب توجہ دلانے میں میڈیا کے کردار کو بھی سراہتا ہے۔ اس سے نہ صرف خشک سالی بلکہ تھر کے دیگر بڑے مسائل کی جانب توجہ مبذول کرانے میں بھی مدد ملی ہے۔

''تھر کے لوگوں کے مسائل خاصے پیچیدہ ہیں اور ہسپتال یا گھروں میں بچوں کی اموات اس کا صرف

ایک پہلو ہے۔ بچوں کی بلند شرح اموات ایک دیرینہ مسئلہ ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کا سبب محض فاقہ کشی ہی نہیں بلکہ متعدد عوامل پر توجہ نہ دینے میں مسلسل ناکامی بھی ہے جن میں غذائی عدم تحفظ اور غذائیت کی کمی، پینے کے صاف پانی اور حفظان صحت کا فقدان اور خواتین کی تعلیم اور خاندانی منصوبہ بندی کا نہ ہونا شامل ہے۔ غربت، کم عمری کی شادیوں، طویل فاصلوں کے باعث زچگی اور نومولود بچوں کی صحت سے متعلق ہنگامی مراکز تک عدم رسائی، ابتدائی نگہداشت صحت کے ایک غیر موثر ڈھانچے اور ایک سنگدل تقدیر پر قناعت کرنے کے ماحول کے باعث یہ مسائل اور بھی سنگین ہو گئے ہیں۔ تھر کے لوگ ایک ایسے متوسط دانشور طبقے سے محروم ہیں جو ان کے مسئلے کو اجاگر کرے اور انہیں بنیادی مطالبات کے اظہار کے لیے بھی عام طور پر باہر کے لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

''خشک سالی ایک قدرتی اور بار بار وقوع پذیر ہونے والا مظہر ہے جس نے تھر کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اس نقصان کو پیشگی منصوبہ بندی کے ذریعے کم کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حکومت نے انہیں خاطر خواہ اور بروقت مدد فراہم نہیں کی اور یہ کہ وہ تاجر جو کہ امداد فراہم کرنے کے ذمہ دار تھے انہوں نے ذمہ داری پر منافع کو ترجیح دی۔'' ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ تھر کی معیشت اور وسائل بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ طلب میں اضافے کے ساتھ خوراک کی ترسیل یا تو بند یا پھر کم ہو گئی ہے۔ کاشت کاری اور مویشیوں کی افزائش دونوں ہی غیر مستحکم ہو چکے ہیں۔ جانوروں اور مویشیوں کی معیشت نقدی معیشت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ لیکن لوگوں کے پاس نقدی رقم نہیں ہے۔ تھر میں پائے جانے والے وافر قدرتی وسائل کو ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکا اور جو مواقع دستیاب ہیں وہ بھی 400 کلومیٹر یا اس سے بھی زیادہ فاصلے پر موجود ہیں۔ غیر ہنر مند افراد کی ایک بڑی تعداد کو فوری توجہ درکار ہے تاکہ ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جا سکے۔ ترقی اور مشقت کے مابین ایک تعلق قائم نہیں کیا گیا۔ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ امداد پر انحصار بڑھ رہا ہے۔'' تھر کے لوگوں کو جن متعدد مسائل کا سامنا ہے وہ ان مسائل سے مختلف نہیں جو پاکستان کے دیگر علاقوں کے لوگوں کو درپیش ہیں؛ پولیس بدعنوان ہے، انتظامیہ نااہل اور سیاسی جماعتیں بے حس ہے۔ دیہات میں قرض داری کی شرح بہت زیادہ ہے اور طرز زندگی میں تبدیلی اور موبائل فون اور موٹر سائیکل جو کہ ترقی کی علامت سمجھے جاتے ہیں، کی مانگ میں اضافے کے ساتھ اس میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

''ہم نے چند مثبت تبدیلیوں کا بھی مشاہدہ کیا، مثال کے طور پر حالیہ دنوں میں صحت کی سہولیات کی دستیابی میں بہتری آئی ہے اگرچہ اس حوالے سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مثبت تبدیلی یہ بھی ہے کہ خواتین کام کے لیے اپنے گھروں سے نکلنے کے قابل ہوئی ہیں جبکہ کئی علاقوں میں چند خواتین نے ذات کی

بنیاد پر تفریق کو مسترد کر دیا ہے اور انتہا پسندوں کی اشتعال انگیزی کے باوجود گروہی ہم آہنگی برقرار ہے۔

''آخری بات یہ کہ پانی، سڑکوں، صحت اور خواتین کی تعلیم سے متعلق مسائل کے حل کے لیے تبدیلی پر مبنی مشترکہ ترقیاتی حکمت عملی تشکیل دینے کی ضرورت ہے؛ اور تبدیلی لانے کے لیے سرکاری و نجی اشتراک کے لیے ضروری سماجی اصول لاگو کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مشاورت اور جامع فیصلہ سازی کی ضرورت کا واضح طور پر ادراک کیا جاسکے اور اس پر عمل درآمد کیا جاسکے۔

ایگزیکٹو کونسل کے بیانات

انسانی حقوق کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر فوری توجہ دی جائے

اپریل **28**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے انسانی حقوق کی بگڑتی صورتحال اور ان معاملات کو ترجیح نہ دینے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ کمیشن برائے انسانی حقوق کے کونسل اور سالانہ عمومی اجلاسوں کے اختتام پر جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا کہ: ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی جنرل باڈی اور ایگزیکٹو کونسل اس امر پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ گزشتہ سال اکتوبر میں منعقد ہونے والے اجلاس سے لے کر اب تک چھ ماہ کے دوران انسانی حقوق کی صورتحال میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ اس کے علاوہ تشویش کی نئی وجوہات سامنے آئی ہیں۔ مندرجہ ذیل معاملات کی خاص طور پر نشاندہی کرنا ضروری ہے۔

1۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی کوئی سمت نہیں۔ واضح پالیسیوں کا فقدان ہے۔ ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے علاقائی تناؤ کو فوری طور پر ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایچ آر سی پی حکومت کو یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ حکومت پلاننگ کمیشن کے کار منصبی کو وسعت دے تاکہ یہ ملک کو درپیش سیاسی و سماجی مسائل کے حوالے سے ایک تھنک ٹینک کے طور پر کام کر سکے اور اس حوالے سے واضح پالیسیاں اور حکمت عملی وضع کی جاسکے۔

2۔ انسداد دہشت گردی پالیسیوں کو شہریوں کو نشانہ بنانے کی بجائے ان کا تحفظ کرنا چاہیے۔ قانون سازی سے متعلقہ اقدامات جن کا مقصد لاقانونیت اور دہشت گردی کا خاتمہ ہے، کے باعث ملزم کے حقوق سے متعلق خدشات میں اضافہ ہوا ہے۔ ان خدشات کا جائزہ لیا جانا چاہیے اور چیلنجوں کے خاتمے سے متعلق قوانین من مانے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر مبنی نہیں ہونے چاہئیں۔

3۔ ایچ آر سی پی کو افسوس ہے کہ بلوچستان حکومت نے اس کے ایک انسانی حقوق کمیشن تشکیل دینے کے مطالبے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کوئٹہ میں اعزازی حیثیت سے ایک خود مختار انسانی حقوق کمشنر اور ہر ضلعے میں انسانی حقوق کے افسران تعینات کیے جائیں۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ ایچ

آر سی پی کی تو تک، جہاں ایک اجتماعی قبر دریافت ہوئی تھی، کا دورہ کرنے کی درخواست منظور نہیں کی گئی۔

4۔ اگرچہ گزشتہ سال دسمبر میں دوسرے صوبوں سے پہلے بلدیاتی انتخابات کا انعقاد کرنے پر بلوچستان حکومت مبارکباد کی مستحق ہے تاہم منتخب کردہ افراد نے ابھی تک حلف نہیں لیا اور اس نظام کے فوائد لوگوں کی پہنچ سے دور ہیں۔ دیگر صوبوں نے تا حال ان اہم انتخابات، جو کہ اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کرتے ہیں اور لوگوں کے مسائل کو حل کرتے ہیں، کا انعقاد نہیں کیا۔ تاہم، ایچ آر سی پی بلوچستان حکومت کے دہشت گردی کے متاثرین، جن میں عام شہری شامل ہیں، کو معاوضہ فراہم کرنے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتا ہے۔

5۔ ایچ آر سی پی دھونس اور قانونی کروائی کی دھمکیوں کے ذریعے میڈیا کی آزادی کو سلب کرنے کی کوششوں پر تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے بڑے بڑے میڈیا اداروں کے درمیان جاری الفاظ کی جنگ، جسے یہ میڈیا کی آزادی اور اس کی عسکری اسٹیبلشمنٹ پر تنقید کرنے کی قابلیت کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتا ہے، پر بھی سخت تشویش ہے۔

6۔ میڈیا اپنی ذی شعور بحث کی حوصلہ افزائی کرنے اور رواداری کی ثقافت کو فروغ دینے کی ذمہ داری کو پورا کرنے میں بھی ناکام ہو رہا ہے۔ کمیشن یہ سمجھتا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کو ایک خودمختار ادارہ بنایا جائے۔

7۔ ایچ آر سی پی مالاکنڈ میں ایکشنز ان ایڈ آف سول پاور آرڈیننس کے تحت من مانی گرفتاریوں کی مذمت کرتا ہے۔ مالاکنڈ سے جبری گمشدگیوں اور زیر حراست اموات کی خبریں بھی موصول ہوئی ہیں، جس سے ریاستی قوت کے غلط استعمال کی نشاندہی ہوتی ہے۔

8۔ ایچ آر سی پی ایک مرتبہ پھر غیر مسلموں کی عبادت گاہوں پر حملوں کی مذمت کرتا ہے۔ لاڑکانہ، تھرپارکر اور حیدرآباد میں مندروں پر متعدد حملے کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ کراچی میں ایک ڈیڑھ سو سالہ مندر کو ایک نجی تعمیراتی کمپنی کی جانب سے انڈر پاس اور پلوں کی تعمیر کے باعث نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ تضحیک مذہب قوانین کے ذریعے مذہبی اقلیتوں کو اذیتیں پہنچانے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ حکومت اور پارلیمنٹ جرات کا مظاہرہ کرے اور ان قوانین میں تبدیلی کے لیے بحث کا آغاز کرے۔

9۔ اقلیتوں کے عدم تحفظ کی عکاسی اس بات سے ہوتی ہے کہ ہزاروں افراد ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ مذہبی عدم رواداری میں اضافے کے باعث لوگ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہیں۔

10۔ تھرپارکر کی خشک سالی اور اس کی وجہ سے ہونے والی اموات خراب نظم و نسق علامت ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر باعث تشویش معاملات ہیں، جن میں بالائی سندھ میں اغواء برائے تاوان کے علاوہ سندھی قوم پرستوں کے اغواء اور ماورائے عدالت قتل کے واقعات شامل ہیں۔

11۔ لوگوں کو دہشت گردوں کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کی شرائط سے آگاہ نہیں کیا گیا، جس کے

باعث ان خدشات میں اضافہ ہوا ہے کہ شہریوں کے حقوق، بالخصوص خواتین اور مذہبی اور فرقہ وارانہ اقلیتوں کے حقوق کی قیمت پر انہیں رعایت دی جاسکتی ہے۔

12۔ جبری گمشدگیوں اور لاشیں پھینکنے کے واقعات کا دائرہ کار خیبر پختونخوا اور سندھ تک وسیع ہو گیا ہے۔ مجرموں کے لیے سزا سے استثنیٰ، جس کے بارے میں ایچ آر سی پی کا کہنا ہے کہ یہ ان واقعات میں اضافے کی ایک بڑی وجہ ہے، کا خاتمہ کیا جائے اور تمام افراد کو جبری گمشدگیوں سے تحفظ فراہم کرنے کے بین الاقوامی میثاق کی توثیق کی جائے۔

13۔ پاکستان میں بہت سے حلقوں کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو گیا کہ سکیورٹی خدشات کے علاوہ معاشی مواقع کے فقدان کے باعث لوگ ملک چھوڑنے پر مجبور ہیں۔

14۔ مہنگائی کی وجہ سے لوگوں کی بنیادی ضروریات زندگی، جن میں صحت، تعلیم اور خوراک شامل ہیں، تک رسائی ممکن نہیں رہی۔ غریب لوگوں کی آمدنی میں اضافے کے لئے معیشت کو بحال کیا جائے تاکہ وہ باوقار طریقے سے بنیادی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

15۔ ایچ آر سی پی اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ فاٹا کو فوری طور پر مرکزی قومی دھارے میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس حوالے سے غفلت برتنے پر نہ صرف اس مصائب کے شکار علاقے کے لوگوں کو بلکہ پورے ملک کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

16۔ انسانی حقوق کا دفاع کرنے والے کارکنان کو بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان کے لیے مسلح تصادم سے متاثرہ علاقوں، جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، میں کام کرنا یا رپورٹنگ کرنا مشکل ہو رہا ہے، ان کی حفاظت اور کام میں آسانیاں پیدا کرنے کی جانب ترجیحی بنیادوں پر توجہ دی جائے۔

17۔ پولیو ورکرز پر حملہ اور ان واقعات میں اضافہ تشویش کا باعث ہے اور یہ طویل المعیادی اقدامات کا تقاضا کرتے ہیں جن میں ان علاقوں میں، جہاں لاقانونیت ویکسینیشن کی راہ میں رکاوٹ ہے، میں آگاہی مہم کا انعقاد کرنا اور حکومت کی رٹ قائم کرنا شامل ہے۔

موجودہ سیاسی صورتحال کے باعث انسانی حقوق کے معاملات کو نظرانداز کیا جارہا ہے

اکتوبر **14**: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ملک بھر میں انسانی حقوق کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ موجودہ سیاسی صورتحال اور بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی انسانی حقوق سے متعلق مسائل سے نبٹنے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔

ایچ آر سی پی کونسل کی دوروزہ اجلاس کے اختتام پر جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا: ''ایچ آر سی پی کی ایگزیکٹو کونسل کو اس امر پر شدید تشویش لاحق ہے کہ گزشتہ اپریل میں کونسل کے اجلاس سے لے کر

اب تک ملک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں شدید اضافہ ہوا ہے۔کونسل کے خیال میں درج ذیل معاملات خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

- دھرنوں پر مشتمل سیاسی صورتحال نے زیادہ اہم معاملات سے لوگوں کی توجہ ہٹادی ہے۔اس کا ایک نتیجہ فرقہ وارانہ طاقتوں کے استحکام کی صورت میں نکلا ہے۔عوام پُر امید ہیں کہ حکومت اگر دھرنے میں شریک جماعتوں سے معاملات طے کرنے کی کوشش جاری بھی رکھے تو وہ لوگوں کے مسائل کے ازالے کے حوالے سے اپنے اوپر عائد کردہ فرائض سے پہلو تہی نہیں کرے گی۔
- مذہبی شدت پسندی میں اضافے کا بلا روک ٹوک سلسلہ جاری ہے اور مذہبی و مسلکی اقلیتوں کے لیے صورتحال ابتر ہوگئی ہے۔ پشاور میں سکھوں، عمر کوٹ میں ہندوؤں پر حملے، سندھ کے علاقوں میں مندروں پر یورش، میر پور خاص میں احمدی ڈاکٹر کی ٹارگٹ کلنگ، گوجرانوالہ میں احمدیوں، آواران میں ذکریوں کا قتل اور اڈیالہ جیل میں تضحیک مذہب کے ملزم پر حملہ مذہبی جنونیت اور عدم رواداری میں شدت کی محض چند مثالیں ہیں۔تضحیک مذہب کے الزام کی زد میں آنے والے افراد کا مقدر پُر خطر بن چکا ہے کیونکہ ان کے لیے دورانِ مقدمہ اپنا دفاع کرنا تقریباً ناممکن بن چکا ہے۔تضحیک مذہب کے ملزم کا دفاع کرنے پر کوئی وکیل آمادہ نہ تھا، اس کا دفاع کرنے پر راشد رحمان کے قتل اور اس کے قاتلوں کی گرفتاری میں حکام کی عدم دلچسپی سے سزا سے استثناء کو مزید تقویت ملی ہے۔
- رینجرز کی جانب سے جاری کراچی آپریشن موثر ثابت نہیں ہوسکا۔لوگوں کو مسلسل اٹھائے جانے کی شکایات منظر عام پر آرہی ہیں اور ان کا ازالہ نہیں کیا جارہا۔اس حوالے سے عدالتی کارروائی نہایت سست روی کا شکار ہے۔فرقہ وارانہ قتل اور ٹارگٹ کلنگ کا عمل شہر میں جاری ہے اور ہلاکتوں سمیت دیگر اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ آپریشن اپنے اہداف حاصل نہیں کرسکا۔ملک کے کسی بھی حصے میں امن عامہ کی بدتر صورتحال میں بہتری لانے کے لیے خلوص نظر نہیں آرہا۔ناقص نظم و نسق نے حالات کو مزید خراب کیا ہے۔اغواء برائے تاوان معمول بن چکا ہے اور مجرموں کی گرفتاری میں ناکامی نے خوف کی فضا پیدا کردی ہے۔
- بلوچستان سے ٹارگٹ کلنگ کی اطلاعات بھی موصول ہوئی ہیں جہاں جبری غائب کئے جانے اور مسخ شدہ نعشوں کی برآمدگی کا سلسلہ جاری ہے اگرچہ ایسے واقعات کی تعداد کم ہوئی ہے۔
- گزشتہ عشرے میں سات قوانین کی منظوری کے باوجود خواتین اور کمسن بچیوں پر تشدد کے واقعات میں اضافے پر ایچ آر سی پی نے شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور صوبائی حکومتوں سے سخت قانون سازی

کرنے اوران کے نفاذ کے لیے موثر اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور سرکاری و نجی ذرائع ابلاغ سے مطالبہ کیا کہ وہ ایک عشرہ قبل منظور کردہ جنس سے متعلقہ حساس رضا کارانہ ضابطہ اخلاق پر عملدرآمد کریں۔

- ڈبلیو ایچ او نے بیرونی سفر کے حوالے سے پاکستان کے لیے سخت اقدامات اپنائے ہیں جن میں مزید ممکنہ پابندیاں شامل ہیں۔ایچ آر سی پی کے خیال میں ان پابندیوں سے پاکستان کی معیشت اور بین الاقوامی تشخص پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔کمیشن نے پولیو ورکرز بالخصوص پاکستان کے دورافتادہ اور قدامت سند علاقوں میں غیر محفوظ بچوں کو ویکسینیشن دینے کی کوشش کرنے والے پولیو ورکرز کی ٹارگٹ کلنگ کی بھی مذمت کی ہے۔کمیشن نے مطالبہ کیا ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں ان پولیو ورکرز بالخصوص فاٹا،خیبر پختونخوا، بلوچستان ،کراچی اور دیگر علاقوں میں کام کرنے والے پولیو ویکسنیٹرز کے تحفظ کے لیے موثر اقدامات کریں۔
- بلوچستان میں صحافیوں کا قتل اور صوبے میں صحافیوں کی حالت زار کو ملک بھر میں انتہائی کم توجہ کا ملنا نہایت افسوسناک امر ہے۔صحافیوں پر حملوں کی تحقیقات ہونی چاہئے اور قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔
- سیلاب متاثرین اور کشیدگی کے باعث اندرون نقل مکانی کرنے والوں کی حالت باعث تکلیف ہے۔ متاثرہ شہریوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے فیصلوں پر ان سے مشاورت نہیں لی گئی۔ان کی جلد اور استحکام پذیر واپسی کے لیے بامعنی اقدامات کی ضرورت ہے۔ایچ آر سی پی نے وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ شمالی وزیرستان سے بے دخل ہونے والی خواتین کو قومی شناختی کارڈ کی فراہمی کے لیے نادرا کے موبائل سروس یونٹ قائم کئے جائیں اور خواتین سربراہوں پر مبنی گھرانوں کو ترجیح دی جائے۔ اس کے باعث وہ ایف ڈی ایم اے/ پی ڈی ایم اے/ این ڈی ایم اے میں بطور آئی ڈی پیز رجسٹر ہونے کے قابل ہوں گی اور نتیجتاً نغدی رقم کے حصول، اقامت کاری، صحت اور تعلیم کی سہولیات سے مستفید ہونے کی اہل بن سکیں گی۔ ہندوستان کے ساتھ سرحدی کشیدگی سے ہونے والی بے دخلی بھی فوری توجہ طلب ہے۔
- حراستی مراکز پر زیرحراست افراد کی حالت کا بھی فوری نوٹس لینا ضروری ہے۔اپنے خاندان کے ساتھ ملاقات کا نہ ہونا اوران کی صحت اور باضابطہ قانونی کارروائی کے حقوق کی پامالی جیسے اقدامات کو ترک کرنے اور دوران حراست ہلاکت کی آزادانہ تحقیقات کروانے کی ضرورت ہے۔ایچ آر سی پی فاٹا اور پاٹا میں ''سول اتھارٹی کی معاونت میں اقدام'' جیسے قانون کی بدستور مذمت کرتا ہے۔ مذکورہ قانون بنیادی حقوق کے اصولوں کے منافی ہے اورمن مانی حراست، ایذا رسانی اور جبری گمشدگیوں جیسے معاملات میں سکیورٹی فورسز کے غیر قانونی اقدامات کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔اس قانون کے زیادہ تر

متاثرین مالاکنڈ ڈویژن کے رہائشی ہیں۔

- خیبر پختونخوا کے تدریسی نصاب میں ہونے والی مثبت تبدیلیوں کو ختم کرنے اور سندھ کے نصاب میں ''ہم سب مسلمان'' جیسے نعروں سے پاکستان میں عدم رواداری اور شدت پسندی کو ہوا ملی ہے۔ ایچ آر سی پی کا صوبائی حکومتوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ نصاب امتیازی سلوک اور لوگوں کو معاشرے سے خارج کرنے کی بجائے انسانیت اور مثبت اقدار کو فروغ دے۔
- کونسل نے ملالہ یوسف زئی کو نوبل امن ایوارڈ ملنے کو خوش آئند قرار دیا اور کہا کہ ملالہ کو ایوارڈ کا ملنا پورے ملک کے لیے فخر کا باعث ہے اور امن و تعلیم خصوصاً لڑکیوں کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنے گا۔

چیئرپرسن اور کونسل اراکین

زہرہ یوسف کو دوبارہ ایچ آر سی پی کا چیئرپرسن منتخب کر لیا گیا

اپریل 27: اتوار کے روز پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے سالانہ عمومی اجلاس کے موقع پر منعقد کردہ عہدیداروں کے انتخابات برائے 16-2014 میں محترمہ زہرا یوسف کمیشن کی دوبارہ چیئرپرسن اور کامران عارف ایڈووکیٹ اس کے دوبارہ کو چیئرپرسن منتخب ہو گئے۔

وائس چیئرپرسنز کے نام یہ ہیں:

بلوچستان۔ طاہر حسین خان ایڈووکیٹ؛ خیبر پختونخوا۔ شیر محمد خان ایڈووکیٹ؛ پنجاب۔ محترمہ نازش عطاءاللہ؛ سندھ۔ اسد اقبال بٹ؛ محترمہ سلیمہ ہاشمی کمیشن کی خزانچی کے طور پر نامزد ہوئیں۔

اس موقع پر ایچ آر سی پی کونسل (گورننگ باڈی) کے لیے منتخب ہونے والے اراکین کے نام یہ ہیں:

محترمہ عاصمہ جہانگیر؛ محترمہ حنا جیلانی؛ ڈاکٹر مہدی حسن؛ ایئر مارشل ظفر اے چوہدری؛ ظہور احمد شاہوانی ایڈووکیٹ؛ محترمہ پروین سومرو؛ محترمہ نسرین اظہر؛ محترمہ عظمیٰ نورانی؛ حبیب طاہر خان ایڈووکیٹ؛ محترمہ طاہرہ کمال؛ غازی صلاح الدین؛ ندیم انتھونی؛ محترمہ سعدیہ بخاری؛ کانجی رانو بھیل؛ جوزف فرانسس؛ اندر آہوجا؛ اختر حسین بلوچ؛ رولینڈ ڈی سوزا؛ بدرالدین سومرو؛ صالح زادہ؛ عبدالغنی مینگل؛ محترمہ طاہرہ عبداللہ؛ بابر ایاز؛ راجہ محمد اشرف اور امرناتھ موتومل۔

ویڈیوگرافی کے مقابلے میں انعامات کی تقسیم

نومبر 28: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 28 نومبر کی شام کو ایوانِ جمہور میں پنجاب کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مابین ویڈیوگرافی کے مقابلے کا انعقاد کیا اور انعامات تقسیم کئے۔ پنجاب کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو مدعو کیا گیا تھا کہ وہ انسانی حقوق کے موضوعات پر اپنے طالبعلموں کی بنائی

ہوئی ویڈیوز پیش کریں۔ خواتین، بچے، اقلیتیں اور جمہوری ترقی کے موضوعات پر ویڈیز یو پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ تین موضوعات پر پیش کی گئی ویڈیو کو مقابلے کے لیے چُنا گیا۔ تین سے پانچ منٹ، پانچ سے دس منٹ اور دس اور اس سے زائد منٹوں کے دورانیے پر مبنی ویڈیو تھیں۔

پہلا انعام درج ذیل اداروں نے جیتا تھا:۔

1۔ بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی: خواتین کا موضوع

2۔ اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور: اقلیتوں کا موضوع

3۔ نیشنل کالج آف آرٹس: بچوں کا موضوع

جمہوری ترقی کے موضوع پر کسی کو پہلا انعام نہیں مل سکا کیونکہ اس موضوع پر صرف دو ویڈیز یو پیش کی گئیں جن میں سے کوئی بھی موضوع سے متعلق نہیں تھی۔

مقابلے میں درج ذیل اداروں نے حصہ لیا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی، بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، لاہور کالج آف ویمن یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، نیشنل کالج آف آرٹس، فورمین کرسچن کالج، یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب، پنجاب گروپ آف کالجز۔

اظہار تعزیت

15 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اپنے سابق سینئر سٹاف ممبر اور انسانی حقوق کے پرُعزم کارکن میاں نظام الدین کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ایچ آر سی پی نے ایک تعزیتی اجلاس میں خلوص کے ساتھ اُنہیں یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ ''انسانی حقوق کے کارکن سے بھی بڑھ کر'' تھے۔ انہوں نے ایچ آر سی پی اور دیگر بہت سی تنظیموں کے حوالہ جاتی سیکشن کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنے زمانہ طالبعلمی میں بھی انسانی حقوق کے بہادر کارکن تھے۔ جب وہ کسی کام کرنے کا ارادہ کر لیتے تو اس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ انہیں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سرگرم حامی ہونے کی بنا پر جیل بھی بھیجا گیا تھا۔